پرانی دُنیا کا ایک عجیب و غریب باغ

نجمہ سلطانہ



جب کبھی ہم دنیا کی پرانی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں تو بابل کا نام ضرور سُننے
تا ہے۔ لیکن جب دنیا کا نقشہ دیکھیں گے تو آپ کو اس نام کا نہ تو کوئی ملک نظر آ
اور نہ شہر۔ دراصل یہ شہر اب سے ہزاروں برس پرانا تھا۔ یہ بغداد سے ۷۰ میل
فاصلے پر بسا ہوا تھا۔ آج کل اس علاقے کو عراق کہتے ہیں۔

اب سے ہزاروں سال پہلے یہ دنیا کا خوبصورت ترین شہر تھا۔ اس کے متعلق
سے قصے اور کہانیاں آج بھی ہم سن کر خوش ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی عجیب اور حیر
میں ڈالنے والی باتیں ہیں جو آپ نے بھی سُنی ہوں گی۔ آئیے! ذرا اس شہر
جھولنے والے باغ HANGING GARDEN کے بارے میں معلوم کریں۔ یہ سوچ کر بڑا تعج
ہوتا ہے۔ کیسے باغ ہوں گے یہ۔

سُنئے! اسی شہر بابل میں تقریباً ۶۰۵ قبل مسیح یعنی حضرت عیسیٰ کی پیدائش

[illegible]

[illegible]

پہنچ جاتا ہے۔ ایک دن اُسے خیال آیا کہ چلو ہملین کے بچوں کو بیکنٹھ کی سیر کرائیں۔ بنسی والا صبح سویرے اٹھا اور اپنی بنسی اُٹھا کر چل پڑا۔ گلی میں نکل کر ایک عجیب وغریب دُھن چھیڑی، اس دُھن کا چھیڑنا تھا کہ سیکڑوں بچے چیونٹیوں کی طرح نکل پڑے اور بنسی والے کے پیچھے ہولئے۔ کالا گورا، پتلا موٹا، بلوان، نربل، چھوٹا بڑا، غرضیکہ کوئی بچہ ایسا نہ تھا جو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بنسی والے کے ساتھ نہ ہولیا ہو۔ یہ لمبا کارواں چلتا گیا اور بڑھتا گیا۔ چلتے چلتے یہ دور جنگل میں پہنچ گیا۔ اور ایک پہاڑی کے پاس جاکر رُک گیا۔ ان کے رُکتے ہی پہاڑی پر ایک دروازہ کھلا اور بنسی والا اپنے قافلے سمیت دروازے کے اندر غائب ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر میرے خیال میں سب بچوں کو منہ مانگی مرادیں ملتی ہوں گی۔ کسی کو کھلونے تو کسی کو کتابیں، مگر چترکاروں کو ڈھیر ڈھیر سے رنگ، عمدہ کاغذ، اور بُرش ملے ہوں گے۔ یہ کہانی سن کر شاید آپ کو خیال آئے کہ کاش ہم بھی ہملین کے شہر میں پیدا ہوتے تو ہمیں بھی بنسی والا رنگ دلواتا اور ہم بھی عمدہ عمدہ تصویریں بناتے۔ آپ کو ہملین کے شہر میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ایک ایسا ہی جادوگر آپ کے اپنے شہر دلی میں بھی ہے۔ جو چھوٹے چترکاروں کا دوست بھی ہے اور رہبر بھی۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو آپ میرے پاس آئیے، میں آپ کو شنکر سے ملواؤں۔ اُن کے پاس جادو کی بنسی تو نہیں پر جادو کا قلم ضرور ہے۔ جب اسے رنگ میں ڈبوکر یہ "چلڈرن آرٹ ایگزیبیشن" لکھتے ہیں تو شاید آخری حرف سوکھنے بھی نہ پاتا ہوگا کہ ساری دُنیا کے بچے جاگ اُٹھتے ہیں۔ چینی اور جاپانی، روسی اور ایرانی، ہندی اور عراقی، امریکی اور انگریز۔ ہندستانی اور پاکستانی؛ اپنی تصویریں بنا بنا کر شنکر کو بھیجنا شروع کر دیتے ہیں۔

جب بچوں نے پہلی بار تصویریں بھیجیں تو ان کی گنتی چند ہزار ہی تھی۔ مگر جب سے اب تک ہر سال گنتی بڑھتی جارہی ہے۔ اور اب کے سال تو سترہ ہزار تصویریں



ننھے فن کاروں کی تصویریں

بیگم قدسیہ زیدی

پانچ سال ہوئے دہلی شہر میں شنکر کو ایک دن یہ خیال آیا کہ سب بڑے بڑے ملکوں اور شہروں میں بڑے مصوّر اور چترکار تو سدا اپنی تصویروں کی نمائش کرتے رہتے ہیں مگر ننھے ننھے مصوّروں اور ہونے والے چترکاروں کو کوئی منہ بھی نہیں لگاتا۔ شنکر کیونکہ خود آرٹسٹ بھی ہے اس لئے اس نے سب ننھے آرٹسٹوں تک یہ سندیسہ پہنچایا کہ وہ شنکر کی نگرانی میں اپنی تصویروں کی نمائش کر سکتے ہیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ننھے چترکاروں کو موقع مل گیا اور انھوں نے دھڑا دھڑ تصویر بنانا شروع کر دیں اور تھوڑے ہی دنوں کے اندر شنکر کے دفتر میں سیکڑوں تصویریں جمع ہو گئیں۔ اچھی خاصی نمائش جم گئی۔

جب اس نمائش کے لئے تصویریں دنیا کے ہر ہر کونے سے آنی شروع ہوتی ہیں مجھے پائڈ پائپر آف ہملین کا قصہ یاد آجاتا ہے۔ ہزاروں سال گزرے ہملین کے شہر ایک بنسی والا رہتا تھا۔ اس کی بنسی جادو کی تھی۔ جب وہ اپنی بنسی بجاتا تو جیسے جا…

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بھی ۵۰۰ سال پہلے ایک بادشاہ بخت نصر یا نبوچد نزار حکومت کرتا تھا۔ اس نے اپنے شہر کے چاروں طرف ایک دیوار بنوائی تھی اور اس کے اندر بڑے بڑے خوبصورت اور شاندار محل بنوائے تھے۔

اس کی شادی میڈیا کی شہزادی امیٹس سے ہوئی تھی۔ شہزادی امیٹس پہاڑی جگہ کی رہنے والی تھی۔ بے چاری رانی اس میدانی علاقے میں بہت گھبراتی تھی۔ کیونکہ بابل تو دریائے فرات کے کنارے پر تھا۔ وہ جب بھی اپنے محل کی چھت پر جاتی اور چاروں طرف میدان دیکھتی تو اسے اپنے وطن کی ندیاں، پہاڑ، جھرنے اور خوبصورت آبشار یاد آجاتے تھے۔

جو بچے پہاڑی جگہ پر رہتے ہیں یا رہ چکے ہیں وہ اس جگہ کے حسن سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ بادشاہ نے جب یہ دیکھا تو اس نے یہ ہوائی باغ بنوانے کا ارادہ کیا، تاکہ اس کی رانی کا دل بہلا رہے۔ پہلے اس نے کھوکھلے ستون بنوائے اور ان پر خوبصورت محرابیں اور ان پر کئی منزلوں میں چبوترے بنوائے۔ ان کی ترتیب اس طرح رکھی کہ نیچے کا چبوترہ اوپر کے چبوترے سے بڑا تھا۔ اس طرح کئی چبوترے ایک کے اوپر ایک بنے ہوئے تھے۔ جنکی اونچائی تقریباً ساڑھے تین سو فٹ تھی۔ ایک ایک منزل کی اونچائی ۵۰ فٹ تھی۔ اور اس کا دائرہ تقریباً چار ایکڑ تھا۔ ستونوں کو نمی سے بچانے کے لئے چبوتروں پر سیسہ پگھلا کر پھیلا دیا گیا تھا، تاکہ پانی دینے سے ستونوں کو نقصان نہ پہنچے۔ اس کے بعد چبوتروں پر اتنی مٹی ڈالی گئی تھی کہ پھول، پھل، میوے وغیرہ اچھی طرح اُگ سکیں۔ سب سے اونچی منزل کے چبوترے پر ایک تالاب تھا جس میں دریائے فرات سے پانی آتا تھا۔ اس پانی سے سارے باغ کو سینچا جاتا تھا۔ اس باغ میں طرح طرح کے پھول، پھل، اور میوے کے درخت تھے اور سنا ہے کہ باغ پھولوں کی خوشبو سے مہکتا رہتا تھا۔

ہر چبوترے پر خوبصورت محرابیں اور دالان بنے ہوئے تھے جو ہر قسم کے عجیب و غریب

بقیہ صفحہ ۲۴ پر دیکھئے۔

سعید اشرف نعمانی



بہادر لڑکی

ایک سوداگر نے اپنے مرنے سے پہلے اپنی لڑکی کو اُس مُلک کے بادشاہ کے سپرد کردیا اور اُس کی حفاظت اور دیکھ بھال کی درخواست کی۔ لڑکی بادشاہ کے پاس رہنے لگی جب وہ بڑی ہوگئی تو اُس نے فوجی تعلیم بھی حاصل کی۔ لیکن بادشاہ اُس لڑکی کے ساتھ بہت بُرا برتاؤ کرتا تھا۔

ایک موقع پر بادشاہ نے اُس پر اپنے دُشمن کے جاسوس ہونے کا شبہہ کیا اور اُس کو جِلا وطن کر دیا۔

لڑکی مردانہ بھیس بدل کر، گھوڑے پر سوار ہوکر چل پڑی۔ راستے میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے لڑکی کا مقابلہ ہوا۔ انھوں نے لڑکی سے کہا "جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ پیش کردو۔" لڑکی نے انکار کر دیا۔ وہ بھیس بدلے ہوئے تھی ڈاکو بھی اسے مرد سمجھے۔ اسی درمیان میں کچھ شکاری اُسی راستے سے گزر رہے تھے۔ ڈاکوؤں کو مسلح دیکھا تو ڈر کی وجہ سے بھاگ گئے۔ لڑکی بہادری سے اپنی جگہ ڈٹی رہی۔ اُس ملک کا شہزادہ شکاریوں

کی جماعت کا رہنا تھا۔

ڈاکو لڑکی کی مستقل مزاجی کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب شہزادہ شکار سے واپس ہوا تو اُس نے دیکھا کہ ڈاکو بھاگ گئے ہیں۔

لڑکی جو مردانہ بھیس بدلے ہوئے تھی اُس کا خوبصورت چہرہ اور موہنی آنکھوں کو دیکھ کر شہزادہ حیران رہ گیا۔ شہزادے نے دل میں سوچا یہ اتنا اچھا نوجوان کون ہے؟ لڑکی نے شہزادہ کے قریب جا کر اُسے سلام کیا۔ اور نوکری کی درخواست کی۔ شہزادے نے اُسے اپنا محافظ مقرر کیا۔ کچھ ہی عرصہ میں وہ دونوں گہرے دوست بن گئے۔

ایک دن شہزادے کو اپنے گارڈ کی شناخت پر شبہہ ہوا اور جب اُس نے زیادہ اصرار کیا تو لڑکی نے اپنی ساری کہانی سنائی۔ شہزادہ سُن کر بہت زیادہ خوش ہوا اور اب جب کہ اُس کو پتہ چلا کہ وہ لڑکی ہے تو اُس نے شادی کی درخواست کی۔ لڑکی نے اپنی رضامندی دے دی۔ بادشاہ اور ملکہ بھی راضی ہو گئے۔ جلدی ہی شادی کی تمام تیاریاں شروع ہو گئیں اور بڑی شان و شوکت سے شادی رچائی گئی۔

لڑکی جس ملک کے بادشاہ کے پاس پہلے رہتی تھی وہ بھی اس موقع پر بطور مہمان مدعو تھے۔ وہ بادشاہ اس لڑکی کو دُلہن بنے دیکھ کر جس کو اس نے جلا وطن کر دیا تھا بہت متعجب ہوا۔

نصیحت :- کوئی بدلہ اس سے زیادہ اچھا نہیں جو بھلائی کر کے لیا جائے۔

(ترجمہ انگریزی)

(بقیہ میٹھی بات کا میٹھا پھل صفحہ ۹)

رہنا مشکل ہو گیا۔ دونوں میں خوب جھگڑے ہوئے آخر بڑھیا نے اُسے گھر سے نکال دیا۔

کوئی اسے کھانا تک نہ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لڑکی جنگل میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی۔ لیکن چھوٹی لڑکی مزے میں اپنی زندگی گزار رہی تھی۔

حضرت عمرؓ کی ہمدردی

مسلمانوں کے چار خلیفہ گزرے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ۔ ان خلیفاؤں کو خلفائے راشدین کہتے ہیں۔ آئیے ہم آپ کو دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ کی ایک کہانی سنائیں، جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کا اپنی رعایا کے ساتھ کیسا سلوک تھا۔

حضرت عمرؓ روزانہ بھیس بدل کر شہر اور اس کے آس پاس کے علاقوں کا دورہ کیا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ اُن قبائلی لوگوں کو دیکھا جائے جو شہر کے باہر خیمے لگا کر رہتے ہیں۔ اب جو وہ ایک خیمے کے پاس سے گزرے تو وہاں سے بچوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ حضرت عمرؓ گھوڑے سے اُتر کر اُس خیمے میں داخل ہوگئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک بوڑھی عورت کے چاروں طرف کچھ بچے بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک کونے میں آگ جل رہی ہے جس پر ایک دیگچی چڑھی ہوئی ہے۔

وہ عورت کہہ رہی تھی کہ "ذرا صبر کرو۔ دیکھو کھانا پک رہا ہے ابھی تیار ہوا جاتا ہے۔"
حضرت عمرؓ نے بڑھیا کو سلام کرنے کے بعد پوچھا "نیک ماں! کیا بات ہے، یہ بچے کیوں

بڑی طرح کیوں رو رہے ہیں ؟"

"کیا بتاؤں " بڑھیا نے آہیں بھرتے ہوئے کہا " یہ بچے بھوکے ہیں ۔ اور میرے پاس ان کو دینے کے لئے ایک سوکھا ٹکڑا بھی نہیں ہے یہ جو آپ چولہے پر دیکھ رہے ہیں ، یہ تو صرف ان بچوں کو بہلانے کے لئے ہے ۔ ورنہ اس میں تو صرف پانی چڑھا ہوا ہے ۔ یہ بچے جب چلاتے چلاتے تھک جائیں گے تو سو جائیں گے

حضرت عمرؓ یہ سن کر بھونچکا سے رہ گئے اور بولے " مگر تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی ؟"

بڑھیا نے کہا " ان بچوں کا سوائے میرے اور کوئی سہارا بھی نہیں "

" لیکن تم اپنی اس مصیبت کا حال جا کر خلیفہ کو کیوں نہیں سناتیں ۔ خلیفہ تمہاری مدد ضرور کرے گا "

یہ سن کر بڑھیا کو بہت غصہ آیا اور اس نے کہا " برا ہو خلیفہ کا ، اس کو خدا سمجھے جو اتنا بڑا ظالم ہے "

بڑھیا کی زبان سے یہ سن کر حضرت عمرؓ کا دل دہل اٹھا اور بولے " تم حضرت عمرؓ کے ساتھ بے انصافی کر رہی ہو "

اب تو بڑھیا کا غصہ اور بڑھ گیا ۔ اس نے کہا " میں خدا کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ عمرؓ بہت ظالم ہے ۔ تم ہی بتاؤ کیا خلیفہ کا یہ فرض نہیں ہے کہ اس کو رعایا کا صحیح صحیح حال معلوم ہو ۔ عمرؓ اپنے محل میں آرام سے سو رہا ہے اور اس کو خبر نہیں کہ میری اور میرے بچوں کی کیا حالت ہے "

" مگر یہ تو بتاؤ کہ خلیفہ کو تمہارے اور تمہارے بچوں کا حال کیسے معلوم ہو ۔ جب تک تم خود جا کر اس کو اپنا حال نہ سناؤ "

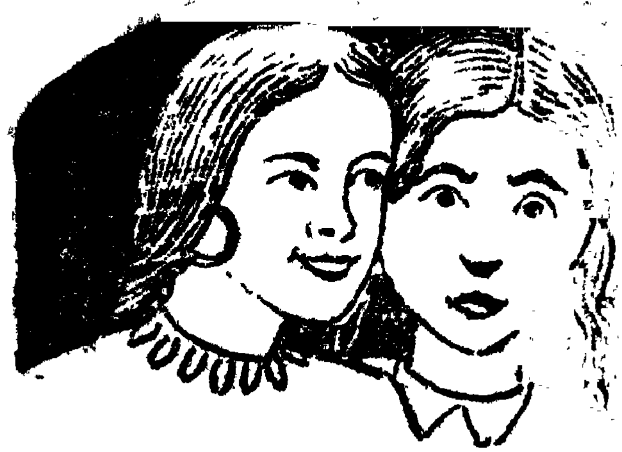
بڑھیا نے بڑے اطمینان سے کہا " یہ ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم اپنی غربت کی کہانی سنائیں ۔ یہ تو عمرؓ کا کام ہے کہ اسے اپنی رعایا کا صحیح صحیح حال معلوم ہو ۔ آخر تم ہی سوچو مجھے اپنی غربت کی کہانی سناتے ہوئے کتنی شرم آئے گی ۔ پھر یہ کہ منصف مزاج حاکم کا کام ہے کہ وہ اپنی امیر رعایا کے مقابلے میں غریبوں کا زیادہ خیال رکھے "

اب تو حضرت عمرؓ نے بھی سر جھکاتے ہوئے کہا " ہاں اچھی ماں ، تم ٹھیک ہی کہتی ہو "

یہ کہہ کر حضرت عمرؓ خیمے سے باہر چلے گئے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد بیت المال سے کھانے کا سامان اپنی پیٹھ پر لاد کر بڑھیا کے خیمے میں لائے اور بچوں کو اپنے سامنے کھانا کھلایا ۔

میٹھی بات کا میٹھا پھل

کنیز فاطمہ



کسی جنگل کے پاس ایک بڑھیا رہتی تھی۔ اس کا شوہر مر گیا تھا۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ یہ دونوں بڑی خوبصورت تھیں۔ لیکن بڑی لڑکی اپنی ماں کی طرح بڑی بد مزاج تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر غصہ کرنے لگتی تھی۔ چھوٹی لڑکی ان دونوں کی بد مزاجی اور غصّے سے بہت پریشان تھی۔ لیکن وہ بیچاری کرتی بھی تو کیا۔ بڑھیا اپنی بڑی لڑکی سے بہت محبّت کرتی تھی، اور گھر کا سارا کام کاج چھوٹی لڑکی سے کراتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کو دور چشمے سے پانی بھی لانا پڑتا تھا۔

ایک روز وہ جب چشمے پر پانی بھر رہی تھی تو اس کے پاس ایک بڑھیا لٹھیا ٹیکتی ہوئی آئی جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے تھی۔ اور بڑے پیار سے بولی "بیٹی! میں بڑی پیاسی ہوں، دو چلّو پانی پلا دو۔"

لڑکی نے بڑی نرمی سے کہا "ہاں ہاں ضرور پیو۔" یہ کہہ کر اس نے چشمے کا صاف سا پانی بھر کر بڑھیا کو پلایا۔ بڑھیا بہت پیاسی معلوم ہوتی تھی، اس نے کافی

پانی پی لیا۔ اور بڑی خوش ہو کر بولی۔ "بیٹی تم بہت اچھی ہو۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم نے مجھ سے بڑی نرمی سے باتیں کیں، جاؤ اب تم جس کسی سے بات کرو گی ہر بات پر تمہارے منہ سے ہیرے اور جواہرات جھڑیں گے۔" یہ کہہ کر بڑھیا وہاں سے غائب ہو گئی۔ یہ بڑھیا دراصل ایک پری تھی۔ جو لڑکی کا امتحان لینے کے لئے چشمے پر بھیس بدل کر آئی تھی۔

جب یہ لڑکی گھر پہنچی تو اس کی ماں اس پر بڑی ناراض ہوئی اور بولی "کمبخت کہاں چلی گئی تھی، جو سارا دن گنوا کر آئی ہے۔"

لڑکی نے بڑے بھولے پن سے کہا "اماں مجھے معاف کرنا، مجھے آج ذرا دیر ہو گئی۔" جیسے ہی لڑکی نے اپنا جملہ پورا کیا اس کے منہ سے دو ہیرے اور دو جواہرات گرے۔ یہ دیکھ کر بڑھیا حیران ہو گئی کہ یہ قصہ کیا ہے۔

لڑکی نے اپنی ماں کو سارا قصہ سنایا کہ کس طرح اس نے ایک بڑھیا کی ملاقات ہوئی، اس کو پانی پلانے پر بڑھیا نے اسے یہ دعا دی تھی۔

بڑھیا کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی اور اس نے سوچا کہ اگر یہ بات ہے تو میں اپنی بڑی بیٹی کو بھیجوں گی۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اس نے اپنی بڑی بیٹی سے کہا "بیٹی اب تم پانی بھرنے کے لئے اس چشمے پر جاؤ اور جیسے ہی وہ فقیرنی ملے اس کو پانی پلاؤ، پھر دیکھو تم بھی جب بولو گی تو تمہارے منہ سے بھی ہیرے اور جواہرات جھڑنے لگیں گے۔" وہ اتنی مغرور تھی کہ اس نے کہا "میں اور اتنی دور گھڑا لے کر پانی بھرنے جاؤں!" لیکن بڑھیا نے اسے بڑی ڈانٹ دیا، آخر زور دے کر اسے چشمے پر پانی کے لئے بھیج ہی دیا۔ اور اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ بڑھیا سے نرمی سے بات کرنا اور اسے خوب صاف پانی پلانا۔

جب یہ لڑکی وہاں پانی بھر رہی تھی تو سامنے سے ایک نوجوان عورت آئی۔ جو بڑے زرق برق کپڑے پہنے تھی اس

نے لڑکی سے کہا "بہن مجھے پیاس لگ رہی ہے ذرا سا پانی تو پلا دینا۔" مگر وہ لڑکی تو بڑھیا کا انتظار کر رہی تھی اس کو بڑا غصہ آیا اور بولی "تم خود پانی پی لو۔ مجھے کیا پڑی کہ میں تمہارے لئے پانی بھروں۔ کوئی میں تمہاری نوکر ہوں؟" وہ عورت یہ جواب سن کر ناراض ہو گئی اور بولی "جاؤ اب تم جس کسی سے بات کرو گی، تمہارے منہ سے دو سنپولئے نکلیں گے۔" دراصل یہ وہی پری تھی جو دوسرا بھیس بدل کر آئی تھی۔ بڑی لڑکی اپنا سا منہ لے کر گھر آ گئی جیسے ہی وہ گھر پہنچی۔ اس کی ماں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بڑے پیار سے بولی "کہو بیٹی کیا ہوا۔"

"اماں، جیسے ہی میں پہنچی" ابھی وہ یہی کہنے پائی تھی کہ اس کے منہ میں سے ایک سانپ نکل کر گر پڑا۔

بڑھیا سانپ کو دیکھ کر حیران ہو گئی اور اُسے اپنی چھوٹی لڑکی پر غصہ آیا اور یہ سمجھی کہ اس میں اسی کی سازش ہے۔ یہ سمجھ کر اس نے غصے میں آ کر اپنی

چھوٹی لڑکی کو گھر سے باہر نکال دیا۔ وہ بیچاری چپ چاپ جنگل کی طرف چل دی۔ اتفاق سے اس روز اس نگری کا شہزادہ وہاں شکار کھیلنے آیا تھا۔ اس نے جو اس لڑکی کو وہاں اس طرح پریشان حال دیکھا تو بولا "تم اتنی شام تک اس جنگل میں کیا کر رہی ہو؟"

لڑکی نے اپنی ساری بپتا کہہ سنائی اور جیسے ہی اس نے بولنا شروع کیا، اس کے منہ سے ہیرے اور جواہرات گرنے لگے۔ شہزادہ حیران رہ گیا۔ جب اس نے اس کی وجہ پوچھی تو لڑکی نے بڑھیا کو پانی پلانے کا قصہ بھی کہہ سنایا۔ اس بیچ میں اس کی زبان سے نہ جانے کتنے موتی اور ہیرے گر گئے۔

شہزادہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس کو اپنے ساتھ محل میں لے آیا۔ دونوں کی شادی ہو گئی اور وہ مزے میں رہنے لگے۔ شاہی خزانہ بھی ہیرے اور موتیوں سے بھر گیا۔

ادھر بڑھیا اور اس کی بیٹی کو سانپ [illegible]



ٹیلیفون کی کہانی

بچپن کی بات ہے ہم سگرٹ کے ٹین کے دو ڈبے لیکر اس کی پینڈے کو کاٹ کے ایک خول بنا لیتے تھے، پھر ان ڈبوں کے ایک منھ پر باریک جھلی سے یا پھر پتنگ کا باریک کاغذ مڑھ لیتے تھے، اور دونوں بند سروں کو ایک لمبے اور باریک دھاگے سے ملا دیا کرتے تھے اس آلہ کا ایک ایک ڈبہ لے کر دو لڑکے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو جاتے تھے، دھاگہ کھینچ کر تان لیا جاتا تھا۔ ایک لڑکا آہستہ آہستہ اپنے ڈبے میں بات کرتا، اور کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا لڑکا اپنے کان سے دوسرا ڈبہ لگائے رہتا اور اس لڑکے کی باتیں سن لیا کرتا تھا، باری باری سب لڑکے بات کرتے اور سنتے رہتے، چھوٹے بچے خوش ہو کر تالیاں بجاتے اور کودتے ہوئے ادھر اُدھر دوڑنے لگتے تھے، ایسی ہی خوشی ایک بڑے آدمی کو ہوئی تھی، اس کا نام گراہم بیل تھا۔ اور اسی شخص نے ٹیلیفون ایجاد کیا تھا، جو آپ کے بچپن کے اس جھوٹ موٹ کے ٹیلیفون کی ترقی یافتہ شکل ہے، جس کی مدد سے کوئی دو آدمی ہزاروں میل کے

فاصلے کے باوجود، ایک ہی ملک میں یا دوسرے ملکوں میں بیٹھے ہوئے اطمینان سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ آواز اتنی دُور کس طرح پہنچ جاتی ہے؟ آئیے اس کا تھوڑا سا حال آپ بھی سُن لیجیے۔

ہمارے چاروں طرف ہوا موجود ہے۔ ہمارے منہ سے جب کوئی لفظ نکلتا ہے، یا کسی چیز کی آواز ہوتی ہے تو ہوا ہلتی ہے اور ہلنے کی وجہ سے اس میں لہریں بننا شروع ہو جاتی ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح پانی میں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں، کسی بڑے حوض یا تالاب میں بھرے ہوئے پانی میں کوئی کنکر پھینکیے، کنکر پھینکنے سے پہلے پانی بالکل خاموش تھا، کنکر کے گرتے ہی لہریں بنیں، ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری، اور کناروں کی طرف پھیلتی نظر آنے لگیں، اسی طرح آواز پیدا ہوتے ہی ہوا کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہے، اور ہمارے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی ہے، تو ہم آواز سن لیتے ہیں۔ آواز، دھاگے کے علاوہ کسی بھی ٹھوس چیز کے ذریعہ جا سکتی ہے۔ لوہے کی چادروں کے گول اور کم لمبے کھمبوں پر تاروں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا ہے۔ یہ کھمبے بجلی کے کھمبوں سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ بس یہ ٹیلیفون کے کھمبے ہیں، اُن پر پھیلے ہوئے تار ٹیلیفون کے تار ہوئے، جن کے ذریعہ آواز ہزاروں میل دُور تک بجلی کی مدد سے سفر کرتی ہے۔

ٹیلیفون ایجاد کرنے کی کوششیں اب سے تقریباً سو سال پہلے سن ۱۸۵۴ء سے شروع ہو چکی تھیں، اس وقت ایک فرانسیسی سائنس داں بورسول نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ بجلی کی مدد سے ٹیلیفون بنایا جا سکتا ہے۔ ۱۸۶۱ء میں فرینکفرٹ میں ایلیشا گرے نے ایسا ٹیلیفون ایجاد بھی کیا تھا جس کے ذریعے صرف ٹیلیگراف کے اشارات کو برقی آواز میں نقل کیا جا سکتا تھا، لیکن اس پر بات چیت نہیں کر سکتے تھے، ٹھیک پندرہ سال بعد امریکہ کے شہر بوسٹن میں ایک سائنس داں گراہم بیل نے ۱۸۷۶ء میں پہلے پہل صحیح کام کرنے والا ٹیلیفون ایجاد کر لیا۔

گریہم بیل، انگلستان کے ایک شہر اڈنبرا کا رہنے والا تھا، پھر وہ امریکہ چلا گیا اور وہیں رہنے بسنے لگا۔ گریہم بیل "آواز" کا زبردست ماہر اور عالم تھا۔ بوسٹن میں گریہم بیل گونگوں کو تعلیم دیا کرتا تھا، اپنی تین سال کی مسلسل کوششوں اور تجربوں کے بعد اس نے کان کے پردوں سے ملتے جلتے دو لوہے کے مصنوعی کان تیار کئے اور برقی تاروں سے اُن کو آپس میں ملا دیا۔ ان مصنوعی کانوں نے تھوڑے فاصلے تک تو آواز بخوبی پہنچائی۔ لیکن زیادہ فاصلے تک بیکار ثابت ہوئے۔ بجلی کا علم پورے طریقے سے نہ جاننے کی وجہ سے اس کو بعض اوقات بڑی پریشانی ہوتی تھی، اس نے بجلی کے علم کو بھی پڑھنا شروع کیا، اور اپنے تجربوں کو بھی جاری رکھا۔ مدد کے لئے ایک دوسرے شخص ٹامس واٹسن کو بھی ساتھ لے لیا۔

۱۸۷۵ء میں ایک دن گریہم اور اس کا ساتھی واٹسن علیحدہ علیحدہ کمروں میں تجربے میں مشغول تھے، دونوں کمروں کو بجلی کا تار ملائے ہوئے تھا، اور تاروں کے سروں پر وہی مصنوعی کان لگے ہوئے تھے، کام کے دوران میں بیل کو آواز سنائی دی گریہم بیل نے واٹسن سے اپنے کمرے میں دوبارہ اسی قسم کی آواز پیدا کرنے کے لئے کہا۔ گریہم بیل نے آواز پھر سنی اور یہ تجربہ کامیاب رہا۔ لیکن اس طریقے پر آواز دوسری جگہ سنانے میں ہاں مدت لگی، اس وقت آواز کو سننے والا آلہ (مصنوعی کان) شور پیدا کر دیتا تھا، اور الفاظ صاف طور پر سنائی نہیں دیتے تھے، گریہم مایوس نہیں ہوا، اور کام میں لگا رہا۔ اور آخرکار ۱۰ر مارچ ۱۸۷۶ء میں بیل کا آلہ بولنے لگا، اور اس سے بات چیت کی جانے لگی۔

اسی زمانے میں امریکہ کے شہر فلاڈیلفیا میں ایک صد سالہ نمائش ہوا کرتی تھی، بیل نے اپنے ٹیلیفون کو اس نمائش میں بھیجا، پھر اخبارات کے ذریعے اس آلے کو شہرت دی گئی۔ اسی مقصد کے لئے ایک کمپنی بھی بنائی گئی اور رفتہ رفتہ سب لوگ اس آلے سے

واقف ہوگئے ۔

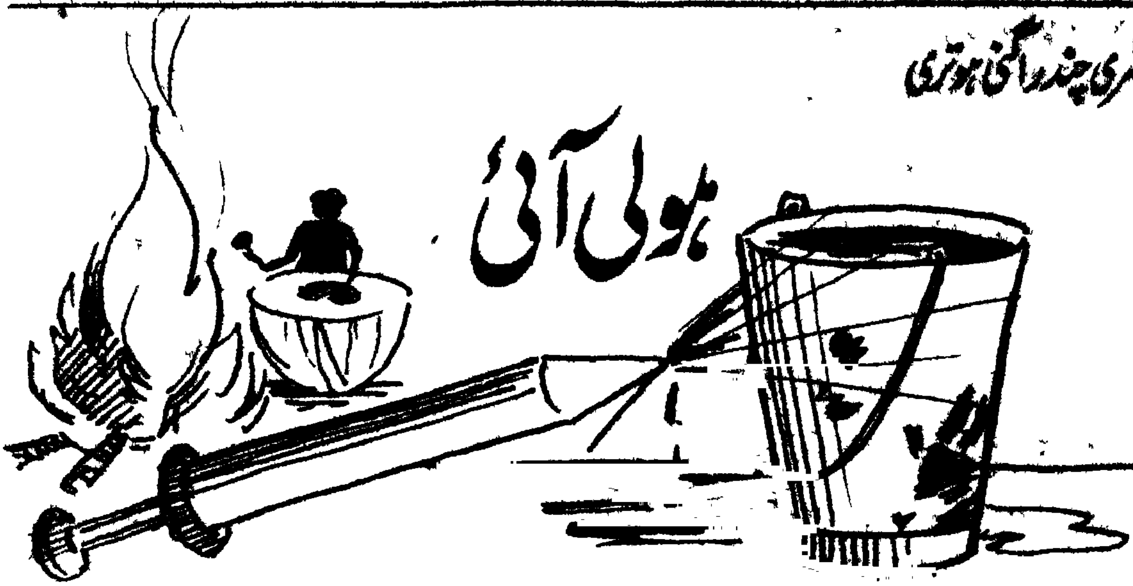
ٹیلیفون میں دو علیحدہ علیحدہ آلے ہوتے ہیں، ایک لمبوتری شکل کا آلہ جس کا ایک حصہ کان سے لگاتے ہیں، اور اس کا ایک حصہ بات کرنے والے شخص کے منھ کے سامنے رہتا ہے، دوسرا آلہ چھوٹے سے بکس کی شکل کا ہوتا ہے، جس میں باریک باریک چھوٹے بڑے تاروں کا جال بچھا رہتا ہے۔ اور اس کے باہر ایک گھیرے میں ۱ سے ۰ تک نمبر دیئے ہوتے ہیں اور جن کے گھمانے کے بعد حسب منشاء نمبر ملا لیا جاتا ہے۔

گریہم بیل کی اس ایجاد سے فائدہ اٹھاکر دوسرے سائنس دانوں نے نئے نئے تجربے کئے اور گراموفون جیسی دلچسپ ایجاد اڈیسن نے کر لی، اب سے تقریباً پچاس سال پہلے موجودہ صدی کی ابتداء میں ڈنمارک کے ایک محقق ویلدامر پولسین نے ٹیلیفون کی ایجاد میں ایک مفید اضافہ کیا، اور ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جس کے ذریعہ آواز محفوظ رہ سکتی تھی، اگر کسی جگہ آواز کو سننے والا موجود نہیں ہے اور یہ آلہ جس کو ٹیلی گراموفون کہتے ہیں لگا ہوا ہو تو آواز محفوظ ہو جاتی ہے، بعد میں اس آواز کو گراموفون کی طرح سنا جا سکتا ہے۔

آپ نے پڑھا اس ایک مفید ایجاد کی مدد سے دوسری کئی مفید ایجادیں ہوئیں لیکن مسلسل کوششوں اور تجربوں کے بعد۔ سچ تو یہ ہے کہ ان ایجادوں کا خیال پیدا کرنے والا بھی گریہم بیل ہی ہے۔

شری چندر اگنی ہوتری

ہولی آئی



سرسوں پھولی بسنت آئی ہولی پھاگُن میں رنگ لائی

قدرت جب گیہوں کے لہلہاتے سبز قالین پر پھولی ہوئی سرسوں کے سُنہرے بیل بوٹے ٹانک دیتی ہے، ٹیسو کے پھول جب سارے جنگل میں لالی بکھیر دیتے ہیں، آم کے بور کی بھینی بھینی مہک جب فضا میں مستی بھر دیتی ہے، کوئل جب کُو کُو سے بچوں اور بوڑھوں سب کے کانوں میں امرت گھولنے لگتی ہے۔ تب گاؤں کی چوپالوں سے ڈھولک کی دھپ دھپ کی سُریلی آواز نکل کر چاروں طرف گونجنے لگتی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ ہولی آگئی۔ ہولی نے اُردو کے شاعر نظیر اکبر آبادی سے لے کر ہندی کے شاعر ودیاپتی اور رویو وبہاری ہندستان کے سب ہی شاعروں کو مست کیا ہے۔ پہلے زمانے سے اب تک ہزاروں شاعروں نے لاکھوں ڈھنگ سے ہولی کی رنگ بھری پچکاریاں چھوڑی ہیں لیکن وہ رنگ ہے کہ خالی ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔

ہولی ہندستان کا بہت پُرانا تیوہار ہے۔ قدیم تاریخوں کے عالموں کا کہنا ہے کہ اس تیوہار کو ہندستان کے باہر بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اب سے ہزاروں سال پہلے قدیم مصر میں [illegible] تیوہار منایا جاتا تھا۔ یہ تیوہار بھی مارچ کے مہینے کے آس پاس [illegible] کی فصل

تیار ہونے پر پڑتا تھا۔ تاریخ جاننے والے اس تیوہار کو مذہبی نہیں سمجھتے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اس کا تعلق کاشتکاری سے ہے۔ ہمارے بزرگوں نے جب شکاری زندگی چھوڑ کر کھیتی باڑی کرنی شروع کی اس وقت سے ہم بھی ہولی مناتے ہیں۔ کھیتوں کی پکی ہوئی سنہری فصل دیکھ کر جب وہ اپنی محنت کامیاب ہوتی دیکھتے تھے تب خوشی سے ناچ اُٹھتے تھے۔ ناچ، گانے اور کھیل تماشوں میں لگ جاتے تھے۔

قدیم زمانے کے لوگوں کے سامنے دو خواہشیں تھیں۔ ایک اپنے کو زندہ رکھنے کے لئے اناج پیدا کرنا۔ دوسری خواہش تھی گھر میں زیادہ سے زیادہ آدمی ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ کام میں ہاتھ بٹا سکیں۔ اُن کے دیوی دیوتا اُن کی پوجا پاٹ۔ ان کی خوشیاں انہیں دو مشغلوں کے اِرد گرد گھومتی تھیں۔ اس زمانے کے لوگ اپنے ہی کسی نامور بزرگ کو اپنا دیوتا مانتے تھے۔ اُس کے ساتھ ہی قدرت کی پرستش کرتے تھے۔ چونکہ قدرت کے سارے راز اُن کو معلوم نہ تھے۔ اس لیے قدرت کو بھی دیوتا [illegible]

کرتے تھے۔ تاکہ اُن کے کھیتوں میں زیادہ اناج پیدا ہو۔ اور اُن کے قبیلے کے لوگ خوش حال رہیں یہی اُن کی خواہش تھی۔

قدیم مصر میں انہیں دو مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہولی سے ملتا جلتا تیوہار منایا جاتا تھا۔ پت جھڑ میں پیڑوں کے پتے گر جاتے ہیں۔ زمین بھی سرسبز نہیں رہتی۔ اسے وہ لوگ اپنے راجا کی موت سمجھتے تھے۔ راجا کو زندہ کرنے کی ایک رسم تھی۔ کنواری لڑکیاں مٹی کی ہانڈیوں میں جَو بوتی تھیں۔ اس کو سینچتی تھیں۔ جَو جیسے جیسے بڑھتا مصر والے سمجھتے کہ ہمارا راجا زندہ ہو رہا ہے۔ آخر ایک خاص دن جَو کے اُگے ہوئے پودوں سے بھری ہانڈیوں کا جلوس نکالتے۔ مرد، عورت، بوڑھے بچے سب اس جلوس میں شامل ہوتے۔ خوب گانا بجانا ہوتا۔ لڑکیاں ناچتیں، مرد گاتے۔ بڑی دھوم دھام کے ساتھ ان ہانڈیوں کو دریائے نیل میں ڈال دیا جاتا۔ سب لوگ ایک دوسرے پر پانی ڈالتے۔ آپس میں ہنسی مذاق کرتے۔

مصر کے بعد یہ جشن [illegible] میں منایا جانے لگا۔ [illegible] یونانی تو [illegible] تے۔

جلوس نکلتا۔ سب لوگ گاتے بجاتے مندر میں جاتے۔ وہاں ناچ گانا ہوتا۔ ڈرامے کھیلے جاتے۔ رتجگا ہوتا۔ عورت مرد سب اس خوشی میں شریک ہوتے۔ مصر اور بابل کی طرح یونان میں بھی اسے قومی تیوہار کی حیثیت حاصل تھی۔

یہ خوشی کی لہر یونان سے مغرب کی طرف روم پہنچی اور رومی بادشاہت کے دنوں میں یہ تیوہار وہاں کا بھی قومی تیوہار بن گیا۔ لیکن دھیرے دھیرے اس تیوہار میں بعض خرابیاں آگئی تھیں۔ ہنسی مذاق نے کچھ ایسی گندی شکل اختیار کرلی کہ سرکار نے اُسے قانون کے ذریعے روک دیا۔

ہندُستان میں یہ قدیم تیوہار آج بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس کو مذہبی رنگ بھی دیدیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کا تعلق بھگت پرہلاد سے ہے۔

بھگت پرہلاد کی کہانی آپ نے بھی سُنی ہوگی۔ ہندُستان میں ہرناکشپ نام کا ایک راجا تھا۔ وہ بہت مغرور تھا۔ وہ اپنے سامنے خدا کو بھی خاطر میں نہ لاتا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں سب سے طاقتور ہوں۔ میرے سامنے خدا بھی کچھ نہیں ہے۔ لیکن اس کے گھر ہی میں اس کا مخالف نکل آیا۔ وہ تھا اس کا بیٹا پرہلاد۔ پرہلاد ایشور کا پجاری تھا۔ وہ اپنے باپ کی بات پر دھیان نہ دیتا۔ برابر ایشور کے بھجن گاتا رہتا۔ ہرناکشپ کو یہ بات بہت بُری لگی۔ اُس نے بیٹے کو طرح طرح سے ستانا شروع کیا۔ ایک مرتبہ اُسے پہاڑ پر سے نیچے گروا دیا۔ لیکن پرہلاد کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ تو ہرناکشپ نے غصے سے پاگل ہوکر اُسے آگ میں جلوا کر مار ڈالنے کی ٹھانی۔ ہرناکشپ کی بہن ہولِکا پرہلاد کو اپنی گود میں لے کر بیٹھی۔ اس کے اِردگرد لکڑیوں کا ڈھیر لگا دیا گیا پھر آگ لگا دی گئی۔ کہتے ہیں کہ کسی وجہ سے ہولِکا کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ نہ جلے گی۔ پرہلاد جل کر خاک ہو جائے گا لیکن ہُوا بالکل اُلٹا۔ پرہلاد کے بدن پر تو آنچ تک نہ آئی اور ہولِکا اس آگ میں جل کر بھسم ہو گئی۔ تب ہی سے اس دن کی یادگار میں ہولی کا تیوہار منایا جاتا ہے۔

ہولی کا تیوہار پھاگن کے مہینے کی آخری تاریخ کو ہوتا ہے۔ رات میں ہولی جلائی جاتی ہے صبح لوگ اس جگہ کی خاک اُٹھا کر اُچھالتے ہیں۔ اور خوشیاں مناتے ہیں۔ اس کے بعد رنگ اور گلال سے ہولی کھیلتے ہیں۔ بزرگوں کا کہنا ہے

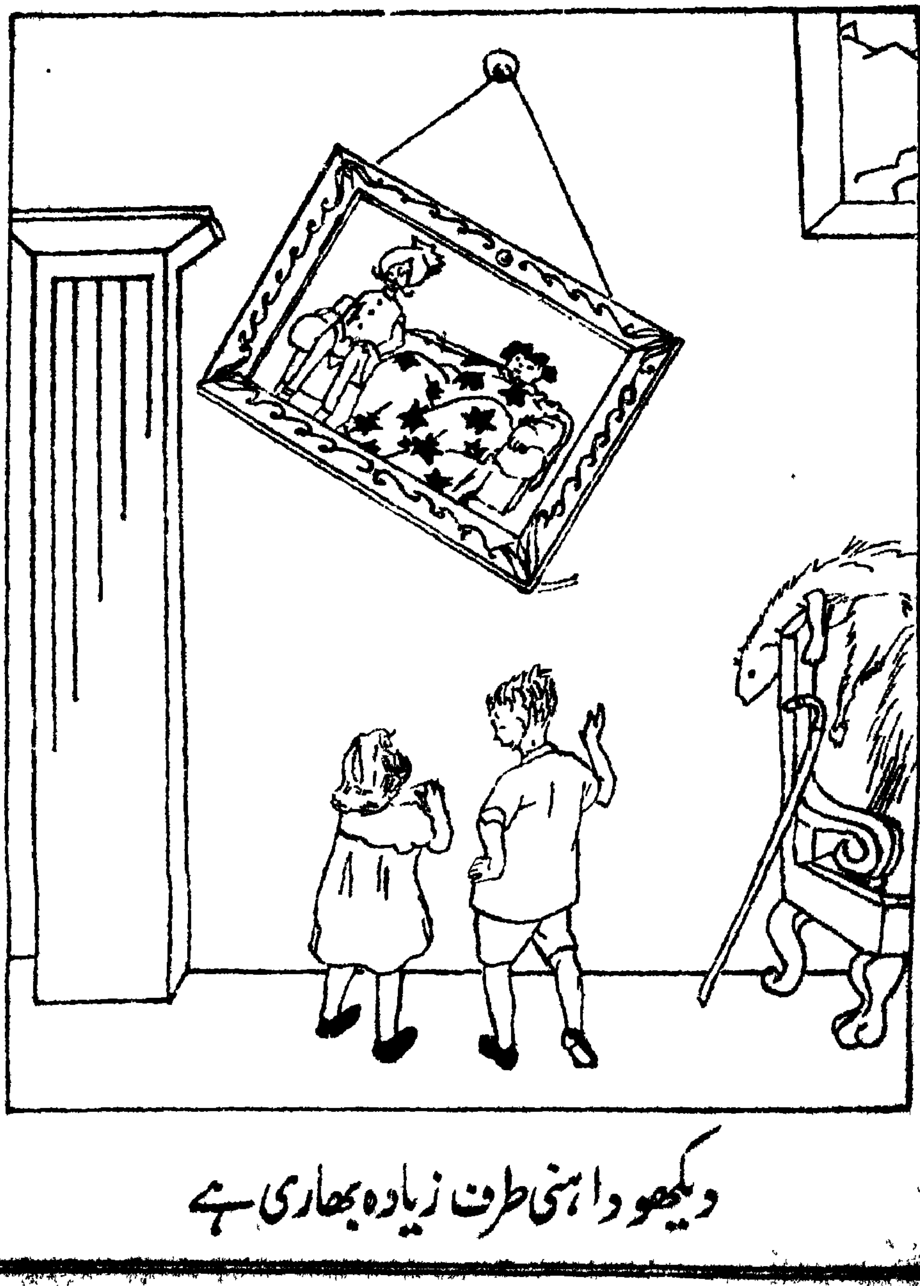
کہ اس دن پرانی سے پرانی دشمنی بھول کر سب سے گلے ملنا چاہیئے۔ لوگ گھر گھر جاکر گلال لگاتے۔ رنگ ڈالتے اور گلے ملتے ہیں۔ یہ تیوہار جی کھول کر خوشیاں منانے کا ہے۔ سارے دن گانا، بجانا کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں۔

ہولی ہندستان کے قومی تیوہاروں میں ہے۔ سارے ہندوستان میں ہولی منائی جاتی ہے۔ کیا بنگالی۔ کیا راجستھانی سب ہی ہولی مناتے ہیں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عید کے علاوہ شاید ہی کوئی تیوہار ہو جس میں چھوٹے بڑے۔ اونچ نیچ۔ غریب امیر سب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوں۔ اور اس دن کے لئے بالکل برابر ہو جاتے ہوں۔

بقیہ عجیب و غریب باغ صفحہ ۱۱ سے آگے

سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ دیواروں اور ستونوں پر طرح طرح کے رنگین پتھروں کی، دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں کھدی ہوئی تھیں۔ ہر چبوترے پر پھولوں کے علاوہ ایک ایک چھوٹا تالاب بھی تھا۔ تالابوں کے چاروں طرف کے فرش نیلے، لال، سنہرے پتھروں سے بنے ہوئے تھے جو پانی کو رنگین بنا دیتے تھے۔ باغ کیا تھا عجیب چیزوں کا مجموعہ تھا۔

کارٹون



دیکھو داہنی طرف زیادہ بھاری ہے

مرزا غالب کی حاضر جوابیاں

اسرار ندوی



مرزا غالب اُردو کے ان شاعروں میں سے ہیں جن کا نام ہندوستان کے باہر بھی بہت مشہور ہے اور اُردو کے پڑھنے والے تو ان کے ایک اک شعر پر سر دُھنتے ہیں۔

لیکن مرزا غالب صرف بہت بڑے شاعر ہی نہ تھے۔ وہ نثر بھی بہت اچھی لکھتے تھے۔ اُنھوں نے جو خط اپنے شاگردوں کو لکھے ہیں وہ اتنے دلچسپ ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ مرزا سے باتیں کر رہا ہے اور خط کا اندازہ اتنا دلچسپ ہے کہ اگر آپ ایک بار پڑھنا شروع کر دیجئے تو ختم کئے بغیر اٹھنے کو جی نہ چاہے۔

مگر مرزا غالب بڑے دلچسپ آدمی تھے وہ حاضر جوابی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ آیئے آج ہم آپ کو اُن کے کچھ لطیفے سنائیں۔

• کسی نے مرزا غالب سے پوچھا "کیوں مرزا صاحب! بچھو جاڑوں میں کیوں

نہیں نکلتے؟ آپ نے فرمایا "گرمی میں اُس کی کون سی عزت ہوتی ہے جو جاڑے میں گھر سے باہر نکلے۔"

● جب مرزا کلکتے سے واپس آرہے تھے تو راستے میں لکھنؤ اترے۔ وہاں کچھ لوگوں نے مرزا کا امتحان لیتے ہوئے پوچھا "رتھ مذکر ہے یا مؤنث؟" مرزا نے فرمایا بھیا "جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث کہو اور جب مرد بیٹھے ہوں تو مذکر سمجھو"۔ یہ جواب سُن کر وہ لوگ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے

● ایک روز مرزا کے ایک شاگرد میر مہدی مجروح ان کے پاس بیٹھے تھے مرزا پلنگ پر پڑے پڑے کراہ رہے تھے۔ مرزا کے شاگرد ان کے پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا "بھائی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے" وہ نہ مانے اور کہا "آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اجرت دے دیجئے گا" مرزا نے کہا "ہاں اس میں مضائقہ نہیں"۔ جب میر مہدی پاؤں داب چکے تو انھوں نے مرزا سے اجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا! "بھیا کیسی اجرت تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمھارے پیسے دابے۔ چلو حساب برابر ہوا۔"

● ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد بڑے زوروں پر پکڑ دھکڑ چلی تھی۔ مرزا صاحب بھی پکڑے گئے۔ حاکم کرنل براؤن نے پوچھا:-

"ول تم مسلمان ہو؟"

"آدھا" مرزا نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

"اس کا مطلب" حاکم نے گھبرا کر پوچھا۔

"شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا"

کرنل یہ سُن کر ہنسنے لگا اور آپ کو اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔

● ایک روز مغلوں کے آخری بادشاہ بہادر شاہ اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ "مہتاب باغ" میں ٹہل رہے تھے۔ مرزا بھی ساتھ تھے۔ "مہتاب باغ" آموں سے لدا پڑا تھا۔ مرزا بار بار آموں کی طرف

غور سے دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا یہ آپ کیا دیکھتے ہیں؟" آپ نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "پیر و مرشد کسی بزرگ نے کہا ہے کہ:-

بر سر ہر دانہ بنوشتہ عیاں
کایں فلاں ابن فلاں ابن فلاں

(یعنی ہر دانے پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ یہ فلاں شخص کا حصہ ہے جو فلاں کا بیٹا ہے۔)

تو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پہ میرا اور میرے باپ دادا کا نام لکھا ہے یا نہیں"۔۔۔ بادشاہ مسکرادیے اور اسی روز ایک ٹوکرا آموں کا مرزا کو بھجوا دیا۔

• ایک دن کھیلتے کھیلتے حسین علی خاں مرزا کے پاس آ نکلے۔ کہنے لگے "دادا جان پیسہ دو۔" مرزا نے کہا "میاں میرے پاس ایک حبہ نہیں" وہ دوڑے صندوقچہ اٹھا لائے اور اس کے خانوں میں تلاش کرنے لگے۔ مرزا نے کہا:-

درم و دام اپنے پاس کہاں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

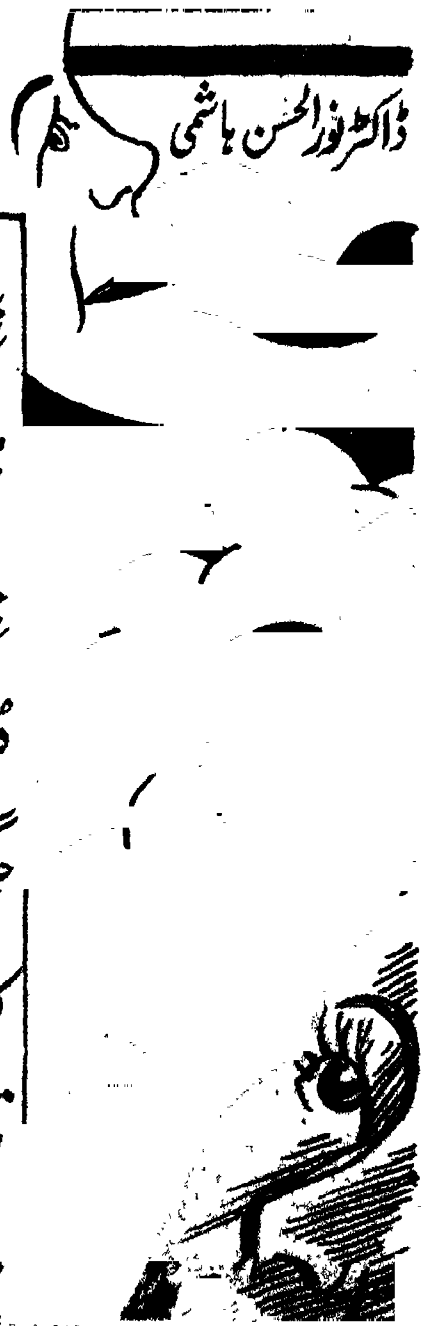
• ایک دفعہ ایک شخص نے مرزا سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ شرابی کی دعا قبول نہیں ہوتی" مرزا نے مسکراتے ہوئے کہا کہ "بھائی جس کو شراب میسر ہے اس کو اور کیا چاہیے جس کے لئے دعا مانگے گا"

• ایک مرتبہ مولانا حالی، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہ بیٹھے تھے۔ مرزا بھی اس مجلس میں تھے۔ آموں کا ذکر چھڑا ہوا تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے ظاہر کر رہا تھا۔ آم میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ جب مرزا کی باری آئی تو آپ نے فرمایا کہ "میرے نزدیک تو آم میں صرف دو خوبیاں ہونی چاہئیں۔ میٹھا ہو اور بہت ہو۔"

• ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ مرزا رام پور گئے۔ نواب صاحب نے بڑی آؤ بھگت کی۔ چند روز بعد نواب کو کہیں جانے کا اتفاق ہوا۔ چلتے وقت نواب نے مرزا سے کہا "خدا کے سپرد" مرزا نے کہا "حضرت، خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے آپ پھر الٹا مجھکو خدا کے سپرد کرتے ہیں"

چاند

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی



نِکلا، نِکلا، نِکلا چاند
آخر سو کر اُٹھا چاند

میٹھا، سلونا مُکھڑا لے کر
نِکلا پیارا پیارا چاند

جیارا اُس پر بَل بَل جائے
لے لوں بَلائیں ایسا چاند

دُنیا ساری چمک اُٹھی ہے
ایسا جھمکا چمکا چاند

جگ چمکائے، جگ دمکائے
جگمگ کرنے والا چاند

کالی رات ہوئی کافور
ایسی شان سے آیا چاند

تارے جی سے واری گئے ہیں
بن سج کر جب نِکلا چاند

دُولھن لینے جاتا ہے
تارے براتی دُولھا چاند



ہاتھ میں کنگن زہرہ کا ہے کرنوں کا ڈالے سہرا چاند
دُنیا پر بلہاری ہو کر گھومے جیسے پتنگا چاند
گانے والے گاتے ہیں یہ دُنیا بھر کی بنرا چاند
لیکن دُنیا کہتی ہے میری آنکھ کا تارا چاند
میرے کلیجے کی ٹھنڈک ہے میرے دل کا ٹکڑا چاند
دُنیا والے کہتے ہیں چاندی یہ ہر سب کا چاند
حُسن کی مُورت ہر کوئی پوجے حُسن کا ہے یہ دیوتا چاند
اچھی چیز ہر اک اپنا ئے سب کہیں میرا اپنا چاند
سب سے اچھی میری دُنیا سب سے اچھا میرا چاند
بھائی نوزل تم بھی کہو نا ہے کہیں ایسا اچھا چاند

شنکر زویکلی میں انعام پانے والی بچوں کی کہانیاں



میں کیا بنوں گا بڑا ہوکر

جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو میں انجینیر بنوں گا۔ میں ایک راکٹ ہوائی جہاز تیار کروں گا یہ سیدھا آسمان کی طرف جائے گا۔ وہاں آپ کو وہ پری نظر آئے گی جو روزانہ رات کو ستاروں میں چراغ جلاتی ہے۔ یہ ہوائی جہاز جو بڑے آدمی بناتے ہیں، بالکل بےکار ہوتے ہیں۔ یہ بڑا شور مچاتے ہیں۔ یہ اکثر گر جاتے ہیں اور تمام آدمی مر جاتے ہیں۔ میں ایسا جہاز بناؤں گا جس میں ذرا بھی آواز نہ ہوگی۔ آپ اس میں بڑے اطمینان سے بات کر سکیں گے۔ یہ گرے گا بھی نہیں۔ اگر کبھی یہ خراب ہو جائے، تو آپ اس کو ہوا میں ہی روک کر ٹھیک کر سکتے ہیں۔ میں اس کے لئے سیڑھیاں بھی بناؤں گا۔

یہ جو ہوائی جہاز ہوتے ہیں، ان میں بڑے بڑے بازو ہوتے ہیں کہ آپ انھیں چھوٹی جگہ میں نہیں روک سکتے۔ میں ایسی ترکیب کروں گا کہ جہاں آپ روکنا چاہیں گے، دونوں بازو گھٹ کے اندر سے سکڑ جائیں گے اور آپ اسے مزے میں جہاں چاہیں اتار سکیں گے۔ اگر آپ اسے دوڑانا چاہیں گے تو یہ دوڑے گا۔ اگر یہ خراب ہو جائے

اور اوپر ہوا میں ٹھیک نہ ہو سکے تو یہ آہستہ آہستہ نیچے اتر آئے گا جیسے ہوائی چھتری اُترتی ہے۔

ہمارے چچا کی موٹر

میرے چچا بھی ایک دن موٹر خرید لائے، اس لئے کہ ان کے دفتر میں ہر ایک کے پاس ایک موٹر تھی۔ وہ تو کہتے ہیں کہ ہماری موٹر بہت اچھی ہے لیکن میں جانتا ہوں۔

ہمارے شہر میں ایک بڑا موٹا آدمی ہے۔ وہ پرانی اور خراب چیزیں بیچتا ہے اور میرے چچا نے اُسے موٹر خریدنے کے لئے پانچ سو روپے دے دیئے۔ اس کی شکل ایسی ہے جیسے ٹین کے بسکٹ کے ڈبے کے نیچے چار پہیئے لگا دیئے جائیں۔ یہ اتنا ہی شور مچاتی ہے جتنا سڑک کوٹنے والا انجن۔ لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ جیسے ہی یہ گھر سے چلتی ہے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے دادی کا گھر آدھے میل کے فاصلے پر ہے، ایک بار جب موٹر چل پڑتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہمارے ماسٹر صاحب درجے میں میز پر چھڑی مارتے ہیں۔

جب وہ موٹر چلاتے ہیں، تو یہ منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ ہمارے ابا جب اپنی گاڑی چلاتے ہیں تو چلانے سے پہلے کوٹ پہن لیتے ہیں اور ٹائی باندھ لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے چچا تو اپنی قمیص تک اُتار دیتے ہیں۔ تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بعد موٹر میں کچھ آواز نکلتی ہے۔ پہلے تو وہ موٹر میں بیٹھ کر بٹن کھینچتے ہیں۔ لیکن کوئی آواز نہیں ہوتی۔ تب وہ ایک لوہے کی چھڑ کو انجن کے اندر گھماتے ہیں۔ بیچاری موٹر ہلنے جلنے لگتی ہے۔ لیکن کیا ہمارے چچا ہار جاتے ہیں؟ ابھی نہیں۔ وہ باورچی کو آواز دیتے ہیں، مالی اور نوکر کو بلاتے ہیں اور سب مل کر موٹر کو دھکا دیتے ہیں اور ہمارے چچا موٹر کے اندر بیٹھے ہوتے ہیں۔

وہ ڈھکیلتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ موٹر پھاٹک کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اور اب اس میں سے آواز [illegible]

ہمارے چچا جیسی، جب ایک بار ان کے پیر پر ہتھوڑی پڑی تھی۔

یہ ان کی "بڑی اچھی" موڑ کی کہانی ہے۔

وسنت بالیگا (عمر ۹ سال) مدراس

جب میں ننھا سا تھا

میں سوچا کرتا تھا کہ ہوا بڑی نرم چیز ہے اور یہ ہم پر گرتی ہے۔ اور جب بارش ہوتی تھی تو میں سمجھتا تھا کہ یہ برف ہے۔ اور میں سوچتا تھا کہ کیچڑ صاف ہوگئی ہے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ دنیا ایک گیند کی طرح ہے اور ہمارے گھر بھی بڑی گیند کی طرح ہیں۔

جب شام ہوجاتی ہے تو میں سوچتا تھا کہ سورج کو ہوا نے اڑا دیا ہے۔

جب رات ہوتی ہے تو میں سوچتا ہوں کہ دنیا گندی ہوتی ہے اور جب چاند نکلتا ہے تو میں سوچتا تھا کہ چاند دنیا کی قندیل ہے۔

کبیر بیدی عمر (۷ سال) نئی دہلی

"اگر میں ہندستان کا وزیر اعظم ہوتا"

اگر میں ہندوستان کا وزیر اعظم بنا دیا جاؤں تو میں تمام استادوں کو حکم دوں گا کہ اب آئندہ وہ بیت نہ استعمال کریں اور لڑکوں کو گھر پر کام دینا بند کر دیں۔ میں انھیں مجبور کروں گا کہ وہ لڑکوں کو چاکلیٹ بانٹیں۔

ڈرل ماسٹر کو حکم دوں گا کہ وہ اور سب کام بند کر کے پتنگ اڑانا سکھائیں۔ پتنگ اسکول کی طرف سے خریدے جائیں۔ میں امتحانات کا سلسلہ ختم کر دوں گا۔ اور وہ تمام طالب علم جو چاکلیٹ پسند کرتے ہیں، خوب اچھی طرح پتنگ اڑا لیتے ہیں، پاس کر دیئے جائیں گے۔

ایک قانون بناؤں گا جس کے مطابق والدین کو ممانعت ہوگی کہ وہ بچوں کو جاڑے میں نہ نہلائیں۔ ماؤں کو اس کی اجازت نہ ہوگی کہ وہ اپنے بچوں کو مار سکیں۔ ہر ڈاکٹر کو حکم ہوگا کہ بچوں کو صرف میٹھی دوائیں دے اور کڑوی دوائیں بڑوں کیلئے ہونگی۔ ان کو بچوں کے آپریشن کی اجازت نہ ہوگی۔

اور دوسرے تمام کاموں کیلئے میں پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنا نائب وزیر اعظم بناؤں گا۔

اشوک کمار (عمر ۱۱ سال) نئی دہلی

مجھے سب بیوقوف کہتے ہیں

'بیوقوف' 'بیوقوف'۔ جی ہاں سب لوگ مجھے بیوقوف کہتے ہیں۔ صرف ایک آدمی جو نہیں کہتا وہ میری ماں ہے۔ مگر میں پرواہ کب کرتی ہوں۔ کہنے دو جو چاہیں سو کہیں۔ میں خود ان کو بیوقوف سمجھتی ہوں۔

ماں اکثر کہتی ہے "بچی تم اوروں کی طرح کیوں نہیں ہو جاتی" میرا بھائی جواب دیتا ہے۔ "اس لئے کہ یہ بیوقوف جو ہے" اس پر میری ماں ناراض ہو جاتی ہے اور اُن کے گھورنے کی وجہ سے سب لوگ چُپ ہو جاتے ہیں" اب اگر میں تم میں سے کسی کو آئندہ اسے ستاتے دیکھوں گی تو دیکھنا کتنی سزا دیتی ہوں" یہ سُن کر سب بہن بھائی میری طرف اس طرح دیکھتے ہیں کہ میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ نہ جانے یہ اماں مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتیں پھر اُلٹی یہ رحم کیوں کرتی ہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ دن بھر اپنی کھڑکی کے پاس یا پیڑ کے نیچے بیٹھی رہوں اور پھولوں اور چڑیوں سے باتیں کرتی رہوں۔ اسی لئے تو یہ لوگ مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں۔

میں نے اپنی بڑی بہن کو اپنی ایک سہیلی سے یہ کہتے سُنا ہے کہ "یہ چودہ سال کی لڑکی ہو گئی ہے اور اتنا بھی نہیں جانتی جتنا چار سال کے لڑکے جانتے ہیں" میرا بھائی کہتا ہے کہ "یہ اتنی چھوٹی کیوں ہے صرف چار فٹ چھ انچ اور اسی لئے یہ بیوقوف نظر آتی ہے"

میری دوسری بہن نے جواب دیا "چلو تم سے اچھی ہے، کسی کو پریشان تو نہیں کرتی تمہاری طرح"

میری ماں اکثر اپنی ملنے جلنے والیوں سے میرے بارے میں پوچھتی رہتی ہے "اے بہن کیا بتاؤں یہ تو سب سے الگ ہے، ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی ہے" "اسے نہ اپنے کپڑوں کا ہوش ہے نہ کتابوں کی فکر، نہ کھیلنے کودنے سے مطلب، جب دیکھو کھڑکی یا کسی پیڑ کے نیچے بیٹھی ملے گی، اب بتاؤ میں کیا کروں" یہ کہتے کہتے ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے"

بھائی بہنوں کے طعنے سُن کر جل جاتی ہوں، لیکن ماں کی اِن باتوں کا کیا جواب، بس مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے، دراصل دنیا میں وہی تو مجھ سے پیار کرتی ہے، میں کوشش کرتی ہوں کہ آئندہ ان کو اپنی باتوں سے تکلیف نہ ہونے دوں۔

میرے ابا مجھ سے تو بہت محبت کرتے ہیں لیکن زرا سخت ہیں، وہ کہتے ہیں "چلو خواب سے چونکو، اور اپنا کام کرو۔"

شام ہوتی ہے تو سب لوگ ریڈیو کے قریب بیٹھ کر گانا سُنتے ہیں۔ ہلکے اور پکے گانے پر بحث کرتے ہیں۔

مگر مجھے ان باتوں سے کیا مطلب، میں چُپ چاپ ایک کونے میں بیٹھی رہتی ہوں۔ ماں چاہتی بھی ہے کہ میں بھی ان باتوں میں دلچسپی لوں اور اسی وجہ سے وہ مجھ سے پوچھتی ہے، "کیوں کیا تمھیں گانا اچھا نہیں لگتا؟" میں نے جواب دیا "ہاں اچھا تو لگتا ہے" سب ہنسنا شروع کر دیتے ہیں تو میں وہاں سے کھسک جانا چاہتی ہوں، لیکن ماں پھر [illegible] بات چیت میں تو کچھ حصہ لیا

ہی نہیں، کیا لتا کے گانے تم کو اچھے نہیں معلوم ہوتے؟" "ہاں مجھے اچھے نہیں لگتے" میرے جواب سے سب بُرا مانتے ہیں، میری بہن کہتی، "ان کو دیکھئے، انھیں لتا کے گانے اچھے نہیں لگتے، زرا پوچھئے تو سہی پھر تمھاری رائے میں کون اچھا گانے والا ہے؟"

میرا بھائی "میں خوب جانتا ہوں، ان کو سُبھا لکشمی کے گانے پسند ہیں۔

"بھئی نہیں گیتا کہو، گیتا" دوسری کہتی ماں کہتی "تم سب اپنی اپنی ہانک رہے ہو۔ اس کو تو بولنے دو۔"

پھر ماں میری طرف دیکھتی ہے۔ مگر میں جواب نہیں دیتی۔ اس کا منہ لٹک جاتا ہے اور وہ نا امید ہو کر دیکھتی ہے۔ "بچی کیا تم بات نہیں کر سکتیں؟"

میں کتنا چاہتی ہوں کہ ان کو دنیا کی سب سے میٹھی آواز کے بارے میں بتاؤں۔ یہ کوئل کی آواز ہے۔ کیا کسی آدمی کی آواز اتنی اچھی ہو سکتی ہے۔ ایسی آواز کہ بڑے سے بڑے مغل شہنشاہ کی نیند میں بھی اسکی آواز سے خلل نہیں پڑتا تھا لیکن [illegible]

بات بتاؤں تو میری ماں بھی اُداس ہو جائیگی۔

میرا جی کتنا چاہتا ہے کہ میں سب کچھ بتا دوں۔ جب میں صبح اُٹھ کر کھڑکی کھول کر باہر دیکھتی ہوں تو میری بہن مجھ سے پوچھتی ہے کہ بتاؤ کیا دیکھ رہی ہو، لیکن میں اُسے کیسے اپنا خوابوں کا محل دکھاؤں۔ یہ باغ میرا محل ہے اور میں اس کی ملکہ ہوں۔ میرے محل کی قالین سبز ہوتی ہے۔ جس پر صبح صبح موتی جڑے ہوتے ہیں۔ میرے محل کی چھت نیلگوں ہے اور صبح شام اس پر لال رنگ پھیرا لگا جاتا ہے۔ رات کو یہ گہری نیلی ہو جاتی ہے۔ دن میں یہ روشن کر دیا جاتا ہے اور سب سے چمکدار چراغ اس محل کو روشن کرتا ہے۔ رات میں اس میں خوبصورت ہیرے جواہرات چمکتے ہیں اور سب سے خوبصورت چاند ہوتا ہے۔ میرے دربار میں خوبصورت خوبصورت گلاب ہوتے ہیں۔ میرے درباری سب بہت خوش رہتے ہیں۔ یہ چڑیاں ہیں جو دن بھر ناچتی گاتی اور مجھے خوش رکھتی ہیں۔ کوئل میری درباری گویا ہے۔ شام کے وقت جب ہوا چلتی ہے تو کوئل اپنے میٹھے سروں میں گاتی ہے۔ میرا تخت، تختِ طاؤس سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اس پر ہرے ہرے درختوں کا سایہ ہے۔ اور پھولوں سے سجا ہوا ہے۔ جب میں اپنے تخت پر بیٹھتی ہوں تو اپنا پیر نرم نرم فرش پر رکھتی ہوں ـــــ ہری ہری دوب پر۔

مگر میں یہ سب باتیں اوروں سے کیسے بتاؤں۔ سب لوگ ہنسیں گے۔ تو نہیں۔

کل میں نے بہت کوشش کی کہ ان سب کو سمجھاؤں۔ میں اپنا دربار لگائے بیٹھی تھی کہ سب لوگ آدھمکے۔ مجھے بہت غصہ آتا ہے جب لوگ اس طرح خلل ڈالتے ہیں۔ سب لوگ میرے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ ابا نے آتے ہی سیاست پر بات چیت شروع کر دی۔ انھوں نے کہا "تم سب ایک ایک کر کے بتاؤ کہ دنیا میں امن کیسے قائم کیا جا سکتا ہے۔ سب سے چھوٹا پہلے بولے گا۔" انھوں نے میری طرف اشارا کیا۔ میں نے بولنا شروع کیا۔ میری آواز سن کر اماں بہت خوش ہوئیں۔ اور سب لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ میں نے ہمت کر کے کہا "ابا اگر

ہر ایک فطرت کی خوبصورتی کو سمجھ لے، تو پھر کوئی اس کو خراب نہ کرے گا۔ اس لئے ہر ایک کو ایک چھوٹا باغیچہ دے دیا جائے جس میں اچھے اچھے پھول کھلے ہوں۔ اور جب ان کو دنیا کی سب سے بڑی دولت مل جائے گی۔ فطرت کی خوبصورتی سب کو خوش کرے گی۔ یہ ان کو محبت اور قربانی کرنا سکھائے گی۔ ہر جگہ امن ہوگا، اور انصاف کی جیت ہوگی۔ اس طرح دنیا میں امن قائم ہوگا۔

میرا بھائی اور بہن سب بڑی زور سے ہنسے۔ اماں نے کہا "اس کو مت ستاؤ اس لئے کہ وہ تم جیسی نہیں ہے۔ بلکہ تم سے بھی اچھی ہے۔ وہ تمھاری جیسی عقل کی نہیں ہے لیکن وہ شاعر ہوگی۔ کون جانے۔"

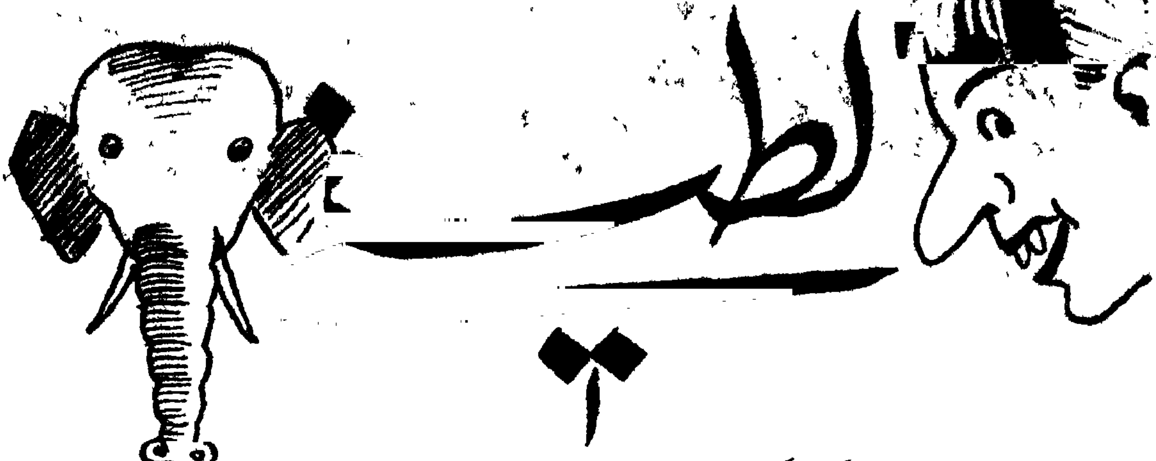
اگر میں شاعر ہو جاؤں۔ تو میں دنیا کی سب سے خوش نصیب انسان ہوں گی۔ میں یہ سوچ کر اتنی خوش ہو جاتی ہوں کہ سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ لیکن میری ماں میرے اوپر رحم کیوں کرتی ہے اور دوسرے سب مجھے بیوقوف کیوں کہتے ہیں۔ مجھے اس کی وجہ نہیں معلوم ہو سکتی۔

پیامِ تعلیم کا سالنامہ ۵۴ء

پیامِ تعلیم کے پڑھنے والے بچوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ بہت جلد پیامِ تعلیم کا سالنامہ شائع ہو رہا ہے جس کا مفصل اعلان اگلے پرچے میں ملاحظہ فرمائیے گا۔

سالنامے کی تیاریاں شروع ہوگئی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ یہ سالنامہ مضامین کے لحاظ سے اور ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے بے نظیر ہوگا۔

اڈیٹر:۔ پیامِ تعلیم



ماسٹر۔ دخانی جہاز کسے کہتے ہیں ؟
شاگرد۔ جناب! جس میں دو خانے ہوں۔

اُستاد۔ بتاؤ، مکھی کا مذکر کیا ہے ؟
شاگرد۔ مکھن۔

احمد۔ بھئی منیر آج اسکول کیوں نہیں آئے۔ ؟
منیر۔ کل ماسٹر صاحب ڈاکٹر کی دُکان پر کھڑے تھے میں نے سمجھا شاید بیمار ہوں۔

احمد حسین

اُستاد۔ بال کی جمع بتاؤ۔
شاگرد۔ سر

اُستاد۔ کلاس میں کون شور مچا رہا ہے۔
مانیٹر۔ جناب مجھے تو نہیں معلوم، میں تو گلا پھاڑ پھاڑ کر شور مچانے والوں کو منع کر رہا تھا۔

ایک امیر آدمی کا نام لدھا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے ملازم فخرالدین سے پوچھا "بتاؤ فخرالدین کا ف" اُڑانے سے کیا بنتا ہے۔ ملازم حاضر جواب تھا فوراً جواب دیا "جو لدھا پر دو مرکز لگانے سے بنتا ہے"

ہیڈ ماسٹر نے دوسرے ماسٹروں سے کہا، دیکھئے اگر رشید شرارت کرے تو میرے دفتر میں بھیج دیجئے گا۔

ساڑھے گیارہ بجے رشید جب ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں داخل ہوا تو انھوں نے دریافت کئے بغیر کان پکڑ کر اس کے کئی چانٹے لگا دیئے۔ اس کے بعد پوچھا "کہو اب کیا کہتے ہو؟"

رشید نے روتے ہوئے کہا "جغرافیہ کے ماسٹر صاحب نے نقشہ منگایا ہے۔

ماں۔ یہ کیسی ماچس خرید لائے۔ بالکل نہیں جلتی۔

بیٹا۔ نہیں اماں! ماچس ٹھیک ہے۔ میں سب جلا کر دیکھ چکا ہوں۔

34119

ماسٹر۔ بتاؤ موہن ہندوستان کب آزاد ہوا۔

موہن۔ پہلی تاریخ کے بعد۔

جج۔ تم نے ان کی جیب میں ہاتھ کیوں ڈالا؟

گرہ کٹ۔ جی! میرے ہاتھوں کو ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ (ریحان احمد عباسی)

(بچوں سے باتیں کا بقیہ مضمون)

ہے اور وعدہ فرمایا ہے کہ جلد ہمارے لئے کچھ چیزیں لکھ کر دیں گی۔

مکتبے میں بچوں کی کتابوں کی تیاری کا کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ عام دلچسپی اور معلومات کی کتابیں بھی تیار کی جا رہی ہیں۔ اس سے پہلے ہم آپ کو بتا چکے ہیں کہ بچوں کی کتابوں کے ۹ مسودے تیار ہیں۔ اب ۹ مسودے اور تیار ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ جلد ہی ان کتابوں کی طباعت بھی شروع ہو جائیگی۔

۱۔ ہوائی جہاز کی کہانی — کماری کملا صاحبہ
۲۔ چمبک کی کہانی — "
۳۔ لوہے کی کہانی — شیکھر صاحب
۴۔ تیل کی کہانی — "
۵۔ کوئلے کی کہانی — "
۶۔ گھر کی کہانی — "
۷۔ بھارت، موریہ عہد میں — شری چندر اگنی ہوتری
۸۔ " " حصہ دوم — "
۹۔ گوتم بدھ — "

عبدالواحد بیدل

بھائی بہن



جگہ :- ایک کمرے میں ایک طرف ستارہ اپنی گڑیوں سے کھیل رہی ہے۔ دوسری طرف سلیم اپنی کتابیں سامنے رکھے گنگنا رہا ہے۔

پہلا منظر

ستارہ :- میری اچھی سی ننھی سی گڑیا۔

سلیم :- (بگڑ کر) ستارہ! تو اپنی زبان بند کرے گی یا نہیں؟

ستارہ :- میں تو اپنی گڑیا سے بات کر رہی ہوں - تم ہی اپنے کان بند کر لو نا!

سلیم :- دیکھ مان جا کیا فائدہ مجھے غصہ آجائے گا۔

ستارہ :- اچھا بھیا، لو اب - میں کچھ نہیں بولوں گی، دیکھو، میں اب سے چپ ہوں ....(وہ اپنے گال پھلا لیتی ہے - سلیم پھر پڑھنے میں لگ جاتا ہے - لیکن اس کا جی پڑھنے میں نہیں لگتا - لالچی آنکھوں سے وہ کھلونے کو دیکھتا ہے)

سلیم :- اچھا میری ستارہ بہن، دیکھوں تیرا کھلونا - ؟ (ستارہ کوئی جواب نہیں دیتی)

سلیم :۔ روٹھ گئی ؟ میری اچھی بہن، زرا دیکھوں تو تمھارا کھلونا!

ستارہ :۔ جاؤ جاؤ، منہ دھو آؤ، تب دیکھنا میرا کھلونا، میں نہیں دیتی، تم کو امتحان دینا ہے، تم پڑھو چُپ چاپ۔

سلیم :۔ اچھا نہیں دیتی ؟

ستارہ :۔ نہیں، نہیں، نہیں، سَو بار نہیں۔

سلیم :۔ (غصّے سے بھر کر) لگا دؤں دو چپت کس کر! شیطان کہیں کی! تو نے کل میری سیاہی کیوں گرا دی تھی ؟ اور دیکھ یہ کتاب بھی تو نے ہی پھاڑی ہے نا ؟

سلیم (اُٹھ کر) نہیں گرائی ہے؟ بدمعاش کہیں کی! جا بھاگ جا یہاں سے۔

ستارہ :۔ نہیں جاتی، کیا کر لوگے تم میرا!

(سلیم غصّے سے بھر کر ستارہ کا کان پکڑتا ہے۔ ستارہ اپنے ناخنوں سے سلیم کے چٹکی کاٹتی ہے۔ دونوں میں کشتی ہوتی ہے، کتابیں اِدھر اُدھر گر جاتی ہیں۔ بچّوں کی چیخ سن کر اندر سے ماں آتی ہے۔)

ماں :۔ یہ کیا شیطانی ہو رہی ہے ؟

سلیم :۔ (سسکتے ہوئے) دیکھو نا ماں، یہ ستارہ کی شیطانی ہے۔ میں تو چُپ چاپ پڑھ رہا تھا۔ اور یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی۔

ماں :۔ کیوں ری ستارہ ؟

ستارہ :۔ (روتی ہوئی) نہیں ماں، میں تو چُپ چاپ کھیل رہی تھی۔ بابو جی نے اسے کھلونے جو نہیں دیئے، اس کا غصّہ یہ مجھ پر اُتار رہا ہے۔ میرے کان اینٹھ دیئے ہیں اس نے۔

سلیم۔ اور اس نے مجھے چُٹکی کاٹی ہے۔

ستارہ :۔ نہیں نہیں، پہلے اس نے مجھے مارا ہے۔

ماں (دونوں کو ایک ایک چپت لگا کر) کتنا سمجھاتی ہوں ان بدمعاشوں کو، لیکن یہ کہنا نہیں مانتے۔ جب دیکھو تب لڑائی۔ جاؤ، بھاگو یہاں سے۔ شام کا ناشتہ بند۔

(ماں اندر چلی جاتی ہے۔ دونوں بچّے منہ پُھلا کر ایک طرف چلے جاتے ہیں)

(دوسرا منظر)

(گھر کے نزدیک کا باغیچہ۔ سامنے تالاب ہے۔ کنارے کی ریت لے کر ستارہ گھر بنا رہی ہے۔ دوسری طرف سلیم تالاب سے مٹی لاکر دیوار بنا رہا ہے)۔

ستارہ۔ یہ میرا گھر ہے، اس کمرے میں میں رہوں گی، اس میں ابّا رہیں گے، اور یہ ماں کے لئے ہے۔ اور ہاں۔ یہ میری گڑیوں کا کمرا ہے۔ بس، اور کسی کو رہنے نہیں دوں گی۔

سلیم۔ اور یہ میرا گھر ہے۔ میں اس میں کسی کو نہیں رہنے دوں گا۔ آج چچا جان آئیں گے۔ وہ میرے لئے کلکتے سے ریل گاڑی لائیں گے! صرف میں ہی اس پر چڑھوں گا۔

ستارہ۔ اور میرے لئے بھی چچا جان موٹر لائیں گے۔

سلیم۔ مُنہ دھو لینا۔ ابا جی نے تجھے کھلونے دیئے، لیکن مجھے نہیں دیا۔ اسی طرح میں بھی چچا جان والا کھلونا نہیں دوں گا۔

(اسی وقت سلیم کی مٹی کی دیوار ٹوٹ جاتی ہے۔ سلیم پھر کوشش کرکے بناتا ہے، لیکن اس سے یہ کام اکیلے نہیں ہوتا)

سلیم۔ اچھا ستارہ، ذرا ادھر آؤ، اس دیوار کے بننے میں مدد کرو۔ تجھے بھی رہنے دوں گا اس میں۔

ستارہ۔ جاؤ، میں نہیں رہتی تمہارے گھر میں۔

سلیم۔ آؤ نا۔ دیکھ میں تجھے بھی چچا جان سے کہہ کر ریل گاڑی دلوا دوں گا۔ بڑی اچھی ریل گاڑی۔

ستارہ۔ میں نہیں لیتی ریل گاڑی۔

سلیم۔ نہیں آئے گی۔

ستارہ۔ نہیں۔ نہیں۔

سلیم۔ تو پھر میں تیرا بھیّا نہ بنوں گا۔

ستارہ۔ اچھا، مت بننا۔

سلیم۔ دیکھ، نہیں آئے گی تو میں اس اینٹ سے اپنا سر پھوڑ لوں گا۔

ستارہ۔ پھوڑ لونا۔!

(سلیم ایک اینٹ اٹھا کر کہے: اپنا سر مار لیتا ہے، ستارہ چپ چاپ

ہے۔ سلیم پھر زور سے سر پر مارنے کے لئے ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ یہ دیکھکر ستارہ دوڑ پڑتی ہے)

ستارہ۔ ہاں، ہاں، یہ کیا کرتے ہو بھیا؟

سلیم۔ میں اپنا سر پھوڑ کر مرجاؤنگا۔

ستارہ۔ (گھبراکر) یہ کیا کرتے ہو، بھیا میرے۔

سلیم۔ نہیں۔ نہیں، میں ضرور مر جاؤں گا۔ تو مجھے بہت تنگ کرتی ہے۔

(پھر ٹھوکر لگانے کے لئے ہاتھ اُٹھاتا ہے)

ستارہ۔ (روتے ہوئے) بس کرو بھیا، کان پکڑتی ہوں، اب کبھی نہ تنگ کروں گی۔

سلیم۔ اور تو مجھے اپنے کھلونے سے نہیں کھیلنے دیتی ہے۔

ستارہ۔ ہاں۔ ہاں، اب ضرور دونگی کھلنے۔ اور تم بھی تو مجھے روز روز مارتے !

سلیم۔ اچھا کبھی نہیں ماروں گا تجھے!

ستارہ۔ تو چلو گھر چلیں۔ (اندر سے ماں پکارتی ہے) ارے او سلیم، او ستارہ، ناشتہ تیار ہے، جلدی آؤ۔

(دونوں بچے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف چلے جاتے ہیں)



بچوں کی کوششیں

بمبئی میں ایک سیٹھ جی تھے۔ انھوں نے درزی سے ایک پاجامہ سلوایا۔ درزی پاجامہ سی کر سیٹھ جی کے گھر دے آیا۔ اُس وقت سیٹھ جی گھر پر نہیں تھے، شام کو جب سیٹھ جی گھر واپس آئے تو دیکھا کہ پاجامے کے پائنچے دو دو انچ بڑے ہیں۔ دوسرے ہی دن سویرے ان کو پاجامہ پہن کر کسی افسر سے ملنے جانا تھا۔

اُنھوں نے اپنی بیوی سے کہا "دیکھو درزی نے پاجامے کے پائنچے دو دو انچ بڑے بنا دئے ہیں۔ دو انچ کاٹ کر سی دو، کل سویرے ہی مجھے افسر سے ملنے جانا ہے۔"
بیوی نے کہا۔ "ابھی مجھے کچھ کام ہے رکھ دیجئے بعد میں سی دوں گی۔" تب سیٹھ جی نے اپنی بہن سے کہا۔ "گھر والی کو ابھی کچھ کام ہے تم ہی میرا پاجامہ ذرا ٹھیک کر دو۔"
بہن نے کہا۔ "اب میں روٹی پکا رہی ہوں، پکانے کے بعد سی دوں گی۔"
پھر سیٹھ جی نے اپنی لڑکی سے کہا۔ "بیٹی! تم ہی میرا پاجامہ دو انچ کم کر کے سی دو۔ کل بہت سویرے افسر کے یہاں جانا ہے۔" لڑکی نے جواب دیا۔ "ابھی تو سبق یاد کر رہی

ہوں۔ کل بہت سویرے آپ کے جانے سے پہلے ہی اُٹھ کر ٹھیک کر دوں گی۔"

سیٹھ جی کھا پی کر سو گئے۔ کھانا کھانے کے بعد بیوی نے سوچا۔ ان کو کل سویرے ہی افسر سے ملنے جانا ہے گھر میں دوسرا پاجامہ بھی نہیں ہے۔ چلو اسے ہی ٹھیک کر دوں۔ یہ کہہ کر وہ اُٹھی اور دونوں پیروں سے ڈیڑھ ڈیڑھ انچ کپڑا کاٹ کر انہیں سی دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی بہن کو یاد آیا کہ بھائی نے پاجامہ ٹھیک کر دینے کو کہا تھا، میں بھول ہی گئی۔ کل سویرے ان کو کہیں باہر جانا ہے۔ یہ سوچ کر وہ اُٹھی اور پاجامے کے دونوں پائینچے ڈیڑھ ڈیڑھ انچ کم کر کے سی دیا۔ بہت سویرے ان کی لڑکی اُٹھی۔ اس نے سوچا چلو باپو جی کے جاگنے سے پہلے ہی ان کا پاجامہ ٹھیک کر کے رکھ دوں۔ نہیں تو ناراض ہوں گے یہ سوچ کر اس نے بھی دونوں پائینچے ڈیڑھ ڈیڑھ انچ کاٹ کر انہیں سی دیا۔ سویرے سیٹھ جی اُٹھے۔ نہا دھو کر وہ افسر سے ملنے کو تیار ہوئے۔ جب پاجامہ پہنا تو دیکھا کہ وہ بہت ہی چھوٹا ہو گیا تھا۔

وی۔ احمد بادشاہ جوہر میلوشارم

شکاری

کہتے ہیں ایک لالچی شکاری جنگل میں شکار کھیلنے گیا۔ آدھا دن پھرنے کے بعد اسے ایک لومڑی نظر آئی اس نے گڑھا کھود کر گڑھے کو پتیوں اور ٹہنیوں سے ڈھکا۔ اس پر خرگوش کا گوشت رکھ کر خود گھنی جھاڑی میں چھپ گیا۔ لومڑی جب گڑھے کے قریب آئی تو وہ سمجھ گئی کہ یہ گڑھا کھود کر میرے لئے جال تیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ لومڑی چالاکی میں مشہور ہے، وہ چلی گئی۔ اتنے میں وہاں ایک چیتا آیا اور گوشت پر جھپٹا۔ لیکن گڑھے میں گر پڑا اس کے گرنے سے دھماکا ہوا لالچی شکاری جو تاک میں تھا جھاڑی سے نکلا اور بغیر کچھ سوچے سمجھے گڑھے میں کود پڑا اور لومڑی کا شکار کرنے کی بجائے خود شکار ہو گیا۔

لومڑی نے لالچ نہ کی تو اس کی جان

بچ گئی۔ چیتا لالچ کے سبب گڑھے میں گرا اور لالچی شکاری اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

اقبال حسین۔ ایوت محل

تماشہ

ہمارے اسکول کے سامنے ایک اندھا فقیر گانا گاکر بھیک مانگا کرتا تھا۔ ایک دن اسکول سے چھٹی ہونے پر میں گھر جا رہا تھا کہ میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا — "دیکھو تمھیں ایک تماشہ دکھاؤں" اور یہ کہہ کر اس نے اندھے فقیر کے سامنے ٹاٹ پر پڑے ہوئے پیسوں میں سے ایک پیسہ اٹھا کر کہا "بابا! یہ لو پیسہ"

فقیر نے اس کو دعا دی اور بولا۔ "ایک گانا سنتے جاؤ۔ میں پیسہ دینے والے کو ایک گانا ضرور سنا دیتا ہوں"۔

اتنا کہہ کر اس نے گانا شروع کر دیا گانا ختم ہونے پر میں نے دیکھا کہ میرے دوست کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور اس نے اپنی جیب سے ایک اٹھنی نکال کر فقیر کو دیتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا گاتے ہو"۔

محمد متین۔ جمشید پور

ہمدردی

افغان ایک ملک ہے۔ وہی افغان جہاں کے لوگ افغانی کہلاتے ہیں۔ یہ ملک پنجاب کے شمال و مغرب میں واقع ہے۔ یہاں زیادہ تر مسلمان بستے ہیں۔ عرصہ ہوا یہاں ایک بادشاہ گذرا ہے جس کا نام سبکتگین تھا — آپ نے محمود غزنوی کا نام سنا ہوگا۔ سبکتگین محمود کا باپ تھا۔ پہلے یہ بادشاہ البتگین کا غلام تھا۔ لیکن اطاعت لیاقت سچائی اور ہمدردی کی بدولت زبردست بادشاہ بن گیا۔

غلامی کے زمانے میں ایک روز شکار کو گیا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسے ایک ہرنی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ دفعتہً گھوڑے کا رُخ اس کی طرف پھیر کر پیچھا کیا۔ ہرنی طاقت ور تھی۔ قریب کی جھاڑی

میں سے چوکڑی مارتی ہوئی، نظروں سے غائب ہوگئی۔ لیکن بچہ ابھی کمزور تھا تھک کر رک گیا۔ سبکتگین نے اسے پکڑ کر گھوڑے پر لاد لیا اور گھر کی طرف چلتا بنا۔

ماں کی ممتا عجیب چیز ہوتی ہے۔ بچے کا حال دیکھا تو بے چین ہوگئی۔ اپنی جان سے بے پروا ہوکر سبکتگین کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ سبکتگین نے مڑ کر دیکھا تو وہی ہرنی جس کا پیچھا کرنے کے لئے گھوڑا دوڑایا تھا، گردن جھکائے خود چلی آ رہی ہے۔ گویا وہ بے زبان کہہ رہی تھی مجھ بے کس پر خدا کے لئے رحم کر کے میرے پیارے بچے کو چھوڑ دو۔ خدا تمھیں اس کا نیک بدلہ عنایت کرے گا۔

سبکتگین کو اس ہرنی پر بہت رحم آیا ترس کھا کر بچے کو آزاد کر دیا۔ بچہ اچھلتا کودتا ہوا ماں کے پاس جا کھڑا ہوا اور ماں خوشی کے مارے بچے کو چومنے لگی۔ اور بچے کو اپنے ساتھ آتا تا قریب کی جھاڑیوں میں لے کر غائب ہوگئی اس روز سبکتگین خالی ہاتھ گھر آیا۔

اسی روز رات کو سبکتگین سویا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

اے سبکتگین! تو نے ہرنی کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بہتر کیا ہے۔ باری تعالےٰ کو تمھاری یہ بات بہت پسند آئی ہے۔ اور اس نے تیرا نام بادشاہوں کی فہرست میں لکھ لیا ہے۔ تو ضرور بضرور بادشاہ ہوگا۔ اب بادشاہت ملنے پر اپنی رعایا سے اسی طرح رحم و کرم سے پیش آنا اور کسی کا دل نہ دکھانا۔

یہ خواب آخر پورا ہوکر رہا سبکتگین کچھ ہی عرصے بعد ایک بڑی سلطنت کا بادشاہ ہوگیا۔

محمد ساجد گھہری
گردھر پور (خلیل آباد)



۱۔ دنیا کا سب سے بڑا شہر لندن ہے۔

۲۔ دنیا کی سب سے اونچی چوٹی مونٹ ایورسٹ ہے جو کہ ۲۹۰۰۲ فٹ بلند ہے اور جس پر پہلی بار انسانی قدم ۲۹ رمئی ۱۹۵۳ء کو پڑے

۳۔ دنیا میں سب سے بڑی جھیل کیسپین ہے۔

۴۔ دنیا کا سب سے بڑا آبشار نیاگرہ (امریکہ) ہے۔

۵۔ دنیا میں سب سے بڑا سینما نیویارک میں ہے۔

۶۔ دنیا میں سب سے بڑا براعظم ایشیا ہے۔

۷۔ دنیا میں سب سے بڑا سمندری جہاز "کوئین الزبیتھ" ہے جس کا کل وزن ۸۱۰۰۰ ٹن ہے۔

۸۔ دنیا میں سب سے بڑی یونیورسٹی ماسکو میں ہے جو ابھی حال ہی میں بنی ہے۔

۹۔ دنیا کا سب سے بڑا دریا مسی سپی (امریکہ) ہے۔

۱۰۔ دنیا کا سب سے بڑا ریگستان سہارا (افریقہ) ہے۔

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×

اور کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں؟

۱۔ دنیا میں پہلا سگریٹ ۱۷۴۹ء میں ترکی کے ایک فوجی سپاہی نے بنا کر پیا تھا
۲۔ دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان انگریزی ہے۔ اور جو ایک ساتھ کئی ملکوں کی مادری زبان ہے۔
۳۔ دنیا میں سب سے زیادہ بارش چیرا پونجی (ہندوستان) میں ہوتی ہے
۴۔ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے۔
۵۔ سورج کی کرن زمین تک آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے۔
۶۔ دنیا کا سب سے خوبصورت شہر پیرس ہے۔
۷۔ دنیا کا سب سے پرانا درخت لنکا میں ہے جو اشوک کے زمانے میں لگایا گیا تھا۔
۸۔ انگلستان کے سیاسی رہنما کرامویل کو مرنے کے کئی سال بعد قبر سے نکال کر پھانسی دی گئی۔
۹۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ تعلیم بمبئی کے ایک شہر سورت میں ہے جس کے ۲۷ فی صدی آدمی پڑھنا جانتے ہیں۔
۱۰۔ دنیا میں سب سے زیادہ سردی ورک ہو یا نسک (سائبیریا) میں ہوتی ہے
۱۱۔ دنیا میں سے زیادہ گرمی جیکب آباد (پاکستان) میں ہوتی ہے۔
۱۲۔ دنیا کا سب سے گہرا سمندر بحرالکاہل ہے۔ بعض جگہ اس کی گہرائی پانچ میل سے زاید ہے۔
۱۳۔ دنیا میں سب سے زیادہ کھاری پانی بحر مردار (فلسطین) کا ہے۔

پیامی معمہ نمبر ۲۸ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل :- دائیں سے بائیں (۱) حسین (۲) عظمت (۳) عقل (۵) اقدام (۶) تیر تار سے پیچھے (۸) جان (۹) نام

صحیح حل صرف آٹھ موصول ہوئے لہٰذا مبلغ تیس روپے کا پہلا انعام بحساب تین روپے بارہ آنے (۳/۱۲) فی کس تقسیم کر دیا گیا۔

(۱) مشتاق احمد۔ ایرنپور (۲) انیس احمد۔ دہلی۔ (۳) محمود احمد خاں۔ کانپور (۴) ریحانہ پروین کانپور۔ (۵) شریف الدین۔ بریلی (۶) مقصود الحق۔ شاہجہانپور (۷) جمیل احمد۔ آگرہ۔ (۸) اشرف علی۔ احمد آباد۔

ایک غلطی والے ۴۶ حل موصول ہوئے لہٰذا بیس روپے کا دوسرا انعام بحساب /۷ فی کس تقسیم کر دیا گیا۔

(نوٹ :- جگہ کی کمی کے باعث ایک غلطی والوں کے نام نہیں دیئے جا رہے ہیں۔)

پیامی معمہ نمبر ۲۹ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل :- (۱) دیں (۲) دھوپ (۳) جلنے (۴) عزم (۵) بھوت (۶) بندگی (۷) شوخی۔

اس بار صحیح حل ۳۲ موصول ہوئے لہٰذا پہلا انعام بحساب ایک روپیہ (عہ) فی کس تقسیم کر دیا گیا۔

(۱) اکرام علی آگرہ (۲) نسیم الدین احمد کلرک پٹنہ (۳) سید سمیع اللہ تلہ گنگ (۴) شفیع الدین پٹنہ (۵) احمد رضا آگرہ (۶) سعیدہ سعد جامعہ نگر (۷) ریحانہ غضنفر دہلی (۸) محمد احمد دہلی (۹) شمیم اختر علی گڑھ (۱۰) جمیلہ بیگم پٹنہ (۱۱) کنیز فاطمہ گلبرگہ۔ (۱۲) سروپ کمار کانپور (۱۳) شمیم آرا کلکتہ (۱۴) عبد الحلیم کلکتہ (۱۵) کریم الدین آگرہ (۱۶) نفیس احمد جمشید پور (۱۷) منو میاں بدایوں (۱۸) اقبال علی گلبرگہ (۱۹) کلیم الدین پٹنہ (۲۰) کفیل احمد آگرہ (۲۱) محمد شریف مجو گنج (۲۲) محمد یوسف دہرہ دون (۲۳) فیاض احمد الہ آباد (۲۴) رام سروپ الہ آباد (۲۵) عبد الرزاق احمد نگر (۲۶) رضیہ بیگم کلکتہ (۲۷) اشوک پٹنہ (۲۸) شرف الحسن لکھنؤ (۲۹) محمد اکرام لکھنؤ (۳۰) اخلاق میاں جمشید پور۔

ایک غلطی والے ۴۴ حل موصول ہوئے لہٰذا دوسرا انعام ۸ آنے فی کس تقسیم کر دیا گیا۔

(نوٹ :- جگہ کی کمی کے باعث ایک غلطی والوں کے نام نہیں دیئے جا رہے ہیں۔)

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔	پچاس ۵۰ روپے کے نقد انعامات	فیس فی اصلاحی حل ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں پانچ حلوں کی فیس چار آنے

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۳۰ روپے || دوسرا انعام ایک غلطی پر ۲۰ روپے

حل اور فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۰ مارچ ۱۹۵۴ء

پیامی معمہ نمبر ۳

۱ ج	ا	ب	ر
۲	س	م	ن
۳	و	ا	ل
۴ ر	ن	گ	
۵	ا	ل	
۶		ی	د
۷ ع	ل	م	

اشارے

۱۔ ایسے آدمی سے سب ہی ڈرتے ہیں (جابر)

۲۔ انسان کو اپنے ــــــ کی باتیں عموماً یاد رہتی ہیں۔ (بچپن۔ دشمن)

۳۔ بعض ــــــ اپنے فن میں بہت ماہر ہوتے ہیں۔ (نقال۔ قوال)

۴۔ ــــــگ جائے تو وہ چیز بدنما معلوم ہوتی ہے۔ (رنگ۔ زنگ)

۵۔ خدا کی راہ میں ــــــ کی قربانی کرنے کا بڑا ثواب ہے۔ (جان۔ مال)

۶۔ ہر شخص میں ــــــ بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ (فقیر۔ مرید)

۷۔ اس کے اچھے استعمال سے دنیا کافی ترقی کر سکتی ہے۔ (قلم۔ علم)

ٹوکن پیامی معمہ نمبر ۳

نام ....

پتہ ....

ٹوکن پیامی معمہ نمبر ۳

نام ....

پتہ ....

بچّوں کی کتابیں

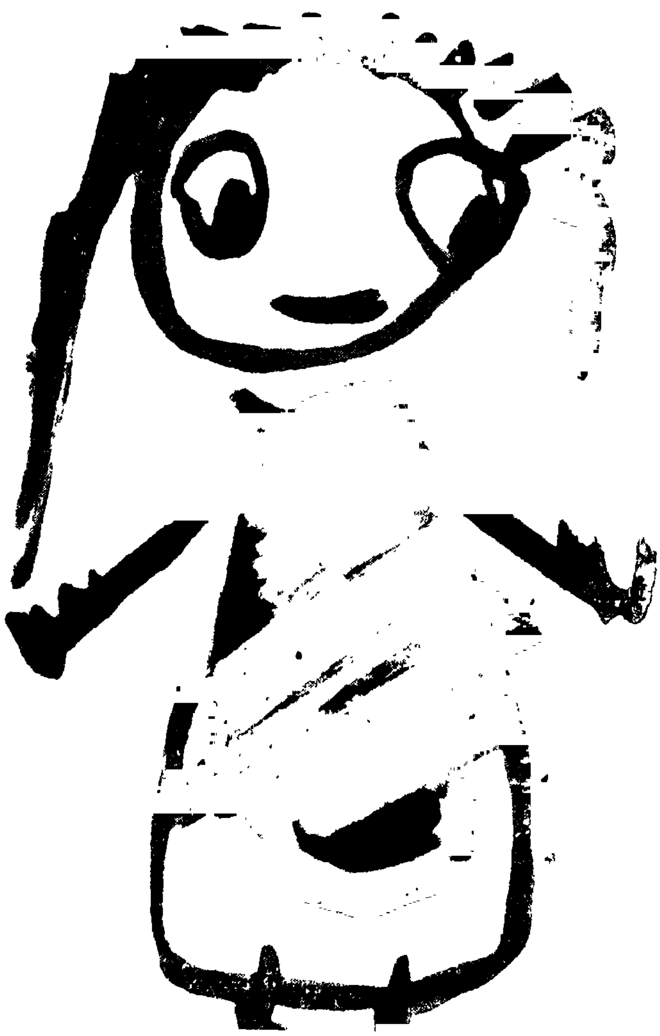
سماجی زندگی اوّل ۸ر
〃 دوم ۱۰ر
〃 سوم ۱۲ر
〃 چہارم ۱۲ر
نئی زندگی اوّل ۱۲ر
〃 دوم ۱۲ر ۳
معلومات کی پہلی عہ
〃 دوسری ۱۲ر ۲
〃 تیسری ۱۲ر ۲
〃 چوتھی عہ ۳
〃 پانچویں عہ ۳
تاریخ ہند کی کہانیاں اوّل ۱۰ر
〃 دوم ۱۰ر
〃 سوم ۱۰ر
اَن تھک جان ۱۰ر
چھن چھن بانو ۱۰ر
جاں باز سپاہی ۱۰ر
قدرت کے کرشمے ۱۰ر

بجلی کی کہانی ۷ر
مقناطیس کی کہانی ۸ر
بجلی اور مقناطیس کے کھیل ۱۰ر
دُنیا کے بچے ۱۲ر
دُنیا کے بسنے والے ۱۲ر
گاندھی بابا کی کہانی (سوانح) صر
مہاتما گاندھی (سوانح) ۱۲ر
چمپاوت کا آدم خور شیر ۵ر (کہانیاں)
چوہوں کی کانفرنس ۶ر 〃
چھوٹی لالٹین ۵ر 〃
مرغی اجمیر چلی ۵ر 〃
ایک کچوری تیل میں ۵ر 〃
ننھا ٹٹو ۴ر 〃
پرندوں کا ایکا ۴ر 〃
لومڑی اور خرگوش کی لڑائی ۵ر 〃
جنگو کی بلّی ۶ر 〃
شہزادی گلنار ۷ر 〃
شہزادہ اور ٹھگ ۸ر 〃

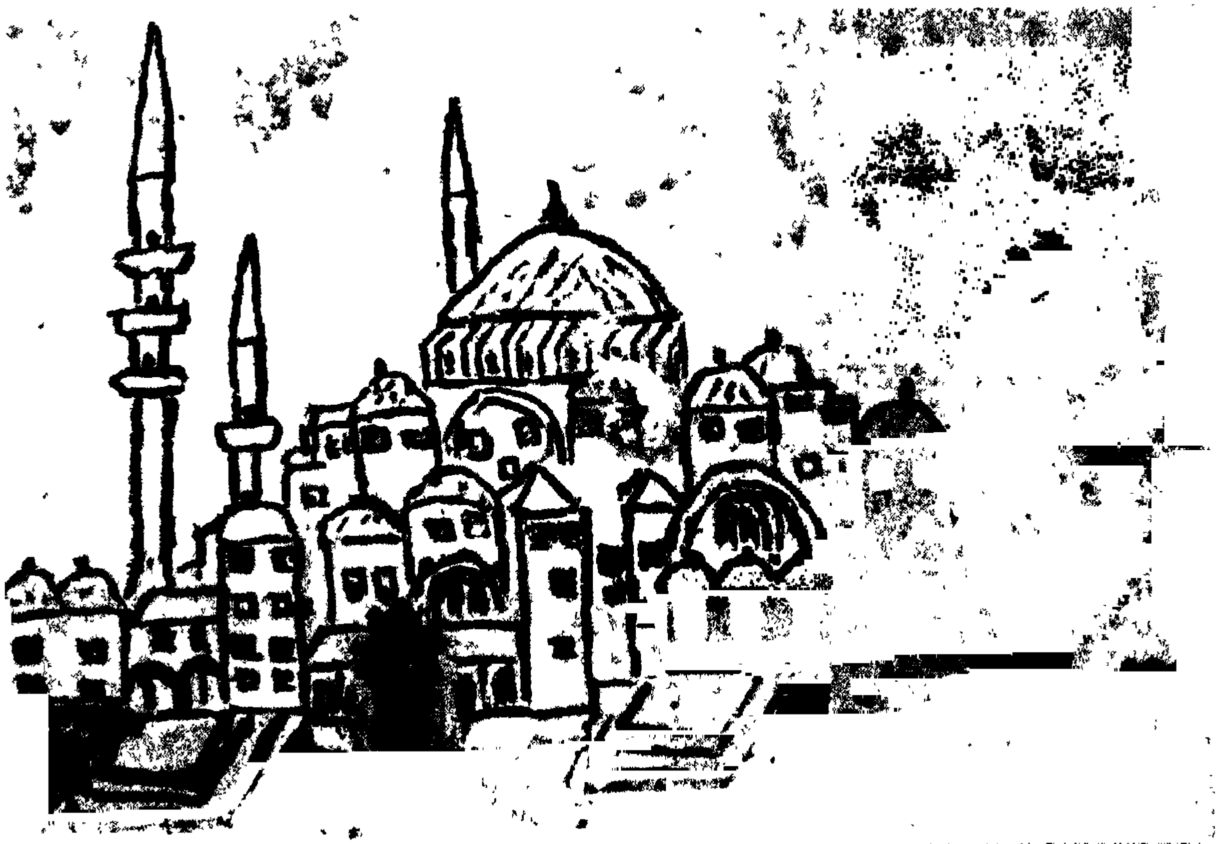
مزہ چکھائیں گے ۵ر (کہانیاں)
ہمت کا پھل ۶ر 〃
گُلّا بوجھ ہیا ۱۴ر 〃
ایک ٹانگ کا بادشاہ ۱۰ر 〃
انوکھی مُلاقات ۱۱ر 〃
کیسا چکمہ دیا ۱۴ر 〃
فسانۂ عجائب [illegible] 〃
جُلّو مرغابی [illegible] 〃
پریم کی جیت ۴ر (ڈراما)
محنت ۷ر (〃)
بچّوں کا کھلونا ۱۲ر (نظم)
جادو کی کُرسی ۶ر
اور مقدمہ چلتا رہا ۶ر
دُھن کی پوری سون چڑیا ۶ر
جادو کی کتاب ۷ر
چھوٹا لڑکا ۴ر
دھمے [illegible]
چور لڑکا [illegible]



میں اور میری ننھی بہن
۱. حمیدہ سلطان فیض عمر ۱۰ سال
لاہور



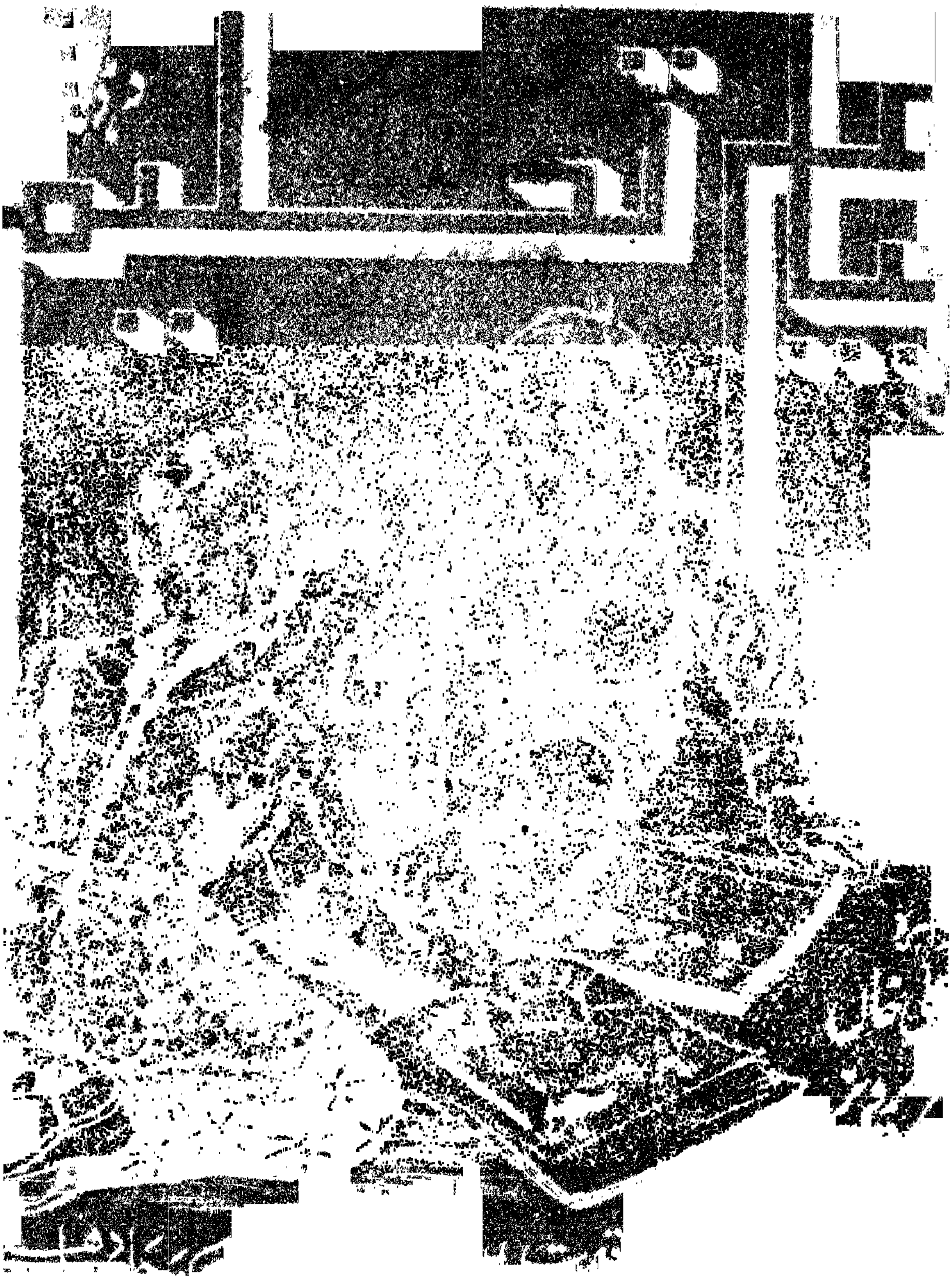
پیرکو
بھرام ۔ مکیلا عمر ۳ سال جاپان



مسجد سلیمانیہ

شہاملی بھٹاچاریہ عمر ۵ سال نئی دہلی

Title Printed Fine Press DELHI





بنیادی مدرسہ اوکھلہ کے بچے"
جو ٹرافی لے جا رہے ہیں



بیگم شفیق قدوائی انعام دے رہی ہیں

پیامِ تعلیم

اپریل ۵۴ء

ادارہ

حامد علی خاں بی۔اے (جامعہ)

اطہر پرویز ایم۔اے (علیگ)

سالانہ چندہ ۴/- روپے
فی پرچہ ۶/ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی

فہرست

بچوں سے باتیں



آپ کو یاد ہوگا کہ اب سے چھ مہینے پہلے ہمارے آرٹسٹ گلیڈون میسی صاحب اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں امریکہ تشریف لے گئے تھے۔ مسٹر میسی یکم مارچ کو دہلی پہنچ گئے۔ اور اس پرچے میں آپ کے لئے اچھی اچھی تصویریں بنا رہے ہیں۔ ہم جمیل اختر صاحب کے خاص طور پر ممنون ہیں کہ انھوں نے اس عرصے میں "پیام تعلیم" کی تصویریں بنائیں۔

---

۱۴ مارچ کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے "یوم نظیر" منایا گیا۔ نظیر اردو کے بڑے اچھے شاعر گذرے ہیں کون ہوگا جس نے ان کی نظم "بنجارہ" نہ سنی ہوگی۔ وہی نظم جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔ "سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ"۔ نظیر کا انتقال ۱۸۳۰ء میں ہوا۔ یہ آگرے کے رہنے والے تھے اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

"یوم نظیر" کی اس تقریب میں دن کے وقت نظیر کی شاعری پر مقالے اور تقریریں ہوئیں جس میں ڈاکٹر عبدالعلیم، محترمہ انیس قدوائی، جناب حافظ رضی الدین صاحب اور جناب ضیا الحسن صاحب فاروقی نے حصہ لیا۔ جلسے کی صدارت کے فرائض مولینا اسلم جیراجپوری نے انجام دیے۔

رات کو محفلِ موسیقی کے بعد ایک ڈراما "آگرہ بازار" ہوا جسے حبیب تنویر صاحب نے خاص طور پر "یومِ نظیر" کے لئے لکھا اور تیار کیا تھا۔ اردو میں اپنی قسم کا یہ خاص ڈراما تھا جس میں زیادہ تر نظیر کے کلام سے کام لے کر اس زمانے کی زندگی پیش کی گئی تھی۔ اِسے بے حد پسند کیا گیا اور اس سے دیکھنے والوں کو نظیر کی شاعری اور اُس زمانے کے حالات سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔

---

۲۵ مارچ کو جامعہ میں ایک اور ڈراما "گدھے" ہوا جسے مسز الزبیتھ گابا اسکول کے بچوں نے پیش کیا تھا۔ بچوں نے اسے بے حد پسند کیا۔ یہ ڈراما اس سے پہلے بھی حبیب تنویر صاحب کی نگرانی میں نئی دہلی میں پیش کیا جا چکا تھا۔

---

۲۸ مارچ کی تاریخ ہندوستان کی ہوائی فوج کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس روز ہندوستانی ہوائی فوج نے اپنی اکیس سالہ تقریب مناتے ہوئے نئی دلی سے چودہ میل کے فاصلے پر اپنی قوت کا بڑا شاندار مظاہرہ کیا۔ اس میں تقریباً سو جہازوں نے حصہ لیا۔ اس کو دیکھنے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں آدمی دور دور سے آئے۔

ہمارے وزیرِاعظم پنڈت جواہر لال نہرو ایک خاص قسم کے ہوائی جہاز میں یہاں آئے جسے "ہیلی کوپٹر" کہتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے اس قسم کے جہاز کو پہلی بار دیکھا۔

آپ نے مارچ کے پرچے میں شنکر ویکلی کے مقابلے میں انعام پانے والی کچھ تصویریں دیکھیں اور بچوں ہی کی لکھی ہوئی چند کہانیاں پڑھیں۔

۲۸ مارچ کی شام کو انعام پانے والے بچوں کے ایک جلسے میں پنڈت نہرو نے انعامات تقسیم کئے۔ چونکہ غیر ممالک کے بچے نہ آسکے اس لئے ان کی طرف سے ان ممالک کے سفیروں نے انعامات لئے۔ اس جلسے میں تقریباً دو ہزار بچوں نے شرکت کی۔ پنڈت جی نے بڑی دلچسپ تقریر کی۔ آخر میں بیگم قدسیہ زیدی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

گئی۔ ہر مدرسہ چھوٹی چھوٹی نقلیں تیار کر کے لایا تھا باری باری سب نے اپنے کمال دکھائے۔

ایک گھنٹے کا یہ پروگرام خاصا دلچسپ رہا۔ تین ججوں کی ایک کمیٹی نے کیمپ فائر کی نقلوں پر نمبر دیئے۔ ۷ مارچ کو صبح جوہر بستی میں اور بہت سی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ معائنہ کمیٹی نے ۹ بجے پھر معائنہ کیا اور نمبر نوٹ کر لئے۔

$9\frac{1}{2}$ بجے کہانیوں کا مقابلہ ہونے والا تھا۔ جامعہ کے تمام لوگ ۹ بجے ہی سے محمد علی ہال میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ہر طرف چہل پہل ہو رہی تھی۔ جامعہ کے بچوں کو دوسرے مدرسوں کے بچوں سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ جدھر دیکھئے بچے ہی بچے۔ کوئی جھول رہا ہے تو کوئی ہوٹل میں چائے پی رہا ہے۔ ہوٹل بھی تو مدرسہ ابتدائی کے بچوں نے کھولا ہے۔ نام تو دیکھئے "آپ کا ٹی اسٹال"۔۔۔

خیر تو $9\frac{1}{2}$ بجے کہانیوں کے مقابلے شروع ہوئے۔ ایک سے ایک دلچسپ اور انوکھی کہانی سننے میں آئی۔ ایک گھنٹے میں یہ پروگرام ختم ہوا۔ سہ پہر میں تین بجے کچھ تصویروں کی مدد سے کہانی سنانے کا مقابلہ ہوا۔ بھئی اس میں تو عقل کا امتحان تھا۔ وہ تصویریں پہلے تو کسی نے دیکھی نہ تھی۔ مگر بچوں کی عقل بھی تو بڑی تیز ہوتی ہے۔ تصویریں دیکھ کر وہ مزے دار کہانیاں بنائیں کہ مزا ہی تو آگیا۔

یہ لیجئے، دو دن کی محنت کا پھل ملنے کا وقت قریب آگیا۔ مقابلے ختم ہوئے، جج صاحبان فیصلہ تیار کرنے میں لگ گئے۔

انعامات کی تقسیم کے لئے، شفیق صاحب مرحوم کی بیگم صاحبہ تشریف لائی تھیں۔ سب سے پہلے تو انہوں نے کھیلوں میں اوّل دوم اور سوم آنے والوں کو سرٹیفکٹ دیئے۔ ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔

زیادہ تر مدرسہ ابتدائی کے لڑکے ہی انعامات لے جا رہے تھے۔ کہانیوں کے مقابلے میں مدرسہ ابتدائی کے اظہار عالم اوّل رہے۔ تحریری مقابلے میں ایم آئی مڈل اسکول باڑہ ہندو راؤ کے طالب علم رحمان بیگ اوّل رہے۔ سب کو بے چینی سے ٹرافی کے نتیجے کا انتظار تھا۔ سب چیزوں میں ملا کر جامعہ کا مدرسہ ابتدائی اوّل رہا۔ کئی منٹ تک مسلسل تالیاں بجتی رہیں۔ مدرسہ ابتدائی کے طلباء نے نہایت خوشی کے ساتھ ٹرافی دوم آنے والے بیسک اسکول اوکھلا کو دے دی۔ ٹرافی چاندی کی ہے اور جامعہ کے اسکول کی نئی عمارت کا ماڈل ہے۔۔۔ تالیوں کے بیچ جلسہ ختم ہوا اور اسی کے ساتھ جوہر ٹرافی کے مقابلے بھی۔ امید ہے آئندہ سال بھیا یہ اور زیادہ کامیاب رہیں گے۔

پیامی معمہ نمبر ۳۳ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل پیامی معمہ نمبر ۳۳:۔ (۱) جابر (۲) دشمن (۳) نقال (۴) رنگ (۵) حال (۶) مرید (۷) قلم *

صحیح حل ۳۲ موصول ہوئے۔ لہٰذا انیس روپے کا پہلا انعام ۳۲ حضرات پر بحساب ۱۵ آنے فی کس تقسیم کر دیا گیا

۱۔ صدیقہ بیگم۔ ٹیکم گڑھ ۲۔ رشید احمد۔ کلکتہ ۳۔ شمیم احمد۔ کلکتہ ۴۔ اقبال احمد۔ کانپور ۵۔ اکرام الدین بمبئی ۶۔ فیاض احمد۔ الہ آباد۔ ۷۔ جمیل احمد۔ کانپور ۸۔ محمد یونس۔ بریلی۔ ۹۔ شریف النساء۔ لکھنؤ۔ ۱۰۔ احمد علی۔ جونپور ۱۱۔ منظور علی۔ ڈیرہ دون ۱۲۔ نجمہ سلطان۔ بریلی ۱۳۔ محمد جلیل۔ جمشید پور۔ ۱۴۔ محمد رزاق۔ حیدر آباد ۱۵۔ کریم الدین حیدر آباد۔ ۱۶۔ رضیہ بیگم۔ کلکتہ۔ ۱۷۔ شمیم فاطمہ۔ جمشید پور۔ ۱۸۔ محمد مشتاق۔ کلکتہ۔ ۱۹۔ مقصود الحق۔ شاہجہانپور ۲۰۔ منو میاں۔ بھوپال۔ ۲۱۔ مبارک حسین۔ جمو۔ ۲۲۔ علی احمد۔ امروہہ ۲۳۔ سعیدہ بیگم۔ اسلام آباد۔ ۲۴۔ مجیب الرحمان۔ دہلی۔ ۲۵۔ نقی محمد۔ پٹنہ۔ ۲۶۔ ریحانہ۔ پونہ۔ ۲۷۔ بلقیس فاطمہ۔ بمبئی ۲۸۔ سردیپ کمار دہلی ۲۹۔ اخلاق احمد۔ پونہ۔ ۳۰۔ کلیم الدین۔ آگرہ۔ ۳۱۔ سمیع الدین۔ آگرہ۔ ۳۲۔ محمد رفیق۔ مراد آباد

ایک غلطی والے ۵۹ حل موصول ہوئے لہٰذا بیس روپے کا دوسرا انعام ۵۹ حضرات پر ۵ نئے پیسے فی کس تقسیم کیا گیا

(جگہ کی کمی کی وجہ سے ان کے نام نہیں دئے جا سکتے)

نوٹ:۔ (۱) اپنے حلوں کے ساتھ رسیدی ٹکٹ یا پھٹے ہوئے ٹکٹ نہ روانہ کریں ورنہ آپ کے حل شریک مقابلہ نہیں کئے جائیں گے۔

۲۔ اپنا پتہ صاف لکھیں۔ تاکہ انعام وقت پر مل سکے

۳۔ حل تاریخ مقررہ سے پہلے ہی سپرد ڈاک کر دیا کریں۔

۴۔ بغیر ٹکٹ والے حل شریک مقابلہ نہیں کئے جاتے۔

پرنٹر پبلشر حامد علی خاں مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں	پچاس ۵۰ روپے کے نقد انعامات	فیس مع اخلاقی حل ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں اور پانچ حلوں کی فیس چار آنے
پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۳۰ روپے	دوسرا انعام ایک غلطی پر ۲۰ روپے	

✱ حل اور فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۰ اپریل ۱۹۵۴ء

پیامی معمہ نمبر ۳۱

۱	آ	ز	ا	د
۲	م	ک	ر	
۳	بھ	و	ک	ی
۴	ش	ا	ل	
۵		و	ٹ	
۶	ش	ر	م	
۷	ج	و	ک	

اشارے

۱۔ ہمارے وزیر تعلیم کا نام مولانا ابوالکلام ۔۔۔ ہے

۲۔ دنیا میں ۔۔۔۔۔ سے کام لینے والے ہی فائدہ میں رہتے ہیں (مکر ۔ مہر)

۳۔ ۔۔۔۔۔ قوم کو بہت جلد گمراہ کیا جا سکتا ہے (بھولی ۔ بھوکی)

۴۔ ۔۔۔۔۔ دیکھ کر انسان کی عظمت کا درست اندازہ نہیں لگایا جا سکتا (شان ۔ شال)

۵۔ ۔۔۔۔۔ پا کر کھنگت لوگ بھی پھسل جاتے ہیں (نوٹ ۔ ووٹ)

۶۔ ۔۔۔۔۔ انسان کو بہت سے گناہوں سے بچاتی ہے (شرح ۔ شرم)

۷۔ اپنی ۔۔۔۔۔ کو سب ہی چھپانے کی کوشش کرتے ہیں (بھوک ۔ جوک)

کوپن پیامی معمہ نمبر ۳۱

نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

پتہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کوپن پیامی معمہ نمبر ۳۱

نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

پتہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

پتہ :۔ پیامی معمہ نمبر ۳۱، ماہنامہ پیام تعلیم، جامعہ نگر

ہماری زمین

یہ زمین جس پر آپ رہتے ہیں اس میں ہزاروں میل لمبے چوڑے میدان ہیں۔ بڑے بڑے پہاڑ۔ سمندر۔ تالاب اور جھیلیں ہیں، خلا میں اس کی حیثیت صرف ایک ذرّے کی ہے وہی جو اناج کے ڈھیر میں ایک دانے کی ہوتی ہے۔ ہماری زمین کے اردگرد کروڑوں سورج اور ستارے چکر لگاتے رہتے ہیں اور یہ خود اپنے سورج کے چاروں طرف گھومتی رہتی ہے کسی زمانے میں یہ اپنے سورج ہی کا ایک ٹکڑا تھی مگر بعد میں یہ اس سے ٹوٹ کر الگ ہو گئی اور اس زمین میں اپنی دنیا الگ بسالی۔

شروع شروع میں تو یہ سورج ہی کی طرح پگھلی ہوئی گرم دھات اور جلتی ہوئی گیسوں کا ایک بڑا سا لوندا تھی۔ پھر آہستہ آہستہ یہ ٹھنڈی ہوتی گئی اس کے اوپر دھات کی ایک سخت سی پرت جم گئی۔

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس پرت میں وہ تمام چیزیں موجود تھیں جو زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ یعنی لوہا، چونا گندھک، سوڈیم اور پوٹیشیم۔

اور سنئے جب یہ پرت ٹھنڈی ہونے لگی تو اس میں جا بجا دراڑ پڑ گئیں۔ زمین کے اوپر کا حصہ تو ٹھنڈا ہو چکا تھا لیکن اس کے اندر کی دھات ابھی تک اسی طرح کھولتی رہی۔

اوپری حصے میں دراڑ پڑتے ہی اسے جو اوپر آنے کا موقع ملا تو یہ بلبلا کر اُبل پڑی۔ جا بجا زمین کے اندر سے دیو جیسے جوالا مکھی پھنکاریں مارتے ہوئے پھٹ پڑے اور اپنے ساتھ ساتھ دھرتی کے پیٹ میں سے بھاپ اور کاربن گیس نکال کر لے آئے۔ یہ بھاپ ٹھنڈی ہونے کے بعد پانی بن گئی اور اس طرح زمین کو سمندر دریا اور ہوا کی نعمتیں ملیں۔ ہماری یہ زمین اس طرح لاکھوں برس تک آگ اور شعلوں کے درمیان جلتی رہی اور کھولتے ابلتے ہوئے پانی میں نہاتی رہی۔ آخر کار سورج کے اس ٹکڑے کو وہ چیز میسر ہوئی جس سے زندگی کا ظہور ہوتا ہے۔ زمین پر جو پانی موجود تھا اسے ہزاروں برس تک ہوا اوپر کو اچھالتی رہی۔ سینکڑوں برس تک پانی زمین کی اوپری پرت سے ٹکراتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی اوپری پرت آہستہ آہستہ کیچڑ کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ اب زندگی کے لئے سب کچھ موجود تھا، روشنی پانی، ہوا، کیچڑ یعنی مٹی۔

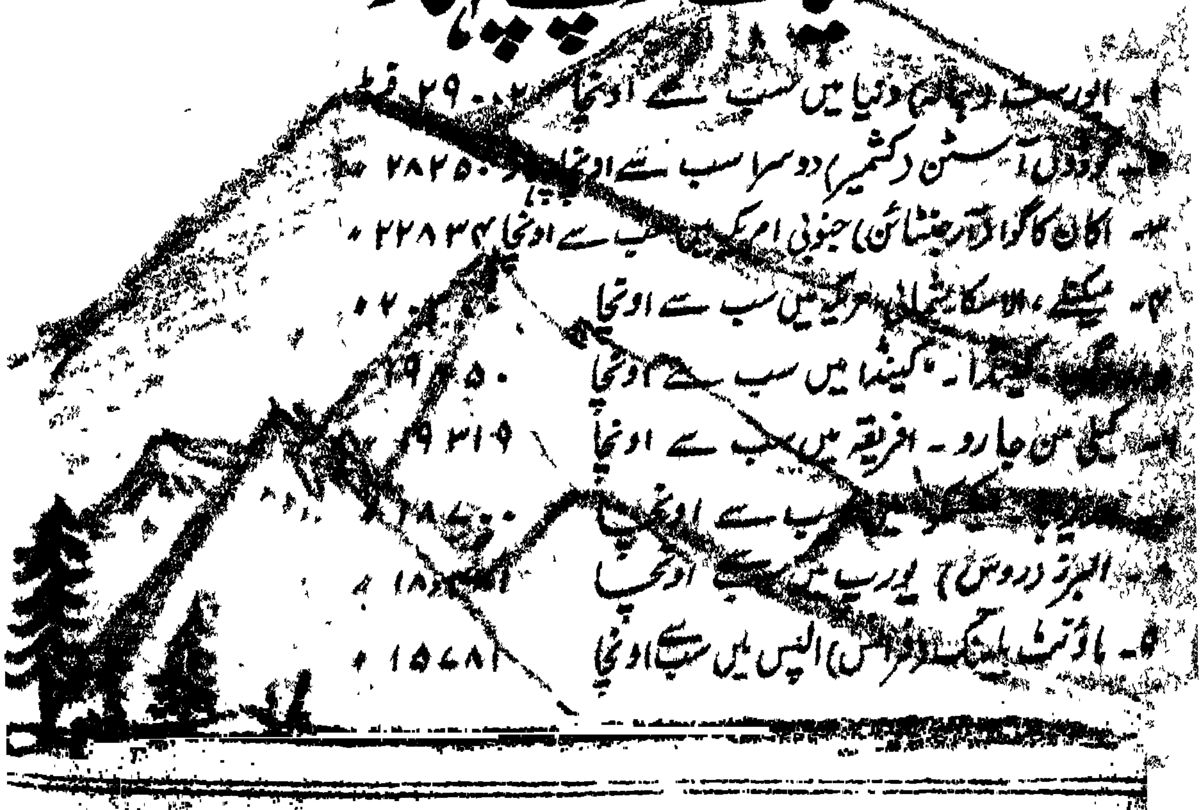
ہماری یہ زمین اب تک سنسان بستی تھی، نہ آدم نہ آدم زاد، فقط اللہ کی ذات، لیکن اب جب کہ زندگی کو وجود میں لانے کے لئے ضروری مسالہ تیار ہو گیا تو سب سے پہلے جان دار چیز بھی پیدا ہوئی۔ سورج کی گرمی پانی سڑاند اور بساندگی وجہ سے پانی میں ننھی ننھی سی چھوٹی چھوٹی لعاب دار مچھلیاں

پیدا ہوئیں، اس کے بعد جیوں جیوں زمانہ بیتتا گیا، یہ پہلی جان دار چیز بھی بدلتی گئی۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے یہ کچھ بڑی بڑی مچھلیاں بنیں پھر اس سے بھی بڑی۔ یہاں تک کہ ان چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی پیدائش کے بارا لاکھ سال بعد دریاؤں اور سمندروں میں بڑے بڑے مگرمچھ اور منوں وزنی مچھلیاں تیرنے لگیں، ان میں سے کچھ پھرتے پھراتے زمین پر چڑھ گئیں۔ وہاں کی گرم زندگی کا مزہ جو پایا تو وہیں رہنے کا جتن کرنے لگیں، ہوتے ہوتے ان کا جسم ایسا ہو گیا کہ یہ خشکی اور پانی دونوں جگہ آسانی سے رہ سکیں، ایسے جانوروں کو جل بھومی کہتے ہیں پھر کچھ عرصے کے بعد آپ کی یہ زمین پودوں اور درختوں کی ہری چادر سے ڈھک گئی۔ ہر طرف جنگل ہی جنگل اور جنگل میں منگل ہونے لگا ان مچھلیوں میں سے کچھ درختوں پر چڑھ کر وہیں بسیرا کرنے لگی تھیں، ہوتے ہوتے ان کی کھال ڈھیلی ہو گئی پھر اس پر پَر نکل آئے یہ لو یہ چڑیاں بن گئیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد بڑے بڑے جانوروں کا وجود ہوا اتنے بڑے کہ ان میں سے بعض کی لمبائی نوّے فٹ تک ہوتی تھی اور وزن ہزاروں من! ان میں سے کچھ گھاس پات پر زندگی بسر کرتے تھے اور کچھ خون خوار تھے، اس زمانے میں دنیا بھی کتنی عجیب رہی ہوگی، ہر طرف گھنے جنگل، اور ان جنگلوں میں پہاڑ جیسے جیسے جانور درختوں پر چڑیاں سمندروں میں مچھلیاں، دنیا پر انھیں کا راج تھا، یہی راجا تھے، یہی رانی، انسان کا ابھی تک کہیں نام و نشان نہ تھا۔

ان جانوروں میں سے کچھ انڈے دیتے تھے کچھ بچے، بچے دینے والوں میں گوریلا یا بن مانس سب سے زیادہ ہوشیار تھا۔ یہ اپنے بچوں کو دودھ پلاتا تھا، انھیں دشمن سے لڑنے اور بچنے کا سبق دیتا تھا، اور معلوم کس

کس چیز کے پڑھائی کے گھنٹے ہوتے ہوں گے! ان کی شکل صورت اور عادتیں بہت کچھ انسان سے ملتی جلتی تھیں۔ بہت سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہی گوریلا، یا بن مانس ترقی کرتے کرتے انسان بنا۔ جب سے آپ کی زمین پر پہلی جان دار چیز یہاں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے تین کروڑ ۶۰ لاکھ برس بعد تمام جان داروں کے سرتاج یعنی انسانوں کا ظہور ہوا۔

دنیا کے اونچے پہاڑ



وقت اور زندگی کی گھڑی

ہر گھنٹے کو ۳۰ لاکھ کے برابر سمجھو



زندگی کو شروع ہوئے گویا ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ سال بیت چکے ہیں ۔

زندگی شروع ہونے سے پہلے تقریباً اُتنا ہی وقت اور گزرا ہوگا ۔



کنگرو



کنگرو

آپ نے اپنے شہر کے عجائب گھر میں ایک عجیب و غریب
ہانور دیکھا ہوگا۔ کنگرو۔ یہ اسٹریلیا میں ہی پایا جاتا ہے۔ آئیے اس کی
کل و صورت کو زرا قریب سے دیکھیں۔

کنگرو اپنے دونوں پچھلی ٹانگوں اور دُم کے سہارے کھڑا ہو سکتا
ہے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی صاحب تین پائے کے
ٹول پر بیٹھے ہیں۔ دُم سے لے کر ناک تک اس کی لمبائی ۴ فٹ
.تی ہے۔ یہ کوئی ہلکا پھلکا جانور نہیں اس کا وزن ڈھائی من کے
یب ہوتا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کا تین چوتھائی وزن
م کے پچھلے حصّے میں ہی ہوتا ہے۔

کنگرو کے جسم کا اگلا حصہ جس طرح ہلکا ہوتا ہے اسی طرح اس
ہ اگلے دونوں پاؤں بھی چھوٹے اور ہلکے ہوتے ہیں۔ کنگرو اپنے اگلے

دونوں پاؤں کو انسانوں کی طرح استعمال کر سکتا ہے۔

کنگرو کا بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو صرف ایک انچ لمبا ہوتا ہے جیسے لال رنگ کا ایک چھوٹا سا کیڑا۔ اگر آپ دیکھیں تو کبھی بھی یقین نہ کریں گے کہ یہ اس کا بچہ بڑا ہو کر ایک خوبصورت کنگرو بن جائے گا۔ مادہ کنگرو اتنے چھوٹے اور کمزور بچے کی بہت حفاظت کرتی ہے۔ اس کے پیٹ میں ایک تھیلی ہوتی ہے جس کا منہ باہر کی طرف ہوتا ہے، وہ بچے کو اس تھیلی میں رکھ لیتی ہے وہیں وہ دودھ پیتا رہتا ہے اور بڑھتا رہتا ہے۔ شروع شروع میں تو وہ خود اپنے آپ دودھ بھی نہیں پی سکتا بلکہ اس کی ماں خود اس کے لئے دودھ نکالتی ہے اس طرح وہ چار مہینے تک اس تھیلی میں رہتا ہے۔ پھر بڑا ہونے پر وہ اس سے باہر بھی نکلنے لگتا ہے جب جی چاہا باہر نکلے، اچھلے کودے، کوئی خطرہ معلوم ہوتا ہے تو اس کی ماں فوراً اٹھا کر اپنی تھیلی میں رکھ لیتی ہے اور بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ یہ کنگرو بھی ہرن کی طرح بڑا چوکنا ہوتا ہے۔ زرا سی آہٹ ہوئی اور اس خطرے کی طرف کان کھڑے ہو گئے۔

کنگرو اپنی دُم اور پچھلی ٹانگوں کی مدد سے بڑی لمبی لمبی چھلانگ لگاتا ہے۔ بعض دفعہ پچیس پچیس فٹ تک چھلانگ لگا لیتا ہے۔ اور اٹھارہ اٹھارہ میل ایک سانس میں بھاگ سکتا ہے۔

مادہ کنگرو نر کنگرو کی بہ نسبت زیادہ بزدل ہوتی ہے وہ دشمن کو دیکھ کر بھاگ جایا کرتی ہے۔ کتا یا اس قسم کا کوئی اور جانور ان کا پیچھا کرے تو وہ اپنے بچاؤ کے لئے پانی میں گھس جاتا ہے۔ دشمن اگر پانی میں بھی آ جائے تو نر چھلانگ

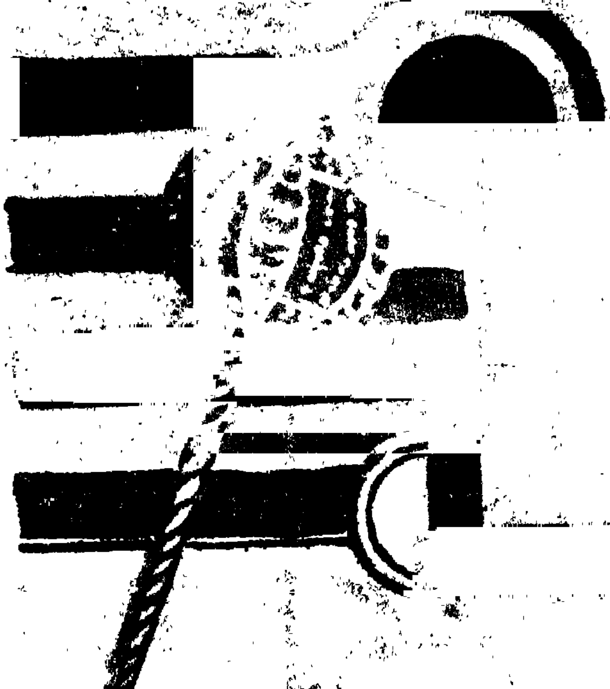
لگا کر اس کو جا دبوچتا ہے اور اسے اپنے اگلے ہاتھوں سے دبا کر پانی میں ڈبو دیتا ہے اور جب تک پانی میں گھٹ کر مر نہیں جاتا وہ اُسے پانی کے اندر دبائے رکھتا ہے۔ اگر اتفاق سے قریب میں پانی نہ ہو تو کسی پیڑ وغیرہ سے کمر لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور جیسے ہی دشمن قریب آتا ہے اپنے اگلے ہاتھوں سے پکڑ کر پچھلے پنجوں سے اتنے زور سے اگلے سر میں ٹھوکر مارتا ہے کہ ایک ہی وار میں کام تمام کر دیتا ہے۔

کنگرو عموماً دن میں آرام کرتے ہیں شام کے وقت کھانے کی تلاش میں نکلتے ہیں وہ گھاس اور چھوٹے چھوٹے پودے کھاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں کنگرو بہت قد آور تھا اس کے بعض ڈھانچے آسٹریلیا ہی میں نکلے ہیں جو موجودہ کنگرو سے قد میں دُگنے لمبے ہیں۔ ریحان احمد عباسی۔

دُنیا کے بڑے شہروں کی آبادی

لندن	(برطانیہ)	۸۲,۰۰,۰۰۰
نیویارک	(امریکہ)	۷۴,۵۵,۰۰۰
ٹوکیو	(جاپان)	۶۷,۸۰,۰۰۰
برلن	(جرمنی)	۴۳,۳۵,۰۰۰
ماسکو	(روس)	۴۱,۳۵,۰۰۰
شکاگو	(امریکہ)	۳۳,۹۵,۰۰۰
اوساکا	(جاپان)	۳۲,۵۵,۰۰۰
لینن گراڈ	(روس)	۳۱,۵۵,۰۰۰
پیرس	(فرانس)	۲۸,۳۰,۰۰۰



مہابھارت کی ایک کہانی

پُرانے زمانے میں ہستنا پور میں چندر بنسی راجا راج کرتے تھے ، اسی خاندان میں دھرت راشٹر اور پانڈو نام کے دو بھائی گذرے ہیں ، دھرت راشٹر پیدائشی اندھے تھے ، ان کے سو لڑکے تھے ، پانڈو کے پانچ لڑکے تھے ، ان کے نام تھے یدھشٹر ، ارجن ، بھیم ، نکل ، سہدیو ۔ ان دونوں خاندانوں میں ہستنا پور کے راج کے لئے لڑائی ہوئی پانڈو کے لڑکے پانڈو راج کا آدھا حصہ چاہتے تھے لیکن دھرت راشٹر کے کورو انھیں بغیر لڑائی لڑے سوئی کے ناکے کے برابر زمین دینے کے لئے تیار نہ تھے ، اسی بات کی وجہ سے زبردست جنگ ہوئی ۔ جو تاریخ میں مہابھارت کے نام سے مشہور ہے اس جنگ میں بھارت کے سبھی راجاؤں نے حصہ لیا تھا ۔ ان میں سے نہ جانے کتنے راجا مارے گئے ۔ کوروں کی فوج پانڈو سے بہت زیادہ تھی ۔ لیکن

کرشن جی پانڈوں کے ساتھ تھے۔ اور آخر میں کوروں کے سب ساتھی مارے گئے اور پانڈوں کی فتح ہوئی۔ یہ جنگ اٹھارہ دن تک ہوتی رہی، انھیں دنوں میں ایک مرتبہ ارجن کو کچھ عرصہ کے لئے باہر جانا پڑا۔ کوروں نے موقع پاکر "چکر دیوہ" کے طریقے سے پانڈوں کو بے بس کر دیا۔ "چکر دیوہ" ایک فوجی طریقہ تھا جس کے ذریعہ دشمن کی فوجوں کو اس طرح گھیر لیا جاتا تھا کہ اس کو بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملتا تھا اس کو توڑنے کا طریقہ صرف ارجن ہی جانتے تھے۔ کوروں نے سوچا کہ ارجن کے نہ ہونے پر پانڈوں کا کوئی بہادر اس "چکر دیوہ" کو نہ توڑ سکے گا اور جنگ میں ان کی فتح ہو جائے گی۔ پانڈوں نے یہ بات سن لی اور ان میں کھلبلی مچ گئی۔ سب سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ اس وقت ارجن کا سولہ سالہ لڑکا ابھیمنیو اٹھ کھڑا ہوا اس نے کہا "میں اس چکر میں جانے کیلئے تیار ہوں" یہ سن کر سب کو بہت تعجب ہوا اس نے سب کو بتایا کہ جب وہ پیدا بھی نہ ہوا تھا کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کو وہ طریقہ بتایا بس اس نے اس چکر کو توڑنے کا طریقہ سیکھ لیا۔

جب پانڈوں کا کوئی بھی آدمی اس چکر کو نہ توڑ سکا تو ابھیمنیو کے اصرار پر اس کو ہی بھیجا گیا۔ دشمن کی فوج میں پہنچ کر اس نے اپنے باپ کی طرح بہادری دکھائی۔ چکر کی حفاظت جے درتھ نامی ایک بہادر کر رہا تھا۔ ارجن کے علاوہ کوئی بھی اسکو ہرا نہ سکتا تھا۔ ابھیمنیو نے بہت دیر تک بہادری سے اس کا مقابلہ کیا۔ باری باری سے کوروں کے سب بہادر ابھیمنیو سے لڑنے لگے جب کوئی بھی اس بہادر لڑکے کو نہ ہرا سکا تو سب نے مل کر اس پر حملہ کیا سات بڑے بڑے بہادر چاروں طرف سے ابھیمنیو پر تیر چلا رہے تھے کچھ دیر میں ابھیمنیو کے رتھ کا گھوڑا

گرچہ اب وہ پیدل ہی جنگ کرنے لگا۔ آخرکار اس کے سارے ہتھیار ٹوٹ گئے پھر اس کے دشمن اس پر وار کرتے رہے۔ ابھیمنیو زمین پر گر پڑا مرتے مرتے اس نے کہا "اے کرشن بھگوان جہاں کہیں ہو میری بات سنو، دشمنوں نے مجھے ہتھیار ٹوٹنے پر دھوکے سے مارا ہے تم اس کا بدلہ ضرور لینا" اس طرح وہ بہادر لڑکا اپنی بہادری دکھا کر ہمیشہ کے لئے دنیا سے چلا گیا۔

تمکین چند

تین ہزار سال پہلے کی ایک ہندستانی کہانی

کہتے ہیں کہ ایک براہمن نے قربانی کرنے کے لئے ایک بکرا خریدا۔ پھر اسے اپنے کندھوں پر لٹکا کر اپنے گاؤں لے چلا۔ راستے میں اسے تین ٹھگوں نے دیکھا۔ ٹھگوں نے سوچا کہ کسی طرح اس بکرے کو اپنے قبضے میں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ برہمن کے راستے میں تھوڑی تھوڑی دور پر بیٹھ گئے۔ جب برہمن قریب آیا تو ایک ٹھگ آگے بڑھا اور برہمن سے بولا "بابا جی! یہ کتا آپ کہاں لے جا رہے ہیں؟"

براہمن نے کہا "نہیں، یہ بکرا ہے کتا نہیں!"

یہ کہہ کر براہمن آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دور پر ایک اور ٹھگ ملا۔ اس نے کہا "پروہت جی! آپ اور یہ کتا — کیا بات ہے؟"

براہمن نے کہا "نہیں یہ بکرا ہے" لیکن اب انھوں نے اسے کندھے سے اتار کر زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے کان پکڑ کر آگے لے چلے۔

ذرا سی دیر میں پھر ایک تیسرا ٹھگ ملا اور بولا "رام رام!! مہاراج۔ یہ کتا کہاں لے جا رہے ہیں؟"

اب تو براہمن سے نہ رہا گیا اور اس نے بکرے کو وہیں چھوڑ دیا۔

پھر تو ٹھگوں نے اسے اٹھا لیا اور چلتے بنے۔

ہماری سواریاں



ذرائع آمد و رفت کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ انسان کی عقل اور اس کی جد و جہد کی کہانی ہے۔

کہتے ہیں کہ ہزاروں لاکھوں برسوں تک آدمی کی سواری اس کے پیر ہی تھے لیکن جیسے جیسے اس کی ضرورت بڑھی اُس نے آنے جانے اور سامان لانے لے جانے کا کام جانوروں سے لینا شروع کیا۔ بہت دنوں تک وہ گھوڑوں، ہاتھیوں، بیلوں، خچروں، گدھوں اور اونٹوں سے کام لیتا رہا۔ آج بھی بعض ایسے علاقے ہیں جہاں آمد و رفت کے لئے آدمی کو ان ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وہ ان سے سواری اور سامان ڈھونے کا کام بھی لیتا رہا ہے۔

پھر انسان نے گاڑیاں بنائیں جن میں یہی جانور جوتے جانے لگے۔ اب پگڈنڈیوں اور راستوں کو چوڑا کیا گیا۔ آہستہ آہستہ یہ گاڑیاں اور بھی خوبصورت

ہوتی گئیں۔ ان گاڑیوں کو مختلف جگہوں میں مختلف جانور کھینچتے تھے۔ اس طرح گاڑیوں کے ذریعے وقت بھی بہت صرف ہوتا تھا اور زیادہ سامان نہ لے جایا جا سکتا تھا۔ راستے میں شیروں کا الگ ڈر۔

پھر ندی نالوں کو پار کرنے کے لئے پل بنانے پڑے اور ندیوں کے لئے کشتیاں۔

پہلے بڑے اور موٹے لٹھوں کو کھوکھلا کر کے کشتیاں بنائی گئیں اور اس کے بعد بادبانی کشتیاں جو ہوا کے بہاؤ کے ساتھ چلتی تھیں۔ نہ کہ دھارے کے بہاؤ کے ساتھ۔

ابھی تقریباً دو سو سال سے کچھ زیادہ وقت گزرا کہ انسان نے بھاپ کی طاقت کا اندازہ لگایا۔ انگلینڈ میں ایک شخص اسٹیفنسن نامی نے بھاپ سے انجن بنایا۔ ان انجنوں کو لوہے کی پٹریوں پر ڈبے کھینچنے کے لئے کام میں لگایا گیا اور اس طرح ۱۸۲۵ء میں پہلی ریل گاڑی [illegible] میں چلی۔ جب وہاں اس کام میں کامیابی ہوئی تو کم وقت میں آسانی سے کام ہونے لگا۔ اور زیادہ سے زیادہ مال بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے لگا۔

پہلے انجن اور ڈبے بہت سیدھے سادے ہوتے تھے اور گاڑیاں بھی اتنا تیز نہ چلتی تھیں۔ لیکن انجن اور ریل کے ڈبوں میں روز بروز ترقی ہوتی رہی۔ انجن، بڑے اور زیادہ طاقتور بننے لگے تاکہ خوب بوجھ کھینچ سکیں۔ ڈبے بھی ایسے بننے لگے جو زیادہ سے زیادہ آرام دہ ہوں۔ اور بعد میں تو اتنی ترقی ہوئی کہ انجن بھاپ کے علاوہ بجلی سے بھی چلنے لگے۔ ہمارے ملک میں بمبئی شہر کے آس پاس گاڑیاں بجلی سے بھی چلتی ہیں۔

اس کے علاوہ سڑکوں کی بھی مسلسل ترقی ہوتی رہی اور ان پر چلنے کے لئے گھوڑا گاڑیوں کے علاوہ بسیں اور موٹر گاڑیاں نکالی گئیں جو پٹرول سے چلتی

ہیں اور کافی تیزی سے سفر طے کرتی ہیں۔ پہلے کچی سڑکیں تھیں جو برسات اور پانی سے جلد خراب ہو جاتی تھیں۔ بعد میں کنکر اور روڑی ڈال کر ان کو مضبوط کیا جاتا تھا۔ لیکن ایسی سڑکیں بھی بھاری گاڑی کے چلنے سے خراب ہو جاتی تھیں۔ پھر بھی سینکڑوں سال تک اسی پر کام چلتا رہا۔ آدمی بھی اسی پر غور کرتا رہا کہ کسی طرح سڑکوں کو مضبوط اور چکنا بنایا جائے۔ آخر کار برطانیہ کے ایک انجینئر میکاڈمن نے تارکول سے پکی سڑکیں بنانے کی ترکیب ڈھونڈ نکالی۔ لیکن یہ بھی بہت مفید ثابت نہیں ہوئی۔ آخر انسان نے سیمنٹ کا پتہ لگایا اور اب ریت اور روڑی کو سمنٹ میں ملا کر ایک نئے قسم کا مسالا تیار کیا گیا۔ اس مسالے کو "کانکریٹ" کہتے ہیں۔ اس مسالے سے جو سڑک بنتی ہے وہ مضبوط بھی ہوتی ہے اور چکنی بھی۔ آج کل زیادہ تر سڑکیں اسی کی بنتی ہیں۔ سڑکوں کے ساتھ ساتھ پل بنانے کے کام میں بھی کافی اصلاح ہوئی اور اب تو اتنے مضبوط پل بنائے جاتے ہیں کہ آدمی دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک پل کلکتے میں ہاوڑا پل ہے۔ یہ پل ایشیا میں اپنی قسم کا ایک ہی پل ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ بیچ میں سہارا دینے کے لئے ایک بھی کھمبا نہیں ہے۔ یہ پل اتنا مضبوط ہے کہ اس پر گاڑی چالیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھی گذر سکتی ہے۔

زمین پر تو انسان نے اپنا کرتب دکھایا ہی ہے وہ سمندر میں بھی اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا رہا ہے۔

پہلے بادبان سے چلنے والے جہاز یا بڑی کشتیاں تھیں۔ لیکن ان میں مسلسل ترقی ہو رہی ہے۔ قطب نما کی دریافت کے بعد ان کے بھٹک جانے کا بھی ڈر نہیں رہا۔

بیسویں صدی کے شروع میں ایک بات اور ہوئی جہاز بھاپ سے

بدلے تیل سے چلایا جانے لگا۔ جہازوں کے لئے بڑے بڑے انجن بنائے گئے جیسے جیسے انجن بڑے ہوتے گئے، جہاز بھی بڑے بننے لگے۔ آدمی تو اس میں زیادہ آتے ہی ہیں۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ ان جہازوں میں آرام کی تمام چیزیں اکٹھا کر دی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں پورا شہر بسا دیا گیا ہے۔

اب بجلی سے چلنے والے جہاز بھی بننے لگے ہیں یہ بجلی یا تو بھاپ سے تیار کی جاتی ہے یا تیل سے۔

انسان نے پانی سے آگے بڑھ کر آسمان کی طرف بھی توجہ دی۔ آسمان پر اڑنے کا شوق بڑا پرانا ہے۔ اب سے سوا سو سال پہلے ایک آدمی غبارے سے اڑا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ آدمی ہوا میں بھی اڑ سکتا ہے۔ اب آدمی سوچنے لگا کہ آخر وہ کیسے اُڑے۔ اب ہوائی جہاز کی ایجاد ہوئی۔ ہوائی جہاز پٹرول سے چلتے ہیں۔ یہ جہاز اکثر چار سو پانچ سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اُڑتے ہیں۔ لیکن ایسے ہوائی جہاز بھی بنائے گئے ہیں جو ڈیڑھ سکنڈ فی میل کے حساب سے اُڑ سکتے ہیں۔

اس تیز چلنے والی سواریوں سے جہاں یہ فائدہ ہوا ہے کہ لوگ بہت جلد ادھر سے اُدھر جا سکتے ہیں۔ وہاں ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ ڈاک آنے جانے میں بڑی سہولت ہو گئی ہے۔

لیکن ابھی بس نہیں انسان اس فکر میں ہے کہ اس دنیا سے بھی آگے کی سیر کرے۔ چنانچہ اب ایسے جہاز بنائے جا رہے ہیں جو شاید منٹوں کا فاصلہ سکنڈوں میں طے کریں، اور پھر انسان وہ کچھ کر دکھائے جسے آج تک ناممکن سمجھا جاتا رہا ہے۔



"بنایا ہے چڑیوں نے جو گھونسلا



میں نے اپنے کمرے کے دروازے پر ایک چھوٹا سا بکس لٹکا رکھا تھا۔ ڈاکیہ میرے خطوط اسی بکس میں ڈال جایا کرتا۔ دوپہر کے وقت اور شام کو میں اس بکس کو کھولتا۔ ایک دن عجیب اتفاق ہوا شام کے ۴ بجے ہوں گے۔ میں نے بکس کھولا اور عادت کے مطابق بغیر دیکھے اس میں ہاتھ ڈال دیا۔ ایک خط میرے ہاتھ میں آگیا لیکن کچھ اور بھی تھا۔ چند تنکے۔ یہ بات نئی تھی۔ میں نے بکس صاف کر کے بند کر دیا اور سوچتا رہا کہ یہ شرارت کس بچے کی ہو سکتی ہے۔ میرا خیال اپنے نئے پڑوسی کے لڑکے کی طرف گیا۔ "یہ اسی کی حرکت ہو گی"۔ میں نے اپنے آپ کو اطمینان دلاتے ہوئے بکسے کے کواڑ بند کر دیے۔

ان دنوں گرمی کے موسم کی ابتدا ہو رہی تھی۔ بسنت کو گزرے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے خوشنما پھولوں کا موسم تھا۔ رات کو تو اچھی خاصی ٹھنڈ ہو جاتی لیکن دن کے وقت گرم کپڑے پہن کر دھوپ میں کھڑا رہنا ناگوار ہوتا تھا۔ دوسرے دن صبح کو ۸ بجے قریب میں اپنی ڈاک دیکھنے کے لئے کمرے کے دروازے پر آیا۔ جوں ہی میں نے کواڑ کھولے

دو چڑیاں "پھر" کرتی ہوئی میرے سر کے اوپر سے نکل گئیں اور کوئی چیز مجھے اپنے اوپر گرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا چند رسّی کے پتلے پتلے ریشوں کا ایک گچھا میرے بائیں کندھے سے لڑھک کر زمین پر آ گیا تھا۔ اس گچھے پر میں نے اچٹتی ہوئی سی نگاہ ڈالی۔ اسی لمحے وہ ہوا کے زور سے آگے بڑھ گیا۔ اور یوں ہی میرا ہاتھ اُٹھ گیا پہلے میں نے اپنے اُلٹے شانے کے قریب قمیض کو ذرا جھٹکا اور پھر قدم بڑھا کر بکس کھولنے لگا۔ آج تو کافی مقدار میں تنکے، چند ڈورے کے ٹکڑے اور دو چار پتلی پتلی لکڑیاں اس کے اندر موجود تھیں۔ میں نے اس سب کوڑے کو ایک جھنجھلاہٹ کے ساتھ باہر نکالا۔ جس کے ساتھ دو چار پر بھی نیچے گرے۔ اس وقت کوئی خط نہ تھا۔ دفعتاً میری نگاہ اوپر اُٹھ گئی۔ میرے سر کے اوپر روشن دان میں دو چڑیاں بیٹھی ہوئی "چوں چوں" کر رہی تھیں اب بات بالکل صاف تھی۔ میں نے کواڑ بند کرتے ہوئے سوچا۔ یہ چڑیاں کیسی بے وقوف ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی گھونسلا بنانے کی جگہ ہے۔ ان کا گھونسلا ہرگز یہاں نہیں بن سکتا۔

شام کو پھر میں خطوں کی تلاش میں بستر سے اُٹھا۔ جیسے ہی میں نے کمرے کے کواڑ کھولے ایک چڑیا بکس کے اندر سے پھڑ پھڑا کر خط ڈالنے والی دراز سے نکلی اور روشن دان میں جا بیٹھی۔ بکس کھولتے ہی چند تنکے زمین پر گرے اور میں نے دیکھا بہت سے تنکوں کے درمیان میرے دو لفافے اندر پڑے ہیں۔ میں نے لفافے اپنی قمیض سے پونچھتے ہوئے جیب میں رکھ لیے اور بکس کو اچھی طرح صاف کرکے بند کر دیا۔ اتنی سی دیر میں دو دفعہ وہ چڑیا میرے سر پر سے گزری اور بکس کے قریب آ آ کر لوٹ گئی۔ میں نے کمرہ بند کرتے ہوئے دیکھا کہ ایک چڑیا میری کھڑکی کے کواڑ پر بیٹھی ہے۔ اس کی چونچ میں ایک بڑی سی جھاڑو کی سینک تھی۔ میری آہٹ پا کر وہ چڑیا اُڑی اور سینک نیچے گر پڑی۔ مجھے اس چڑیا پر بڑا ترس آیا۔ میں اپنے خطوط کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے لگا لیکن کئی بار میرا دھیان اُچٹ اُچٹ گیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ "چوں چوں" اور پھڑ پھڑ سنائی دیتی۔

باہر لگے ہوئے لکڑی کے بکس پر کئی دفعہ "کھٹ
کھٹ" بھی ہوئی۔ خطوط پڑھنے کے بعد میں نے
ایک سگرٹ سُلگائی اور ان چڑیوں کے متعلق
آپ ہی آپ ذہن میں خیالات آنے لگے!

آج کل یہ چڑیاں بڑا پریشان کرتی ہیں
اور کوڑا بھی کرتی ہیں۔ انھیں کام کرنے کی قطعی
تمیز نہیں۔ بے کار محنت کیا کرتی ہیں۔ بہت
بے وقوف ہوتی ہیں......"

دوسرے دن اتوار تھا۔ میں صبح سویرے
اُٹھ کر اپنے ایک دوست سے ملاقات کرنے
چلا گیا۔ میرے یہ دوست ایک گاؤں میں رہتے
تھے۔ یہ گاؤں میرے مکان سے چھ میل پر تھا۔
میں سائیکل پر گیا۔ اس دفعہ پورے دو مہینے کے
بعد ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے رنجیدہ سے
نظر آئے۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ
پچھلے مہینے اُن کے نئے مکان میں کسی نے آگ
لگا دی اور چھپّر، کواڑ سب کچھ جل گیا۔ دوپہر کا
کھانا کھانے کے بعد میں اُس مکان کو دیکھنے
گیا۔ واقعی نہ کوئی کواڑ بچا تھا اور نہ چھپّر کے
نام کا ایک تنکا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ یوں تو جس
مکان میں وہ رہتے تھے کافی بڑا تھا اور آرام دہ۔
لیکن یہ مکان اُنھوں نے بڑے شوق سے بنوایا
تھا کہ اُن کے شہری دوست آرام سے ٹھہر سکیں۔
مجھے مکان دکھا کر اُن کا دل کچھ اور بھر آیا۔ کہنے
لگے: "بھائی، دل کی تمنّا دل ہی میں رہ گئی۔
میری محنت مٹّی میں مل گئی۔ اب ہمت نہیں کہ دوبارہ
چھپّر ڈلواؤں اور کواڑ لگواؤں۔ پانچ سو روپے
سے زائد کا خرچ ہے۔ افسوس! کیا کروں قسمت
ہی خراب ہے۔" میں نے اُنھیں دلاسا دیا اور
جلدی سے وہاں سے لوٹ پڑا تاکہ اُن کا خیال
اُس مکان کی طرف سے ہٹ جائے۔

دن چھپنے سے کچھ پہلے ہی میں وہاں سے
واپس آگیا اور راستے میں اُس مکان کا خیال
بار بار مجھے ستاتا رہا۔

پیر کو ۱۱ بجے کے قریب میں نے خطوط نکالنے
کے لیے بکس کھولا۔ اور حیران رہ گیا۔ آدھے سے
زائد بکس میں تنکے۔ پتّے۔ رسّی کے ریشے اور
اسی قسم کی دوسری چیزیں بھری پڑی تھیں۔
چند تنکے تو بے شک نیچے گرے مگر باقی یوں ہی
رکھے رہے۔ اب تو باقاعدہ گھونسلا بن گیا تھا۔
میں نے اوپر سے اپنا خط اُٹھا لیا اور چاہا کہ
اُس گھونسلے کو گرا دوں مگر نہ معلوم کون سی طاقت

تھی جس نے میرا ہاتھ روک دیا۔ میرے بالکل قریب ہی کھڑکی پر دو ننھی چڑیاں بیٹھی ہوئی زور زور سے "چوں چوں" کر رہی تھیں۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ بڑی بے چین ہیں۔ ایک چڑیا کی چونچ سے ایک چھوٹا سا تنکا میرے سامنے نیچے گرا اور وہ بے دھڑک ذرا ہی اُسے اٹھانے زمین پر آ گئی۔ میں چڑیوں کی اس "چوں چوں" سے مرعوب سا ہو گیا۔ بغیر سوچے ہوئے میں نے بکس کا ڈھکنا بند کر دیا اور کمرے میں چلا گیا۔ اس وقت میں نے ان پرندوں کی طرف سے اپنے دل میں ایک تعظیم کا جذبہ محسوس کیا۔

ولی بخش قادری

ایک دلچسپ کھیل

گلاس میں موم بتی جلانا

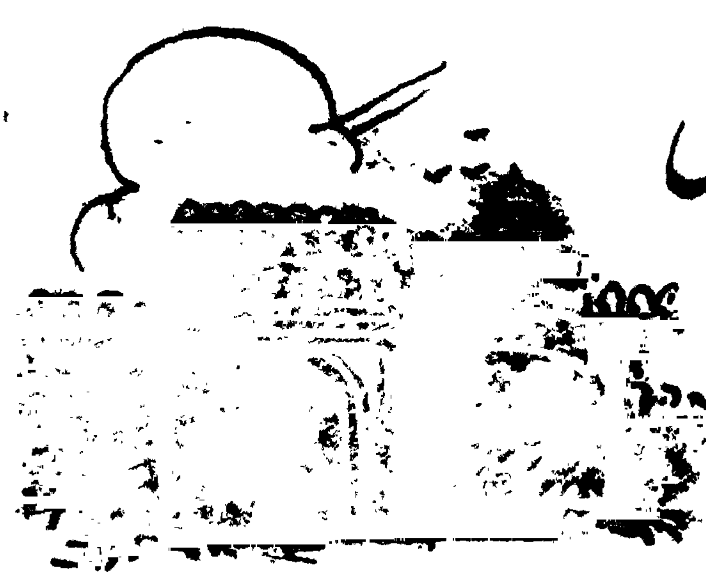
اگر آپ کسی سے یہ کہیں کہ آپ پانی کے گلاس میں موم بتی جلا سکتے ہیں تو شاید وہ ہنسے اور یہ سمجھے کہ آپ مذاق کرتے ہیں۔ لیکن آپ سچ مچ پانی کے گلاس میں موم بتی جلا سکتے ہیں۔ آیئے ہم آپ کو اسکی ترکیب بتائیں۔

ایک گلاس میں اتنا پانی لیجئے کہ گلاس کا ایک چوتھائی حصّہ خالی رہے۔ اب آپ موم بتی کا ایک ٹکڑا لیجئے اور موم بتی کے نچھلے حصّے میں ایک کیل گاڑ دیجئے۔ کیل کا کچھ حصّہ باہر رہے لیکن کیل زیادہ بھاری نہ لیجئے کہ موم بتی اس کے بوجھ سے پانی کی تہ میں بیٹھ جائے۔ بلکہ موم بتی کا اوپری حصّہ آدھے انچ کے برابر پانی کی سطح کے اوپر رہے اب آپ دیا سلائی سے بتی جلا دیجئے۔

آپ دیکھیں گے کہ موم بتی آخیر تک جلے گی۔

لیکن اس کا خیال رکھئے کہ گلاس ہلنے جلنے نہ پائے ورنہ پانی کے چھینٹوں سے موم بتی بجھ جائے گی۔ جیسے جیسے بتی جلتی اور چھوٹی ہوتی جائے گی وہ سطح کے اوپر آتی جائے گی۔ یہاں تک کہ آخر سرے تک جلے گی۔

جب ہوا تیز چلتی ہو تو آپ اس طرح گھر میں موم بتی جلا سکتے ہیں۔ کتنی ہی تیز ہوا ہو موم بتی کبھی نہیں بجھ سکتی۔



گولکنڈے کی تاریخی سیر

حیدرآباد کو تاریخی یادگاروں کے اعتبار سے ہندوستان بھر میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہاں جگہ جگہ پتھر کے زمانے (STONE AGE) سے یادگاروں کا ایک سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ یہ آثار، یہ یادگاریں ہماری قومی میراث ہیں، ہماری تاریخ کا قیمتی خزانہ ہیں، ان سے ہمیں اپنے ملک کی ہر زمانے کی تہذیب، تمدن اور طرز تعمیر کا پتہ چلتا ہے۔

ہمارے ملک کے مشرقی حصے میں پتھر کے زمانے کی چند نشانیوں کے علاوہ مدور پتھروں کے سرداب (تہہ زمین قبریں) ایک ڈال کی ستون نما قبروں کے نشان مسکی ضلع رائچور میں اشوک کی لاٹ، پھر اجنتا کی تصویریں، ایلورا کی مورتیں، ہنم کنڈا کا ہزار کھمبا یا ہزار ستون دیول، اسمبہ جرگاؤں اور تھا پور کے مندر عالم پورہ، انگی، پالم پیٹھ وغیرہ میں تاریخی عمارتیں، پٹن کے پرانے کھنڈر، الوم [illegible] کریم نگر کے دبے ہوئے مندر، ہندو تہذیب کے آثار ہیں اور ہندو

تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اور پھر دولت آباد، خلد آباد، گلبرگہ، گولکنڈہ اور حیدرآباد وغیرہ میں مسلمان عہد کی یادگاریں۔ ان میں سے اکثر اب تک سلامت ہیں۔ گولکنڈہ تو خصوصاً تاریخی عمارتوں سے مالا مال ہے۔

یہ شہر کسی زمانے میں قطب شاہی خاندان کا دارالسلطنت تھا۔ اسے قلعہ کیا گڑھی کہنا چاہیئے۔ ورنگل کے راجا دیو رائے کے بزرگوں نے اسے بنوایا تھا۔ اس وقت آس پاس کے علاقے میں اسے بہت اہمیت حاصل تھی۔ منکل قلعہ کے نام سے مشہور ہے۔

دیو رائے نے یہ قلعہ بہمنی بادشاہ کے سپرد کر دیا تھا۔ پھر قطب شاہی خاندان کے قبضے میں آ گیا۔ اس خاندان کا بانی، قلی قطب سلطان محمد شاہ بہمنی کی طرف سے تلنگانہ کا صوبے دار تھا۔ اس بادشاہ کے مرنے پر بہمنی سلطنت کم زور پڑی۔ بہت سے صوبے دار خود مختاری کے خواب دیکھنے لگے۔ تلنگانہ کے صوبے دار نے بھی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی۔ تلنگانہ کا بادشاہ بن بیٹھا اور گولکنڈا کو دارالسلطنت بنایا۔

سلطان قلی قطب شاہ ترکمان نسل سے تھا۔ ہمدان میں پیدا ہوا تھا۔ سلطان محمد شاہ بہمنی کے زمانے میں دکن آیا۔ یہاں بہمنی سرکار میں اس کی رسائی ہو گئی اور ترقی کرتے کرتے تلنگانہ کا صوبے دار اور محمد شاہ کے مرنے پر یہاں کا بادشاہ بن گیا۔ گولکنڈا اسی نے آباد کیا اس نے اس علاقے میں ۴۴ سال حکومت کی۔ عمارتیں بنوانے کا اسے خاص شوق تھا۔ گولکنڈے میں اس نے اچھی اچھی عمارتیں بنوائیں۔ طرز تعمیر اس کا اپنا تھا۔ اس نے ہندی، ایرانی اور پٹھان طرز تعمیر کو بڑی خوبی سے ایک دوسرے میں سمو دیا تھا۔ گولکنڈے اور حیدرآباد کی عمارتوں کو غور سے دیکھیے ان میں ایرانی طرز تعمیر کی نفاست اور چابک دستی ایرانی شوکت و شباہت بعد ہندی طرز تعمیر کا حسن جھلکتا نظر آئیگا۔

اس کے جانشینوں نے بھی اسی انداز کی عمارتیں بنوائیں۔ اسی لئے یہ قطب شاہی طرز تعمیر کہلاتا ہے

اچھا آیئے پہلے قلعے کی سیر کریں۔ بہت سی سیڑھیاں طے کرنا پڑیں گی۔ قلعہ چار سو فٹ کی اونچائی پر ہے۔ ہم فتح دروازے سے چلیں گے۔ مغلوں کی فوج گولکنڈہ کو فتح کرتے وقت اسی دروازے سے داخل ہوئی تھی۔ یہ نام مغل شہنشاہ اورنگ زیب کا رکھا ہوا ہے۔ ویسے سات دروازے اور ہیں۔ مگر اب آمد و رفت اسی دروازے سے ہوتی ہے۔ دیکھئے شاہی محل، امراء اور فوج کی قیام گاہیں، مسجدیں، ماونا مندر، بارود کے دستے۔ سلاح خانے، بازار وغیرہ اسی دروازے سے ملحق ہیں۔

یہ ان میں ماونا مندر۔ جامع مسجد اور دو منزلہ شاہی بارہ دری کل تین عمارتیں محفوظ حالت میں ہیں باقی کھنڈر ہو چکی ہیں۔ بارہ دری کتنی خوب صورت کتنی شاندار ہے۔ اس کے ایک کونے میں غار نما جو راستہ ہے، کہتے ہیں یہ گوشہ محل تک چلا گیا ہے۔ خاص خاص موقعوں پر شاہی آمد و رفت گوشہ محل تک اسی راستے سے ہوتی تھی۔ یہ محل یہاں سے پانچ میل ہے۔ ماونا مندر غالباً ورنگل کے راجاؤں کا بنوایا ہوا ہے۔ قطب شاہی زمانے میں ماونا وزیر اور دوسرے ہندو امیر امراء اس میں پوجا پاٹ کرتے تھے۔ اسی لئے اسے خاص طور پر محفوظ رکھا گیا۔ قطب شاہی خاندان مذہب کے معاملے میں بہت روادار اور فراغ دل تھا۔

جامع مسجد سلطان قلی قطب شاہ نے اپنی صوبے داری کے زمانے میں بنوائی تھی۔ مسجد میں ایک ہی بڑا دالان ہے۔ اس میں چار در اور پانچ کمانیں ہیں اس مسجد کی تاریخی اہمیت ایک خاص وجہ سے بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کا بانی قطب قلی شاہ اپنے ولی عہد جمشید قطب شاہ کے اشارے سے اسی مسجد میں قتل کیا گیا۔ یہ اس وقت سجدے میں تھا۔

اس کی فصیل پہلے مٹی کی تھی۔ اس خاندان کے چوتھے بادشاہ ابراہیم قطب شاہ نے اسے پتھر اور گچ سے پختہ کرایا۔ پر اب یہ بھی جگہ جگہ سے ٹوٹی پڑی ہے۔ قلعے کا حصار چار میل لمبا ہے اندر لق و دق میدان ہے۔ کہتے ہیں خطرے کے وقت شہر کی آبادی کا زیادہ تر حصہ اس میں سما جاتا تھا۔ میدان میں کھیتی باڑی بھی ہوتی تھی۔

اُن وقتوں میں یہاں کیسی بہار کیسی رونق کیسی چہل پہل رہتی ہوگی پر اب تو سوائے ان تین عمارتوں کے ہر طرف کھنڈر ہی کھنڈر ہے، یا کھلا میدان اور بس اللہ کا نام۔ فتح دروازے کے علاوہ مکہ دروازہ بھی اچھی حالت میں ہے۔ اور بہت مضبوط بنا ہوا ہے۔ اس کا رُخ مکے کی طرف ہے اسی لئے مکہ دروازہ کہلاتا ہے۔

قلعہ تو دیکھ لیا اب ذرا گنبد (مقبرے) بھی دیکھتے چلیں۔ یہ سامنے تو ہیں۔ قلعے سے زیادہ سے زیادہ ایک ہزار فٹ دور ہوں گے۔ دیکھئے یہاں سے یہ کتنے اچھے لگتے ہیں۔ قطب شاہی سلاطین کا ایک دستور عجیب تھا۔ اپنے مقبرے اپنی زندگی میں بنوا لیتے تھے۔ اور انہی میں دفن ہوتے تھے نہ جانے کیوں، یہ گنبد یا مقبرے لوگوں میں بہت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے بہت متبرک سمجھے جاتے تھے بڑے سے بڑے مجرم کو ان میں پناہ لینے کے بعد امان مل جاتی تھی۔

بادشاہی زمانے میں یہ فرش فروش اور جھاڑ فانوس سے آراستہ رہتے تھے قبروں کے سرہانے قرآن شریف رکھے رہتے تھے۔ قرآن خوانی کے لئے قرآن خواں، اور حافظ مقرر تھے۔ ایسے ویسے اور معمولی آدمی کی تو یہاں تک پہنچ بھی مشکل تھی۔ یہ جگہ اس وقت لنگر فیض کے اثر کے نام سے مشہور تھی۔ شام کو چار بجے یہاں محتاجوں اور فقیروں کو کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ پر اب اس کا نام گنبد ہی پڑ گیا ہے۔ جیسے دلی میں صفدر جنگ کا مزار مقبرہ کہلاتا ہے۔

ان مقبروں میں سے اکثر اچھی حالت میں ہیں ۔ اور بہت خوب صورت ہیں۔ پانچواں بادشاہ قطب قلی شاہ کا مقبرہ سب سے بڑا اور سب سے شاندار ہے ۔ چوکور چبوترے پر بنا ہے چبوترے کا ہر ضلع لمبائی میں دو سو فٹ ہے ۔ اس کا گنبد بھی بہت بڑا ہے ۔ غالباً مقبرہ ہمایوں کے گنبد کے بعد اسی کا نمبر ہے ۔ اگرچہ ان دونوں کے طرز تعمیر میں بہت فرق ہے ۔

اس بادشاہ کے زمانے میں قطب شاہی حکومت بہت ترقی پر تھی ۔ قطب قلی شاہ کو عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا ۔ حیدرآباد اسی نے آباد کیا ہے ۔ اس کی بیوی بھاگ متی اسی طرف کسی گاؤں کی رہنے والی تھی ۔ اسی بھاگ متی کی بدولت اس زمین کے بھاگ جاگے ۔ چار مینار، چار کمان، جامع مسجد دارالشفا وغیرہ عمارتیں اسی کی بنوائی ہوئی ہیں ۔

اس مقبرے کے مقابل ایک حمام ہے ۔ مگر زندوں کے لئے نہیں مردوں کے لئے سلطان قلی قطب اوّل نے اسے تعمیر کرایا تھا ۔ شاہی خاندان کی میتوں کو غسل دینے کے لئے ۔ یہ ایرانی حماموں کا بہت عمدہ نمونہ ہے مگر زیادہ اچھی حالت میں نہیں ۔

چھٹے بادشاہ سلطان محمد قطب قلی شاہ کے مقبرے کے بعد اسی کا نمبر ہے ۔

چوتھے بادشاہ سلطان ابراہیم قلی شاہ کے مقبرے کا نمبر تیسرا ہے ۔ یہ بڑا اولوالعزم، بہادر اور بیدار مغز بادشاہ گذرا ہے ۔ اس کے زمانے میں مسجدیں مسافر خانے، شفا خانے، تالاب بکثرت تعمیر ہوئے، باغ لگانے کا بھی شوق تھا ۔ بہت دریا دل اور مخیّر تھا ، تجارتی مال پر چنگی یا ٹیکس معاف کر دیا تھا ۔ اس کا مقبرہ بھی ایک مربع چبوترے پر ہے اور اس کا ہر ضلع ۱۱۷ فٹ ہے گنبد گول بہت خوب صورت بہت شاندار ہے ۔

سلطان قلی قطب اوّل کا مقبرہ بھی
چوکور چبوترے پر ہے اس کا ہر ضلع
۱۰۰ فٹ ہے۔ اندر سے دیواریں ہشت
پہل ہیں۔ کمرے کا ہر ضلع ۲۲ فٹ
دس انچ ہے۔ اوپر گول گنبد۔ باہر
سے چبوترے کی مناسبت سے عمارت
چوکور نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ اور
بھی کئی مقبرے ہیں۔

ہاں ایک مقبرہ نامکمل یا ناتمام
بھی ہے۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ
ابوالحسن تانا شاہ خاندانی روایات کے
مطابق اپنی زندگی میں اپنا مقبرہ بنوا
رہا تھا۔ مگر مغلوں سے لڑائی چھڑ گئی۔
اور اسے مکمل کرنے کی مہلت نہ
ملی۔ اورنگ زیب کی فوجوں کی فتح
ہوئی تانا شاہ گرفتار کر لیا گیا بے
چارے کی قبر بھی دوسری جگہ بنی۔

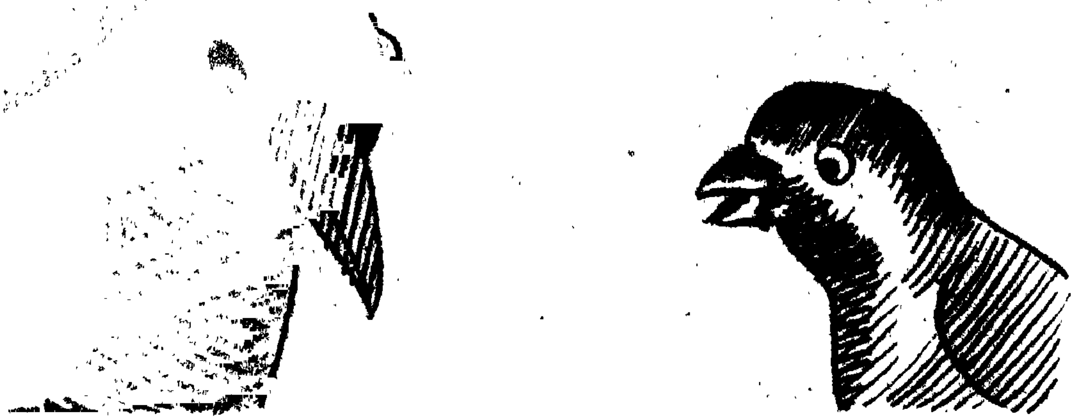
گولکنڈہ دہلی کی طرح تاریخی یادگاروں
کا شہر ہے۔ قلعے میں قلعے کے آس
پاس شہر میں شہر سے باہر جگہ جگہ
آپ کو یہ یادگاریں نظر آئیں گی۔
ان میں نو محل، مسجد کلاں، مکہ دروازہ
ہیرا مسجد، موسیٰ برج وغیرہ بہت اچھی
حالت میں ہیں۔ ان عمارتوں کی ایک
امتیازی چیز ان کے کتبے ہیں۔ یہ
کتبے اس زمانے کے مشہور خوش نویسوں
اور خطاطوں کے مہارت فن کا نمونہ
ہیں۔

یہ یادگاریں، یہ شان دار مقبرے
یہ ٹوٹے پھوٹے کھنڈر قطب شاہی
عظمت و جلال کی منہ بولتی تصویریں
ہیں۔ ان کی مدد سے آپ اُس
زمانے کی تاریخ کا بہت کچھ مواد
فراہم کر سکتے ہیں۔

لطیفہ

مالک۔ نالائق میری گھنٹی بجانے پر کیوں نہیں آیا۔
ملازم۔ حضور میں نے گھنٹی نہیں سنی۔
مالک۔ (غصے سے) اگر گھنٹی کی آواز نہیں سنائی
دی تو بتایا کیوں نہیں؟ پھر بجا دیتا۔

چالاک دوست



ایک گوریّا اور کوّے میں بڑی دوستی تھی۔ ایک دن کوّے نے کہا "بہن آؤ ہم تم مل کر کھیتی باڑی کریں۔ جو کچھ غلّہ پیدا ہو، وہ آدھا آدھا آپس میں بانٹ لیں۔ گوریّا کو کوّے کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔

اب گوریّا نے اپنا کام شروع کر دیا اور دو ایک روز کے بعد کوّے سے کہا "آؤ بھائی اب تم بھی اس کام میں لگ جاؤ۔

کوّے نے کہا "تم کئے جاؤ، میں زرا کھا پی لوں تو اپنا کام شروع کروں، تم کرتی رہو مجھے زرا دیر لگے گی۔"

گوریّا نے کوّے کی بات پر بھروسا کر لیا اور خود اپنے کام میں لگ گئی۔ اس نے ہل جوتنا شروع کر دیا اور کچھ دن کے اندر ساری زمین ٹھیک ٹھاک کر لی۔ اس نے جب ہل جوتنے کا کام ختم کر دیا تو پھر کوّے سے کہا "بھائی کوّے تم نے ساری زمین جوت لی، اب آؤ دونوں مل کر اسے بو ڈالیں۔"

کوّے نے پھر پہلے کی طرح ٹالتے ہوئے کہا "تم اپنا کام کئے جاؤ مجھے جیسے ہی فرصت ملی میں زرا سی دیر میں سارا کام کر ڈالوں گا"

گوریا نے پھر اس کی بات مان لی اور اپنے کام میں لگ گئی۔ لیکن کوا پھر بھی نہ آیا۔ آخر کچھ دنوں کے بعد بوائی کا کام بھی ختم ہو گیا۔ اور گوریا نے کھیت میں سینچائی شروع کر دی۔ سینچائی کے کام میں بھی کوّے نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ اس نے یہ کام بھی اکیلے ہی کیا۔

کوا بہت چالاک تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ گوریا بیچاری سارا کام خود ہی کرلے۔ وہ تو بس شام کو تھوڑی دیر ٹہل کر اور کائیں کائیں کر کے چلا جاتا تھا۔

یہاں تک کہ کٹائی کا وقت بھی آ گیا اور گوریا نے کوّے سے کہا "ارے بھائی اب تو کٹائی کا وقت بھی آ گیا تم کٹائی میں ہی میری مدد کرو"

کوّے نے پھر وہی جواب دیا "تم اپنا کام کرتی رہو، مجھے جیسے ہی فرصت ملے گی، میں اپنا کام زرا سی دیر میں ختم کردوں گی"

آخر کٹائی کا کام بھی ختم ہو گیا اور جب گوریا غلّے سے بھوسی الگ کرنے لگی تو کوا آ موجود ہوا اور اس نے اپنے حصّے کی بھوسی الگ کر دی اور کہا "یہ میرا حصّہ ہے"

بیچاری گوریا سیدھی سادی تو تھی ہی۔ وہ کوّے کے سامنے کچھ نہ بولی اور اس نے خوشی خوشی آدھا غلّہ اُسے دیدیا۔ اور اپنا غلّہ لے جا کر اپنے گھونسلے میں رکھ دیا۔ کوّے کے پاس تو کوئی گھونسلا تھا نہیں، اس نے اپنا غلّہ وہیں پڑا رہنے دیا۔

جب بارش کا موسم آیا اور خوب زور کی بارش ہوئی تو کوّے کے حصّے کا سارا غلّہ بہہ گیا اور گوریا بڑے اطمینان سے اپنے گھونسلے میں بیٹھی رہی اور کوّے میاں پیڑ پر بیٹھے بھیگتے رہے اور کائیں کائیں کرتے رہے۔

محمد آفاق



نادان دوست

(منشی پریم چند اردو کے بہت اچھے افسانے لکھنے والے تھے ۔ وہ اپنے افسانوں میں لوگوں کی روزمرہ کی زندگی کی باتیں لکھا کرتے ہیں اس لئے جو چیز لکھتے ہیں دل میں اتر جاتی ہے ۔ اس افسانے میں انہوں نے ایک بھائی بہن کا قصہ بیان کیا ہے ۔ جنہوں نے اپنے خیال میں اپنی پیاری چڑیا کے ساتھ محبت کا سلوک کیا تھا لیکن اپنی بے وقوفی کی وجہ سے اس بیچاری کو تکلیف پہنچائی)

کیشو کے گھر میں ایک کارنس کے اوپر ایک چڑیا نے انڈے دیئے تھے ۔ کیشو اور اس کی بہن شیاما دونوں نے بڑے غور سے چڑیا کو وہاں آتے جاتے دیکھا سویرے دونوں آنکھیں ملتے کارنس کے سامنے پہنچ جاتے اور چڑیا اور چڑا دونوں کو وہاں بیٹھا پاتے ۔ ان کو دیکھنے میں دونوں بچوں کو نہ معلوم کیا مزا ملتا تھا ۔ دودھ اور جلیبی کی سدھ بھی نہ رہتی تھی ۔ دونوں کے دل میں طرح

طرح کے سوال اُٹھتے۔ انڈے کتنے بڑے ہوں گے؟ کس رنگ کے ہوں گے؟ کتنے ہوں گے کیا کھاتے ہوں گے؟ ان میں سے بچے کس طرح نکلیں گے؟ بچوں کے پَر کیسے نکلیں گے؟ گھونسلا کیا ہے؟

لیکن ان باتوں کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ نہ امّاں کو گھر کے کام دھندے سے فرصت تھی نہ بابوجی کو پڑھنے لکھنے سے، دونوں بچے آپس میں سوال و جواب کرکے اپنے دل کو تسلّی دے لیا کرتے تھے۔ شیاما کہتی "کیوں بھیّا! بچے نکل کر پھُر سے اُڑ جائیں گے"۔

کیشو عالمانہ غرور سے کہتا ہے "نہیں ری پگلی، پہلے پَر نکلیں گے۔ بغیر پَروں کے بے چارے کیسے اُڑیں گے؟"

شیاما۔ بچوں کو کیا کھلائے گی بے چاری؟

کیشو! اس پیچیدہ سوال کا جواب کچھ نہ دے سکتا تھا۔ اس طرح تین چار دن گذر گئے۔ دونوں بچوں کی تحرا شرے تحقیقات دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ انڈوں کے دیکھنے کے لئے وہ بیتاب ہوئے جاتے تھے۔ انہوں نے قیاس کیا اب بچے ضرور نکل آئے ہونگے بچوں کے چارے کا سوال اب ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔ چڑیا بے چاری اتنا دانا کہاں پائے گی جو سارے بچوں کا پیٹ بھرے۔ غریب بچے بھوک کے مارے چوں چوں کرکے مر جائیں گے۔

اس مصیبت کا اندازہ کرکے دونوں گھبرا اٹھے دونوں نے فیصلہ کیا کہ کارنس پر تھوڑا سا دانا رکھ دیا جائے۔ شیاما خوش ہوکر بولی۔ "تب تو چڑیا کو چارے کے لئے کہیں اُڑ کر نہ جانا پڑے گا"۔

کیشو! نہیں تب کیوں جائے گی؟

شیاما! کیوں بھیّا۔ بچوں کو دھوپ نہ لگتی ہوگی۔

کیشو کا دھیان اس تکلیف کی طرف نہ گیا تھا۔ بولا "ضرور تکلیف ہوگی بیچارے پیاس کے مارے تڑپتے ہوں گے؟ اوپر سایہ بھی تو نہیں۔

آخر یہ فیصلہ ہوا کہ گھونسلے کے

اوپر کپڑے کی چھت بنا دینی چاہئے ۔ پانی کی پیالی اور تھوڑے سے چاول رکھ دینے کی تجویز منظور ہوگئی ۔

دونوں بچے بڑے شوق سے کام کرنے لگے ۔ شیاما ماں کی آنکھ بچا کر مٹکے سے چاول نکال لائی ۔ کیشو نے پتھر کی پیالی کا تیل چپکے سے زمین پر گرادیا اور اسے خوب صاف کرکے اس میں پانی بھرا ۔ اب چاندنی کے لئے کپڑا کہاں سے آئے پھر اوپر بغیر چھڑیوں کے ٹھیریگا کیسے اور چھڑیاں کھڑی کیسے ہوں گی ؟

کیشو بڑی دیر تک اسی اُدھیڑبن میں رہا ۔ آخرکار اس نے یہ مشکل بھی حل کرلی ۔

شیاما سے بولا ۔ "جاکر کوڑا پھینکنے والی ٹوکری اٹھالاؤ ۔ اماں کو مت دکھانا"

شیاما ۔ "وہ تو ٹوٹی ہوئی ہے ۔ اس میں سے دھوپ نہ جائے گی ؟

کیشو نے جھنجلا کر کہا ۔ "تو ٹوکری تو لا ، میں اس کے سوراخ بند کرنے کی کوئی ترکیب نکالوں گا " ۔

شیاما دوڑ کر ٹوکری اٹھا لائی ۔ کیشو نے اس کے سوراخ میں تھوڑا سا کاغذ ٹھوس دیا اور ٹوکری کو ایک ٹہنی سے ٹکا کر بولا ۔ "دیکھو! ایسے ہی گھونسلے پر اس کی آڑ کردوں گا ۔ تب کیسے دھوپ جائے گی " ۔

(۲)

گرمی کے دن تھے بابوجی دفتر گئے ہوئے تھے ۔ ماں دونوں بچوں کو سلاکر خود سوگئی تھی ۔ لیکن بچوں کی آنکھوں میں نیند کہاں ! اماں جی کو بہلانے کو دونوں دم روکے ، آنکھیں بند کئے موقع کا انتظار کر رہے تھے ۔ جوں ہی معلوم ہوا کہ اماں جی اچھی طرح سوگئیں دونوں چپکے سے اٹھے اور بہت آہستہ سے دروازے کی سٹکنی کھول کر باہر نکل آئے ۔ انڈوں کی حفاظت کی تیاریاں ہونے لگیں ۔

کیشو کمرے سے جاکر ایک اسٹول

اٹھالیا۔ لیکن جب اس سے کام نہ چلا تو نہانے کی چوکی لاکر اسٹول کے نیچے رکھی اور ڈرتے ڈرتے اسٹول پر چڑھا شیاما دونوں ہاتھوں سے اسٹول پکڑے ہوئے تھی۔ اسٹول کی چاروں ٹانگیں برابر نہ ہونے کی وجہ سے جس طرف زیادہ دباؤ پاتا تھا۔ ذرا سا ہل جاتا تھا۔ اس سے کیشو کو کس قدر تکلیف برداشت کرنی پڑتی تھی یہ اسی کا دل جانتا تھا دونوں ہاتھوں سے کارنس پکڑ لیتا اور دبی آواز سے شیاما کو ڈانٹتا "۔ اچھی طرح پکڑ ورنہ اتر کر اچھی طرح ماروں گا" مگر بے چاری شیاما کا دل تو اوپر کارنس پر تھا بار بار اس کا دھیان ادھر ادھر چلا جاتا اور ہاتھ ڈھیلے پڑ جاتے۔

• کیشو نے جونہی کارنس پر ہاتھ رکھا دونوں چڑیاں اڑ گئیں۔ کیشو نے دیکھا کہ کارنس پر تھوڑے سے تنکے بچھے ہوئے ہیں اور اس پر تین انڈے پڑے ہیں۔ جیسے گھونسلے اس نے درخت پر دیکھے تھے۔ ویسا کوئی گھونسلا نہیں ہے۔

شیاما نے نیچے سے پوچھا "کے بچے ہیں بھیا؟"

کیشو۔ "تین انڈے ہیں ابھی بچے نہیں نکلے"۔

شیاما "زرا ہمیں دکھا دو بھیا کتنے بڑے ہیں"۔

کیشو۔ "دکھا دوں گا پہلے ذرا چیتھڑا لے آؤ نیچے بچھا دوں بیچارے انڈے تنکوں پر پڑے ہیں"۔

شیاما دوڑ کر اپنی پرانی دھوتی پھاڑ کر ایک ٹکڑا لائی۔ کیشو نے جھک کر کپڑا لیا اور اسے تہہ کرکے ایک گدی بنائی اور اسے تنکوں پر بچھا کر تینوں انڈے آہستہ سے اس پر رکھ دیئے۔ شیاما نے پھر کہا "ہم کو بھی دکھا دو بھیا"۔

کیشو۔ "دکھا دوں گا پہلے زرا وہ ٹوکری تو دے دو اوپر سایہ تو کر دوں"

شیاما نے ٹوکری نیچے سے تھما دی اور بولی۔ "اب تم اتر آؤ میں بھی

دیکھوں"۔

کیشو نے ٹوکری کو ایک ٹہنی سے لٹکا کر کہا۔"جا دانہ اور پانی کی پیالی لے آ۔ میں اتر آؤں تو تجھے دکھا دوں گا"۔

شیاما پیالی اور چاول بھی لے آئی کیشو نے دونوں چیزیں ٹوکری کے نیچے رکھ دیں اور اتر آیا۔

شیاما نے گڑگڑا کر کہا۔" اب ہم کو بھی چڑھا دو بھیا"۔

کیشو۔"تو گر پڑے گی"۔

شیاما۔"نہ گروں گی بھیا تم نیچے سے پکڑے رہنا"۔

کیشو۔"بھیا کہیں تم گر گرا پڑے تو اماں جی میری چٹنی ہی بنا ڈالیں گی کہیں گی کہ تو نے ہی چڑھایا تھا۔ کیا کرے گی دیکھ کر اب انڈے بڑے آرام سے ہیں۔ جب بچے نکلیں گے تو ان کو پالیں گے"۔

دونوں پرندے بار بار کارنس پر آتے تھے۔ اور بغیر بیٹھے ہی اڑ جاتے تھے کیشو نے سوچا ہم لوگوں کے ڈر سے یہ نہیں بیٹھتے۔ وہ اسٹول اٹھا کر کمرے میں رکھ آیا۔

شیاما نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا تم نے مجھے نہ دکھایا میں اماں جی سے کہہ دوں گی"۔

کیشو۔"اماں جی سے کہے گی تو بڑا ماروں گا۔ کہے دیتا ہوں"۔

شیاما۔"تو تم نے مجھے دکھایا کیوں نہیں؟"

کیشو۔"اور گر پڑتی تو چار سر نہ ہو جاتے"۔

شیاما۔"ہو جاتے ہو جاتے۔ دیکھ لینا میں کہہ دوں گی"۔

اتنے میں کوٹھری کا دروازہ کھلا اور ماں نے دھوپ سے آنکھوں کو بچاتے ہوئے کہا۔ تم دونوں باہر کب نکل آئے؟ میں نے نہیں کہا تھا دوپہر کو باہر نہ نکلنا؟ کس نے یہ کواڑ کھولا؟ کواڑ کیشو نے کھولا تھا لیکن شیاما نے یہ بات ماں سے نہ کہی۔ اسے خوف ہوا کہ بھیا پٹ جائیں گے۔ کیشو دل

میں کانپ رہا تھا کہ کہیں شیاما کہہ نہ دے انڈے نہ دکھائے تھے۔ اس وجہ سے اب اس کو شیاما پر اعتبار نہ تھا۔ شیاما صرف محبت کے مارے چپ تھی یا اس قصور میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے۔ اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ شاید دونوں ہی باتیں تھیں۔

ماں نے دونوں کو ڈانٹ کر پھر کمرے میں بند کر دیا اور آپ آہستہ آہستہ انہیں پنکھا جھلنے لگی۔ ابھی صرف دو بجے تھے۔ باہر سے تیز لو چل رہی تھی۔ اب دونوں کو نیند آ گئی تھی۔

(۳)

(آپ جانتے ہیں کہ کام ختم کرنے کے بعد
پھر کیسے اطمینان کی نیند آتی ہے وہ
سوئے اور ایسا سوئے کہ ان کو
کچھ پتہ نہ چلا لیکن پھر کیا ہوا،
منشی پریم چند کی زبانی ہی سنئے)

چار بجے شیاما کی آنکھ کھلی۔ کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی کارنس کے پاس آئی۔ اور اوپر کی طرف تاکنے لگی۔ ٹوکری کا پتہ نہ تھا۔ اتفاقاً اس کی نگاہ نیچے گئی وہ الٹے پاؤں دوڑتی ہوئی آئی کمرے میں جاکر زور سے بولی۔ "بھیا انڈے تو نیچے ہی پڑے ہیں بچے اڑ گئے۔"

کیشو گھبرا کر اٹھا اور دوڑا ہو باہر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ تینوں انڈے نیچے ٹوٹے پڑے ہیں۔ پانی کی پیالی بھی ایک طرف ٹوٹی پڑی ہے۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ سہمی ہوئی آنکھوں سے زمین کی طرف دیکھنے لگا شیاما نے پوچھا۔ "بچے کہاں اڑ گئے بھیا؟"

کیشو نے افسوسناک لہجہ میں کہا۔ انڈے تو پھوٹ گئے۔

شیاما۔ "اور بچے کہاں گئے بھیا؟"

کیشو۔ تیرے سر میں۔ دیکھتی نہیں انڈوں میں اُجلا اُجلا پانی نکل آیا ہے وہی تو دو چار دن میں بچے بن جاتے ماں نے سوئی ہاتھ میں لئے ہوئے پوچھا "تم دونوں وہاں دھوپ میں کیا کر رہے ہو" شیاما نے کہا۔ "اماں جی چڑیا کے

انڈے ٹوٹے پڑے ہیں"۔

ماں نے آکر ٹوٹے ہوئے انڈوں کو دیکھا۔ اور غصہ سے بولی "تم لوگوں نے انکو چھوا ہوگا"۔

اب شیاما کو بیچارا پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ اسی نے شاید اس طرح اٹھا کر اوپر رکھ دیا کہ وہ نیچے گر پڑے۔ اس کی سزا بھی اسے ملنی چاہئے۔ بولی۔

"انہوں نے انڈوں کو چھیڑا تھا اماں جی"۔

ماں نے کیشو سے پوچھا۔ "کیوں رے"

کیشو بھیگی بلی بنا کھڑا رہا۔

ماں۔ "تو وہاں پہنچا کیسے؟"

شیاما۔ "چوکی پر اسٹول رکھ کر چڑھے تھے اماں جی"۔

کیشو۔ "تو اسٹول تھامے نہیں کھڑی تھی؟"

شیاما۔ "تم ہی نے کہا تھا"۔

ماں۔ "اتنا بڑا ہوا تجھے ابھی اتنا بھی نہیں معلوم کہ چھونے سے چڑیوں کے انڈے گندے ہو جاتے ہیں۔ چڑیا پھر انہیں نہیں سیتی"۔

شیاما نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "تو کیا چڑیا نے انڈے گرائے ہیں اماں جی؟"

ماں۔ "اور کیا کرتی۔ کیشو کے سر اس کا پاپ پڑے گا۔ ہا ہا ہا! تین جانیں لے لیں دشٹ نے"۔

کیشو رونی صورت بنا کر بولا۔ "میں نے تو صرف انڈوں کو گدی پر رکھ دیا تھا اماں جی"۔

ماں کو ہنسی آگئی۔

مگر کیشو کو کئی دن تک اپنی غلطی کا افسوس رہا۔ انڈوں کی حفاظت کرنے کے زعم میں ان کو اس نے ستیاناس کر ڈالا اس کو یاد کر کے وہ اپنے جی میں کبھی کبھی رو پڑتا تھا۔

دونوں چڑیاں وہاں پھر کبھی نہ دکھائی دیں۔



فوٹوگرافی

سائنس کی کسی بھی ایجاد میں صرف ایک شخص کی محنت اور کوشش کو دخل نہیں ہوتا۔ سائنس داں برابر اپنے اپنے ملکوں میں تجربے کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ تجربے کبھی کبھی مہینوں ہی نہیں برسوں تک ہوتے رہتے ہیں اور تب جاکر کہیں کوئی ایجاد سامنے آتی ہے اسی طرح فوٹوگرافی کی ایجاد بھی ہوئی۔ اس ایجاد میں بہت سے لوگوں نے کام کیا اور بہت سے دماغ اس کوشش میں لگے رہے کہ ایسی چیز ایجاد کریں جس سے ہو بہو تصویر کھنچ کر سامنے آ جائے۔

جرمنی میں ایک سائنس داں تھا اس کا نام جان اسکلٹزا تھا۔ یہ علم کیمیا کا ماہر تھا، اس نے ۱۷۲۷ء میں اس ایجاد کے لئے پہلا قدم اٹھایا۔ ایک دن اس نے نائٹرک ایسڈ میں تھوڑی سی چاندی حل کی، پھر اس حل میں کھریا ملائی۔ اس مسالہ کو جب دھوپ میں رکھا گیا تو جس جس جگہ دھوپ پڑی وہ حصہ کالا پڑ گیا۔ یہی وہ پہلی بات تھی جس کی وجہ سے انسان کا دماغ فوٹوگرافی کی ایجاد کی طرف متوجہ ہوا۔

اب سے تقریباً دو سو سال پہلے
ایک خاص قسم کا کیمرا کام میں لایا جاتا
تھا۔ اس کی بناوٹ نہایت سادہ ہوتی تھی،
کسی چھوٹے سے بکس میں ایک سرے
پر "لینس" لگا ہوتا تھا۔ اور دوسرے
سرے پر ایک پردہ۔ اس بکس کو آگے
پیچھے کھسکا کر کسی منظر کا عکس پردہ پر
لے لیا جاتا تھا۔ بس یوں سمجھئے جس
طرح آج کل کیمروں میں ایک چھوٹا سا
شیشہ ہوتا ہے جس میں سامنے کا منظر
سامنے آ جاتا تھا۔ اسے "ویو فائنڈر"
کہتے ہیں VIEW FEINDER میں لگے
ہوئے "لینس" کی مدد سے سامنے کا
منظر یا تصویر کا عکس، گھستے ہوئے چوکور
شیشے پر اُتر آتا۔ اس بات کو "فوکس"
کرنا کہتے ہیں، بالکل اسی طرح اس زمانے
کے کیمرے میں منظر کا عکس نظر آتا تھا
اور تصویر بنانے والا اس "عارضی تصویر"
کی مدد سے اپنی تصویر تیار کر لیتا تھا
اس زمانے کے بعض سائنس دانوں نے
یہ کوشش کی کہ اس "عارضی" منظر کو کسی
طرح مستقل طور سے محفوظ کر لیا جائے
مشہور سائنس داں سر ہمفری ڈیوی نے
کیمرے کے پردے کی جگہ، ایک کاغذ کو
نائٹرک ایسڈ اور چاندی کے مسالے میں
بھگو کر کیمرے کے "لینس" کے سامنے
رکھا، منظر کا پورا عکس کاغذ پر آ گیا۔
لیکن اس منظر کو مستقل طور پر باقی
کس طرح رکھا جائے۔ یہ سوال ابھی
حل ہونا باقی تھا۔

۱۸۲۴ء میں فرانس کے ایک سائنس
داں جوزف نی ایپس نے دنیا کی
سب سے پہلی تصویر بنائی۔ اس تجربے
کے سلسلے میں جوزف نے چاندی اور
نائٹرک ایسڈ کے مسالے کے بجائے
ایک دوسری چیز "بٹیومن" استعمال
کی اب تک سائنس داں چاندی اور
نائٹرک ایسڈ سے مرکب مسالے کو کام
میں لاتے تھے، جوزف نے بٹیومن کو
ایک کاغذ پر لگایا اور اس کو پردے کی
جگہ کیمرے میں فٹ کیا۔ تصویر لینے کے
بعد اس کاغذ کی پشت پر ایک قسم کا

روغن مل کر اس کو شفاف (TRANSPARENT) بنا لیا۔ اب تصویر کاغذ کے آر پار نظر آنے لگی، پھر دھات کے ایک ٹکڑے پر "بیٹیومن" لگا کر تصویر کو اس پر رکھا اور ان چیزوں کو دھوپ میں متواتر دس گھنٹے تک رکھا رہنے دیا تب کہیں وہ تصویر اس پلیٹ پر اتر سکی۔ یہ تصویر دنیا کی سب سے پہلی تصویر تھی۔ لیکن ابھی اس بات کی ضرورت تھی کہ کام کے طریقے میں سہولت پیدا کی جائے۔

ان دنوں فرانس میں ایک دوسرا سائنس داں بھی تھا۔ اس کا نام لوئی ڈاگوئر تھا۔ ڈاگوئر "بیٹیومن" کی جگہ چاندی اور ایوڈین سے تیار کیا ہوا مسالہ استعمال کرتا تھا۔ کچھ دنوں بعد دونوں سائنس داں جوزف نی ایپس اور لوئی ڈاگوئر نے مل جل کر کام کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ ایک دوسرے کے شریک بن گئے۔

[illegible] سے ۱۸۲۹ء تک کسی سائنس داں کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی، ایک دن اتفاقیہ کامیابی نے ڈاگوئر کے قدم چوم لئے، اس نے ایک پلیٹ پر سلور اور ایوڈین سے تیار کیا ہوا مسالہ لگایا اور اس کو کیمرے میں پردہ کی جگہ رکھا اور کیمرے کو دھوپ میں رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سورج بادلوں میں چھپ جانے کی وجہ سے ڈاگوئر نے اپنا کام دوسرے دن پر ملتوی کر دیا۔ اور پلیٹ کو کیمرے سے نکال کر ایک الماری میں رکھ دیا۔ اس وقت پلیٹ پر کسی قسم کے نقش نہیں تھے، اس الماری میں ایک برتن میں پارہ رکھا ہوا تھا، پارے کے ابخرات اڑ اڑ کر پلیٹ تک پہنچتے رہے اور پلیٹ پر "تصویر" کے تمام نقوش ابھر آئے، ڈاگوئر اپنی اس کامیابی سے بہت خوش ہوا اور دوسرے دن اس تجربے کو دہرایا تو صحیح پایا۔ اور اس نے اپنے تجربے سے دنیا والوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

انگلستان کے ایک سائنس داں ولیم ہنری فاکس ٹیلباٹ نے پلیٹ کی جگہ مسالے میں بھیگا ہوا کاغذ رکھا، پھر مسالہ لگے

ہوئے خشک کاغذ کو استعمال کیا، یہ دونوں تجربے کامیاب رہے، اس کا طریقہ بھی ڈاگوئر کے طریقے سے ملتا جلتا تھا۔ فوٹو گرافی کا طریقہ ایجاد ہو چکا تھا۔ اس کے آلے میں حسب ضرورت ترمیم ہوتی رہی۔ ۱۸۷۰ء میں شیشے کی خشک پلیٹ جس پر مسالہ لگا ہوا تھا، استعمال ہونے لگی۔ کیمرے کے "لینس" بھی ایجاد ہوئے۔ اور آج کل دھات کی پلیٹ، شیشہ کی پلیٹ کی جگہ سلو لائڈ کی فلموں نے لے لی ہے۔ اس فلم کو اگر کیمرے سے باہر نکال کر دیکھا جائے تو روشنی پڑتے ہی اس فلم کا رنگ بدل جائے گا۔ اور ان پر کھنچی ہوئی تصویریں بے کار ہو جائیں گی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کیمرہ چاروں طرف سے اس طرح بند کر لیا جاتا ہے کہ اندر روشنی کی چھوٹی سی چھوٹی کرن بھی نہیں پہنچ سکتی۔

موجودہ کیمرے کی بناوٹ کچھ ایسی پیچیدہ بھی نہیں، ایک ننھے سے بکس میں تصویر کھینچنے کے لئے سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ ایک سرے پر ایک گول گول شیشے کا ٹکڑا لوہے یا پیتل کے گول ٹکڑوں میں کسا ہوتا ہے، یہی کیمرے کی جان ہے۔ اگر "لینس" اچھا نہ ہو تو تصویر بھی اچھی نہیں کھینچ سکتے اسی سرے پر کچھ اوپر شیشے کے چوکور ٹکڑے لگے ہوتے ہیں، جن میں تصویر کھینچنے سے پہلے اس کا اچھا، یا برا ہونا دیکھ لیتے ہیں۔ اس میں تصویر اچھی اور "پوری" آ گئی ہے، کیمرے کا بٹن دبا دیجئے، لینس کی پشت پر لگے ہوئے لوہے کے پردوں میں سرسراہٹ ہوتی ہے اور ان میں ایک سوراخ نمودار ہوتا ہے۔ اس سوراخ کے ذریعہ سامنے کا پورا عکس کیمرے کے اندر لگے ہوئے فلم پر پڑتا ہے اور تصویر کھنچ جاتی ہے۔ لوہے کے پردوں کا سوراخ بند ہو جاتا ہے یہ پردے جن کو SHUTTER کہتے ہیں اپنی جگہ آ جاتے ہیں۔ یہ سوراخ روشنی کم ہونے پر چوڑے اور زیادہ ہونے پر پتلے کر لئے جاتے ہیں۔ اس فلم کو اندھیرے میں احتیاط سے کیمرے سے الگ کیا جاتا ہے۔ اس وقت

دیکھنے پر کوئی تصویر نظر نہیں آئے گی۔ اس
کو ایک کیمیائی مرکب میں ڈالئے اس مرکب
کا نام DEVELOPER ہے، اب فلم پر
تصویر کے نقوش ابھر آتے ہیں۔ ان نقوش
کو پائدار بنانے کے لئے اس کو ایک دوسرے
مسالے میں ڈالا جاتا ہے۔ اس سالے
کو FIXER کہتے ہیں۔ جس سے وہ تصویر
مستقل شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے
بعد اس فلم کو مسالہ لگے ہوئے کاغذ پر
چھاپ لیا جاتا ہے۔ چھاپنے سے پہلے
اس تصویر کا نام NEGATIVE تھا،
چھپنے کے بعد اس کو POSITIVE کہنے
لگے۔

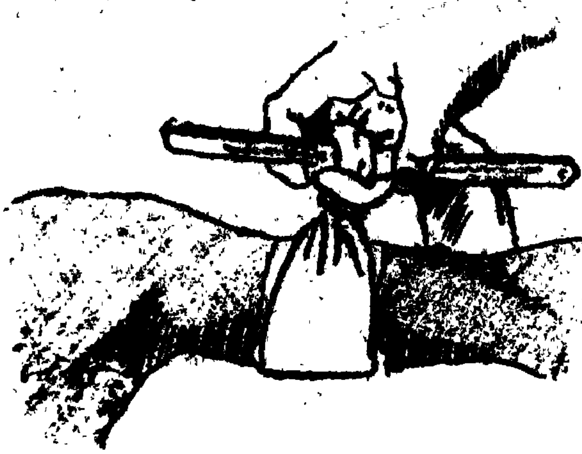
ڈیڑھ سو سال کی مسلسل محنت
کے بعد آدمی اس قابل ہوا کہ ایسی
اچھی تصویر کھینچ سکے، کہ بچے یا بڑے
سب اُن کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔
فوٹوگرافی کی سائنس یہیں ختم نہیں
ہوگئی۔ یہ برابر ترقی کر رہی ہے اور اس سے
انسانوں کی بھلائی کے بے شمار کام ہو رہے
ہیں۔

سیفی امروہوی

ہوائی جہازوں کا عالمی ریکارڈ

- ۱۵ ستمبر ۱۹۴۸ء کو امریکہ کے ایک ہواباز میجر آر، ال، جونس نے ۶۷۱ میل فی گھنٹے کے حساب سے تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کیا۔
- ۱۴ اگست سے ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کے درمیانی عرصے میں نیو فاؤنڈلینڈ کے ایک ہواباز ولیم اوڈم نے دنیا کا ایک چکر ۷۳ گھنٹے اور ۵ منٹ کے اندر لگایا۔ اور ۱۹,۶۵۴ میل کی مسافت طے کی۔
- ۲ اگست کو ایک ہواباز ڈگلس سب سے زیادہ وزن یعنی ۱۷۲۰۰۰ پونڈ لے کر اڑے۔

پہلی امداد



کہاوت ہے کہ جو چڑھتا ہے وہ گرتا بھی ہے۔ محنتی آدمی گرنے سے نہیں ڈرتا۔ کام کاج، کھیل کود، سفر یا تجارت میں کبھی کبھی ہمارے جسم پر چوٹ آ جاتی ہے۔ ٹھوکر لگ جاتی ہے یا جسم کا کوئی حصّہ جل جاتا ہے ایسی حالت میں کیا کیا جائے؟ ڈاکٹر کی مدد تو اس وقت مل نہیں سکتی۔ ذرا سی لاپرواہی سے کام بگڑ سکتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو کیا چاہیئے کہ آپ طبی امداد ملنے سے پہلے زخمی کی دیکھ بھال کریں۔ اسی دیکھ بھال کو "ابتدائی طبّی امداد" کہتے ہیں۔

فرض کر لیجئے کہ آپ کا کوئی ساتھی آپ کے دیکھتے دیکھتے سائیکل سے گر پڑے۔ آپ کو اس کی ابتدائی دیکھ بھال کرنی چاہیئے۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ چوٹ کہاں لگی ہے۔ جسم پر کہیں کوئی زخم تو نہیں آ گیا ہے۔ کہیں سے خون تو نہیں بہہ رہا ہے۔

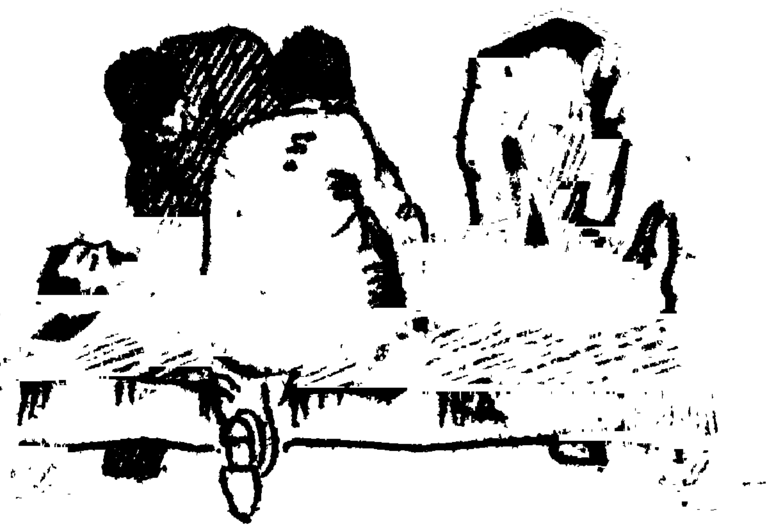


لیکن اگر چوٹ معمولی ہے یا جسم کا کوئی حصہ کھرچ گیا ہو تو اس پر ٹنکچر لگا دیجئے۔ جب ٹنکچر سوکھ جائے تو زخم پر صاف پٹی باندھ دی جائے۔ میلی پٹی کبھی نہ استعمال کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ میلی پٹی میں اکثر بیماریوں کے کیڑے آجاتے ہیں۔

تصویروں میں آپ جسم کے مختلف حصّوں پر پٹیاں باندھنے کے طریقے دیکھ لیجئے۔

جس جگہ چوٹ آئی ہو، وہاں سے اگر خون نکلتا ہو تو خون روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے، زخم پر گدّی رکھ کر کسی رومال پٹی، یا کپڑے کے ٹکڑے کو اس کے چاروں طرف لپیٹ دیجئے۔

زیادہ چوٹ آئے، یا ہڈی ٹوٹ گئی ہو تو بیمار کو ہلانا، جلانا ٹھیک نہیں۔ کہیں لے جانا اگر ضروری ہی ہو تو بیمار کو کسی لکڑی



ے تختے، چارپائی
یا دوسری چیز پر
لٹا کر اپنی جگہ سے
ہٹائیے ۔ زمین پر
سے اٹھانے میں
بھی بڑی ہوشیاری
سے کام لینا چاہیے
کئی آدمی مل کر
اگر بیمار کو اٹھائیں
تو زیادہ اچھا رہیگا
بھی کبھی چوٹ
اندرونی ہوتی ہے، اندرونی زخم کی پہچان
یہ ہے کہ زخمی کا رنگ پیلا پڑ جاتا
ہے ۔ کبھی کبھی بے ہوشی بھی ہو
جاتا ہے، سانس دھیرے دھیرے
ور رک رک کر آتا ہے ۔ کبھی کبھی
نٹ اور ناخن نیلے پڑ جاتے ہیں۔
یسی حالت میں ڈاکٹر کے آنے تک
یمار کو آرام سے لٹا دیجئے ۔اسی طرح
سی کو ہوا نہ لگنے دیجئے، کمبل اڑھا
یجئے سردی لگنے کا ڈر ہو تو بیمار
کے آس پاس گرم پانی کی
بوتلیں رکھ دیجئے ۔ گرم چائے یا
دودھ پلانے سے بھی فائدہ پہنچتا
ہے۔ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھئے
کہ ابتدائی دیکھ بھال کرتے وقت آپ
جلدی کے باوجود نہ گھبرائیں ۔ بیمار کے
آس پاس بھیڑ بھی اکٹھی نہ ہو
بھیڑ لگنے سے بیمار تک تازہ ہوا
نہیں پہنچتی اور اسے تکلیف ہوتی
ہے ۔

ایک قدیم ہندوستانی کہانی

سمجھدار خرگوش



کسی جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ وہ بڑا بہادر تھا۔ ہر روز وہ ہرنوں، خرگوشوں اور دوسرے جانوروں کو مارتا تھا۔ ایک دن اس جنگل کے سارے جانور اکٹھے ہو کر شیر کے پاس گئے اور بولے "سرکار! ہم سب جانوروں کو اس طرح روز روز مارنے سے آپ کو کیا ملتا ہے۔ آپ کا پیٹ تو ایک جانور سے ہی بھر جاتا ہے۔ اس لئے ہم آج سے آپ سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے پاس بیٹھے بیٹھے ایک جانور روز آجایا کرے گا۔ اس طرح آپ کو اپنے شکار کے لیے پریشان بھی نہ ہونا پڑے گا اور ہم لوگوں کی جانیں بھی بے کار نہ جائیں گی۔ آپ جنگل کے بادشاہ ہیں آپ کو بھی کچھ ہمارا خیال کرنا چاہیے۔ جو بادشاہ اپنی رعایا سے ایسا سلوک کرتے ہیں وہ ہمیشہ ترقی کرتے ہیں۔ اور جو بادشاہ اپنی رعایا کو نقصان پہنچاتے ہیں، وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔" ان کی یہ باتیں سن کر شیر نے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو میں سب کو مار کر کھا جاؤں گا۔"

سب نے وعدہ کیا کہ اب ہمیشہ آپ کو ایک جانور مل جایا کرے گا۔ اس کے بعد تو پھر جنگل کے سب جانور بے فکر ہو کر جنگل میں گھومنے لگے۔ اب انھیں ڈر ہی کیا تھا؟ ہر جانور اپنی باری پر چلا جاتا۔

ایک بار خرگوش کی باری آئی۔ سب جانوروں کے زور دینے پر وہ بے چارہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا، آہستہ آہستہ، اور دل ہی دل میں شیر کو مارنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ اس نے راستے میں ایک کنواں دیکھا، اس میں اس کو اپنی پرچھائیں نظر آئی۔ پرچھائیں دیکھ کر اس کے سمجھ میں ایک بڑی اچھی ترکیب آگئی۔ اب تو وہ اطمینان سے پیڑ کے نیچے لیٹ گیا اور لگا مزے میں سونے۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ شام ہو گئی تھی۔ اب وہ ٹہلتا ہوا شیر کے پاس پہنچا۔ شیر اتنی دیر سے انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا اور غصے میں بھوکا بیٹھا ہوا تھا۔ اور اپنے ہونٹوں کو زبان سے چاٹ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ کل سویرے ہی جنگل کے سارے جانوروں کو جان سے مار ڈالوں گا۔ اس وقت خرگوش نے جا کر اُسے سلام کیا۔ اس کو دیکھ کر تو شیر اور بھی آپے سے باہر ہو گیا اور بولا "کمینے خرگوش! ایک تو تو چھوٹا ہے اور پھر اتنی دیر کر کے آیا، اسی لئے تیرے اس جرم کی وجہ سے تجھ کو اور جنگل کے سارے جانوروں کو مار ڈالوں گا۔"

خرگوش نے بڑی عاجزی سے جواب دیا "اس میں نہ تو میرا قصور ہے اور نہ دوسرے جانوروں کا۔ دیر ہونے کی وجہ تو ایک اور ہے۔"

شیر نے کہا "ذرا جلدی سے بتاؤ کیا وجہ ہے۔"

خرگوش بولا "چھوٹا سمجھ کر سب جانوروں نے مجھے پانچ خرگوش کے ساتھ بھیجا تھا۔ جب میں آ رہا تھا تو راستے میں ایک اور شیر نے مجھے روکا اور کہا "کیوں رے! تم سب کہاں جا رہے ہو؟" ہم نے کہا "ہم وعدے کے مطابق اپنے بادشاہ شیر کے پاس جا رہے ہیں۔"

اس نے کہا "یہ جنگل میرا ہے۔

وہ شیر تو بدمعاش ہے۔ اگر وہ بادشاہ ہے تو ان چار خرگوشوں کو یہاں چھوڑ کر اسے جلدی سے بُلا لاؤ۔ ہم دونوں میں جو طاقتور ہوگا وہی تم کو کھا جائے گا۔"

یہ سُن کر شیر گرج کر بولا "اگر یہ بات ہے تو چل جلدی سے مجھے اس شیر کو دکھا، جس نے ایسی بات کہی۔"

خرگوش نے کہا "سرکار! یہ سچ ہے کہ اپنی زمین اور اپنی آن کے لئے بہادر لوگ لڑائی لڑتے ہیں۔ پر وہ شیر قلعے میں رہتا ہے۔ قلعے میں رہنے والا پھر بھی بچا رہتا ہے۔ آپ کے پاس قلعہ نہیں ہے، اور جس شیر کے پاس قلعہ نہ ہو، وہ ایسا ہوتا ہے جیسے بِلا دانت کا سانپ۔"

یہ سُن کر شیر نے کہا "چل تو مجھے اس کو دکھا دے۔ میں اُسے مار ڈالوں گا۔ کیونکہ کوئی شخص اگر دشمن اور بیماری کو پیدا ہوتے ہی نہیں دبا دیتا تو وہ بڑھ کر اس کو ہی ختم کر دیتے ہیں۔ اور جو اپنی قوت کو سمجھتا ہے، وہ پھر کسی سے نہیں دبتا۔"

خرگوش نے کہا "یہ تو سچ ہے لیکن اس کے باوجود ابھی آپ کو اس کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔"

شیر نے کہا "مجھے ان باتوں سے کیا کام، تو تو چل مجھے وہ شیر اور اس کا قلعہ دکھا دے، میں اسے سمجھ لوں گا۔"

خرگوش نے کہا کہ "اگر یہ بات ہے تو آئیے میرے ساتھ چلیے"۔ یہ کہہ کر وہ آگے آگے ہو لیا۔ اور اسے اس کنویں کے پاس لے گیا کہ آپ کو دیکھ کر وہ اپنے اس قلعے میں چھپ گیا ہے۔ آپ کہیں تو میں دکھلاؤں۔"

شیر نے کہا "ضرور۔"

خرگوش نے اُسے وہ کنواں دکھا دیا۔ کنویں کے پانی میں اپنی پرچھائیں دیکھ کر بیوقوف شیر گرجنے لگا۔ اس کی آواز بڑے زور سے کنویں میں گونجی۔ وہ سمجھا کہ یہ قلعے والا شیر گونج رہا ہے اب تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور کنویں میں کود پڑا۔

بس پھر کیا تھا خرگوش جان واپس آئے اور شیر کے مرنے کی خبر سارے جنگل کے جانوروں کو سنائی جسے سن کر سب جانور بہت خوش ہوئے اور اب وہ چین و آرام سے رہنے لگے۔



فاہیان کاسفر

ہندستان میں آنے والے چینی سیاحوں میں تین سیاح خاص طور پر قابل ذکر ہیں پہلے فاہیان آیا، پھر سنگیان، اور تیسرا سیاح ہوان چانگ تھا۔ ان تینوں نے اپنے سفر کا جو کچھ حال لکھا ہے وہ دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر چھپ چکا ہے۔ اس سے بھارت کی پرانی تہذیب کا بہت کچھ حال معلوم ہو جاتا ہے۔

آیئے ہم آپ کو سب سے پہلے سیاح فاہیان کا حال سنائیں۔ فاہیان وسط چین کا رہنے والا تھا۔ پانچویں صدی عیسوی میں وہ اپنے ملک سے بھارت کے لئے روانہ ہوا۔ اس سفر میں اس کا مقصد بودھ مقامات کی سیر اور بودھ مذہب کی کتابوں کو اکٹھا کرنا تھا۔ اس زمانے میں چین سے ہندستان آنے کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ افغانستان ہوتا ہوا ہندستان کی سرحد پر پہنچتا تھا۔ لیکن یہ راستہ بڑے چکر کا تھا۔ دوسرا راستہ سمندری تھا سمندری جہاز سے جاوا ہوتے ہوئے آتے تھے۔ یہ راستہ پہلے کے مقابلے میں اچھا تو تھا،

لیکن اس میں خرابی یہ تھی کہ سمندر کے طوفانوں کا ڈر تھا۔ لیکن فاہیان بڑا نڈر انسان تھا۔ اس نے دونوں راستے استعمال کئے۔ وہ بھارت آیا تو پہلے خشکی کے راستے ہی سے، لیکن لوٹا سمندر کے راستے سے، اس نے راستے میں بڑی بڑی مشکلات کا مقابلہ کیا۔

جب فاہیان آرہا تھا تو اس کے ساتھ اور بہت سے مسافر بھی تھے۔ افغانستان پہنچنے کے لئے راستے میں ایک بڑا جنگل پڑتا تھا۔ جنگل میں مسافروں کو بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی۔ میلوں پانی نہ ملا۔ اور گرمی کے مارے بُرا حال تھا۔ پھر یہ کہ وہ بیچارے اکثر راستہ بھی بھول جاتے تھے۔ جب وہ کسی طرح جھیل کے کنارے پہنچے اس وقت ان کی بری حالت تھی۔ کتنے ہی مسافر ہمت ہار گئے۔ لیکن فاہیان اپنی دُھن کا پکا تھا، وہ یہ تمام تکلیفیں برداشت کرتا ہوا ختن پہنچا۔ اس وقت ختن میں ایک بودھ حکومت تھی۔ لیکن ختن اجڑا پڑا تھا۔

ختن سے فاہیان، کابل پہنچا، اس وقت کابل شمالی ہندستان ہی کا ایک حصہ تھا۔ کابل سے وہ سوات، گاندھار، اور تکشلا ہوتا ہوا پیشاور پہنچا۔ پیشاور میں اس نے ایک بہت بڑا اونچا اور خوبصورت بودھ استوپ دیکھا۔ دریائے سندھ کو پار کرکے وہ متھرا آیا۔ فاہیان نے اپنے زمانے میں متھرا کا جو حال دیکھا وہ بیان کرتا ہے۔

"متھرا میں جمنا کے دونوں کناروں پر بیس سنگھارام (جن میں بودھ مت کے ماننے والے سادھو رہتے تھے) ہیں جن میں تقریباً تین ہزار سادھو رہتے ہیں۔ بودھ مذہب کی خوب تبلیغ ہوتی ہے۔ راجپوتانہ کے راجا بودھ مذہب کے ماننے والے ہیں۔ جو علاقہ دکھن کی طرف ہے وہ مدھیہ پردیش کہلاتا ہے اس علاقے کی آب وہوا نہ تو بہت ٹھنڈی ہے نہ گرم۔ رعایا آرام سے رہتی ہے۔ ان پر زیادہ ٹیکس بھی نہیں ہیں۔ جو لوگ زمین جوتتے بوتے ہیں انہیں اپنی پیداوار کا ایک مقررہ حصہ حکومت کو دینا پڑتا ہے۔ مجرموں کو ان کے جرم کے مطابق سزا دی جاتی ہے لیکن جسمانی تکلیف زیادہ نہیں دی جاتی البتہ

بڑے بڑے جرموں پر ہات کاٹ دیتے ہیں۔
لوگ گوشت، لہسن اور پیاز بھی نہیں کھاتے"

فاہیان متھرا سے قنوج آیا۔ یہ شہر اس زمانے میں گپت خاندان کے بادشاہوں کا دارالسلطنت تھا۔

پھر وہ کپل وستو بھی گیا جہاں مہا تما بدھ پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اس وقت کپل وستو کی حالت بہت خراب تھی۔ یہاں نہ کوئی راجا تھا اور نہ پرجا تھوڑے بہت سادھو نظر آتے تھے

فاہیان پاٹلی پتر بھی گیا جسے اب پٹنہ کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ اس کا پرانا راج محل بڑا انوکھا تھا۔ اس کے بنانے میں بڑے بڑے پتھروں سے کام لیا گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ پتھر کس طرح اوپر لے جائے گئے ہوں گے۔ ایک خوبصورت سنگھارام بنا ہوا ہے جس میں تقریباً چھ سات سو سادھو رہتے ہیں۔ ہر سال دوسرے مہینے کے آٹھویں دن ایک جلسہ ہوتا ہے۔ اس موقع پر چار پہیوں کا ایک رتھ بنایا جاتا ہے اس رتھ کی پانچویں منزل پر ایک مندر رکھا جاتا ہے۔ یہ مندر بانسوں کا بنتا ہے اس کے بیچ میں سات آٹھ گز لمبا ایک بانس ہوتا ہے، مندر کو سفید کپڑے سے مڑھ دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا پچھلا حصہ چمکیلے رنگ سے رنگا جاتا ہے۔ خوبصورت شامیانوں میں دیوتاؤں کی مورتیاں کپڑوں اور گہنوں سے سجا کر رکھی جاتی ہیں۔ رتھ کے چاروں کونوں میں چار طاق ہوتے ہیں۔ ان طاقوں میں مہا تما بدھ کی بیٹھی ہوئی مورت رکھی جاتی ہیں۔ اس طرح کے تقریباً بیس رتھ تیار کئے جاتے ہیں۔ اس روز بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ کھیل تماشے ہوتے ہیں اور مورتیوں پر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ اس موقع پر دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ وہیں ٹھہرتے ہیں اور ساری رات خوشیاں مناتے ہیں۔

پٹنہ راجگری میں پہلی بودھ کانفرنس ہوئی تھی اسی لئے اسے دیکھنے کے لئے فاہیان وہاں پہنچا۔ گیا میں وہ پیپل کا پیڑ بھی دیکھنے گیا تھا، کہتے ہیں کہ اسی پیڑ کے نیچے مہاتما بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ وہاں سے وہ کاشی (بنارس) اور کوسمبی (الہ آباد کے پاس) پہنچا۔

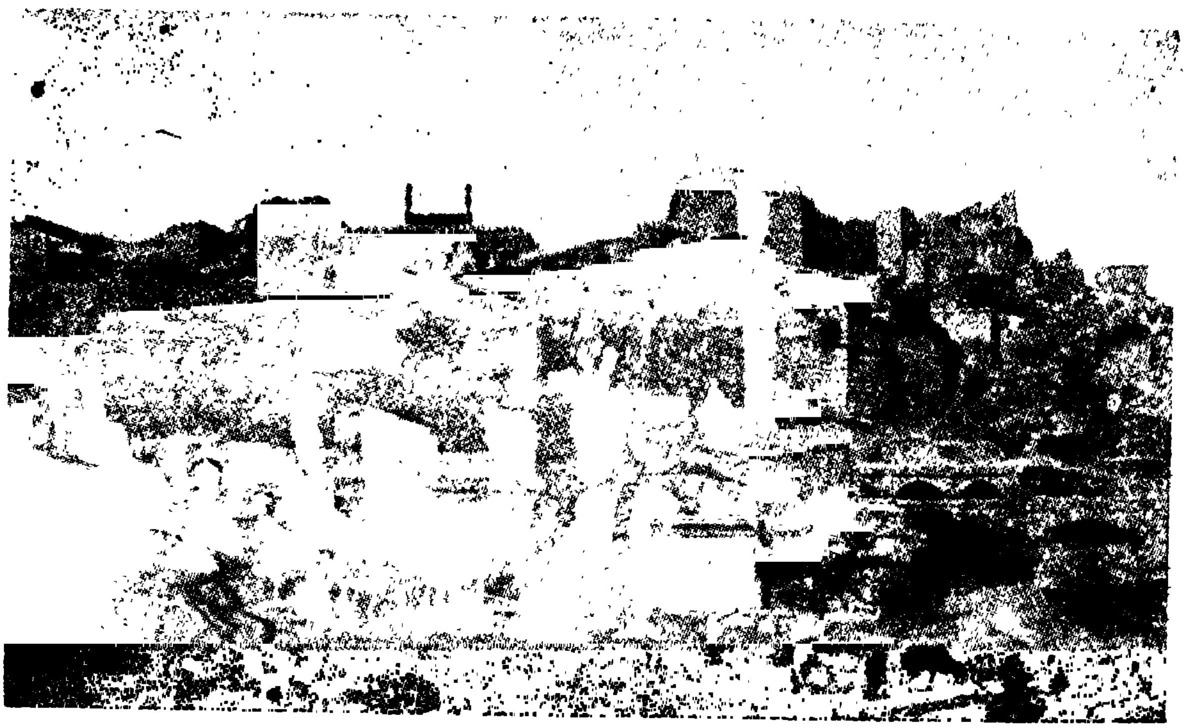
فاہیان نے ہندستان میں دو سال قیام کیا اور اس نے اس عرصہ میں بہت سی بودھ مذہب کی کتابیں جمع کیں اور اُن کی نقلیں کیں۔ پھر وہ جہاز میں بیٹھ کر لنکا گیا۔ لنکا کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ

" لنکا میں پہلے بہت کم آدمی بستے تھے۔ دھیرے دھیرے تاجر یہاں آنے لگے یہاں مہاتما بدھ بھی آئے تھے اور انہوں نے بودھ مت کی تبلیغ کی اور وہ لوگ اُن کے پیرو ہو گئے۔ چنانچہ لنکا کے لوگ بدھ مذہب کے ماننے والے ہیں۔

فاہیان لنکا میں بھی دو برس رہا یہیں سے وہ سیدھا چین لوٹ گیا۔ کہتے ہیں کہ ایک تاجر نے اُسے چین کا بنا ہوا ایک پنکھا تحفے کے طور پر دیا۔ اپنے ملک کی یہ بنی ہوئی چیز دیکھ کر اس کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے۔ اسی زمانے میں دو سو مسافروں کا ایک جہاز چین جا رہا تھا۔ وہ بھی اسی پہ بیٹھ گیا راستے میں طوفان آیا، اور جہاز میں چھید ہو گیا۔ جہاز کو ہلکا کرنے کے لئے لوگ جہاز میں لدے ہوئے سامان کو سمندر میں پھینکنے لگے بہت سا مال و اسباب سمندر میں پھینک دیا گیا۔ فاہیان نے اپنے سارے برتن تک سمندر میں اس ڈر کے مارے پھینک دیئے کہ کہیں لوگ اس کی کتابوں اور مورتیوں کو سمندر کے حوالے نہ کر دیں۔ لیکن ۱۳ دن کی سخت پریشانی کے بعد ان کو خشکی نظر آئی۔ وہاں جہاز کی مرمت ہوئی۔ بڑی سخت تکلیف برداشت کرنے پر جہاز جاوا پہنچا۔ جاوا میں اس وقت بودھ اور ہندو مذہب کے ماننے والے تھے۔

فاہیان جاوا میں پانچ مہینے رہا۔ اس کے بعد وہ ایک اور جہاز میں سوار ہوا۔ یہ جہاز بھی پہلے کی طرح خراب ہو گیا۔ اب تو ملاحوں نے کہنا شروع کر دیا کہ فاہیان کی بدولت ہی ہم پر یہ مصیبت آ رہی ہے۔ اب اگر کوئی جزیرہ ملے تو اسے وہاں اتار دینا چاہیئے۔ یہ وہاں پر چاہے مرے چاہے جیئے۔ لیکن اس جہاز میں ایک اور شخص بھی تھا۔ جو بہت اچھا آدمی تھا۔ اس نے ملاحوں کی اس تجویز کی ڈٹ کر مخالفت کی اور اس کو بچا دیا۔ بیاسی دن کے سفر کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح چین کے ساحل پر پہنچا۔

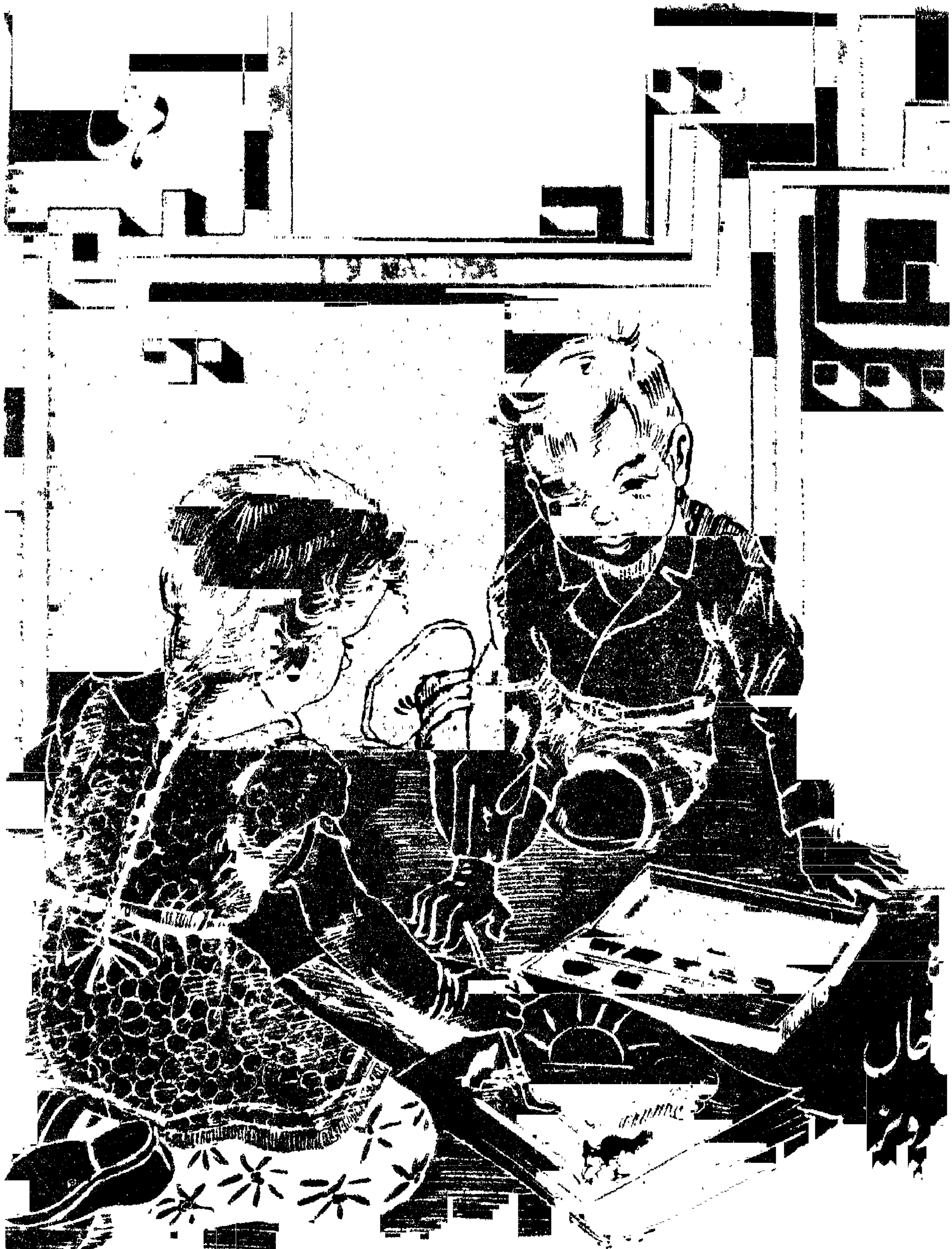
اطہر پرویز



گولکنڈے کا قلعہ

اندر کے صفحات میں مضمون پڑھئے


یہ لیبل دیکھ لیجیے
مقبولیت کو دیکھ کر بہت سے نقالوں نے
سے ملتے جلتے ناموں کے شربت تیار
کر رکھے ہیں اگر آپ نے احتیاط نہیں کی
تو عین ممکن ہے کہ آپ دھوکا کھا جائیں
خریدتے وقت اس لیبل کو ضرور دیکھ
لیجیے اور ہمدرد دواخانہ دہلی کا نام بھی
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی





بچوں کی باتیں

ان دنوں جامعہ میں امتحانات کا چرچا ہے، لیکن کھیل کود کا سلسلہ بھی ختم نہیں ہوا ہے۔ کھیل بھی ہو رہے ہیں اور پڑھائی کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

۱۸ اپریل کو شام کے ۵ بجے ثانوی کے تقسیم انعامات کا جلسہ اس سلسلے کی آخری کڑی تھا۔ یہ جلسہ کھلاڑیوں کے انعامات دینے کے لیے ہوا تھا۔ جس کی صدارت جموں اور کشمیر کے سابق ڈائرکٹر تعلیمات جناب سید اسد اللہ صاحب کاظمی نے فرمائی۔ سب سے پہلے کھیل کے ناظم جناب عبدالرحمان صاحب نے اپنی سالانہ رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد لڑکوں نے ورزش کی۔ حاضرین نے ان ورزشوں کو [illegible]۔

اس جلسے کا سب سے دلچسپ پروگرام رسہ کشی تھی۔ یہ رسہ کشی استادوں اور طلبا کے درمیان ہوئی۔ اس [illegible] شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب اور ہمارے پیام تعلیم کے مدیر اعلیٰ جناب حامد علی خان صاحب بھی شریک ہوئے۔ پہلے پہلے استادوں نے جو زور لگایا تو لڑکے کھنچے چلے آئے۔ [illegible] آگے بڑھ گئے لیکن لڑکے کہیں اس طرح جیت ہار سکتے ہیں۔ انھوں نے [illegible] استادوں کے قدم اکھڑ گئے۔ اور وہ کھنچے چلے آئے۔

اس کے بعد پروفیسر جناب اسناد الله صاحب کاظمی نے ایک بہت دلچسپ تقریر کی اور انعامات تقسیم کئے۔ ان انعامات میں دو انعام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک انعام سب سے زیادہ جس بچے کو دیا گیا۔ یہ انعام محمد کریم صاحب طالب علم ثانوی اول نے حاصل کیا۔ اس کے بعد دو انعامات سب سے صاف رہنے والے لڑکوں کو دیئے گئے۔ یہ انعام تبت کے ایک طالب علم غلام محمد متعلم ثانوی دوم اور سید مہدی نقامی متعلم ثانوی چہارم کو ملے۔

اس طرح یہ دلچسپ پروگرام بڑی اچھی طرح ختم ہوا۔

اپریل کا پورا مہینہ ہمارے لئے بہت مصروفیت کا زمانہ رہا۔ دہلی اسٹیٹ کے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کے لئے تئیس ۲۳ کتابیں تیار کی گئیں۔ اسکولوں کے لئے کتابیں تیار کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ جامعہ بچوں کی تعلیم اور لٹریچر کے معاملہ کو ہمیشہ بہت اہمیت دیتی رہی ہے۔ اس لئے اس کام کے انجام دینے میں جامعہ کی برادری کے بہت سے لوگ سرگرم رہے۔ استادوں نے کتابیں لکھیں، طلباء نے نقلیں کیں۔ تنقیدی کمیٹیوں نے جانچا۔ اپریل کا دوسرا ہفتہ تو اتنا دلچسپ اور ہنگامے کا تھا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

جن لوگوں نے اس سلسلے میں کام کیا ان کے ناموں کی بڑی لمبی فہرست ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ ہر صاحب کا نام بنام شکریہ ادا کیا جائے لیکن افسوس کہ پیام تعلیم کے صفحوں میں اتنی گنجائش نہیں۔

مکتبہ یہ کام ہرگز انجام نہ دے سکتا اگر جامعہ اور علی گڑھ کے استاد اور دلی کے علمی حلقوں کی اسے پوری مدد نہ ملتی۔ اس کام میں جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب شیخ الجامعہ اور جناب حامد علی خاں صاحب ڈائرکٹر مکتبہ چیف ایڈیٹر، جناب محمد حفیظ الدین آرگنائزر۔ نگین چند جی اور اگنی ہوتری جی مددگار ایڈیٹر اور آرگنائزر تھے۔

دلی کے مشہور آرٹسٹ بدری بابو اور ہمارے امریکہ سے لوٹے ہوئے عیسیٰ صاحب آرٹ کے کام کے ذمہ دار تھے۔ علی گڑھ کے کچھ آرٹسٹوں اور دیگر حضرات نے بھی ان کی مدد کی۔

جامعہ کے اساتذہ میں ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب پروفیسر مسعود حسین صاحب، جناب مشیر فاطمہ صاحبہ، پروفیسر ضیاء الحسن صاحب فاروقی، پروفیسر عبد الحق صاحب، جناب عبد الغفار صاحب مدھولی، جناب پنڈت تارا چند صاحب، جناب معین الدین صاحب اور ان کے ساتھیوں سے تصنیف و تالیف کا کام بڑی تن دہی سے انجام دیا۔

دہلی کے علمی حلقوں نے بھی خاص دلچسپی لی۔ خصوصاً جناب طاہرہ صاحبہ، جناب نوح ناروی صاحب، جناب ایس پال صاحب، جناب آنا پتی رائے چندیل صاحب، جناب رتن لال بنسل صاحب، جناب کشمی نرائن صاحب اور ان کے ساتھیوں سے تصنیف و تالیف اور اس سلسلے کے دوسرے کاموں میں قابل قدر مدد ملی۔

جناب اشرف صاحب نے باوجود علالت کے مسز موہنی باگڑ و مسز گجرال نے کافی مصروفیتوں کے ہوتے ہوئے بھی اس کام میں تعاون فرمایا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے استادوں میں پروفیسر محمد شفیع صاحب، پروفیسر رشید احمد صاحب اور پروفیسر محمد انس صاحب نے کتابوں کی تیاری میں بڑا حصہ لیا۔ ہمیں یہ قیمتی مدد جناب پروفیسر ڈاکٹر عبد العلیم صاحب کی عنایت اور توجہ سے حاصل ہوئی۔

ہمارے ان سب کاموں کی چہل پہل اور سرگرمی کے پیچھے خواجہ غلام السیدین صاحب کے اس انہماک کا نتیجہ تھا جو لیے ہوئے بدرجہ دکھاتے ہیں۔ موصوف نے اپنے بہت سے ضروری پروگرام ملتوی کر دیے تھے اور رات دن اس کام میں ایسی مستعدی سے لگے رہے کہ دیکھنے والوں میں کام کی امنگ اور جوش پیدا ہوتا تھا۔



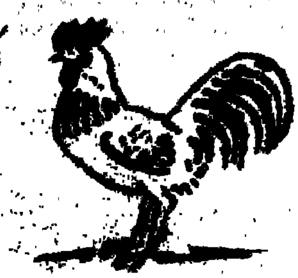


ہمارا گاؤں

گاؤں کو جس دم جائیں گے ہم

دودھ ملائی مکھن اور گھی		کھچڑی چاول انڈا مچھلی
مرغ رسادل دال اور بھاجی		کھائیں گے جو چاہے گا جی

گاؤں کو جس دم جائیں گے ہم



آلو شلجم گاجر مولی		سیم ٹماٹر لوکی گوبھی
چنے کا ساگ ترئی اور بھنڈی		کھائیں گے ترکاری تازی

گاؤں کو جس دم جائیں گے ہم

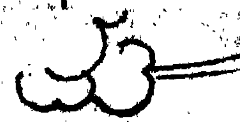


چھائے ہوئے جب بادل ہوں گے		پیڑوں میں ڈالیں گے جھولے
پیڑوں سے جب آم گریں گے		دوڑیں گے ہم اُن کو اٹھانے

گاؤں کو جس دم جائیں گے ہم



ننھے منے رنگ برنگے   سرخ سفید اور نیلے پیلے
دیکھیں گے پھولوں کو کھلتے   بھینی بھینی خوشبو والے
گاؤں کو جس دم جائیں گے ہم



ہرے بھرے پیڑوں کے پودے   دیکھیں گے ہم ہولے ہلتے
دیکھیں گے ہم ہل کو چلاتے   اور کھیتوں کو پانی دیتے
گاؤں کو جس دم جائیں گے ہم



دیکھیں گے دریا پہ جاکے   مچھلیوں کے ہم کھیل تماشے
مرغابی سارس اور بگلے   دیکھیں گے دریا کے کنارے
گاؤں کو جس دم جائیں گے ہم



دیکھیں گے ہم گھر چھپر کے   آدمیوں کو اس میں رہتے
بھیڑیں بکری بیل اور گائے   بچھڑے چھوٹے بندھے ہوئے
گاؤں کو جس دم جائیں گے ہم

خلیل مجوری

سعید الرحمٰن

پانچ سالہ منصوبہ

ادھر دو ایک سال سے اخباروں میں اور ریڈیو پر پانچ سالہ منصوبے کا بہت چرچا رہتا ہے۔ آپ یہ سوچتے ہوں گے آخر یہ کیا چیز ہے؟ اور اس کا تعلق آپ کی زندگی سے کیا ہے؟

منصوبہ یا پلان کا مطلب یہ ہے کہ کچھ خاص کام کرنے سے پہلے اس کے بارے میں اچھی طرح سوچ لیا جائے اور اس کام کے کرنے کے لئے ایک خاص طریقہ اختیار کر لیا جائے۔ جیسے مکان بنانے سے پہلے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کس طرح کا مکان ہوگا۔ اس میں کتنے کمرے ہوں گے۔ چھت اور فرش کس چیز کے ہوں گے، صحن کتنا بڑا ہوگا۔ کتنی مدت میں مکان مکمل ہوگا اور اس پر کیا لاگت آئے گی۔ اسی طرح ملک کو ترقی دینے کے لئے بھی پلان بنایا جاتا ہے۔

یہ تو تم جانتے ہی ہوگے کہ ہمارا دیس بہت غریب ہے۔ ہمیں جتنے غلے کی ضرورت ہے اتنا غلہ نہیں پیدا ہوتا۔ جتنے کپڑے کی ضرورت ہے وہ ہمارے دیس کی ملوں سے نہیں ملتا۔ اور ہم کو باہر کے دیسوں سے اور اس قسم کے دوسرے ضرورت کے سامان منگانے پڑتے ہیں۔ اس طرح دیس کا بہت سا روپیہ دوسرے ملکوں کو چلا جاتا ہے۔ اس لئے حکومت نے ۱۹۵۰ء میں ایک ایسا ہی منصوبہ چلانے کے لئے ایک

کمیشن بنایا، جس نے یہ طے کیا کہ ۵ سال تک یہ منصوبہ چلے گا جس پر ۲۰۶۹ کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا اور پانچ سال کے بعد کھانے کے لئے زیادہ خوراک، پہننے کے لئے زیادہ کپڑا، رہنے کے لئے زیادہ مکان، پڑھنے کے لئے زیادہ مدرسے، کھیلنے کے لئے زیادہ کھیل کے میدان بن جائیں گے۔

دیکھا تم نے کتنے کام کی چیز ہے یہ پانچ سالہ منصوبہ ــــ لیکن تم یہ نہ سمجھ لینا کہ ــــ اس منصوبے کے مکمل ہونے کے بعد تمہارے دیس میں دودھ کی نہریں بہنے لگیں گی اور تم اس میں غوطے لگاؤگے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن بہت دنوں کے بعد جب ایسے ہی کئی اور منصوبے مکمل ہو چکے ہوں گے۔

اب تو تم سمجھ گئے ہوگے کہ اس منصوبے کا تمہاری زندگی سے کیا تعلق ہے۔ اس لئے اب تمھیں اس سے دلچسپی بھی ہوگی۔

اس منصوبے کا سب سے پہلا کام زیادہ غلّہ پیدا کرنا ہے۔ زیادہ غلّہ پیدا کرنے کے لئے کسانوں کی اپنی زمین ہونی چاہئے۔ اسی لئے زمینداری کا خاتمہ کیا جا رہا ہے جس کے مطابق زمین زمیندار کی نہ رہے گی، بلکہ کسان کی بھی ہو جائے گی اور جب کسان کی اپنی زمین ہوگی، اور جب اس کے اپنے کھیت ہوں گے تب کسان جی لگا کر کام کرے گا۔

اس کے کھیت کو بنانے کے لئے، اچھی کھاد بنانے کے کارخانے کھولے جا رہے ہیں۔ اس کے کھیتوں کو سینچنے کے لئے نہریں، کنوئیں اور تالاب بنوائے جا رہے ہیں۔ کھیتوں میں بونے کے لئے اچھے بیج دیئے جا رہے ہیں۔ جب اچھا بیج بویا جائے گا تب ہی تو اچھا اناج پیدا ہوگا۔ اور تب ہی تو زیادہ کپاس پیدا ہوگی اور کپڑے کی ملیں دن رات چلنا شروع ہو جائیں گی۔ پھر کیا ہے دوکانوں پر کپڑے کا ڈھیر نظر آنے لگا۔

لیکن ملیں چلانے کے لئے بھی تو مشین اور اوزاروں کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے لوہا اور کوئلہ زیادہ مقدار میں کانوں سے نکالا جا رہا ہے۔ جن سے زیادہ مشینیں بننی شروع ہوں گی۔ ان کارخانوں میں کام کرنے کے لئے بہت سے لوگ آئیں گے اس طرح ان کو روزگار مل جائے گا۔ لیکن پھر بھی بہت سے ایسے لوگ بچ رہیں گے جن کے لئے کوئی کام نہیں ہوگا۔ ایسے لوگوں کے لئے گھریلو دستکاری شروع کی جا رہی ہے۔ مٹی کے ننھے ننھے برتن بنانا، چٹائیاں بننا، ٹوکریاں بنانا اور ایسی ہی دوسری چھوٹی موٹی چیزیں بنانے کا کام بہت بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱ پر)

کنیز فاطمہ

پنچ تنتر کی ایک کہانی

نادان دوست

کسی ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ اپنے محل میں بڑے آرام سے ایک خوبصورت سے کمرے میں سوتا تھا۔ اس کے بستر پر دو سفید ریشمی کپڑوں کے درمیان ایک جوں رہتی تھی۔ وہ بادشاہ کا خون چوستی تھی اور آرام و چین سے دن گزارتی تھی۔ ایک دن کہیں سے گھومتا ہوا ایک کھٹمل اُدھر سے آنکلا اس کو دیکھ کر جوں کو بہت تکلیف ہوئی اور بولی "تم یہاں کیسے آگئے؟ اس سے پہلے کہ کوئی تم کو دیکھ لے اور مار ڈالے اچھا ہے کہ تم خود یہاں سے بھاگ جاؤ۔

کھٹمل نے بڑی عاجزی سے کہا کہ "اگر بُرا آدمی بھی گھر پر آجائے تو اُسے اِس طرح نہ کہنا چاہیئے۔ بھلے آدمی ہمیشہ اس کی خاطر مدارات کرتے ہیں۔ میں نے کڑوے کسیلے، نمکے ہر طرح کے خون کو چکھا ہے، لیکن میٹھا خون آج تک نہیں چکھا۔ اگر تو مجھ پر مہربانی کرے تو طرح طرح کے لذیذ کھانے سے اس بادشاہ کے بدن میں جو میٹھا خون پیدا ہوا ہے اُسے چکھ کر زبان کا لطف لوں۔" تو اکیلی ہی بادشاہ کا خون

"چوسنا مجھے تو کچھ مناسب نہیں ہے۔" یہ سُن کر جوں نے کہا "ارے کھٹمل، میں تو جب بادشاہ سو جاتا ہے اُس کا خون چوستی ہوں۔ لیکن تو تو جاگتے ہی میں چوسنے لگتا ہے۔ لیکن خیر اگر تو میرے ساتھ خون چوسنا چاہتا ہے تو ٹھہر جا"

کھٹمل نے کہا "تم بے فکر رہو، میں بھی سونے سے پہلے نہ پیوں گا۔"

ابھی وہ دونوں یہی بات چیت کر رہے تھے کہ بادشاہ اپنی چارپائی پر آکر لیٹ گیا اور ابھی وہ سونے بھی نہ پایا تھا کہ کھٹمل نے بڑھ کر کاٹ لیا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ پڑی ہوئی عادت آسانی سے نہیں چھٹتی۔ کھٹمل نے جو کاٹا تو بادشاہ کو محسوس ہوا جیسے کوئی چیز چبھی۔ وہ چارپائی چھوڑ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "ارے دیکھو تو اس چادر میں کیا ہے، کھٹمل ہے یا جوں۔" نوکروں نے چادر کو بڑے غور سے دیکھا کھٹمل تو موقع پا کر اتنی دیر میں چارپائی میں کھسک گیا بے چاری جوں رہ گئی۔ اس کے لئے بھاگنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ جوں پکڑی گئی اور اسی وقت مار دی گئی۔

اسی لئے کہتے ہیں کہ جس کے بارے میں معلوم نہ ہو اُسے کبھی پناہ نہ دینی چاہیئے۔

مشتاق احمد اعظمی



ابتدائی آدمی کی کہانی

ابتدائی آدمی کی کہانی بالکل سیدھی سادی اور سپاٹ ہے۔ اس کی پوری زندگی کی کہانی بس چند لفظوں میں بیان کی جا سکتی ہے۔ کسی پیڑ کے نیچے سے صبح سو کر اٹھنا۔ دن بھر کھانے کی تلاش میں جنگل جنگل بن بن مارے پھرنا، جنگلی جانوروں کے ڈر سے ہر وقت چوکنے رہنا۔ کوئی گیدڑ یا لومڑی ہاتھ لگ گئی تو اس کا کچا گوشت کھا کر سو رہنا، یہ نہ ہوا تو جنگلی درختوں کے جڑوں سے پیٹ بھر لینا۔ یہ بھی نہ ہوا تو بھوکے پڑے رہنا۔

پھر آہستہ آہستہ موسم، حالات کی تبدیلی اور قدرتی طاقتوں نے ابتدائی آدمی کو عقل کا سبق پڑھایا۔ اس نے اپنی عقل اور تجربے سے یہ سیکھا کہ کھانے کی تلاش میں جنگل جنگل مارے مارے پھرنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ جانوروں کی طرح بھٹ بنا کر کسی غار میں بسیرا کرنا چاہئے۔ موذی جانوروں سے بھی محفوظ رہیں گے اور سخت سردی اور گرمی سے بھی۔ چنانچہ اس نے جانوروں کے بھٹوں اور غاروں پر قبضہ کر لیا اور اس نے گھر بنا کر اپنی نئی زندگی شروع کر دی۔ اب بجائے سب الگ الگ پھرنے کے بہت سے لوگ مل کر ایک جگہ رہنے لگے۔

ان کی زندگی کا دارومدار شکار پر تھا اور شکار کا طریقہ بالکل سیدھا سادا تھا۔ کوئی نوکیلا سا پتھر اٹھا کر کھینچ مارا۔ لگ گئی تو واہ واہ نہیں تو ہائے ہائے۔ جس جانور کو مار کر لاتے کسی دھار دار پتھر سے اس کی کھال علیحدہ کرتے۔ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے کرتے اور سب مل کر دانتوں سے نوچ نوچ کر اس کو ہضم کر جاتے۔ کھال کو سکھا لیتے۔ عورتیں پھر اسے دانتوں سے چبا چبا کر نرم کر لیتیں اور یہ جسم ڈھکنے کے کام آتی۔ کھال میسر نہ ہوتی تو درختوں کی چھالیں اور پتیاں اپنے جسم سے لپیٹ لیتے تھے۔ آپ شاید سوچ رہے ہوں کہ ننگے پھرنے میں انھیں شرم آتی ہوگی اور اپنے بدن کو ڈھکنے کے لئے یہ سارے جتن کرتے ہوں گے۔ تو بھئی شرم تو وہ جانتے ہی نہ تھے کیا بلا ہے۔ یہ سارے جتن سردی سے بچنے کے لئے تھے۔

غاروں میں رہنے کی وجہ سے انھیں تھوڑا سا سکون اور اطمینان ملا تو انھوں نے اپنے پتھر کے ہتھیاروں میں بھی کچھ مناسب تبدیلیاں کیں۔ پتھر کے بڑے بڑے ہتھوڑے بنائے، کلہاڑیاں بنائیں۔ نوکیلے پتھر کو لاٹھی کے سرے پر تانت سے مضبوط باندھ کر بھالا بنایا۔ اس طرح پانی رکھنے کا بھی اب تک کوئی سامان نہ تھا۔ ایک غار کے ایک حصے میں اسی ہتھوڑے سے ٹھونک ٹھونک کر ایک گہری سی جگہ کر لی۔ یہ تو پانی رکھنے کے لئے ظرف بھی بن گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ عورتوں کو گہنوں اور بچوں کو کھلونوں کا شوق تو ہوتا ہی ہے۔ عورتیں چھوٹی چھوٹی ہڈیوں اور پتھر کے ٹکڑوں کو تانت میں پرو کر اپنے گلے میں ڈال لیتیں۔ یہ ہوا ان کا نیکلس۔ اور بچے چکنے پتھروں اور ہڈیوں سے دن بھر غار کے باہر کھیلتے پھرتے تھے۔ جی مدرسے سے اب تک چھٹی تھی۔ ابھی کسی کو بولنا تو آتا ہی نہ تھا پھر بھلا پڑھائی کا کیا سوال؟

ان لوگوں کو اب تک آگ کا علم نہ تھا۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ بعض دفعہ جنگلوں میں اپنے آپ آگ لگ جاتی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ رگڑ سے گرمی پیدا ہوتی ہے۔ ہوا کی وجہ سے درختوں کی شاخیں آپس میں رگڑ کھاتی رہتی ہیں۔ اس رگڑ سے کبھی کبھی اتنی تیز گرمی پیدا ہو جاتی ہے کہ جنگل میں آگ لگ جاتی ہے۔ اسی طرح ایک روز رگڑ کی وجہ سے ان کے غار کے پاس کا جنگل دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ اس عجیب چیز کو یہ لوگ حیرت سے منہ پھاڑے دیکھتے رہے۔ جب لوگ قریب پہنچے تو آہا یہاں تو خوب گرمی تھی لیکن

صاحب نے اس خیال سے کہ اسے اپنے غار میں لے چلنا چاہیے ایک دہکتے ہوئے انگارے کو جھٹ ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ ظالم آگ نے ان کی خبر لی تو اسے پھینک سی سی کرتے ہوئے بھاگے۔ ایک بڈھا جو زرا زیادہ عقلمند تھا اس نے اپنے دوست پتھر کی مدد لی اور انگارے کو ایک پتھر کے ٹکڑے پر رکھ کر غار میں لے آئے۔ سب اس کے گرد جمع ہو گئے اور گرم گرم آگ کے مزے لینے لگے۔ آپ کی طرح ایک چلبلے لڑکے نے اس پر سوکھی ہوئی چند پتیاں پھینک دیں تو وہ ایک دم سے جل اُٹھیں۔ یہ لو انھیں آگ کو زندہ رکھنے کا گُر بھی معلوم ہو گیا۔ جب آگ بجھنے لگتی یہ اس پر سوکھی ہوئی پتیاں ڈال دیتے اور وہ بھڑک اُٹھتی۔ یہ لوگ آگ کو کبھی بجھنے نہیں دیتے تھے سوچتے تھے کہ یہ خزانہ ہاتھ سے چلا گیا تو پھر کیا ہو گا۔ آج بھی آگ کو زندہ رکھنے کی رسم چلی آتی ہے۔ پارسی اپنے معبدوں میں ہمیشہ آگ زندہ رکھتے ہیں۔ آگ کا بجھ جانا ان کے نزدیک گناہ کی بات ہے اسی لیے یہ لوگ "آتش پرست" کہلاتے ہیں۔

زرا سوچیے تو صرف ایک آگ کی وجہ سے ابتدائی آدمی کی زندگی میں کیسی رونق آ گئی۔ گوشت کو یہ لوگ بھون کر کھانے لگے سخت سے سخت سردی پڑے لیکن ایسا ہی کوئی بدنصیب ہو گا جو سردی سے اکڑ کر مرتا ہو گا۔ پہلے عورتیں بھی مردوں کے ساتھ ساتھ شکار کو جاتی تھیں اب گھر کا کام بڑھا تو عورتیں گھر کی رانی بنیں اور مرد جنگل کا راجا۔ آگ کو زندہ رکھنا، گوشت کو بھوننا، کھالوں کو تیار کرنا، گہنے اور کھلونے بنانا، بس انھیں دھندوں میں سارا دن بیت جاتا تھا۔

مردوں کو بھی زرا فرصت ملی۔ کسی دن کوئی شکار نہ ملا تو کل کا بھونا ہوا گوشت کھا لیا۔ کسی دن سردی بہت ہی سخت ہوتی تو اپنے مزے سے گھر میں بیٹھے آگ تاپا کرتے۔ فرصت اور سکون میں انسان کا دماغ عجیب عجیب باتیں سوچتا ہے، ایک روز ایک صاحب کا جی غار میں بیٹھے بیٹھے گھبرا گیا تو انھوں نے اپنے بلم سے غار کی دیوار پر خرگوش بنانا شروع کیا۔ ایسی ہی اینڈی بینڈی سی تصویر بنی جیسی دو سری کے بچے بنایا کرتے ہیں لیکن صاحب ان کے لیے یہی بہت تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر وہ پھولے نہ سمائے۔ پھر تو ہر کوئی تصویر بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ کسی نے بارہ سنگھے کی تصویر بنائی تو کسی نے ارنا بھینسے کی۔ آہستہ آہستہ ان کا ہاتھ صاف ہوتا گیا اور تصویریں خوبصورت ہوتی گئیں۔ کوئلے

اور لال پتھر کو پیس کر ان تصویروں میں وہ لوگ کالا اور لال رنگ بھی بھرنے لگے۔

یہ بھی بالکل ابتدائی انسان کی کہانی ہے۔ اس زمانے کو "پتھر کا قدیم زمانہ" کہتے ہیں۔ "پتھر کا زمانہ" کیوں کہتے ہیں، آپ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا جواب کچھ ایسا مشکل نہیں۔ پتھر کا زمانہ اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی زندگی کا سارا کاروبار پتھر ہی کی بدولت چلتا تھا۔ پتھر کے ہتھوڑے، پتھر کی کلہاڑیاں، پتھر کے تیر، پتھر کی چھریاں، پتھر کے کھلونے اور گہنے۔ پانی رکھنے کے لیے برتن بھی پتھر کا۔ اس زمانے کے دو حصے کرتے ہیں۔ جس زمانے کی کہانی ہم نے آپ کو سنائی ہے وہ "پتھر کا قدیم زمانہ" ہے جو حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے ۵۰ ہزار برس پہلے کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد کا زمانہ جس میں انسان نے جانوروں کو سدھانے، کھیتی باڑی کرنے، بات چیت کرنے اور لکھنے کا ڈھنگ سیکھا "پتھر کا نیا زمانہ" کہلاتا ہے۔ یہ زمانہ ۵۰ ہزار قبل مسیح سے ۱۰ ہزار قبل مسیح کا زمانہ ہے۔

ص پانچ سالہ منصوبہ کا بقیہ

پھر دریاؤں کے پیٹ میں جو اتنا پانی بھرا ہوا ہے اس سے بھی تو فائدہ اٹھانا ہے۔ اسی پانی سے نہریں نکالی جائیں گی اور کھیتوں کو سینچا جائے گا۔ اور دوسری طرف بجلی حاصل کی جائے گی جس سے گھر گھر روشنی پہنچے گی۔ ریڈیو پہ نغمے کی الاپ، سینما کے پردے پر رنگ برنگ کی تصویریں اور ناچ گانا۔ اور پھر مزے ہی مزے۔

گاؤں گاؤں میں تفریح کا سامان ہوگا۔ پڑھنے کے لیے اچھے مدرسے ہوں گے۔ اچھے مکان ہوں گے۔ گاؤں گاؤں پکی سڑکیں جن پر پوں پوں کرتی موٹریں دوڑیں گی۔ ریل کی پٹریاں جن پر دھواں اڑاتی چھک چھک کرتی ریل گاڑی آندھی کی طرح بھاگے گی۔

جب یہ سب کچھ ہو جائے گا تو دیس کے سبھی بڑے چھوٹے سکھ چین کی زندگی گزاریں گے۔ اور دیس خوشحال کہلائے گا۔ پھر دنیا کے اور ترقی یافتہ دیسوں کی صف میں ہمارا بھی دیس کھڑا ہوگا۔

اناطول فرانس



دلیری

(اناطول فرانس فرانسیسی زبان کا بہت اچھا لکھنے والا ہے۔ اس افسانے میں بچوں کی حالت دکھائی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ شرمندگی اور وہ بھی ایک عورت کے سامنے بزدلی کی شرمندگی۔ مرد کو سب سے زیادہ دلیر بنا دیتی ہے) (ادارہ)

سورج بڑی آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ ننھی لوئیزاں اور ننھا فریڈرک گیت گاتے ہوئے مدرسے جا رہے ہیں۔ وہ بلبل کی طرح چہچہا رہے ہیں کیونکہ ان کے دل بلبل کی طرح شاد ہیں۔ یہ بچے وہی پرانا گیت گا رہے ہیں جسے کبھی ان کی بڑی بوڑھیاں اٹھتی جوانی میں اپنی ہجولیوں کے ساتھ گایا کرتی تھیں۔ ایک دن آئے گا کہ یہی گیت اُن کے بچے اور پھر اُن کے بچے گائیں گے۔ کیونکہ گیت ایسے سدابہار پھول ہیں جو کبھی نہیں مرجھاتے۔ وہ سالہا سال سے زبانوں پر چڑھتے ہوئے اور ایک زبان سے دوسری زبان پر منتقل ہوتے چلے جاتے

ہیں۔ زبانوں کو موت خاموش کر دیتی ہے لیکن یہ پھول ہمیشہ تروتازہ رہتے ہیں۔

لوشیراں اور فریڈرک گاتے جا رہے ہیں جب وہ اپنے چھوٹے چھوٹے گول گول منہ کھولتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو شگفتہ پھول ہوا کے ہلکے خوش گوار جھونکوں میں ہچکولے لے رہے ہیں۔

ہائیں ہائیں۔ یہ کیا ہو گیا۔ فریڈرک گاتے گاتے یکایک چپ کیوں ہو گیا۔ وہ ایسی کیا چیز تھی جسے دیکھتے ہی فریڈرک کی آواز حلق ہی میں اٹک گئی۔ ہر روز صبح کے وقت جب وہ لوشیراں کے ساتھ مدرسے جاتا تو راستے میں تھوڑی دور تک خوشی خوشی گاتا رہتا۔ لیکن جوں ہی بازار کے موڑ پر قصاب کی دکان کے پاس پہنچتا تو قصاب کے کتے کو دیکھ کر وہ سب راگ رنگ بھول جاتا۔ چہرے کا رنگ اڑ جاتا۔ دہشت سے ننھا سا دل دھڑکنے اور ٹانگیں کانپنے لگتی تھیں اس میں شک نہیں کہ قصاب کا کتا بہت ہی مسکین تھا۔ دوسرے کتوں کی طرح آج تک نہ کبھی کسی کے پیچھے بھاگا یا بھونکا تھا۔ بے چارہ اپنے آقا کی دکان کے پاس ہی چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا۔ اگر قصاب نے کوئی ہڈی یا چھیچھڑا پھینک دیا تو آہستہ سے بڑھ کر اٹھا لیا اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ مگر اس میں بے چارے کا کیا قصور۔ جو اللہ میاں نے اس کی شکل ہی ایسی ڈراؤنی بنائی تھی۔ ایک تو بکری کے برابر قد اس پہ سر سے لے کر دُم تک سیاہ رنگ آنکھیں ایسی جیسے دہکتے ہوئے انگارے۔ دانت سفید نکیلے اور جبڑوں سے باہر نکلے ہوئے۔

فریڈرک نے آج معمول سے زیادہ بہادری دکھائی کہ بڑھ کر ایک بڑا پتھر اٹھا لیا۔ اٹھا تو لیا مگر مارنے کی جرأت کہاں سے لائے۔ سہم کر سامنے کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ سرکتا ہوا گذر گیا —— یہ دیکھ کر لوشیراں خوب ہی ہنسی۔ ظاہر میں تو کچھ نہ کہا۔ مگر ہیبت کر کے اپنے

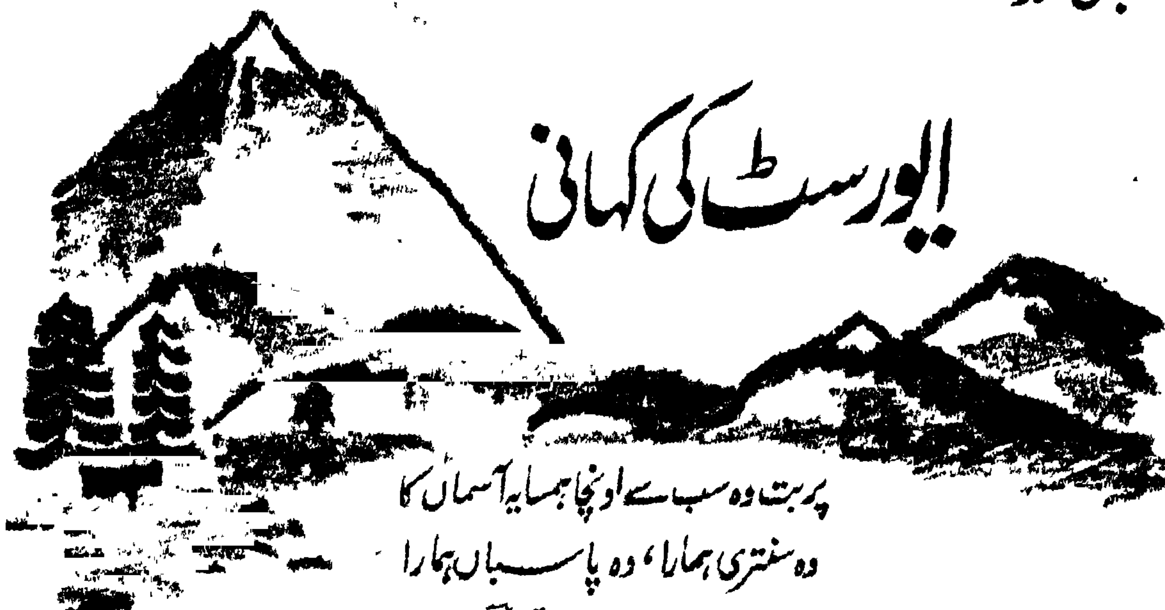
طنز آمیز لہجے میں ادا کرنے لگی کہ فریڈرک سمجھ گیا۔ یہ میری بزدلی پر چوٹ ہے اس کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے گانے میں لوشیران کا ساتھ نہ دیا۔ ایک گہرے سوچ میں ڈوبا ہوا آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ مدرسے پہنچ کر بھی اس نے دن بھر کسی سے بات نہ کی۔ نہ کھیل کود میں حصہ لیا۔ سارا دن اس کے ننھے سے دل میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔ آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر سینکڑوں آفتیں، ہزاروں بلائیں بھی سامنے ہوں تو ندامت ان سب سے بڑھ کر ہیبت ناک ہے۔ اب اُسے صرف ایک ڈر تھا۔ کہ میں کتے سے پھر نہ ڈر جاؤں۔

جب مدرسے سے چھٹی ہوئی تو لوشیران اور فریڈرک گھر لوٹتے ہوئے پھر قصاب کی دکان پر پہنچے۔ مگر اب فریڈرک بہادروں کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا اور بالکل بے خوف ہو کر کتے کی خونی آنکھوں کے سامنے کھٹ کھٹ کرتا ہوا گذر گیا۔

دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جب فریڈرک سر اونچا کئے، سینہ تانے چل رہا تھا تو کنکھیوں سے لوشیران کو بھی دیکھتا جاتا تھا کہ وہ میری شجاعت کو دیکھ رہی ہے۔

اقبال احمد

ایورسٹ کی کہانی



پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
(اقبال)

ہمارا یہ سنتری اور ہمارا یہ پاسبان ہمالہ ہی تو ہے جس کی سب سے اونچی چوٹی ۲۹۰۰۲ فٹ بلند ہے، اور دُنیا کے سب سے بڑے پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ اس کا نام کس نے نہیں سُنا۔
ماؤنٹ ایورسٹ ــــ جس نے ۳۲ سال تک انسان کے عزم اور استقلال کا امتحان لیا۔ کتنے بہادر اور جیالے سورماؤں نے اس کے قدموں میں جانیں دیں۔ کتنے ارادوں اور آرزوؤں کے سامنے اس نے روڑے اٹکائے، اور اُن کی تمناؤں کو خاک میں ملا دیا۔ لیکن انسان جدوجہد کا دوسرا نام ہے۔ اسی جدوجہد نے اسے ہواؤں پر اُڑنا سکھایا۔ اور اسی جدوجہد نے بالآخر ہمالہ کی بلندیوں پر پہنچایا جہاں انسان کا سانس لینا بھی ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ اور آخر کار ۲۹ رمئی ۱۹۵۳ء کو وہ ایورسٹ کے بلندترین مقام پر پہنچ گیا۔
یہ فتح کسی ایک یا دو آدمیوں کی فتح نہیں جو ایورسٹ کی چوٹی پر ۲۹ رمئی کو پہنچے بلکہ ان تمام انسانوں کی فتح ہے جو اس کوشش میں ناکامیاب رہے۔ لیکن ان کی ناکامیوں سے بھی بعد میں آنے والی مہموں کو

پنے تجربات دیئے۔ یہ کوئی ایسا مقابلہ نہ تھا جس میں گ ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے لئے بڑھ رہے ہوں۔ بلکہ اس کی اگر کوئی مثال ہو سکتی ہے تو جھنڈی والی دوڑ کی ہی جس میں دوڑنے والا اپنی منزل پر پہنچ کر جھنڈی اپنے سے آگے والے کے حوالے کر دیتا ہو، یہاں تک کہ آخری دوڑ ختم ہو جاتی ہے اور پھر اس دوڑ میں ہر ایک برابر کا فاتح ہوتا ہے۔

یہی حال ان تمام مہموں کا ہے جو ۱۹۲۱ء سے ۱۹۵۳ء تک ہوتی رہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء کی فتح تو در اصل اس کہانی کا انجام تھی جس کی شروعات ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی۔ اگر اس مہم کے سامنے ایورسٹ کی چڑھائی کے اتنے بڑے تجربے نہ ہوتے تو یہ مہم کبھی کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔

ایورسٹ پر کل گیارہ بار مہمیں گئی تھیں۔

ہمالہ کی صحیح اونچائی ۱۸۵۲ء میں معلوم کی گئی۔ دہرہ دون میں سروے جنرل کے دفتر میں ایک شخص کام کرتا تھا۔ ایک دن جب وہ 'سروے' کے کام میں لگا ہوا تھا تو اسے یہ چوٹی نظر آئی، جو ۲۹۰۰۲ فٹ بلند تھی اور پہلی بار دنیا کو معلوم ہوا کہ یہ دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ پھر اس کا نام سر جارج ایورسٹ سروے جنرل کے نام پر پڑا۔ نیپالی اسے چومولنگ ما کہتے ہیں۔

اس چوٹی کی فتح کا خیال فرانسس ینگ ہزبینڈ کے دل میں ۶۷ سال پہلے پیدا ہوا۔ اس وقت ہمت کتنی بلند سہی لیکن ذرائع محدود تھے۔ لیکن فرانسس ینگ ہزبینڈ کو اجازت نہ مل سکی۔

۱۹۲۱ء میں تبت کے دلائی لاما نے اجازت دی اور پہلی تحقیقاتی مہم کرنل سی ہاورڈ کی رہنمائی میں گئی۔ یہ لوگ پہلی ہی کوشش میں ۲۱۵۰۰ فٹ کی بلندی پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن پھر اس کے آگے نہ جا سکے۔ چونکہ زیادہ اونچائی پر آکسیجن کم ہونے لگتی ہے اس لئے کوہ پیما اپنے ساتھ آکسیجن کی بوتلیں لے جاتے ہیں۔

دوسری مہم ۱۹۲۲ء میں جنرل چارلس بروس کی رہنمائی میں فتح کے ارادے سے روانہ ہوئی۔ چوٹی تک پہنچنے کے لئے میلوری، نارٹن، سمرول اور فنچ جیسے سیاح چنے گئے۔ لیکن یہ مہم بھی ناکام ہوئی۔ اس میں ۷ قلیوں کی جانیں گئیں۔ لیکن میلوری اور نارٹن ۲۷۲۳۵ فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے۔

۱۹۲۴ء میں دو سال بعد تیسری مہم پھر جنرل چارلس بروس کی رہنمائی میں روانہ ہوئی۔

اس میں اروِن نامی ایک نوجوان بھی شامل ہوا جو بڑا ہوشیار تھا۔ اس مہم میں آخری فتح کے لئے میلوری اور اروِن روانہ ہوئے۔ لیکن پھر واپس نہ آسکے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ منزلِ مقصود پر پہنچ گئے لیکن اپنی کامرانی کی خبر لے کر واپس نہ آسکے۔ ایورسٹ کی تمام مہموں میں میلوری اور اروِن کی یہ قربانی بڑی اہم حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے نو سال تک ایورسٹ کی زندگی میں کوئی ہلچل نہ پیدا ہو سکی۔ اور نہ کوئی مہم ہی آئی۔

لیکن ۱۹۳۳ء میں ہوائی جہاز کے ذریعے ایورسٹ پر انسان نے اپنی نظریں ڈال لیں۔ لارڈ کلیڈ سڈیل نے تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کیا۔ اس خبر سے ساری دُنیا میں ہلچل سی مچ گئی کیونکہ ہمالہ کی چوٹی اپنے آپ کو انسان کی نظروں سے محفوظ نہ رکھ سکی۔ لیکن انسان اس فضائی فتح سے مطمئن نہ ہوا۔ اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور اسی سال چوتھی مہم روانہ ہوئی۔ اس مہم کو راستہ بنانے میں بڑی دقت پیش آئی۔ کیونکہ ۹ سال کے طویل عرصے میں ایورسٹ کا نقشہ کافی بدل گیا تھا۔ یہ لوگ کسی نہ کسی طرح ۲۸۱۰۰ فٹ کی بلندی پر تو پہنچ گئے لیکن موسم کی خرابی کے سبب آگے نہ جا سکے اور واپس آگئے۔

اس کے بعد دو مہمیں ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں ارک سپٹن اور رٹلج کی قیادت میں یکے بعد دیگرے گئیں لیکن ان کو بھی نامراد واپس آنا پڑا۔

پھر ساتویں مہم ۱۹۳۷ء کو میجر تلمان کی رہنمائی میں گئی لیکن موسم نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا۔ یہ مہم شمال کی طرف سے ایورسٹ کو فتح کرنے کی آخری کوشش تھی۔ اس لئے کہ اس کے بعد پھر نیپال کے راستے سے مہمیں گئیں۔

۱۹۳۸ء کے بعد لڑائی چھڑ گئی۔ اب ایورسٹ نے پھر اطمینان کا سانس لیا۔ تیرا سال کے بعد ارک سپٹن کی رہنمائی میں ایک وفد بالکل نئے راستے سے گیا۔ یہ راستہ نیپال کی طرف سے تھا۔ اس نے معلوم کر لیا کہ اگر غیر معمولی برف باری نہ ہو تو یہ راستہ پچھلے شمالی راستے کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔ اس نئے راستے کی دریافت نے کوہ پیماؤں کی دنیا میں ہلچل مچا دی۔ ایورسٹ پر نویں اور دسویں مہمیں سوئیزرلینڈ سے ۱۹۵۲ء میں گئیں حکومت نیپال نے ان کو سال بھر کے لئے اجازت دے دی یہ مہم ۲۸۲۱۰ فٹ کی بلندی پر پہنچ کر ناکامیاب واپس آئی۔ دسویں مہم میں شیرپا تین سنگھ

بھی شامل تھا جو ۱۹۵۲ء کی کامیاب مہم میں چوٹی تک پہنچا تھا۔

ان مہموں نے بھی ایورسٹ کی فتح میں اپنے قیمتی تجربات کو شامل کیا تھا۔

آخری مہم مئی ۱۹۵۳ء میں گئی۔ اس کے رہنما سر جان ہنٹ تھے۔ اس میں کل چودہ آدمی شامل تھے۔ ان کے علاوہ ۳۴ شیرپا قلی تھے۔ ۵ فاضل آدمیوں کو بھی رکھ لیا گیا تاکہ کوئی حادثہ پیش آئے تو اُن میں سے کسی کو رکھ لیا جائے۔

اس مہم کے لوگوں کے سامنے ایورسٹ کے تمام پچھلے تجربات تھے۔ انھوں نے یہ طے کیا کہ وہ پہلے ہی بلندی پر چڑھنے کی عادت ڈالیں گے۔ اس طرح ان کو اپنے ضروری سامان کی کمی کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ لیکن یہ لوگ کافی ہوشیار اور چوکنے بھی تھے انھوں نے یہ بھی سوچ لیا کہ مشق کرنے میں زیادہ وقت نہ لگایا جائے بلکہ اتنا ہی جتنا کہ ضروری ہوتا ہے کہ پہاڑ پر خواہ مخواہ زیادہ وقت ضائع نہ ہو۔ یہ تجربہ پچھلی مہموں سے حاصل ہوا تھا۔ جنھوں نے اکثر ابتدائی مشق کے چکر میں ہی اپنی قوت کو زائل کر لیا تھا۔

ان لوگوں نے ایورسٹ پر چڑھنے کے لئے ۹ کیمپ قائم کئے اور آخری بنیادی کیمپ ۲۱۰۰۰ فٹ کی بلندی پر قائم کیا۔ اس وفد کے رہنما کرنل ہنٹ نے دو دو آدمیوں کی دو ٹیمیں چنیں جو یکے بعد دیگرے ایورسٹ جائیں۔ دو ٹیمیں اس لئے تیار کیں کہ بالفرض اگر ایک کو ناکامیابی ہو تو دوسری ٹیم آگے بڑھے۔ پہلی ٹیم میں چارلس ایوانس اور ٹام بورڈلین شامل تھے۔ اور دوسری میں نیوزیلینڈ کا ایڈمنڈ ہلاری اور دارجلنگ کا شیرپا تین سنگھ نورکے۔ پہلی ٹیم ایورسٹ سے ۳۰۰ فٹ نیچے سے واپس آگئی اس کے بعد تین سنگھ اور ہلاری آگے بڑھے اور بالآخر ۲۹؍ مئی ۱۹۵۳ء کو ½ ۱۱ بجے ایورسٹ کے بلندترین مقام پر پہنچ گئے۔ تین سنگھ نے اپنی بغل سے نیپالی، برطانوی ہندستانی اور اقوام متحدہ کے جھنڈے نکال کر وہاں نصب کر دیئے۔ یہ لوگ یہاں ۱۵ منٹ ٹھیرے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے ساری دنیا کا نقشہ پڑا ہے۔ اور دنیا کے سب سے بڑے مقام پر کھڑے ہو کر اس پر نظر ڈال رہے ہیں۔ ایورسٹ کا غرور چکنا چور ہو گیا تھا اور انسان کے قدموں میں اس کی شکست ہوئی اور فطرت کی وہ رازدار چوٹی جس نے ہزاروں سال سے اپنے آپ کو انسان کی نظروں سے چھپا رکھا تھا انسانی عزم کے سامنے سر تسلیم خم کر چکی تھی اور اس طرح ایورسٹ کے سلسلے کی جدوجہد کا ایک باب انسانی عزم کے ہاتھوں پایہ تکمیل پر پہنچا۔

محمود پرویز



جیسی کرنی ویسی بھرنی

بہت دنوں کی بات ہے، کسی ملک میں ایک بادشاہ رہا کرتا تھا۔ اس نے ایک خوبصورت رانی سے شادی کی تھی۔ اس رانی سے ایک ننھی منی، بھولی بھالی لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام رضیہ رکھا گیا۔ اس کی آنکھیں چمکیلی تھیں۔ اس کے بال سورج کی روشنی کی طرح سنہرے تھے۔ اس کے دانت موتی کی طرح اُجلے اُجلے تھے۔ ماں باپ اپنی بچی سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اسے پیار کرتے اور گود میں لے کر ٹہلاتے تھے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جب رضیہ آٹھ برس کی ہوئی تو اس کی ماں سخت بیمار پڑی، اور اس بیماری میں بیچاری مر گئی ـــــ اب رضیہ بڑی اُداس رہتی۔ اس کے چہرے پر پہلے کی طرح خوشی کی جھلک نہ تھی۔ جب اسے ماں کی یاد آتی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا کرتی اور محل کے کونے کونے میں ماں کو ڈھونڈتی۔

ابھی بادشاہ جوان ہی تھا۔ دوستوں کے کہنے سننے سے دوسری شادی کر لی۔ یہ رانی گرچہ بہت امیر تھی مگر رضیہ کی ماں کی طرح خوبصورت نہ تھی۔ اور ساتھ ہی وہ بڑی بدمزاج تھی۔ اس کے محل میں آنے کے بعد سب لوگ اس سے پریشان تھے اور اس سے ڈرتے تھے۔ اور بے چاری رضیہ تو اس کے ظلم کا شکار رہی ہوتی تھی۔ یہ سوتیلی ماں کا بہت سارا کام کرتی اور جھڑکی سنتی۔ نہ جانے کیوں وہ کہا رضیہ ڈائن تھی، چڑیل تھی،

شیطان تھی ۔۔۔ کچھ دنوں بعد اس رانی کے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ یہ رضیہ کی طرح خوبصورت نہ تھی، نہ اس کے بال سنہرے تھے۔ نہ اس کی آنکھیں چمکیلی تھیں۔ وہ رضیہ کی خوبصورتی سے اور بھی جلتی۔

بے چاری رضیہ بڑی مصیبت میں زندگی گذار رہی تھی۔ روز روز اس کی ڈانٹ سنتی مار سہتی ۔۔۔ سوتیلی ماں کے بہکانے سے باپ نے بھی اس کی توجہ کرنی چھوڑ دی تھی۔ اب اس کا باپ بھی اس سے اتنی محبت نہ کرتا تھا۔ ایسی حالت میں رضیہ گھٹ گھٹ کر زندگی گذار رہی تھی۔ اور اکیلے ماں کو یاد کرکے خوب خوب روتی اور پھر تھک کر سو جاتی۔ اس دنیا میں اس کا کوئی اپنا نہ تھا۔

ایک دن رضیہ نے سوچا۔ وہ کب تک ظلم سہے گی۔ بہتر ہے یہاں سے کسی طرف کو چلی جائے۔ اور اپنی قسمت آزمائے۔ اور آخر ایک روز، جب کہ سب لوگ آرام کر رہے تھے، رضیہ ایک تھیلے میں کچھ روٹیاں اور پانی سے بھری ہوئی بوتل رکھ کر، ہمیشہ کے لئے اپنے شاندار محل سے باہر چلی گئی۔ محل سے نکل کر اس نے سیدھے جنگل کا رُخ کیا۔ چلتے چلتے راستہ میں اسے ایک بوڑھا آدمی ملا۔ جو اپنی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا۔ رضیہ کو دیکھ کر اس نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

"بیٹی! بہت بھوکا ہوں۔ کچھ ہو تو دے۔ تیرا بھلا ہوگا۔"

رضیہ تو نیک دل لڑکی تھی۔ جھٹ اس نے دو روٹی تھیلے سے نکال کر بوڑھے کے سامنے رکھ دی۔ اور گلاس میں پانی انڈیل کر اسے بھی رکھ دیا۔ بوڑھا کھاکر بہت خوش ہوا۔ اس نے رضیہ کو بہت بہت دُعائیں دیں۔ پھر پوچھا۔

"اے بچی تو اس جنگل میں کدھر جا رہی ہے کیا تجھے ڈر نہیں معلوم ہوتا؟"

"نہیں، نہیں، میں ڈرنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے خدا پر بھروسہ ہے۔ وہ میری جان بچائے گا ۔۔۔ اور میں اپنی قسمت آزمانے جا رہی ہوں۔"

"اچھا بیٹی! جاتی ہے تو جا۔ مگر یہ ڈنڈا لے لے۔ آگے تجھے کانٹوں سے بھری جھاڑی ملے گی۔ مگر تو اس کی بدولت جھاڑی کو پار کرلے گی۔"

پھر رضیہ وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ چلتے چلتے اسے ایک بہت گھنی جھاڑی ملی۔ مگر ڈنڈے کی بدولت اس نے بڑی آسانی سے اس کو پار کرلیا۔ اس پار پہنچ کر اسے ایک کنواں ملا۔ اب اسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ وہ اس کنویں پر بیٹھ گئی اور اطمینان سے کھانا کھانے لگی۔

اس کنویں میں تین پریاں رہا کرتی تھیں جب کوئی شخص اس کنویں پر آتا تھا تو پریاں آتیں۔ اور باری باری یہ سوال کرتیں۔

"مجھے نہلا دو، مجھے کنگھی کر دو" ۔۔۔ اور جو کوئی ان کا کہنا مان لیتا اس کو یہ دعائیں دیتیں، اور جو نہیں مانتا اسے بددعائیں۔

اور جب رضیہ کھانا کھا چکی تو یہ تینوں پریاں اس کے پاس پہنچیں۔ اور اس سے باری باری کہا۔

"مجھے نہلا دو ۔۔۔ مجھے کنگھی کر دو"

بھلا رضیہ کب انکار کرنے والی تھی۔ وہ تو نیک اور معصوم لڑکی تھی۔ دوسروں کی بات سُننا تو اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سوتیلی ماں کے بُرے برتاؤ کے باوجود اس کی بڑی خدمت کرتی تھی ۔۔۔ تو ہاں، رضیہ جھٹ تیار ہو گئی اس نے تینوں کو باری باری نہلایا اور پھر کنگھی کر دی تینوں بہت خوش ہوئیں۔ پہلی نے کہا: "اس کی سانس میں گلاب جیسی خوشبو ہو گی۔"

"یہ چاند سے بڑھ کر خوبصورت ہو گی۔" دوسری بولی۔

اور تیسری نے کہا: "اس کی ایک خوبصورت شاہزادے سے شادی ہو گی۔" تب تینوں کسی طرف کو چلی گئیں۔

رضیہ وہاں سے اُٹھی۔ واقعی اب اس میں غضب کی خوبصورتی آ گئی تھی۔ اور اس کی سانس میں گلاب کی سی بو تھی۔ رضیہ اس کامیابی پر خوش خوش آگے بڑھتی رہی۔ ٹھیک جس وقت یہ جنگل سے نکل رہی تھی، ایک خوبصورت شاہزادہ شکار کو آ رہا تھا۔ وہ رضیہ کو گھوڑے پر بٹھلا کر اسے اپنے محل میں لایا۔ اور کچھ دنوں بعد بڑی دھوم دھام سے دونوں کی شادی ہو گئی۔ اور دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ رضیہ نے شہزادے سے اپنے باپ کا ذکر کیا۔

ایک دن دونوں بڑی شان سے گاڑی میں بیٹھ کر بادشاہ کے پاس پہنچے۔ بادشاہ ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ کئی روز کے بعد بادشاہ نے انھیں انعام و اکرام دے کر ہنسی خوشی رخصت کیا۔

جب رضیہ کی سوتیلی ماں کو بادشاہ کی زبانی رضیہ کا پورا قصہ معلوم ہوا تو جل ہی تو گئی۔ اس نے بھی عہد کیا کہ وہ اپنی لڑکی کو بھیج کر رہے گی۔

نعیمہ بھی بالکل ماں کی طرح ظالم، بدزبان، اور بدمعاش تھی۔ اس نے ماں سے کہا کہ میں ضرور جاؤں گی۔ اور ایک روز چلنے کو تیار ہوئی۔ ماں نے اسے ایک تھیلا دیا، جس میں کھانے کی بڑی اچھی اچھی

... [illegible] ! نعیم محل سے نکل کر
... کی طرف چلی۔ راستے میں اُسے وہی بڑھیا
... [illegible] ... اس نے نعیم سے
... [illegible] کی برداشت [illegible] تھی۔

اس نے اس بڑھے کو اس زور سے جھڑکی دی کر
بے چارے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور نعیم اس کی
پرواہ کیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ راستے میں اسے گھنی
جھاڑی ملی جس میں کانٹے بکھرے پڑے تھے۔ بڑی
مشکلوں سے اس کو وہ پار کر سکی۔ مگر اس کے کپڑے
پھٹ گئے اور جسم لہو لہان ہو گیا۔ پھر اسے سامنے
... ان نظر پڑا۔ یہ کنوئیں پر آ بیٹھی۔ تھیلے سے چیزیں
... کر کھانے لگی۔ اتنے میں تینوں پریاں کی شکل
... اس کے پاس بھی آئیں اور باری باری فرمائش
کی۔

"مجھے نہلا دو۔ مجھے کنگھی کر دو"
یہ سن کر نعیم غراتے ہوئے بولی۔
"چل ہٹ۔ کیا میں تیری نوکر ہوں۔ بڑی آئی
کہیں کی"
یہ سن کر تینوں پریاں جلال میں آ گئیں۔
"تجھ کو کوڑھ ہو جائے" پہلی نے غصہ میں

"تیری شکل ڈائن کی ہو جائے" دوسری نے
بد دعا دی۔

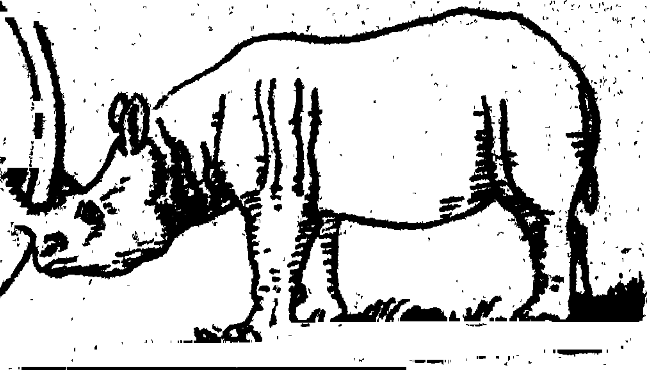
اور تیسری بولی "تیری شادی چمار سے ہو"

پھر نعیم وہاں سے چل پڑی۔ سچ مچ اسے کوڑھ
ہو گیا تھا چلتے چلتے یہ ایک شہر میں پہنچی جس نے اس کو دیکھا
چیخ مار کر دور ہی سے بھاگا۔ اس کی صورت بڑی ڈراؤنی ہو گئی
تھی اور اس کا سارا بدن پھوٹ گیا تھا ایک چمار کی نظر اس پر پڑی
اسے ترس آ گیا اور اپنے گھر لے آیا۔ اسے جڑی بوٹی معلوم تھی۔
ڈھونڈھ کر لایا اور اس کی خدمت شروع کر دی۔ جب نعیم
اچھی ہو گئی تو چمار نے اس سے شادی کر لی۔

ایک دن نعیم نے چمار سے کہا کہ وہ فلاں بادشاہ کی
لڑکی ہے اس لیے وہ اس سے ملنے جائے گی۔ چمار ہنسا اور سمجھا
کہ نعیم کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مگر بار بار کے یقین دلانے پر راضی
ہو گیا اور ایک دن دونوں بادشاہ کے پاس روانہ ہو گئے جب
بادشاہ کے پاس پہنچے، تو اس نے کچھ روپیہ پیسہ دے کر اپنی
سلطنت سے نکلوا دیا جب نعیم کی ماں کو یہ حال معلوم ہوا
تو...... اس نے خودکشی کر لی۔ اور اس کو اپنے
کیے کی پوری سزا ملی۔ سچ ہے۔
جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

ریحان احمد عباسی

گینڈا



گینڈا افریقہ میں پایا جاتا ہے اس کا جسم بھی عجیب طرح کا ہوتا ہے۔ پاؤں اور دھڑ ہاتھی کی طرح بھاری بھر کم، گردن شیر کی طرح سخت اور اکڑی ہوئی، بڑی بڑی آنکھیں۔ بیل کی طرح کے کان۔ ان باتوں کے علاوہ سب سے زیادہ عجیب چیز اس کی ناک کے اوپر کا ٹھوس اور سخت سینگ ہے۔ یہ سینگ دو تین فٹ لمبا ہوتا ہے گینڈے کا وزن ۳۰ من سے ۶۰ من تک ہوتا ہے اس کی لمبائی ۱۰ فٹ اور اونچائی ۵ فٹ کے قریب ہوتی ہے۔ گینڈے کے جسم میں بلا کی طاقت ہوتی ہے وہ اپنے اس سینگ پر ہاتھی تک کو اٹھا کر پھینک سکتا ہے اتنا بھاری بھرکم ہونے کے باوجود بہت تیز دوڑتا ہے وہ ۳۵ میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھاگ سکتا ہے اس وقت جو چیز بھی سامنے آ جاتی ہے اس کو روندتا ہوا نکلا چلا جاتا ہے اور جس جگہ سے گزرتا ہے ایک راستہ سا بن جاتا ہے۔

گینڈا گوشت نہیں کھاتا وہ پیڑوں کی جڑیں کھاتا ہے کھودنے کا کام اسی سینگ سے لیتا ہے گوشت خور نہ ہونے کی وجہ سے عام طور پر وہ بغیر چھیڑے

کسی کو نہیں ستاتا۔ مگر جب کبھی لڑائی ہو جاتی ہے تو غصہ میں آکر سینگ سے چیر پھاڑ کر ٹکڑوں سے کچل دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سے مقابلہ کرتے ہوئے ہاتھی اور شیر جیسے طاقتور جانور بھی گھبراتے ہیں۔

گینڈے کے سینگ سے تلواروں کے قبضے وغیرہ بنتے ہیں اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں بنائی جاتی ہیں جو بہت قیمت کی ہوتی ہیں۔ اس کی کھال سینگ سے بھی زیادہ کار آمد اور قیمتی ہے۔ اس کی بغیر بالوں والی کھردری کھال تقریباً ڈیڑھ انچ موٹی ہوتی ہے جس پر بہت کے پرت چڑھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کھال اتنی سخت اور موٹی ہوتی ہے شیر کے ناخن، تلوار اور بندوق کی گولیاں اس پر اثر نہیں کرتیں اس کی کھال سے ڈھال بنائی جاتی ہے۔ جس پر سپاہی دشمنوں کے وار کو روک کر اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔

اتنا طاقتور اور بڑا ہونے کے باوجود آدمی اسے زندہ پکڑ لیتے ہیں لیکن یہ بڑا خطرناک کھیل ہوتا ہے۔ وہ بھی نتیجے سب سے پہلے گینڈے کی گھومنے پھرنے کی جگہ پر ایک گیلا اور موٹا پیڑ چن لیتے ہیں۔ کچھ آدمی وہیں چھپ جاتے ہیں اور اپنے ہاتھوں میں موٹے موٹے تانت کے بنے ہوئے رسّے تیار رکھتے ہیں۔ اب ایک آدمی گینڈے کو جا کر دور سے چھیڑتا ہے۔ پہلے تو گینڈا دھمکی سے کام لیتا ہے کہ آدمی بھاگ جائے۔ مگر جب وہ برابر چھیڑتا ہی چلا جاتا ہے تو غصے میں آکر بہت زور سے اُس کے پیچھے بھاگتا ہے۔ آگے آگے وہ آدمی بھی اس پیڑ کی سیدھ میں بھاگتا ہے جیسے وہاں چھپنے کے لئے کوئی جگہ ہی تو بنی ہوئی ہے لیکن پیڑ کے قریب آتے ہی آدمی ایک طرف کو بھاگ جاتا ہے اور گینڈے صاحب غصے اور زور میں آکر اسی پیڑ سے ٹکرا جاتے ہیں۔ ان کا سینگ پیڑ میں گھس جاتا ہے پھر تو وہ اور بھی غصے میں

آ کر زور لگاتے ہیں۔ وہ چھپے ہوئے اس موقعے کے منتظر ہوتے ہیں لیکن پھر تو ذرا سی دیر میں گینڈا انسانوں کے قبضے میں ہوتا ہے۔

گینڈے کی عادتیں دوسرے تمام جانوروں سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس کو آپ پکڑنے کے بعد کبھی بھی پالتو نہیں بنا سکتے۔ دوسرے جانور تھوڑے دنوں کے اندر ہی اندر مانوس ہو جاتے ہیں لیکن گینڈا کبھی بھی مانوس نہیں ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ عجائب خانوں میں ان کے لئے خاص قسم کے کٹہرے بنائے جاتے ہیں۔ اور جب بھی اُسے موقع ملتا ہے وہ انسان پر حملہ کرتا ہے۔ در اصل گینڈا اپنی آزادی کو کبھی نہیں بھولتا اور ہمیشہ اس کے لئے تڑپتا رہتا ہے۔

بقیہ "چائے" صفحہ ۴۹ سے آگے

بقیہ "چائے" صفحہ ۴۹ سے آگے

انگلستان میں چائے بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ چائے دانی میں اس کی پتیاں ڈال کر اس میں کھولتا ہوا پانی ڈالتے ہیں۔ اور اس کو چائے پوش سے ڈھک دیتے ہیں۔ ذرا سی دیر کے بعد جب اس کا رنگ گہرا ہو جاتا ہے تو اس میں دودھ اور شکر ڈال کر پیتے ہیں اسی طرح ہندوستان میں بھی چائے پی جاتی ہے۔



لطیفے

اُستاد۔ اخبار سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟
طالب علم۔ گھر میں ردّی جمع ہوجاتی ہے اور ہم اسے بیچ کر قلفی کھاتے ہیں۔

دیہاتی نے ڈاکیے سے، کوئی چٹھی میری بھی ہے؟
ڈاکیہ۔ تمہارا نام کیا ہے؟
دیہاتی۔ میرا نام چٹھی پر لکھا ہے۔

استاد۔ (شاگرد سے) کسی اسم کی مثال دو۔
شاگرد۔ گیتا۔
استاد۔ کوئی اور مثال دو۔
شاگرد۔ ہی دوسرا گیتا۔

فرحت ہاشمی حیدرآباد

منصف۔ (ملزم سے) تم یہاں کیسے آئے؟
ملزم۔ پیدل۔

ماسٹر۔ "کل اسکول میں انسپکٹر صاحب آئے تھے" اس کا ترجمہ انگریزی میں کرو۔
طالب علم۔ مگر ماسٹر صاحب کل تو اسکول بند تھا آپ غلط بات کیوں لکھوا رہے ہیں۔

باپ۔ مُرغی پر پانی کیوں ڈال رہے ہو۔
بیٹا۔ تاکہ کل اُبلا ہوا انڈا دے۔

رضیہ۔ ارے اسلم! بھائی جان کا پمپ کیوں چلا رہے ہو۔
اسلم۔ ایسے ہی تمہیں کیا۔
رضیہ۔ ساری ہوا ختم ہوجائے گی تو

بھائی جان ہوا کیسے بھریں گے۔

ایک آدمی۔ (وکیل صاحب زرا دیکھئے یہ روپیہ کھرا ہے یا کھوٹا۔

وکیل۔ (روپیہ جیب میں ڈال کر) ایک روپیہ اور دیجئے اس لئے کہ میں رائے دینے کی فیس لیتا ہوں۔

ایک طالب علم۔ (کتب فروش سے) کیا آپ کے پاس انسانی جسم پر کوئی کتاب ہے۔

کتب فروش۔ کتاب ہے تو لیکن بیس سال پرانی۔ اس زمانے میں انسانی جسم میں کوئی تبدیلی تو ہوئی نہیں۔ اس لئے نئی کتاب کی ضرورت ہی کیا۔

استاد۔ (امتحان کے کمرے میں) دیکھو تم لکھتے کیوں نہیں۔ تم قلم بند کرکے کیوں بیٹھے ہو۔ پرچہ کیوں نہیں حل کرتے ہو۔

وکی۔ جناب! پرچے میں لکھا ہے کہ اکبر کے حالات قلمبند کرو۔ اسی لئے قلم بند کرکے بیٹھا ہوں۔

باپ۔ سب سے زیادہ کون جانور کام آتا ہے۔

بیٹا۔ گدھا۔

باپ۔ کیوں۔

بیٹا۔ میری شرارت پر آپ اور ماسٹر صاحب گدھے کا ہی نام لیتے ہیں۔

استاد۔ سلیم جب اعظم نے تم کو مارا تھا تو تم نے اسے کیوں مار لیا مجھ سے آ کر کیوں نہیں کہا۔

سلیم۔ جناب! آپ ہی تو کہتے ہیں کہ اپنا کام خود کیا کرو۔

عظیم۔ اگر تمہارے گھر میں چور گھس آئیں تو کیا کرو گے۔

وسیم۔ فوراً رضائی میں گھس جاؤں گا۔

یوسف۔ تمہارا مکان جل رہا ہے۔

عقیل۔ مجھے معلوم ہے۔

یوسف۔ تب تم خاموش کیوں ہو۔

عقیل۔ خاموش کہاں ہوں۔ خدا سے بارش کی دعا کر رہا ہوں۔

[illegible]

صفدر نقوی

بہروپیا

میں بہروپیا ہوں .... جی ہاں، میں ایسا بہروپیا ہوں جسے آپ روز دیکھتے ہیں۔ .... صرف دیکھتے ہی نہیں بلکہ میری بدولت آپ زندہ ہیں۔ کیا آپ مجھے پہچانتے بھی نہیں؟ آپ نے مجھے دیکھا ہے۔ بار بار دیکھا ہے۔ ایک دو بار نہیں آپ مجھے سیکڑوں مرتبہ دیکھتے ہیں۔ آپ نے مجھے ہر روپ میں دیکھا ہے لیکن پہچانا نہیں۔ بتاؤں آپ نے مجھے کس کس شکل میں دیکھا ہے۔ سنئے!۔

پچھلے سال گرمی کا زمانہ تھا۔ بہت سخت گرمی تھی۔ سورج دیوتا خوب چمک رہے تھے۔ دوپہر میں امی نے آپ کو کمرے میں بند کر دیا تھا۔ لیکن ان کے سوتے ہی آپ نکل بھاگے تھے۔ جھلسا دینے والی دھوپ میں کھیل رہے تھے۔ اس وقت میں نے اپنی فوج کے ساتھ آپ کو جلتی دھوپ سے بچا لیا تھا۔ آپ بہت خوش ہو گئے تھے۔ اور میرے سائے میں ٹھاٹھ سے کھیل رہے تھے۔ سورج دیوتا میرے آتے ہی منہ چھپا بیٹھے تھے میری فوج زمین پر چلتی ہوئی نہیں آئی تھی۔ آسمان پر اڑتی ہوئی آئی تھی۔ پھر سارا آسمان بھی چھپ گیا تھا اندھیرا ہونے لگا تھا۔ میں پوری دنیا پر چھا گیا تھا۔ امی جاگ اٹھی تھیں۔ انھوں نے جلدی سے آپ کو اندر بلا لیا تھا۔ جلدی جلدی کپڑے برتن اور دوسرا سامان کمرے میں رکھ لیا تھا۔ وہ بھی میرے آنے سے خوش

تھیں۔ کسان بڑے خوش تھے۔ ہنس ہنس کر اوپر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس وقت جہاں تک نظر جائے میری حکومت تھی۔ اور پھر میرے سپاہیوں نے اوپر سے بوندوں کی شکل میں آترنا شروع کر دیا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ چھپ چھپ کر گھروں میں سے جھانک کر مجھے دیکھنے لگے۔ راستہ چلتے لوگ چھجوں اور گھروں کی آڑ میں پناہ لینے لگے۔ جہاں کوئی سائبان نہ تھا وہاں لوگ پیڑوں کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ کچھ منچلے لوگوں نے چھتریاں کھول کر مجھ سے مقابلہ کیا۔ سر بچ گئے تو کیا ہوا پیر تو پانی اور کیچڑ سے لت پت ہو گئے۔ گرمی کم ہو گئی تھی۔ سب لوگ خوش تھے۔ میرے سپاہی بہت تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگے۔ بہت تیزی سے۔ آپ کا گھر، صحن، چھت سب میں میں ہی میں تھا۔ پھر میں نالیوں اور نالوں میں بہتا ہوا کبھی تیزی سے بھاگتا اور کبھی آہستہ آہستہ سیر کرتا دریاؤں میں مل گیا۔ اور پھر اپنے گھر سمندر میں پہنچ گیا۔

...اور پھر سردیوں کی وہ شام —— جب امی آپ کو باہر نکلنے کے لئے منع کر کے باورچی خانے میں گئی تھیں۔ میری فوج آسمان پہ چھائی ہوئی تھی۔ آپ باہر کھیل رہے تھے کہ میں نے آسمان پر آگ کا سنہری کوندا سا لہرا گیا تھا۔ پھر میں بڑے زور سے گرجا تھا۔ اور آپ...... ہا ہا ہا۔ آگ کے اس کوندے سے ڈر کر اندر بھاگ گئے تھے۔ اس وقت تھا بھی میں بہت غصے میں۔ میں نے اپنا پہلا گولا پھینکا تو سب ڈر کر اندر چھپ گئے تھے۔ اور پھر پوری طرح گولا باری ہونے لگی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ پتھر برس رہے ہیں۔ آپ ڈرے ہوئے بھی تھے اور خوش بھی۔ کبھی دوڑ کر کسی ٹکڑے کو اٹھا لیتے خوش ہو کر کھاتے اور کہتے جاتے تھے "اولے" ہا ہا ہا —— بہت سے لوگوں نے بہت سے ٹکڑے اٹھا کر بوتلوں میں بند کر کے رکھ لئے تھے۔ بوتلوں میں میں پھر اپنی شکل میں آ گیا تھا۔ کہتے ہیں جلے ہوئے جسم پر لگا دیجئے، ٹھنڈ معلوم ہونے لگے گی...... اور پھر میں بے جان اینٹوں کی طرح چھتوں پر، گھر میں، بازار میں، گلیوں میں اور کھیتوں میں پڑا رہ گیا تھا۔ پھر میرے جسم میں کچھ گرمی آئی تو آپ نے دیکھا تھا کہ اولے غائب ہو گئے تھے۔ اور میں پہنچنے کے لئے جلدی جلدی نالیوں اور نالوں کے راستے اپنے گھر چلا گیا تھا۔

آپ نے دیکھا ہے کہ امی سالن پکاتے میں سبزی اور مصالحوں کے ساتھ پتیلا بند کر دیتی ہیں۔

اور میں وہاں سے غائب ہو جاتا ہوں۔ آپ نے مجھے چائے کی کیتلی اور سالن کی دیگچی میں سے بھاگنے کی کوشش کرتے دیکھا ہوگا۔ سچی سچی بات یہ ہے کہ میں زیادہ گرمی برداشت نہیں کرسکتا۔ جہاں مجھے زیادہ گرمی لگی اور میں نے بھیس بدلا بھاپ بن کر ذرا سی دیر میں نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ آپ کی امی آپ کے کپڑے مجھ سے صاف کرتی ہیں۔ تو میں کپڑوں میں جذب ہو جاتا ہوں۔ وہ کپڑے دھوپ میں رسّی پر ڈال دیتی ہیں۔ کبھی یہیں سوکھنے ڈالے ہیں۔ میں نے دھوپ کی گرمی کھائی اور میں غائب ـــــ لیکن میری مصیبت اُس وقت آتی ہے جب امی سالن کی دیگچی ڈھک دیتی ہیں۔ میں بلبلا کر بھاپ کے بھیس میں بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن راستہ نہیں ہوتا۔ ڈھکنے سے سر ٹیک کر پھر اپنی شکل میں آجاتا ہوں۔ اور بوند بن کر دیگچی میں گر پڑتا ہوں۔

آپ نے مجھے کیتلی اور دیگچی سے بھاگنے اور ہوا کے کاندھوں پر سوار حملہ کرتے دیکھا ہے اس صورت میں آپ مجھے بھاپ کہتے ہیں۔

آپ نے مجھے گرمی کے زمانے میں سلون کی شکل میں بازاروں میں بکتے دیکھا ہے۔ ایسی صورت میں مجھے ٹاٹ میں لپیٹ کر رکھتے ہیں کہ کہیں بھاگ نہ جاؤں ـــــ آپ نے مجھے آسمان سے پتھر کی شکل میں گرتے دیکھا ہے، لوگ ایسی صورت میں برف اور اولا وغیرہ کہتے ہیں۔

آپ نے مجھے بڑے بڑے دریاؤں میں دوڑتے اور تیزی سے بہتے دیکھا ہے۔ آپ کے کپڑے مجھ سے صاف ہوتے ہیں۔ آپ اپنا جسم مجھ سے صاف کرتے ہیں۔ پیاس بجھانے کے لئے مجھے پی جاتے ہیں۔ اس شکل میں مجھے کیا کہتے ہیں؟ بتایئے تو۔

گرمی لگنے پر میں بھیس بدل کر بھاپ بن جاتا ہوں اور ہوا میں مل جاتا ہوں۔ لیکن بھی ایسی حالت میں بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے کہ کہیں کسی چیز سے ٹکرا نہ جاؤں یا سردی نہ لگ جائے ورنہ پھر اصلی شکل میں آجاتا ہوں اور بہنے لگتا ہوں۔

اگر مجھے بہت زیادہ سردی لگ جائے تو پھر میں پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہوں یا یوں کہیئے کہ برف بن جاتا ہوں لیکن اس حالت میں گرمی سے بچنا پڑتا ہے۔ ذرا گرمی لگی اور میں اپنی اصلی شکل میں آیا۔

یہ ہیں میرے تین روپ۔ کیا آپ نے مجھے پہچان لیا۔ بھلا بتایئے تو میں کون ہوں؟

چاند بی بی

چاند بی بی تخت پر بیٹھی سوچ رہی ہے۔ کمرہ خالی ہے۔ باہر توپوں کے چھٹنے کی آواز آ رہی ہے۔ "شاباش بہادر شاباش بہادرو!" کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ ہتھیاروں کی جھنکار بھی سنائی دیتی ہے۔ چاند بی بی غور سے ان آوازوں کو سننے لگتی ہے پھر خود ہی کہہ اٹھتی ہے۔ آہ کب تک! یہ مقابلہ ہو سکتا ہے۔ ہائے میرا وطن! پیارا وطن! اکبر کا زیر دست لشکر اور احمد نگر کے مٹھی بھر سپاہی۔ ایک طرف گنگا اور دوسری جانب مٹی کی کچی دیوار۔ مگر۔۔۔ مگر مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ میں اس زمین کو جس میں پلی اور بڑھی ہوں۔ جس میں میرے بڑوں کی ہڈیاں گڑی ہیں دشمنوں کے گھوڑوں کے سموں سے پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ ہائے! مگر کیسے بچاؤں؟ کیسے حفاظت کروں؟۔ نظام الملک چھوٹا ہے۔ غلاموں اور حبشیوں کا زور ہے۔ ہائے اللہ کیا

وں۔ کیا نہ کروں؟ صلح کرتی ہوں
عزت جاتی ہے۔ جنگ جاری رکھتی
ہوں تو ریاست جاتی ہے۔
کسی کے آنے کی آہٹ سنتی
ہے۔ آنے والا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔
چاند بی بی۔ کون ہے اندر آؤ۔
(ایک فوجی افسر اندر آتا ہے۔
آنکھوں سے گھبراہٹ اور چہرے سے
پریشانی ٹپکتی ہے۔ سلطانہ کھڑی ہو
جاتی ہے
افسر: سلطانہ اب جم کر لڑنا ناممکن
ہوتا جاتا ہے۔ دشمن کی فوج جس
طرح بڑھتی جاتی ہے اسی طرح ہماری
فوج کی گنتی گھٹتی جاتی ہے۔
چاند بی بی: مگر ہار جیت گنتی کے گھٹنے
یا بڑھنے سے نہیں ہوتی۔ جیت بازو
کی قوت اور دل کی مضبوطی سے ہوتی
ہے۔
افسر: مگر سلطانہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں
پھوڑ سکتا۔
چاند بی بی: تو کیا تم چاہتے ہو کہ مغلوں

سے ہار مان لی جائے۔
افسر: جی ہاں، میں عرض کرتا ہوں
اب لڑائی اور ہمت کا وقت نہیں رہا۔
چاند بی بی: تمھیں شرم نہیں آتی؟
افسر: اپنے سے طاقتور سے ہار
مان لینا شرم کی بات نہیں ہے۔
چاند بی بی۔ بہت ٹھیک، مگر یہ ملک
کا، وطن کا سوال ہے۔
افسر: احمد نگر ہمارا وطن نہیں ہم
ترکستان اور افغانستان کے رہنے
والے ہیں۔
چاند بی بی۔ دور ہو جا میرے سامنے
سے۔ ہٹ جا یہاں سے، باغی کہیں
کا، تو ہوگا افغانستان اور ترکستان کا۔
تو وہیں چلا جا۔ تیرے لئے اس ملک
میں جگہ نہیں۔ چاند بی بی اس ملک
میں پیدا ہوئی۔ اسی میں اب تک
زندہ ہے اور مر کر بھی اسی میں
گڑے گی۔
افسر: تمھارے منہ سے یہ باتیں بھلی
نہیں معلوم ہوتیں۔ سلطانہ تم بھولتی ہو

کہ تمھارے نازک ہاتھ نہیں بلکہ یہ مضبوط ہاتھ اس بوجھ کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہی موٹے موٹے، میلے سخت ہاتھ۔

چاندبی بی:- کسی ہاتھ کا موٹا، کھردرا اور گندا ہونا اس کی مضبوطی کی دلیل نہیں۔

افسر:- دیکھو گی اس کی طاقت سلطانہ۔

چاندبی بی:- مجھے اس کی طاقت کیا دکھائے گا۔ چاند سلطانہ دکن کے کسی طاقتور مرد سے تلوار اور تیر چلانے میں کم نہیں۔

افسر:- ہاں یہ گھمنڈ!

چاندبی بی:- چاند بی بی گھمنڈ نہیں کرتی۔ مگر وہ کسی سے دبتی نہیں اور ..... اور نہ وہ مغلوں سے ڈر کر ہار مان لینے کے لئے تیار ہے۔

افسر:- تو کیا میں مغلوں سے ڈرتا ہوں۔

چاندبی بی:- اگر ڈرتا نہیں تو رشوت لی ہے۔

افسر:- کیا کہا؟

چاندبی بی:- سچی بات کڑوی لگتی ہے۔ کیوں؟

افسر:- سلطانہ! خدا کی قسم! اب تمھاری ہاتھیں سنی نہیں جا سکتیں۔

چاندبی بی:- تو کیا تم نے سمجھا تھا کہ تمھاری تلوار کی طرح میری زبان کو بھی زنگ لگ گیا ہے۔

افسر:- (تلوار کھینچتے ہوئے) تو میں ابھی بتائے دیتا ہوں کہ میری تلوار کو زنگ نہیں لگا ہے۔

چاندبی بی (زور سے ہنس کر) واہ! واہ! کیا بہادری، کیا دلیری، کیا جرات ہے؟ ایک نہتی عورت پر۔ ایسی عورت پر جو تمھاری حاکم ہے، افسر ہے۔ جس کا تم نمک کھاتے ہو۔ حملہ کرنا۔ کیا احمد نگر کے فوجی افسروں کی یہی شان ہے؟ رک کیوں گئے؟ ہاں ہاں وار کرو۔ تم تو ترکستان اور افغانستان کے رہنے والے ہو؟ تمھارا تو احمد نگر وطن نہیں ہے۔ باپ دادا کی نہ یہاں قبریں ہیں۔ اور نہ ان کا خون اس جگہ کی مٹی میں ملا ہوا ہے۔

افسر:- (تلوار غصے سے میان میں رکھتے ہوئے) تم ہے عورت سے کوئی

نہیں جیت سکتا۔ (دروازے کی طرف مڑتا ہے)

چاند بی بی۔ (تخت سے اترتی ہے۔ افسر کے برابر آتی ہے۔ افسر کے کاندھے پر داہنا ہاتھ رکھتے ہوئے) تم دلیر ہو۔ بہادر ہو۔ مجھے تم سے یہ امید ہے کہ تم اب پھر رن سے اس طرح پلٹ کر نہ آؤ گے سپاہی کا کام بس لڑنا اور مرنا ہے۔ راج راجاؤں کا کام ہے، اس لئے صلح ہوگی یا نہ ہوگی یہ مجھ پر چھوڑ دو۔

افسر۔ (جھینپ کر) سلطان میں شرمندہ ہوں

چاند بی بی۔ (دل بڑھانے کے طور پر) نہیں مجھے تمہاری باتوں کا کوئی خیال نہیں۔ ہاں اتنا یاد رکھو کہ میں عورت ہوں۔ میرا دل تم جیسے سپاہیوں کی موت سے بہت دکھتا ہے۔ مگر۔ مگر میں سچ کہتی ہوں تم اگر میرے بیٹے بھی ہوتے تو میں یہی دعا کرتی کہ خدا تمہیں رن میں عزت کی موت دے اور اس دن کے لئے زندہ نہ رکھے جب تم اپنی آزادی کو کھو کر دشمن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہو
(افسر سر جھکائے ہوئے سلام کرکے باہر چلا جاتا ہے)

ذرا ہنسئے تو

ناظر۔ انسان اندھا کب ہو جاتا ہے۔
طالب علم۔ اندھیرے میں۔

گاہک۔ (دکاندار سے) مجھے جلدی سے ایک پنجرا دو مجھے گاڑی پکڑنی ہے۔
دکاندار۔ میرے پاس اتنا بڑا پنجرا نہیں ہے کہ اس میں گاڑی آجائے۔

مالک۔ (نئی خادمہ سے) میں بہت کم بولتا ہوں جب میں ہاتھ کا اشارہ کروں تو سمجھ جانا کہ میں بلا رہا ہوں۔
خادمہ۔ مجھے بھی کم بولنے کی عادت ہے جب میں سر ہلاؤں تو سمجھ لینا کہ میں نہیں آ پاتی۔

کہ تمھارے نازک ہاتھ نہیں بلکہ یہ مضبوط ہاتھ اس بوجھ کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہی موٹے موٹے، میلے سخت ہاتھ۔

چاند بی بی:۔ کسی ہاتھ کا موٹا، کھردرا اور گندا ہونا اس کی مضبوطی کی دلیل نہیں۔

افسر:۔ دیکھو گی اس کی طاقت سلطانہ۔

چاند بی بی:۔ مجھے اس کی طاقت کیا دکھائے گا۔ چاند سلطانہ دکن کے کسی طاقتور مرد سے تلوار اور تیر چلانے میں کم نہیں۔

افسر:۔ ہاں یہ گھمنڈ!

چاند بی بی:۔ چاند بی بی گھمنڈ نہیں کرتی۔ مگر وہ کسی سے دبتی نہیں اور ...... اور نہ وہ مغلوں سے ڈر کر ہار مان لینے کے لئے تیار ہے۔

افسر:۔ تو کیا میں مغلوں سے ڈرتا ہوں۔

چاند بی بی:۔ اگر ڈرتا نہیں تو رشوت لی ہے۔

افسر:۔ کیا کہا؟

چاند بی بی:۔ سچی بات کڑوی لگتی ہے۔ کیوں؟

افسر:۔ سلطانہ! خدا کی قسم! اب تمھاری باتیں سنی نہیں جا سکتیں۔

چاند بی بی:۔ تو کیا تم نے سمجھا تھا کہ تمھاری تلوار کی طرح میری زبان کو بھی زنگ لگ گیا ہے۔

افسر:۔ (تلوار کھینچتے ہوئے) تو میں ابھی بتائے دیتا ہوں کہ میری تلوار کو زنگ نہیں لگا ہے۔

چاند بی بی (زور سے ہنس کر) واہ! واہ واہ! کیا بہادری، کیا دلیری، کیا جرات ہے؟ ایک نہتی عورت پر۔ ایسی عورت پر جو تمھاری حاکم ہے، افسر ہے۔ جس کا تم نمک کھاتے ہو۔ حملہ کرنا۔ کیا احمد نگر کے فوجی افسروں کی یہی شان ہے؟ رک کیوں گئے؟ ہاں ہاں وار کرو۔ تم تو ترکستان اور افغانستان کے رہنے والے ہو؟ تمھارا تو احمد نگر وطن نہیں ہے۔ باپ دادا کی نہ یہاں قبریں ہیں۔ اور نہ ان کا خون اس جگہ کی مٹی میں ملا ہوا ہے۔

افسر:۔ (تلوار غصے سے میان میں رکھتے ہوئے) سچ ہے عورت سے کوئی

نہیں جیت سکتا۔ (دروازے کی طرف مڑتا ہے)

چاند بی بی:۔ (تخت سے اترتی ہے۔ افسر کے برابر آتی ہے۔ افسر کے کاندھے پر داہنا ہاتھ رکھتے ہوئے) تم دلیر ہو۔ بہادر ہو۔ مجھے تم سے یہ امید ہے کہ تم اب پھر رن سے اس طرح پلٹ کر نہ آؤ گے سپاہی کا کام بس لڑنا اور مرنا ہے۔ راج راجاؤں کا کام ہے، اس لئے صلح ہوگی یا نہ ہوگی یہ مجھ پر چھوڑ دو۔

افسر:۔ (جھینپ کر) سلطان میں شرمندہ ہوں

چاند بی بی:۔ (دل بڑھانے کے طور پر) نہیں مجھے تمہاری باتوں کا کوئی خیال نہیں۔ ہاں اتنا یاد رکھو کہ میں عورت ہوں۔ میرا دل تم جیسے سپاہیوں کی موت سے بہت دکھتا ہے۔ مگر۔ مگر میں سچ کہتی ہوں تم اگر میرے بیٹے بھی ہوتے تو میں یہی دعا کرتی کہ خدا تمھیں رن میں عزت کی موت دے اور اس دن کے لئے زندہ نہ رکھے جب تم اپنی آزادی کو کھو کر دشمن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہو۔

(افسر سر جھکائے ہوئے کمرے کے باہر چلا جاتا ہے)

ذرا ہنسئے تو

ماسٹر۔ انسان اندھا کب ہوجاتا ہے۔

طالب علم۔ اندھیرے میں۔

گاہک۔ (دکاندار سے) مجھے جلدی سے ایک پنجرا دو مجھے گاڑی پکڑنی ہے۔

دکاندار۔ میرے پاس اتنا بڑا پنجرا نہیں ہے کہ اس میں گاڑی آجائے۔

مالک۔ (نئی خادمہ سے) میں بہت کم بولتی ہوں جب میں ہاتھ کا اشارا کروں تو سمجھ جانا کہ میں تمہیں بلا رہی ہوں۔

خادمہ۔ مجھے بھی کم بولنے کی عادت ہے جب میں سر ہلادوں تو سمجھ لیجئے گا کہ میں نہیں آنا چاہتی۔

بچوں کی کوششیں



رشوت مانگنے کی سزا

کسی گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا۔ وہ بڑا سمجھدار آدمی تھا۔ لیکن تھا بہت غریب۔ یہ کسان اپنی زبان میں بڑے اچھے اچھے شعر کہتا تھا۔ ایک دن اس کسان نے سوچا، چلو، راجا کے پاس اپنے گیت سنا کر کچھ انعام حاصل کر لیں۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی پرانی شال اور پگڑی پہنی اور چل پڑا۔ کسان جب راجا کے محل پر پہنچا۔ وہاں ایک سپاہی پہرا دے رہا تھا۔ سپاہی نے اس غریب کسان کو دیکھ کر اسے روکا۔ "خبردار کون ہے؟" کسان نے کہا "بھائی میں ایک غریب کسان ہوں۔ مہاراجا سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔" سپاہی نے کہا "جاؤ مہاراج کو فرصت نہیں ہے۔" کسان سمجھ گیا کہ یہ آدمی رشوت خور ہے اس لئے کہ اکثر راج دربار کے نوکر رشوت کے عادی ہوتے ہیں۔ اگر ان کو رشوت نہ دیں تو کسی کا کام نہیں کرتے۔ کسان نے کہا بھائی مجھے جانے دو جو کچھ انعام و اکرام ملے گا اس میں سے تم کو بھی کچھ حصہ دوں گا۔ سپاہی نے کہا، اچھا اب تم جا سکتے ہو۔ کسان دربار میں پہنچا۔ وہاں اس نے اچھے اچھے گیت سنائے۔ راجا نے خوش ہو کر اپنے خزانچی کے نام ایک خط لکھ دیا۔ کہ ان کو پانچ روپے دے دو۔ کسان روپے لے کر گھر چلا گیا۔ سپاہی کو روپے دینا بالکل بھول گیا۔ دوسرے دن وہ پھر آیا اس دن پھر اس نے سپاہی کو کچھ انعام دینے کا وعدہ کیا لیکن پہلے کی طرح

یں دیا۔ اس طرح کئی دن گزر گئے۔ سپاہی سوچنے
یہ کسان بڑا جھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ اچھا اب اس کو
کی سزا دینی چاہیئے۔

سپاہی راجا کے پاس پہنچا اور سلام کرکے بولا:
ور وہ کسان جو روز یہاں آتا ہے بہت بُرا آدمی
علوم ہوتا ہے۔ وہ لوگوں سے آپ کی شکایت
تا پھرتا ہے۔ میں نے کل اپنے کانوں سے شکایت
تے ہوئے سُنا۔ راجا نے سپاہی کی بات سچ
ن لی، دوسرے دن پھر جب وہ کسان دربار
یں آیا۔ کسان کے گیت سُننے کے بعد راجا نے
پنے خزانچی کے نام ایک خط لکھ دیا۔ کسان جب
خط لے کر باہر آیا تو اس سپاہی کے پاس گیا اور
خط اس کے ہاتھ میں دے کر بولا: "لو بھائی آج کا
نعام تم ہی لو" سپاہی خط لے کر خوش ہوتا ہوا خزانچی
کے پاس پہنچا۔ خزانچی نے جب خط کو پڑھا حیران
رہ گیا۔ اس میں لکھا تھا کہ "اس خط کے لانے والے
کو دس کوڑے لگوا دو" بے چارے سپاہی کو کیا
معلوم تھا کہ چٹھی میں کیا لکھا ہے۔ خزانچی نے راجا
کے حکم کے مطابق سپاہی کو دس کوڑے لگوا دیئے۔
بے چارا مار کھا کر روتا پیٹتا راجا کے پاس گیا۔
راجا کو خزانچی پر بہت غصہ آیا۔ اس نے خزانچی
کو بلوا کر پوچھا تم نے سپاہی کو کیوں پیٹا؟ خزانچی نے
ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور کا حکم تھا میں نے اس پر عمل کیا۔
یہ سپاہی خط لے کر میرے پاس آیا۔ میں نے آپ کے
حکم کے مطابق اس کو کوڑے لگوا دیئے۔ راجا بہت
حیران تھا۔ اس نے سپاہی سے پوچھا "یہ چٹھی تم کو
کیسے ملی؟" سپاہی نے کہا حضور اس کسان نے
دی جو روز یہاں آیا کرتا ہے۔ اب راجا نے کسان کو
بلوا کر پوچھا۔ کسان نے سارا قصہ سُنایا۔ تب راجا کو
اس سپاہی پر بہت غصہ آیا۔ اس نے فوراً اُسے
نوکری سے نکال دیا۔

دی۔ احمد۔ بادشاہ جوہر میلوشارم

بیجو چرواہا

کسی گاؤں میں بیجو نامی ایک غریب لڑکا رہتا
تھا۔ وہ روزانہ کھانے کے لیے دو روٹیاں باندھ کے
گائے چرانے جنگل جایا کرتا تھا۔ رات کو اس کی
ماں بھوتوں، پریتوں، بادشاہوں اور پریوں کی
کہانی سنایا کرتی تھی۔ لیکن نہ جانے بیجو کو پریوں کی
کہانیاں سُننے میں کیوں اتنی دلچسپی تھی۔ وہ جب
گائے چرانے جاتا تو ہری ہری گھاس کے میدان
میں جھرنے کے پاس گائیں چرنے کے لیے چھوڑ دیتا

پھر وطن جانے کے بجائے گتے کی طرح بھاگ کر ایک پیڑ کے نیچے جا بیٹھا۔ اس وقت وہ محسوس کرتا کہ وہ پریوں کے ملک کا شہزادہ ہے۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ گیدڑ کے جھنڈ کے جھنڈ ایک طرف چلے جا رہے ہیں۔ بیجو نے آگے بڑھ کر پوچھا "کہاں جا رہے ہو بھائی؟" لیکن کسی نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ تب بیجو کے دل میں کچھ شک ہوا۔ اس لئے وہ بھی گیدڑوں کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ دیکھا کہ ایک جنگل کے اندر ایک جگہ بھیڑ لگی ہے اور ایک بوڑھا گیدڑ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا ہے "بھائیو! آپ لوگ کئی دنوں سے بھوک کے مارے پریشان ہیں۔ مجھے ہمدردی ہے اس لئے میں ابھی آپ لوگوں کو ایک خوشخبری سنا رہا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آج پریوں کی شہزادی کا سوئمبر ہونے والا ہے۔ وہاں خوب دعوتیں ہوں گی۔ میں آپ لوگوں کو سمندر کے اندر جانے کی راہ بتا دوں گا۔ جس سے آپ لوگ صحیح سلامت وہاں پہنچ جائیں گے لیکن ہاں! ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ کوئی آدمی آپ کے ساتھ نہ جاوے ورنہ جان کی خیر نہیں۔

بیجو اس خبر کو سن کر خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا۔ لیکن آخری بات سن کر بہت فکر مند ہو گیا۔ وہ بھی اس سوئمبر کو دیکھنا چاہتا تھا۔ بھلا وہ اس نازک ترین موقع کو کب چھوڑنے والا تھا۔ اس لئے وہ گیدڑوں کے پیچھے ہو لیا۔ آخر میں سب گیدڑ ایک ایک کر کے سمندر میں کود پڑے۔ بیجو بھی بنا سوچے سمجھے سمندر میں کود پڑا۔ اس کے بعد ایک بہت بڑی مچھلی نے بیجو کو سمندر کے اندر پہنچا دیا جہاں بادشاہ کا محل تھا۔ اب بیجو چاروں طرف ہر چیز کو بڑی حیرت سے دیکھنے لگا۔ اور اس فکر میں تھا کہ شہزادی کو کسی طرح دیکھے۔ کچھ دیر بعد بیجو گھومتے گھومتے شہزادی کی کوٹھری کے قریب پہنچ گیا۔ جونہی شہزادی کی نظر بیجو پر پڑی تو وہ شہزادی فوراً ایک چڑیا بن گئی۔ اب تو سارے محل میں ایک سناٹا چھا گیا۔ سب لوگوں نے بیجو کو چاروں طرف سے گھیر لیا اب تو ڈر کے مارے اس کے ہوش و حواس ٹھکانے نہ رہے جب سب نے کہا کہ شہزادی کی شادی تم سے ہوگی تب کہیں بیجو کے حواس بجا ہوئے۔ کچھ دیر بعد دونوں میں شادی ہو گئی۔ بیجو دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ چڑیا شہزادی کو لے کر کیا کرے گا لیکن بادشاہ نے کہا کہ جب تم اسے گھر لے جاؤ گے تو یہ پھر شہزادی بن جائے گی۔

اچانک بیجو کی پیٹھ پر کسی نے زور سے دو گھونسے رسید کئے وہ تلملا کر اُٹھ بیٹھا اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھتا ہے کہ اس کا مالک لال آنکھیں کئے ہوئے ڈنڈا لے کر کھڑا ہے۔ اور کہہ رہا ہے "بڑے نواب کے نواسے بنے ہو۔ بے ایمان تو گائے چرانے آتا ہے یا پھولوں کے بچھونے پر سونے۔ کمبخت نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ جا کر دیکھ تو گائیوں نے فصل کی کیا حالت کی ہے؟"۔

بیجو اب چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا کہ اس کی شہزادی کہاں اُڑ گئی.....!

عبدالواحد بیدل پورینہ

بوتل کا بھوت

رامو نامی ایک لکڑہارا ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا تھا۔ صبح سے شام تک محنت مزدوری کرکے وہ اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا چند سال میں اس نے کچھ روپیہ جمع کر لیا تھا۔ جب ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا نام راجو رکھا۔ جب راجو بڑا ہوا تو رامو نے اس کو پڑھنے کے لئے قریب کے ایک اسکول میں بھیجا۔ ابھی راجو دو ہی سال پڑھنے پایا تھا کہ اس کے باپ کا جمع کیا ہوا روپیہ ختم ہو گیا۔ باپ ہیڈ ماسٹر کے پاس گیا اور کہا "حضور! میرے پاس اتنا روپیہ نہیں کہ اپنے لڑکے کو پڑھا سکوں۔ اس لئے اس کو مفت پڑھنے کی اجازت دے دیجئے۔ ہیڈ ماسٹر نے کہا فیس معاف نہ ہوگی۔ رامو نے جوں ہی یہ سُنا رونے لگا۔ مگر ظالم ہیڈ ماسٹر پہ کچھ اثر نہ ہوا۔ مجبوراً راجو کو اسکول چھوڑنا پڑا۔

باپ نے راجو سے کہا "بیٹا گھر بیٹھنے سے کیا فائدہ۔ چلو جنگل سے لکڑیاں کاٹ لائیں۔ اور انھیں بیچ کر اپنا پیٹ پالیں"۔ وہ پڑوسی کے گھر گیا اور ایک کلہاڑی اُدھار مانگ لایا اور وہ دونوں جنگل کو چل دیئے۔

راجو نے ایک شیشم کے پیڑ کو کاٹنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اسے یہ آواز سُنائی دی "مجھے باہر نکالو، مجھے باہر نکالو"۔ اس نے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی بھی نظر نہ آیا تو اس نے خود پوچھا "تم کون ہو، کہاں ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

"میں اسی شیشم کے پیڑ کی جڑ میں دبا ہوں۔ تم مجھے نکالو مجھے نکالو"۔ پھر آواز آئی۔ لڑکے نے کہا "تم مجھے کیا انعام دوگے"۔ آواز آئی "نکالنے کے بعد بتاؤں گا"۔

راجو نے پیڑ کی جڑ کو جب کھودا تو اس کو ایک بوتل ملی جس میں ایک مینڈک نظر آیا۔ مینڈک نے کہا "مجھے نکالو مجھے نکالو۔" لڑکے بوتل کھول دی فوراً ایک بھوت باہر نکل آیا اور بڑی تیزی سے بڑا ہونے لگا۔ ایک لمحے میں وہ پہاڑ کے مانند نظر آنے لگا۔

بھوت گرج کر بولا "جانتے ہو کیا انعام ملے گا"

لڑکے نے نڈر ہو کر کہا "مجھے کیا خبر ہے تم نے نکالنے کے بعد بتلانے کا وعدہ کیا تھا"

بھوت نے کہا "میں تم کو ابھی کھا جاؤں گا"

لڑکے نے سہم کر کہا "تم مجھ کو کھانے سے پہلے یہ تو بتلا دو کہ تم کیسے اتنے چھوٹے بوتل میں آسے رہے"

بھوت غرور میں آکر پھر اس بوتل میں گھس گیا راجو نے جلدی سے بوتل بند کر دی اور بوتل کو شیشم کی جڑ کے نیچے رکھ دیا۔ بھوت نے پھر التجا کی اگر تم مجھے پھر آزاد کر دو تو ایک چیز دوں گا جس سے تم دولت مند ہو سکتے ہو۔"

لڑکے نے کہا "تم پھر دھوکا دو گے"

بھوت نے کہا "سچ مانو میں بہت عمدہ انعام دوں گا"

لڑکے نے سوچا شاید بھوت اپنا وعدہ پورا کرے یہ سوچ کر اس نے ڈاٹ کھول دی۔ بھوت پھر باہر نکل آیا اور لڑکے کو ایک کالا رومال دے کر کہا اس کو جس چیز پر رگڑو گے وہ سونا ہو جائے گی۔

شام کو جب باپ نے اس کو خالی ہاتھ دیکھا تو وہ غصہ ہوا۔ مگر جب لڑکے نے اسے سب معاملہ بتا دیا تو وہ بہت خوش ہوا کہ اب لکڑی نہیں کاٹنی پڑے گی۔ اور راجو بھی پڑھ سکے گا۔ مگر یکایک اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں راجو کو بھوت نے دھوکا تو نہیں دیا ہے مگر جب راجو نے اسے اپنی کلہاڑی سے رگڑا تو وہ سونا ہو گئی۔ اب تو وہ بہت رئیس ہو گیا۔

محمد شمیم جیراجپوری



سعید اشرف

سقراط

سقراط اب سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ایک معمولی بڑھئی تھا۔ ماں دایہ تھی۔ اس کی ناک چپٹی تھی قد ناٹا شکل بد صورت تھی۔

یہ بہت باتونی آدمی تھا اُس نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ باتیں کرنے میں گزارا۔ جس گلی کوچہ سے گذرتا ہے چھوٹے بڑے سے باتیں کرنے لگتا۔ مگر وہ بے کار قسم کی گپ نہیں کرتا تھا بلکہ زندگی میں کام آنے والی باتیں کرتا اور زندگی کی مصیبتوں اور تکلیفوں کا حل بتاتا۔ اس کو انسانوں سے بڑا پریم تھا اور اس کی باتوں میں سچائی تھی اس لئے وہ اپنی زندگی ہی میں بہت مقبول ہوگیا۔

آپ جانتے ہیں جہاں کسی کے چند دوست ہوتے ہیں وہاں کچھ دشمن بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ کسی انسان کو زندگی کی دوڑ میں کامیابی ہو اور لوگ اس کی بات پر اعتبار کرنے لگیں اور اس سے ہر موقعہ پر مشورہ کریں اور اس

سے محبت بھی کرتے ہوں تو کچھ لوگ جلتے
اور حسد بھی کرنے لگتے ہیں یہی حال سقراط
کا ہوا جب وہ بہت مشہور ہو گیا تو دیس
کے کچھ لوگ اس سے جلنے لگے۔ اور
اس کے دشمن ہو گئے۔

اکثر موقعوں پر اس سے جھوٹ
بولنے پر مجبور کیا گیا۔ مگر وہ اپنی بات پر
اڑا رہا کہ سچائی اور حق پر خواہ جان چلی
جائے مگر جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے۔ جو
حال باپو کا ہمارے دیش میں ہوا کہ وہ
سچائی اور حق کے لئے لڑتے تھے اور
غلط بات کے سامنے اپنا سر نہیں جھکاتے
تھے اسی لئے انہیں شہید کر دیا گیا وہی
حشر سقراط کا اپنے دیش یونان میں ہوا
یعنی ان کو زہر کا پیالہ دیا گیا۔

سقراط کی خواہش تھی کہ تمام لوگ
اچھے بن جائیں لوگوں میں اچھی اچھی باتیں
پیدا کرنا ہی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔

سقراط نے فوج میں بھی بڑے
کارہائے نمایاں انجام دئے تھے اور ایک
آدمی کی جان بچائی تھی جو جنگ میں
اس کا دوست اور چیلا بن گیا تھا۔ ہر
ایک اس کی باتیں غور سے سنتا اور
سوالات کرتا سقراط ہر بات کا تسلی
بخش جواب دیتا۔ سقراط کا خیال تھا
کہ جب تک آدمی میں اچھی باتیں نہ ہوں
وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ سقراط کا عقیدہ
تھا کہ اگر لوگوں کو اچھائی کا صحیح علم ہو
تو وہ ضرور اسے تلاش کریں گے اور اچھے
بن جائیں گے اور تمام خوبیاں اچھائی
کے صحیح علم پر منحصر ہیں اسی طرح برائیاں
اور گناہ جہالت اور صحیح علم نہ ہونے
کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

سقراط سوائے لوگوں کو بٹھا کر
اچھی باتیں بتانے کے کسی سیر و تفریح
وغیرہ میں بھی حصہ نہیں لیتا تھا۔

لوگوں میں بیٹھ کر سقراط یہ نہیں
ظاہر کرتا تھا کہ وہ بہت بڑا عالم فلسفی
اور قابل آدمی ہے بلکہ اپنے کو جاہل
اور معمولی آدمی کی طرح پیش کرتا تھا۔

سقراط محض تقریر ہی نہیں کرتا
تھا بلکہ جن باتوں کے لئے لوگوں سے

کہتا اس پر خود بھی عمل کرتا تھا۔

۴۰۴ قبل مسیح میں جب ایتھنز کی سلطنت کا زوال ہو گیا سقراط کو بر برسر اقتدار ایتھنز والوں نے کچھ ناجائز گرفتاریاں کرنے کا حکم دیا لیکن یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی جان خطرے میں ہے اس نے انکار کر دیا لیکن وہاں کے باشندے چونکہ سقراط سے بہت محبت کرتے تھے اس لئے اس کی جان بچ گئی ورنہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ بہر حال سقراط کی ہمت دیکھئے کہ سچائی کے سامنے اس نے جان کی پرواہ نہیں کی۔

۳۹۹ قبل مسیح میں جب سقراط ۶۰ برس کا ہو چکا تھا اس کے دشمنوں کو پھر موقع مل گیا۔ اس کے خلاف دو بڑے الزامات لگائے۔ پہلا یہ تھا کہ وہ جمہوریہ کے خداؤں کو نظر انداز کرتا اور ان پر یقین نہ رکھتا تھا دوسرے یہ کہ وہ شہر کے نوجوانوں کو خراب اور برباد کر رہا ہے۔ ایتھنز کے ایک مشہور مقرر (LYSIAS) لی سی اس نے سقراط کی حمایت میں ایک تقریر لکھی اور فلسفی سقراط کو پیش کی۔ سقراط نے اسے پڑھ کر اس کا شکریہ ادا کیا لیکن اسے استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔

سقراط نے اپنی محافظت کے لئے خود کہا: "ایتھنز کے لوگو! میں نہیں جانتا تم میرے برا کہنے والوں سے کس حد تک متاثر ہوئے ہو جہاں تک میرا تعلق ہے میں ان کی باتیں سن کر خود اپنے کو بھول جاتا ہوں۔ ان کی دلیلیں کتنی بے کار ہیں تاہم میں کہتا ہوں کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے سب غلط ہے"

سقراط موت سے تو ڈرتا نہیں تھا اس نے اپنے علم سے اپنے ملکی بھائیوں کی خدمت کی تھی اور ان کی زندگی خوش اور بہتر بنانے کی کوشش کی تھی۔ جب مقدمہ چلایا گیا تو سقراط نے بھری عدالت میں ججوں سے کہا کہ جو زندگی میں خدا اور بھگوان کے

خاص حکم سے اپنے فرض کو ادا کیا جن کا اختیار میرے نزدیک تمہارے اختیارات سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

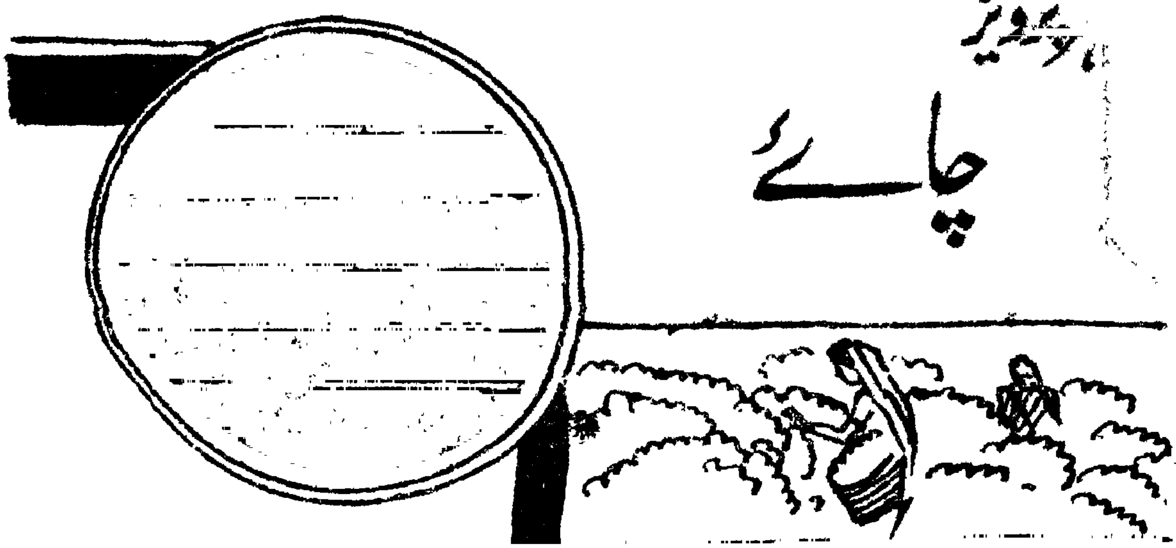
عدالت میں ایک ہل چل سی مچ گئی سقراط نے کہا میں سچائی کی تلاش کو نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک میری سانس باقی ہے اس سے باز نہیں آؤں گا۔ جس سے بھی میری ملاقات ہو میں یہ کہنا نہیں چھوڑوں گا کہ "کیا تمہیں دولت اور عزت کی تلاش میں شرم نہیں آتی جب کہ تمہیں عقل مندی، سچائی اور اپنی روح کو بہتر بنانے کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے" میں نہیں جانتا موت کیا چیز ہے ممکن ہے اچھی چیز ہو اور مجھے اس کا بالکل خوف نہیں ہے۔ اچھائی کو ہر حال میں برائی پر ترجیح دیتا ہوں

چنانچہ ججوں نے سقراط کو موت کی سزا کا حکم سنا دیا۔

لیکن ایتھنز کے قانون کے مطابق سقراط کو اس کا حق حاصل تھا کہ وہ سزائے موت کے بجائے کوئی اور تجویز مثلاً جلا وطن ہونا پیش کرے۔ سقراط نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے جس کا وہ اہل تھا یعنی پبلک کا خیر خواہ۔

عدالت اس سے بہت ناراض ہوئی۔ اور ایتھنز کے قانون کے مطابق اسے زہر کا پیالہ پیش کیا گیا۔ سقراط نے زہر کا پیالہ خوشی سے لے لیا۔ عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا اب جدائی کا وقت ہے میرے لئے موت اور تمہارے لئے زندہ رہنا لیکن سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا کہ میری حالت بہتر ہے جو مرنے جا رہا ہوں یا تمہاری جو زندہ رہوگے۔

سعید اشرف نعمانی



پرویز

چائے

ہمارے ملک میں شاید ہی کوئی ایسا گاؤں ہو، جہاں چائے نہ پہنچی ہو، امیر غریب سب ہی تو چائے پیتے ہیں۔

ہندستان میں اس کی کاشت آج سے دو ہزار برس پہلے سے ہوتی چلی آ رہی ہے اور یہیں سے چائے چین بھی پہنچی اب تو یہ حال ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ پیداوار چین میں ہوتی ہے یوں سمجھئے کہ جتنی چائے ساری دنیا میں پیدا ہوتی ہے اس کی آدھی سے زیادہ چائے چین ہی میں پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے چین میں چائے بڑے شوق سے پی جاتی ہے اس کے بعد جاپان اور تبت کا نمبر آتا ہے۔

یورپ کے لوگوں نے چائے کا استعمال ایشیا کے باشندوں سے سیکھا سترھویں صدی میں پہلی بار انگلستان کے باشندوں نے چائے استعمال کی۔ لیکن ہندوستان، لنکا، چین، جاپان اور جاوا سماترا تو اس کے گھر ہیں۔ اگر کبھی

آپ آسام جائیں تو آپ کو چائے کے باغ ضرور نظر آئیں گے۔ چائے کے پودوں کی لائنیں بڑی بھلی لگتی ہیں۔ ان کی اونچائی ۵ فٹ یا اس سے کچھ کم ہوتی ہے۔

چائے پہاڑی علاقے میں پیدا ہوتی ہے چھوٹے چھوٹے پودے جو چار چار فٹ کے فاصلے سے لگائے جاتے ہیں۔ یہ کچھ دنوں میں پھیلنے لگتے ہیں یہاں تک کہ سارے کا سارا پہاڑی علاقہ ڈھک جاتا ہے۔ جو پودے اپنے آپ اُگتے ہیں، وہ تو کافی بڑھ جاتے ہیں لیکن کھیتی کے پودے تین چار فٹ سے زیادہ بڑھنے نہیں دئے جاتے تاکہ مزدور ان کی پتیاں آسانی سے توڑ سکیں۔ باغ میں کہیں کہیں سائے کے لئے بڑے بڑے پیڑ بھی لگا دئے جاتے ہیں۔ چائے کے لئے برسات کا موسم بہت فائدہ مند ہوتا ہے لیکن اگر ان کی جڑوں میں پانی زیادہ دیر رکا رہ جائے تو وہ خراب ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ڈھلوان جگہوں پر یہ خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ تین سال کے بعد یہ چائے کی کاشت کے لائق ہو جاتے ہیں۔ ہر تین سال کے بعد ان کو چھانٹ ڈالتے ہیں اور اس کے بعد یہ پھر اور اچھی چائے کی پتیاں تیار کرتے ہیں۔

چائے کے پودے زیادہ سے زیادہ تین انچ بڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ہندوستان اور جاوا کی چائے کے پودے چار انچ سے لے کر نو نو انچ تک لمبے ہوتے ہیں یہاں کے پودوں سے جتنی چائے ملتی ہے اتنی دوسرے ملکوں کے پودوں میں نہیں ہوتی

چائے کی پتیاں چننے کا کام بسنت آتے ہی شروع ہو جاتا ہے اور پت جھڑ کے دنوں تک ہوتا رہتا ہے۔ مرد کاٹ چھانٹ کا کام کرتے ہیں عورتیں اپنے گلے میں بڑی بڑی ٹوکریاں لٹکا کر چائے کے باغ میں جاتی ہیں۔ یہ عورتیں بڑی ہوشیار ہوتی ہیں۔ اور پتیاں چننے میں بڑی پھرتی دکھاتی ہیں۔ پودوں کی کیاریوں میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ چلتی پھرتی ہیں اور پتیاں توڑنے میں تو ان کی انگلیاں حجام کی قینچی سے بھی زیادہ تیزی سے کام کرتی ہیں۔

چائے کی پتیوں کا وزن بہت کم ہوتا ہے پھر بھی وہ دن بھر میں پندرہ پندرہ سیر پتیاں چن لیتی ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو وہ پتیاں چنتی نہیں بلکہ نوچتی ہیں اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ان کو ہر پتی کے توڑنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ صرف نرم نرم کلیاں اور ہر ڈال کی ملائم پتیاں توڑنے کی اجازت ہوتی ہے۔ یہ پتیاں جتنی ملائم اور تازہ ہوں گی اتنی ہی زیادہ عمدہ چائے ہوں گی۔ اسی طرح ہر باغ میں دس دس دن کے بعد پتیاں توڑی جاتی ہیں۔

جب عورتوں کی ٹوکریاں پتیوں سے بھر جاتی ہیں۔ تو انھیں یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ کہیں پتیوں میں ڈنٹھل تو نہیں ملے ہیں۔ اس کے بعد پتیوں کو بڑے بڑے تھالوں میں پھیلا دیا جاتا ہے۔ وہاں ہوا لگنے اور گرمی پہنچنے سے یہ پتیاں آہستہ آہستہ مرجھا جاتی ہیں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اُن کی سختی اور کھردرا پن دور ہو جاتا ہے اور یہ پتیاں ملائم ہو جاتی ہیں۔ ان کا وزن بھی پہلے سے آدھا رہ جاتا ہے پھر ان کو اندھیرے کمروں میں، طشت میں پھیلا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ چونکہ پتیاں رس میں بھیگی ہوئی ہوتی ہیں اس لئے ان میں خمیر اٹھنے لگتا ہے

جب خمیر اٹھتا ہے تو ان کا رنگ بھورا پڑ جاتا ہے۔ اب ان پر مشینوں سے گرم ہوائیں دی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ سوکھ جاتی ہیں۔ ایسی مشین ایک ایک گھنٹے میں منوں چائے سوکھا دیتی ہے۔ مشین ہی کے ذریعے چائے ٹین کے ڈبوں میں بند کی جاتی ہے اور اس میں سے ہوا نکال لی جاتی ہے تاکہ چائے خراب نہ ہو۔

مختلف ملکوں کے لوگ چائے کو الگ الگ طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ جاپان کے لوگ چائے کی سوکھی پتیوں کو باریک پیس کر گرم پانی میں ملا لیتے ہیں۔ ایران میں چائے کو ایک کیتلی میں پانی کے ساتھ خوب جوش دیتے ہیں۔ جب پانی کا رنگ کالا ہو جاتا ہے تو سونف، الائچی لونگ اور شکر ڈال کر پی جاتے ہیں۔ روس کے لوگ چائے میں شکر یا دودھ بہت کم استعمال کرتے ہیں بلکہ لیمو ڈالتے ہیں۔

بقیہ ص [illegible] پر

محمد تصدق داد خاں۔ شاہجہاں پور

گویئے مُسافر



ایک کسان کے پاس ایک گدھا تھا دن بدن بوڑھا ہونے کی سے گدھا اب زیادہ محنت کا کام نہیں کر سکتا تھا کسان اس سے تنگ آچکا تھا۔ اور اس کو مار ڈالنے کی سوچ رہا تھا۔ گدھے نے یہ دیکھ کر کہ اس کا مالک اس کو مار ڈالنے کی فکر میں ہے خود ہی وہ مکان چھوڑ دیا۔ وہ پریشان تھا کہ اب کہاں جائے اور کیا کرے۔ آخر اس نے سوچا کہ وہ کسی ایسے شہر میں جائے جہاں لوگ گانے کے شوقین ہوں اور وہ لوگوں کو گا نا سُنا کر ایک اچھی زندگی بسر کرے۔ یہ سوچتے ہی وہ شہر جانے والی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ وہ ابھی کچھ ہی دور چلا ہو گا کہ اسے ایک کتا ملا جو کہ سڑک کے ایک کنارے پر پڑا ہوا تڑپ رہا تھا۔

"آپ اس قدر بے چین کیوں ہیں ؟" گدھے نے پوچھا۔

افسوس !! میرا مالک مجھے جان سے مارنے والا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا اور میں بھاگ آیا۔ یہ سُن کر گدھے نے کہا میں موسیقار بننے شہر جا رہا ہوں اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ چلئے، اور ہو سکے تو آپ بھی موسیقی سیکھیں۔

میں تیار ہوں۔ کُتے نے جواب دیا اور وہ دونوں روانہ ہو گئے۔

وہ ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ انھیں ایک بلی ملی جو کہ بیچ سڑک پر انتہائی افسردہ حالت میں بیٹھی

ہوئی تھی۔

اے شریف خاتون آپ کیسی بیٹھی ہوئی ہیں؟ گدھے نے بلی سے دریافت کیا۔

افسوس! میں بڈھی ہوگئی اور چوہے مارنے کے لائق نہ رہی تو میری آقا مجھ سے تنگ آگئی اور چاہتی تھی کہ مجھے ڈبو کر مار ڈالے لیکن مجھے معلوم ہوگیا اور میں بھاگ آئی۔ معلوم نہیں اب میری زندگی کیسے بسر ہوگی۔

ارے جناب تو تو پھر ہر حالت میں ہمیں شہر چلنا چاہیے، گدھے نے بلی سے کہا۔ آپ رات کی گانے والی ہیں آپ تو بہت جلد مال دار ہو جائیں گی۔ بلی نے یہ رائے بہت پسند کی۔ اور ان لوگوں کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ تھوڑی دور اور چلنے کے بعد جب وہ ایک کھیت میں سے گزر رہے تھے انھیں ایک مُرغا ملا جو ایک ڈال پر بیٹھا زور زور سے کڑ کڑا رہا تھا۔ بہت اچھے جناب! میرے خیال میں آپ خوب اچھا شور مچا لیتے ہیں؟ گدھے نے مرغے سے کہا۔ کہیے خیریت تو ہے؟

جی جناب بالکل خیریت کل ہمارے گھر پر مہمان آنے والے تھے ان کی خاطر کے لئے میرے مالک اور اس کے خاندان والوں نے میرا شوربا بنانے کی تیاری کرلی تھی مجھے پتہ چل گیا اور میں بھاگ آیا۔

خدا نہ کرے جناب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ شہر چلیں اور وہاں ہم لوگ گانا گاکر اپنا پیٹ پالیں گے۔

میں بخوشی تیار ہوں! یہ کہہ کر مرغا بھی گدھے کُتّے اور بلی کے ساتھ ہولیا۔ اور وہ چاروں خوشی خوشی چل دیئے۔

وہ پہلے دن شہر نہ پہنچ سکے اور جب رات ہوئی تو وہ سب کے سب جنگل ہی میں تھے۔ انھوں نے رات جنگل ہی میں بسر کی۔

گدھا اور کُتّا تو بہت بڑے درخت کے نیچے لیٹ گئے، بلی اس درخت کی ایک اونچی شاخ پر جا بیٹھی اور میاں مرغے اس درخت کی پھنگی پر اُڑ کر بیٹھ گئے۔ سونے سے پہلے مرغے نے احتیاطاً اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی اور دور بہت دور اسے کوئی چیز ٹمٹماتی نظر آئی۔ اس نے نیچے اپنے دوستوں کو پکارا۔ دوستو! ضرور وہاں کوئی مکان ہے کیونکہ مجھے روشنی دکھائی پڑ رہی ہے۔ واقعی! اگر ایسا ہے تو تو فوراً ہمیں اپنی جائے رہائش بدلنا چاہئے یہاں تو ہم سب تکلیف میں ہیں۔ اور بھوکے بھی ہیں! کُتّے نے کہا ممکن ہے ہمیں وہاں کوئی ہڈی یا بوٹی مل جائے۔

فوراً ہی وہ سب کے سب اس روشنی کی طرف چل دیئے۔ جتنا وہ قریب ہوتے جاتے تھے روشنی صاف ہوتی جاتی تھی۔ آخرکار وہ ایک گھر کے پاس پہنچ گئے جس میں ڈاکوؤں کا ایک بہت بڑا گروہ رہتا تھا۔ گدھا سب سے لمبا تھا وہ ایک کھڑکی کے قریب گیا اور اندر جھانکنے لگا۔

کہو دوست گدھے کیا دیکھا ؟ مرغے نے گدھے سے پوچھا۔

بہت کچھ میاں مرغے! گدھے نے جواب دیا ایک بہت بڑی میز پڑی ہوئی ہے جس پر تمام اچھی اچھی چیزیں چنی ہوئی ہیں اور ڈاکو لوگ اس میز کے چاروں طرف بیٹھے خوش گپیاں کر رہے ہیں۔

تو تو پھر یہ بہت اچھی جگہ ہے۔ مرغے نے جواب دیا ”بالکل“ گدھے نے کہا۔ اور سب مل کر ڈاکوؤں کو مکان سے نکالنے اور خود مکان پر قبضہ کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ آخرکار ایک ترکیب ان کی سمجھ میں آئی۔ گدھے صاحب اپنے پچھلے پیروں پر کھڑے ہوگئے اور اگلے پاؤں کھڑکی پر رکھ لیے۔ کتا اس کی پیٹھ پر چڑھ گیا۔ بلی کتے کے کندھوں پر جاکر بیٹھ گئی اور مرغا اڑا اور اڑ کر بلی کے سر پر بیٹھ گیا۔

جب سب اپنی اپنی جگہ پر سنبھل گئے، تو مرغے نے اشارہ کیا اور سب نے مل کر ایک ساتھ موسیقی کی تان چھیڑ دی۔

گدھے کی ڈھینچو کتے کی بھوں بھوں بلی کی میاؤں اور مرغے کی ککڑوں کوں نے ایک سماں باندھ دیا۔ اور یہ چاروں کے چاروں جھن جھن کرتے ہوئے کھڑکی کے شیشوں کو توڑ کر کمرے میں کود پڑے۔

ڈاکو چوں کہ موسیقی کی ان عجیب و غریب دھنوں سے بری طرح ڈر گئے تھے یہ سمجھے کہ ان پر بھوتوں اور چڑیلوں نے حملہ کر دیا ہے۔ انھوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور سر پہ پیر رکھ کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مکان پر ان چاروں کا قبضہ ہوگیا۔ چاروں گویئے فوراً ہی کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ اور خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد روشنی بجھا دی گئی۔ اور سب نے الگ الگ اپنے آرام کے لیے جگہ تلاش کر لی۔ گدھا برآمدہ میں پیال پر جاکر لیٹ گیا۔ کتے صاحب دروازہ کے پاس ایک چٹائی پر آرام فرمانے لگے بلی صاحبہ چولھے کی گرم گرم راکھ میں گڑ مڑی مار کر پڑ گئیں اور میاں مرغے

ایک شاخ پر جا بیٹھے۔ سفر کی تھکان کی وجہ سے سب کے سب فوراً ہی میٹھی نیند سونے لگے۔

آدھی رات کے قریب کچھ ڈاکو واپس آئے اور جھاڑیوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ مکان میں تاریکی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آخر کار ان میں سے ایک سب سے زیادہ بہادر ڈاکو یہ دیکھنے کے لئے آگے بڑھا کہ مکان میں کیا ہو رہا ہے وہ اطمینان سے مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ سب چیزیں اپنی جگہ پر تھیں ڈاکو روشنی کی تلاش میں باورچی خانے میں گیا تو چولھے کے پاس اس کو دو خوفناک آنکھیں نظر آئیں۔ یہ بلی کی آنکھیں تھیں۔ ڈاکو سمجھا کہ یہ انگارے ہیں اور اس نے کچھ لکڑی کی چپٹریاں انگاروں پر سلگانے کے لئے ڈالیں۔ بلی یہ مذاق بالکل نہ سمجھ سکی اور اچھل کر ڈاکو کے منہ پر ایک پنجہ رسید کیا۔ ڈاکو کانپ اٹھا اور چلا کر دروازے کی طرف بھاگا جیسے ہی وہ دروازہ پر پہنچا کتا جاگ پڑا اور دوڑ کر ڈاکو کی ٹانگ میں کاٹ لیا۔ اب گدھا بھی کچی نیند سے ہی جاگ اٹھا تھا اور جیسے ہی ڈاکو برآمدے میں سے گزرا گدھے نے بھی دو لاتیں اس کی پیٹھ پر جمائیں اس گڑبڑ میں مرغا بھی جاگ اٹھا اور زور زور سے اذان دینے لگا۔ ڈاکو کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ چلاتا ہوا باقی ساتھیوں کی طرف بھاگا۔ اس کے ساتھیوں نے پوچھا کہو دوست تم پر کیا گزری ہے ڈاکو نے جواب دیا میں اپنی زندگی میں اتنا خوف زدہ نہیں ہوا تھا جتنا کہ آج۔ ہمارا تمام مکان خوفناک بھوتوں سے بھرا ہوا ہے۔ جیسے ہی میں باورچی خانے میں گیا ایک بھتنی اڑی اور میرے منہ کو نوچ لیا اور جب میں دروازے کی طرف بھاگا تو ایک بھوت نے دوڑ کر میرے پاؤں میں چاقو بھونک دیا اور جب میں برآمدہ میں بھاگا تو ایک شیطان کے بچے نے اپنا گرز پوری طاقت سے پے در پے میری پیٹھ پر مارا۔ میں سمجھا کہ شاید میں مارا گیا کیونکہ جب زخمی حالت میں میں دروازہ کی طرف بھاگ رہا تھا تو میں چھت پر ایک چڑیل کو چلاتے ہوئے سنا "کون ہے یہ کمینہ" "کون ہے یہ کمینہ"

اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھنے کے بعد کسی ڈاکو کی بھی یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ مکان کے اندر جائے ڈاکو بھاگ گئے اور مکان پر گویّے مسافروں کا قبضہ ہو گیا۔ چاروں دوستوں کو وہ مکان اتنا پسند آیا کہ وہ وہیں رہنے لگے۔

اور شاید اب بھی وہ چاروں مسافر گویّے اسی مکان میں رہتے ہوں گے۔ ....

پیامی معمہ نمبر ۳۱ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل پیامی معمہ نمبر ۳۱ :- (۱) آزاد (۲) مہر (۳) بھولی (۴) شان (۵) نوٹ (۶) شرم (۷) چوک

صحیح حل صرف بیس موصول ہوئے۔ لہٰذا پہلا انعام ۲۰ حضرات پر بحساب ۲؍ فی کس تقسیم کر دیا گیا۔

(۱) جمیل احمد کانپور (۲) اسرار احمد خاں جبلپور (۳) نعیم اللہ دہلی (۴) اجمل خاں دہلی (۵) سلیم احمد کانپور (۶) سعید اختر کلکتہ ۱۹ (۷) کلیم اللہ کلکتہ (۸) شریف النساء بریلی (۹) محمد نصیر حیدر آباد۔ (۱۰) نجمہ فاطمہ جمشید پور (۱۱) پروین فاطمہ جمشید پور (۱۲) رحیم الدین پٹنہ (۱۳) محمد جمال الدین علی گڑھ۔ (۱۴) منظور احمد کلکتہ ۱۷ (۱۵) خلیل الرحمان بریلی (۱۶) امیر حسن پٹنہ (۱۷) رمیش دہلی (۱۸) مسٹر جمناداس آگرہ (۱۹) سرون کمار کانپور (۲۰) سمیع اللہ کلکتہ۔

ایک غلطی والے تیس حل موصول ہوئے لہٰذا دوسرا انعام ۳۰ حضرات پر بحساب ۱؍ فی کس تقسیم کر دیا گیا۔

جگہ کی کمی کے باعث اُن کے نام نہیں دیئے جا سکتے۔

نوٹ

(۱) اپنے حلوں کے ساتھ رسیدی ٹکٹ یا پھٹے ہوئے ٹکٹ نہ روانہ کریں۔ ورنہ آپ کے حل شریک مقابلہ نہیں کئے جائیں گے۔

(۲) اپنا پتہ صاف لکھیں۔ تاکہ انعام وقت پر مل سکے۔

(۳) حل تاریخ مقررہ سے پہلے ہی سپردِ ڈاک کر دیا کریں۔

(۴) بیرنگ والے حل شریک مقابلہ نہیں کئے جاتے۔

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں

پچاس روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ فی حل ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں اور پانچ حلوں کی فیس چار آنے

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۳۰ روپے | دوسرا انعام ایک غلطی پر ۲۰ روپے

★ حل اور فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۰ رمئی ۵۴ء

پیامی معمہ نمبر ۳۲

۱		ر	ی	ت	
۲	ن		ا	ز	
۳	ع	ق			
۴	م		ر	و	ر
۵		ا	ل	ک	
۶	ج		م		
۷	بھ	ی			

۱۔ ــــ آدمی سے گفتگو کرتے وقت لوگ نہایت احتیاط سے کام لیتے ہیں (شریف۔ ظریف۔ حریف)

۲۔ ــــ سے دل کو ایک طرح کا سکون نصیب ہوتا ہے۔ (نماز۔ نیاز)

۳۔ ــــ کے حملے سے بچنا آسان نہیں (عقب۔ عقل)

۴۔ دولت مل جانے پر کون ــــ نہیں ہوتا۔ (مسرور۔ مغرور)

۵۔ کتا ــــ سے کھیل کر بہت خوش ہوتا ہے (مالک۔ بالک)

۶۔ جیل میں مشقت وغیرہ قیدی کے ــــ کے مطابق لی جاتی ہے (جسم۔ جرم)

۷۔ اپنی عزت چاہتے ہو تو اپنے ــــ کا خود خیال رکھو۔ (بھیس۔ بھید)

کوپن پیامی معمہ نمبر ۳۲

نام ....

پتہ ....

کوپن پیامی معمہ نمبر ۳۲

نام ....

پتہ ....

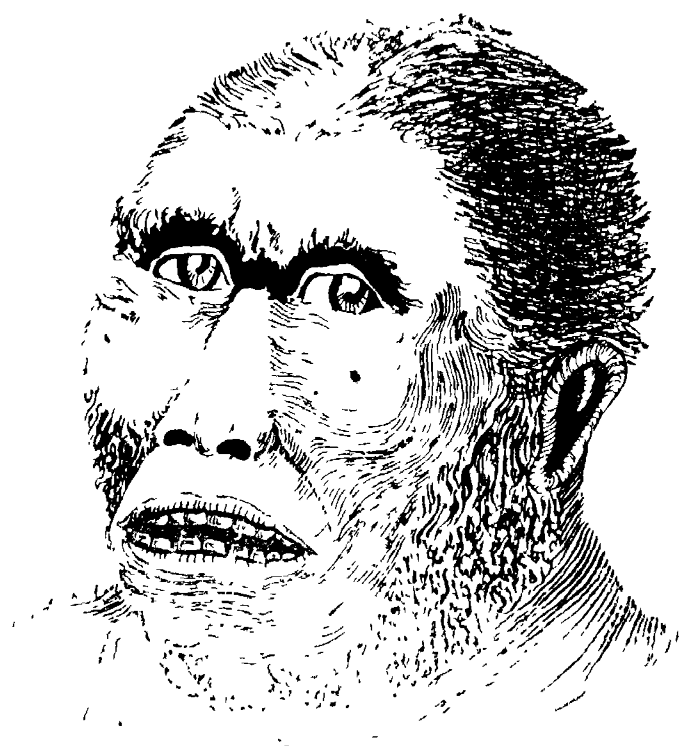
پتہ:۔ پیامی معمہ نمبر ۳۲ معرفت پیام تعلیم جامعہ نگر دہلی

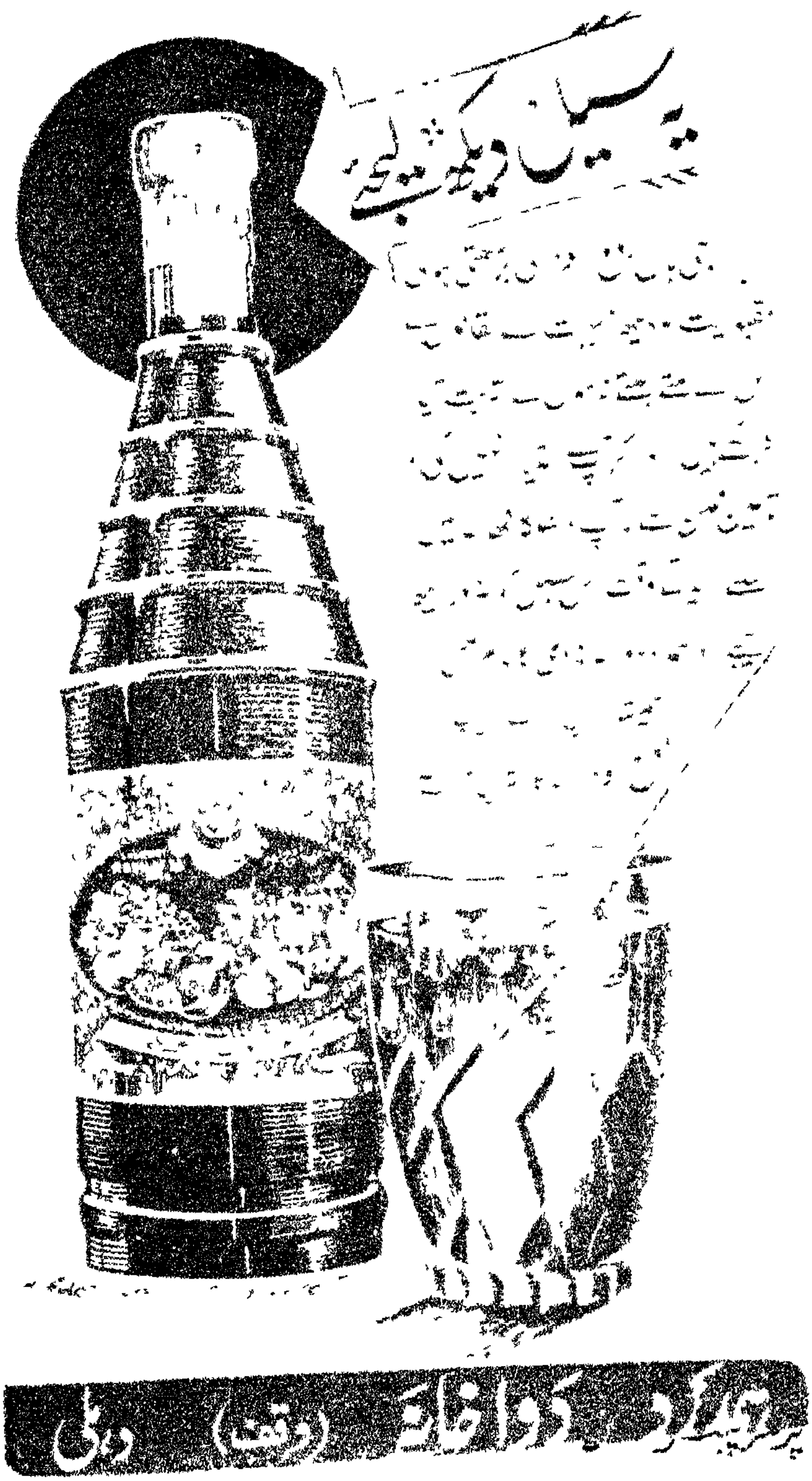
پرنٹر و پبلشر حامد علی خاں ...
مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ ...



ہلاری اور تین سنگ ایوریسٹ کی مہم کے بعد

ابتدائی آدمی
اندر کے صفحات پر
مشتاق احمد صاحب
کا مضمون پڑھئے




ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی


پیام تعلیم



گوتم بدھ

جس نے سارناتھ میں اپنا پہلا پیغام دیا

([illegible] میں محفوظ ہے)

فہرست

پیام تعلیم

ادارہ

حامد علی خاں بی، اے (جامعہ)

اطہر پرویز ایم، اے (علیگ)

اسسٹنٹ:- گلیڈون میسی

سالانہ چندہ ــــــ ۴ روپے

فی پرچہ ــــــ ۶ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، دہلی

بچوں سے باتیں



۱۵ رمئی کو جامعہ بند ہوگئی۔ صرف کچھ دن گزرے ہوئے ہیں۔ بچے اپنے اپنے گھر چلے گئے ہیں، اب نہ اُن کا شور و غوغا ہے نہ وہ کھیل کود، اور نہ وہ ہما ہمی، ساری رونق ختم ہوگئی، ہر طرف دھول اُڑتی نظر آتی ہے۔ اِنے گِنے چند بچے رہ گئے ہیں جو اپنے وطن کو دوری کی وجہ سے نہیں جا سکتے، یعنی ”تعلیمی بچے“، لیکن وہ بھی گرمیاں گزارنے کے لیے پہاڑوں پر جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

اس سناٹے کو دیکھ کر وہ سارے پچھلے ہنگامے اور بھی یاد آتے ہیں۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے بچوں نے دو بڑے دلچسپ ڈرامے کیے۔ ایک ڈراما ”گڑیا کی شادی“ ابتدائی کی بچیوں نے پیش کیا۔ ڈرامے

کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ مکالمے بچوّں کے اپنے ہی معلوم ہوتے تھے۔ اور اسٹیج کی فضا ایسی تھی گویا بچیاں دیکھنے والوں کی موجودگی سے بے خبر "گڑیا کی شادی" میں مصروف ہیں۔

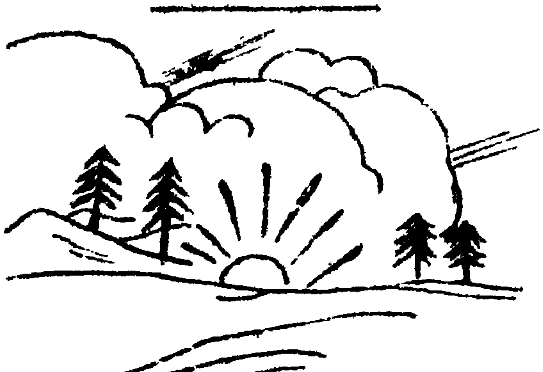
اس کے لئے ہماری ابتدائی کی اُستانی صاحبہ، محترمہ مشیر فاطمہ نے خاص طور پر بچوّں کو تیار کیا وہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔ آپ حال ہی میں لندن سے بچوّں کی تعلیم کے طریقے سیکھ کر واپس آئی ہیں۔

اس کے بعد پنجم جماعت کے بچوّں نے دوسرا ڈراما "چور لڑکا" پیش کیا۔ یہ ڈراما جناب عبدالغفار صاحب مدھولی کا لکھا ہوا ہے بچوّں نے بڑی اچھی اداکاری کی اور ڈرامے کا مقصد بھی اُبھر کر سامنے آیا۔ اس کو ابتدائی کے اُستاد جناب مجیب الرحمٰن صاحب نے پیش کیا۔ ہم اس ڈرامے کی کامیابی پر ان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

دہلی اسٹیٹ ٹیچرز ایسوسی ایشن کی جانب سے دہلی حکومت کی نگرانی میں پچھلے سال اکتوبر اور نومبر میں بچوّں کی ایک ٹرین تعلیمی سفر پر گئی تھی۔ جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اس بار گرمیوں کی چھٹیوں میں اُستادوں کی اسی جماعت کی طرف سے دلّی کے طالب علموں کی ایک جماعت کشمیر کی سیر کے لئے جا رہی ہے۔ اس جماعت میں تقریباً پانچسو لڑکے، لڑکیاں اور استاد شامل ہوں گے یہ جماعت ۳۰ رمئی کو یہاں سے روانہ ہو جائے گی۔ اور جولائی کے پہلے ہفتے میں واپس آئے گی۔ جامعہ کے کچھ طلبا، جناب مولوی شفیع الدین نیّر کی نگرانی میں جا رہے ہیں۔

---

۲۰ رمئی کو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب جرمنی سے واپس آگئے۔ آپ اقوام متحدہ کے تہذیبی ادارے یونسکو کی طرف سے وہاں تشریف لے گئے تھے۔ ہم ادارے کی جانب سے ان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔




میری تکلی
میری کالی کالی تکلی
سوت کی کاتنے والی تکلی
کام بناتی رہتی ہے یہ
کھیل کھلاتی رہتی ہے یہ
یہ گھومے تو کام بنائے
ہم گھومیں تو چکر آئے
یہ ہے کالی سوت ہے گورا
کاتے کاتے بھر گیا پورا
حامد اللہ افسر

مشتاق احمد اعظمی



انسانی تہذیب۔

— پتّھر کے زمانے میں

انسانی تہذیب میں "پتّھر کا زمانہ" بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس زمانے میں انسان نے جو کچھ بنایا وہ پتھر ہی کا بنایا۔ پتھر کے ہتھوڑے، پتھر کی کلہاڑیاں، پتھر کے بلّم، پتھر کی چھریاں، پتھر کے کھلونے اور پینے پانی کے برتن ـــــ غرض ہر چیز پتھر کی تھی۔ اس زمانے کو دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں: "پتھر کا قدیم زمانہ" جو حضرت عیسیٰؑ سے ۵۰ ہزار سال پہلے کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد کا زمانہ "پتّھر کا نیا زمانہ" کہلاتا ہے۔ اس زمانہ '' میں انسان نے جانوروں کو سدھانے، کھیتی باڑی کرنے، بات چیت کرنے اور لکھنے کا ڈھنگ سیکھا "پتھر کا نیا زمانہ" کہلاتا ہے۔ یہ زمانہ ۵۰ ہزار قبل مسیح سے ۱۰ ہزار قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ لیکن کیا آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ پتھر کے قدیم زمانے کے لوگوں کا وطن کیا تھا؟ خیال یہ ہے کہ یہ لوگ یورپ کے علاقوں میں رہتے تھے۔ اور یہ علاقے عموماً برف سے ڈھکے رہتے تھے۔ پتھر کے قدیم زمانے کے لوگ ابھی آگ تاپنے، شکار کھیلنے اور اینڈی بینڈی تصویریں بنانے میں مگن تھے کہ ایشیا اور افریقہ کے گرم علاقوں کی طرف سے انسانوں کا ایک دوسرا گروہ اٹھا اور آہستہ آہستہ یورپ کی طرف بڑھنے لگا۔ ان لوگوں کے پاس بھی پتھر ہی کے اوزار تھے لیکن آپ کے پرانے دوستوں کے ہتھیاروں

زیادہ تیز چمکدار اور مضبوط تھے یہ لوگ دھیرے دھیرے پورے یورپ پر چھا گئے، پرانے لوگوں میں سے کچھ تو ان حملہ آوروں کے ہاتھوں سے مارے گئے، کچھ جان بچا کر اتر کی طرف بھاگ نکلے اور بہت سے ان نئے آنے والوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ اب ان نئے آنے والوں کی کہانی سنئے۔

یہ نئے آنے والے آپ کے پرانے دوستوں کی طرح نرے وحشی نہ تھے۔ انھیں بہتر زندگی بتانے کے بہت سے ڈھنگ آتے تھے۔ سن سے ایک موٹے قسم کا کپڑا بننا جانتے تھے کھیتی باڑی کا معمولی ڈھنگ بھی آتا تھا۔ لکڑی کے ہلوں سے زمین کو جوت کر جو، باجرہ اور مکئی بو دیتے پھر فصل کاٹ کر اپنا گھر بھر لیتے تھے۔ دو پتھروں کے بیچ میں اناج کو پیس کر آٹا تیار کرتے تھے اور پتھر کو گرما کر اس پر موٹے موٹے روٹ پکا کر اپنا مزے سے کھاتے تھے۔ ان کے پاس تیر اور کمان بھی تھے۔ تیروں کی نوک پتھر ہی کے ہوتے تھے۔ لیکن ان تیروں سے یہ بڑے بڑے جانوروں کو مار گراتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں دریاؤں کا سفر بھی کرتے تھے لیکن ابھی مچھلی پکڑنے کا ڈھنگ غریبوں کو نہیں آیا تھا بیچارے کتنی بڑی نعمت سے محروم تھے۔

ان لوگوں کو مویشی پالنے کا ڈھنگ بھی آتا تھا۔ عام طور پر بھیڑ، بکریاں، سور اور گتے پالتے تھے۔ کھیتی کا ڈھنگ چونکہ ابھی ٹھیک سے نہیں آتا تھا اس لئے اکثر فصل خراب ہو جاتی تھی اور جب کوئی شکار بھی ہاتھ نہ لگتا تو اپنے پالتو مویشیوں ہی کو مار کر پیٹ بھر لیتے تھے مویشیوں کی وجہ سے ان کی زندگی بڑے آرام سے گزرتی تھی کیونکہ سب سے بڑے دشمن یعنی بھوک سے ان مویشیوں کی وجہ سے امان تھا۔

آپ نے دیکھا کہ یہ لوگ آپ کے پرانے دوستوں سے بہت سی باتوں میں آگے تھے۔ آپ کے پرانے دوستوں کو تو بولنا بھی نہیں آتا تھا۔ کوئی بات کہنی ہوتی تو بس اشاروں اشاروں میں ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتے تھے گونگوں کی طرح۔ لیکن یہ نئے والے آپس میں تیزی سے گفتگو کر سکتے تھے۔ پرانے لوگوں کو ہرن کہنا ہوتا تھا تو سر کے اوپر ہاتھ لے جا کر بڑے بڑے سینگوں کا اشارہ کرتے تھے لیکن انھوں نے اپنی زبان میں 'ہرن' کے لئے

ایک لفظ مقرر کر لیا تھا۔ بعض ملکوں میں کھدائی کے دوران میں ڈھول کے خول اور بانسریاں وغیرہ بھی پائی گئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ گانا بجانا بھی جانتے تھے۔ تو پھر ان کے پاس بھیڑ، بکری، ہرن کے علاوہ، رنج، غم، دُکھ سُکھ اور خوشی کے لیے بھی الفاظ ہوں گے۔ جب یہ اتنے آگے بڑھ چکے تھے تو دیکھیں خدا وغیرہ کے بارے میں ان کے کیا خیالات تھے۔

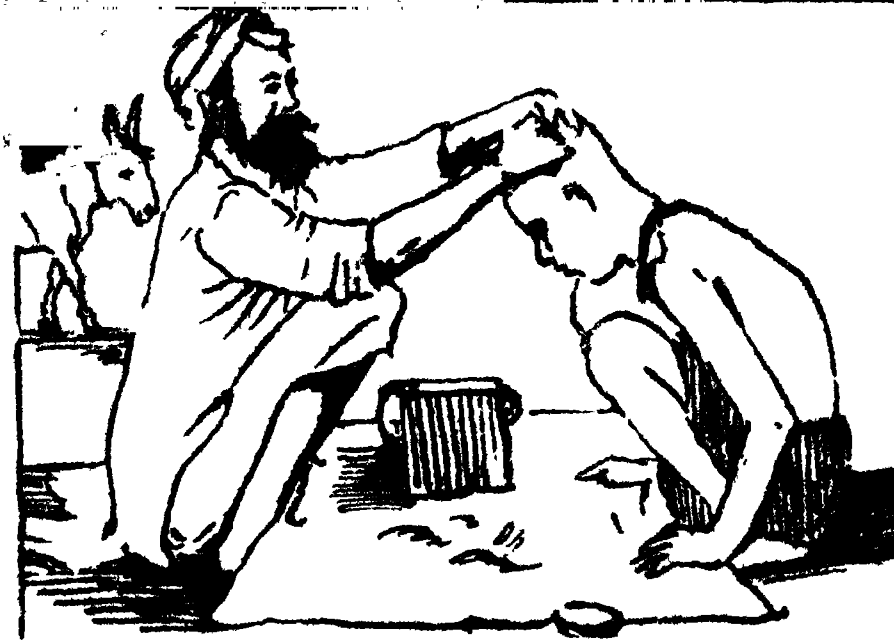
ابھی یہ لوگ قدرت کے بھیدوں کو سمجھتے نہیں تھے۔ اس لئے تیز بہنے والے ندی نالوں سے، بجلی کی چمک اور بادلوں کی کڑک سے، اندھیری رات اور طوفان سے یہ لوگ ڈرتے اور خوف کھاتے تھے۔ ان میں سے کچھ کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور کچھ کو دوست۔ ہوتے ہوتے قدرت کی انہی طاقتوں کو جنھیں اپنے سے زیادہ طاقتور سمجھتے تھے دیوتا یا خدا سمجھنے لگے۔

اب، ان دیوتاؤں کو منانے اور خوش کرنے کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں بھی کرنے لگے گھر کے بڈھے اور بوڑھیاں ان کو خوش کرنے، ان کے غصّے کو دور کرنے، بیماریوں کو ہٹانے کے لیے طرح طرح کے ٹوٹکے ٹونکا اور جنتر منتر سے کام لینے لگے۔ اس طرح جادو کے خیال کی بُنیاد پڑی۔ یہ لوگ یہ بھی سمجھتے تھے کہ گھر کے بوڑھے اور بڑھیاں مرنے کے بعد کسی نہ کسی طرح ہماری نگرانی اور حفاظت کرتی رہتی ہیں۔ چنانچہ ہوتے ہوتے یہ بھی دیوتاؤں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔

دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے یہ لوگ آدمی کو بھینٹ چڑھانے لگے۔ فصل بونے کے موقع پر یا کسی بلا کو ٹالنے کی غرض سے قبیلے کے سب سے خوبصورت اور ہر لحاظ سے اچھے جوان کو پکڑ کر دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے آپ کے ان نئے دوستوں کا خیال تھا کہ آدمی کے خون سے دیوتا کی پیاس بجھ جاتی ہے اور وہ خوش ہو جاتا ہے۔ قربانی کی رسم کو پروہت یا کاہن ادا کرتے تھے۔ کیوں کہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ دیوتاؤں کو خوش کرنے کا ڈھب۔ انہی کو آتا ہے۔ پھر قربانی کے مشکل منتر بھی صرف انہی کو یاد ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں میں کاہنوں کا بہت ہی اثر تھا۔ ٹونے، ٹوٹکے، جادو منتر، جھاڑ پھونک، غرض ان تمام باتوں کے یہ استاد سمجھے جاتے تھے۔ ان کا کام تھا کھانا اور اسی طرح کی رسمیں ادا کرنا۔ قبیلے والوں کی طرح سے خدمت مشقت سے انھیں

شاہد احمد

بغداد کا حجام



پرانے زمانے میں بغداد میں ایک نائی رہتا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا ہوشیار تھا آنکھوں پر پٹی باندھ کر بھی بہت اچھی حجامت بنا سکتا تھا بغداد کے تمام بڑے آدمی اور شاہی دربار کے سبھی لوگ اُسی سے حجامت بنواتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت مغرور ہو گیا تھا اور عام آدمیوں کی حجامت بنانا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ اور لوگوں کے ساتھ بڑی بری طرح سے پیش آتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک غریب لکڑہارا اپنے گدھے پر لکڑیاں لادے ہوئے بغداد آیا۔ وہ جب نائی کی دکان کے پاس پہنچا تو نائی نے پوچھا "کیوں رے، تیرے گدھے پر جتنی لکڑیاں لدی ہیں اس کی قیمت کیا ہے۔ لکڑہارے نے قیمت بتائی اور نائی نے اسے منظور کر لیا۔ جب نائی نے ساری لکڑیاں گدھے پر سے اُتار لیں اور پیسے

لگے تو نائی نے کہا " ابھی تو نے ساری لکڑیاں تو دی نہیں ، میں تجھے دام کیسے دوں ۔ اپنی کاٹھی بھی تو دے ، یہ بھی تو لکڑی کی بنی ہوئی ہے ۔ میں نے تو ساری لکڑیوں کی قیمت طے کی تھی ۔ لکڑہارے نے کہا " یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ میں نے تو آج تک ایسا کوئی گاہک نہیں دیکھا جو لکڑیوں کے ساتھ کاٹھی بھی لے "

یہ سن کر نائی کو بہت غصہ آیا ۔ اس نے لکڑہارے سے اس کی ساری لکڑیاں بھی لے لیں ، کاٹھی بھی چھین لی اور اُسے دکان سے باہر نکال دیا ۔

لکڑہارہ بے چارہ روتا دھوتا شہر کے قاضی کے پاس گیا ۔ قاضی بھی اسی نائی سے حجامت بنوایا کرتا تھا ۔ اُس نے اس لکڑہارے کی شکایت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی ۔ یہ دیکھ کر وہ سب سے بڑے قاضی کے پاس پہنچا ۔ لیکن اس نے بھی اس کی شکایت کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اُڑا دیا ۔ آخر جب اُس نے دیکھا کہ کوئی بھی اس کی شکایت کی طرف دھیان نہیں دیتا تو وہ خلیفہ کے پاس پہنچا ۔ خلیفہ کو لکڑہارے پر بڑا رحم آیا اور اُس نے لکڑہارے کی شکایت کو بڑے غور سے سنا ۔ اور اُس کے کان میں آہستہ سے ایک بات کہہ دی ۔ وہ بات سن کر لکڑہارا چپ چاپ چلا گیا ۔ دو چار دن کے بعد لکڑہارا نائی کے پاس پہنچا اور بولا کہ " میں اور میرا ساتھی آپ سے حجامت بنوانا چاہتے ہیں اس کی اُجرت بتا دیجئے " نائی نے جتنے پیسے بتائے لکڑہارے نے خوشی خوشی منظور کر لیئے اور نائی نے کہا " تمہارا ساتھی کہاں ہے اس کو بھی لے آؤ تاکہ اس کی حجامت بھی بنا دوں ۔

لکڑہارے نے کہا " میں اُسے

لے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر گیا۔ اپنے گدھے کو دکان کے اندر لے آیا اور کہنے لگا۔ "یہ میرا ساتھی ہے اس کی حجامت بنا دو۔"

نائی کے بدن میں سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی چلّا کر بولا "اچھا۔ میں گدھے کی حجامت بناؤں گا۔ تم میری بے عزتی کرتے ہو۔ جاؤ میری دکان سے نکل جاؤ۔" لکڑہارا سیدھا خلیفہ کے دربار میں پہنچا اور اس کو یہ واقعہ سنایا۔ قاضی نے حکم دیا کہ "حجام اپنے حجامت کے سامان کے ساتھ دربار میں پیش کیا جائے۔" دس منٹ کے اندر اندر حجام آ گیا۔ خلیفہ نے پوچھا کہ "تم لکڑہارے کے ساتھی کی حجامت کیوں نہیں بناتے۔ جب کہ تم دونوں میں یہ طے ہوا تھا کہ اس کے ساتھی کی حجامت بناؤ گے۔" حجام نے کہا "حضور طے تو ضرور ہوا تھا لیکن کبھی کسی نے گدھے کو بھی اپنا ساتھی بنایا ہے۔"

خلیفہ نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا کبھی کسی نے لکڑیوں کے ساتھ کاٹھی پر بھی اپنا حق جتایا ہے۔ اب تو اس کی سزا بھگتو اور گدھے کی حجامت بناؤ۔"

بے چارا حجام کیا کرتا۔ بھرے دربار کے سامنے اس کو گدھے کی حجامت بنانی پڑی۔ اور دوسرے دن یہ واقعہ سارے بغداد میں مشہور ہوگیا۔

پہیلیوں کا جواب

۱۔ انگوری
۲۔ آری
۳۔ موتی ...
۴۔ ...

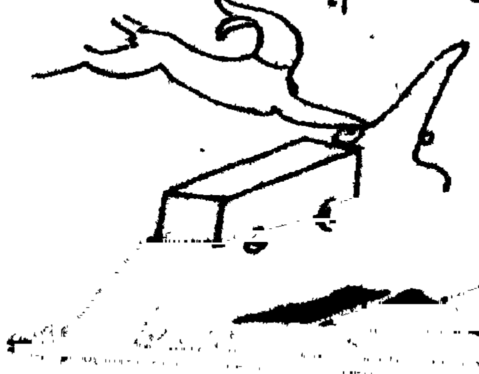


ننھے مُنّے پودے

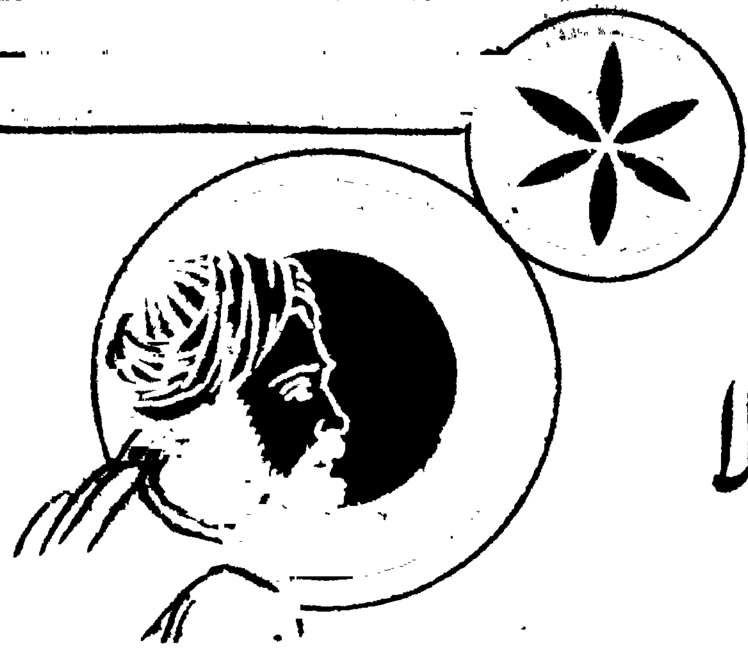
دُنیا کی تمام جاندار مخلوقات کو دو گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پودوں اور جانوروں میں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اور آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس ننھی مُنّی جان کا تعلق پودوں کے خاندان سے ہے یا جانوروں کے۔ آپ اور ہم ہی نہیں بعض اوقات بڑے بڑے سائنس داں بھی چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کے ایک سائنس داں جگدیش چندر بوس پہلے آدمی تھے جنھوں نے یہ ثابت کیا کہ پودوں میں بھی جان ہوتی ہے۔ اس لئے کہ بعض ننھے مُنّے کیڑے ان ہی پودوں کا لباس پہن لیتے ہیں اور ہلتے جلتے بھی نہیں اور غلطی سے لوگ ان کا تعلق پودوں ہی کے خاندان سے سمجھتے ہیں۔ جس طرح یہ پودے اپنے ماحول اور پاس پڑوس کی فضا کا اثر [illegible]ل کرتے ہیں اسی طرح جانور بھی اپنے ماحول کے مطابق اپنے آپ کو بدلتے رہتے ہیں۔ جانوروں [illegible]ر پودوں میں صرف یہی بات ملتی جلتی نہیں بلکہ ایک بات اور بھی ہے۔ پودوں میں بڑھنے [illegible] [illegible] قوت پائی جاتی ہے۔ البتہ اس میں ایک فرق ہے وہ یہ کہ جانوروں کے خاندان [illegible] لے ایک خاص عمر تک بڑھتے [illegible] ہمیشہ بڑھتے رہتے [illegible]

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ جب زمین پر پہلی بار زندگی کے آثار نظر آئے، تو اس وقت ہوا، پانی اور نمک کے علاوہ کوئی کھانے کی چیز نہ تھی، اور ایسی حالت میں اگر کوئی چیز زندہ رہ سکتی تھی تو وہ صرف پودے ہی تھے۔ اس لئے سائنسدانوں کو یقین ہے کہ پہلی زندہ چیزوں میں پودے ہیں نہ کہ جانور ——— جو پہلے پہل گھاس کی شکل میں رونما ہوئے۔ ان پودوں کی ضروریات جو پہلے تھیں وہی تقریباً آج بھی ہیں۔

یہ پتہ لگنا تو خیر ناممکن ہے کہ زمین پر گھاس کا پہلا پودا کب اُگا۔ پھر بھی ہم کچھ نہ کچھ معلومات تو حاصل کر ہی سکتے ہیں۔ اگر آپ زمین کو کھودتے چلے جائیں تو آپ کو زمین پر مختلف تہیں نظر آئیں گی۔ ایک کے بعد دوسری تہہ ——— دراصل یہ تہہ بھی ایسی ہے جیسی کہ یہ زمین جس پر ہم آپ رہتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم کھدائی کریں تو ہم کو ان تہوں میں مختلف قسم کے جانوروں اور پودوں کے باقیات نظر آئیں گے۔ اور ان کی مدد سے ہم زمین پر زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ پودوں کے یہی باقیات بعد میں کوئلہ بن گئے جو معدنیات کی شکل میں نکلے۔ پہلے نہ تو پیڑ تھے اور نہ پھل پھول، بلکہ خالی سیدھی سادی سمندری گھاس تھی۔ ایسی گھاس جو اب بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے یہ پودے دن بدن ترقی کرتے گئے، یہاں تک کہ پھل پھول بھی اُگنے لگے۔ یہ پھل جب بھی اُگے اور ان کے لئے دُنیا کی آب و ہوا سازگار ہوئی تو پودوں کی دنیا میں ان کو ہی بادشاہت ملی۔ جس طرح جانوروں کے خاندان میں ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کو بڑا مانا گیا ہے اس طرح پودوں میں ان پھل اور پھول والے پودوں کو عزّت ملی۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ انھوں نے آکر دوسرے پودوں کو ختم کر دیا جو دھرتی پر پہلے اُگے تھے۔ بلکہ یہ پودے اپنی جگہ پر تھے حالانکہ ان کا خاندان بڑھتے بڑھتے پودوں تک پہنچ گیا تھا۔ ان مختلف قسم کے پودوں کا حال ہم پھر کبھی بتائیں گے۔



رابندر ناتھ ٹیگور



کابلی والا

میری پانچ برس کی لڑکی مُنّی گھڑی بھر کے لئے خاموش نہیں رہتی۔

ایک دن سویرے جب میں نے اپنے ناول کی سترھویں قسط لکھنی شروع کی تھی۔ اُسی وقت مُنّی نے آکر کہا "بابوجی سوبودھ (میرا نوکر) کوّے کو کاک کہتا تھا۔ وہ کچھ نہیں جانتا۔ اور دیکھیے" بابوجی۔ بھولا کہتا تھا کہ آسمان میں ہاتھی اپنی سونڈوں سے پانی برساتے ہیں۔ بھولا ایسی ہی جھوٹی باتیں بکا کرتا ہے"

میں نے ہنس کر منّی سے کہا "مُنّی تو بھولا کے ساتھ جا کر کھیل مجھے اس وقت کام کرنا ہے"

میرا گھر سڑک کے کنارے ہی پر تھا۔ مُنّی یکایک برآمدے میں دوڑی گئی اور "کابلی او کابلی" کہہ کر چلّانے لگی۔

میلا، ڈھیلا اور موٹے کپڑے کا کُرتا پہنے، صافہ باندھے۔ کندھے پر میوے کی جھولی ڈالے۔ ہاتھ میں دو چار انگور کی پٹاری لیئے۔ لمبے ڈیل ڈول کا ایک کابلی سڑک پر آہستہ آہستہ چلا جارہا تھا۔ مُنّی کی آواز سن کر جیسے ہنس مکھ کابلی نے گھوم کر دیکھا اور اسے دیکھ کر مُنّی گھبرا گئی اور اُس کابلی کو

پھاٹک کے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اندر بھاگ گئی۔ اس لئے کہ منّی کی ماں کہا کرتی تھی کہ وہ جھولی کے اندر بند کر کے بچوں کو پکڑ لے جاتا ہے۔

میں نے منّی کے خوف کو دور کرنے کے خیال سے اس کو اندر سے بلایا۔ وہ آئی۔ کابلی اپنی جھولی سے کشمش نکال کر منّی کو دینے لگا۔ منّی کسی طرح لینے پر راضی نہ ہوئی۔ اُس کا شبہہ اور بھی بڑھ گیا وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس غیر ملکی سے میرا پہلا تعارف اس طرح ہوا۔

ایک دن میں سویرے گھر سے نکلا۔ میں نے دروازے پر دیکھا کہ منّی اسی کابلی سے من مانی باتیں کر رہی تھی۔ وہ بہت سے بادام اور کشمش لئے ہوئے تھی۔ میں نے کابلی سے کہا "اُس کو یہ سب کیوں دیا۔ اب مت دینا۔" یہ کہکر میں نے جیب سے نکال کر اُس کابلی کو ایک اٹھنی دی۔ کابلی نے بلا کسی جھجک وہ اٹھنی لے کر جیب میں ڈال لی۔

جب میں کام سے لوٹ کر گھر آیا۔ تو میں نے دیکھا اُس اٹھنی کی وجہ سے گھر میں بڑا شور مچا ہوا ہے۔ اس کی ماں اُس سے ڈانٹ کر پوچھ رہی ہے کہ تو نے اُس سے اٹھنی کیوں لی؟ منّی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر جواب دیا "میں نے اس سے مانگی نہیں ـــــ وہ اپنے آپ ہی دے گیا۔"

میں منّی کو اس مصیبت سے بچا کر اس کو لے کر باہر چلا آیا۔

معلوم ہوا کابلی کا یہ دوسرا ہی پھیرا نہیں تھا۔ وہ روز آتا ہے اور پستے بادام دے کر منّی سے دوستی کر لی ہے۔

کابلی کا نام رحمت تھا۔ رحمت اور منّی کی عمر میں زمین اور آسمان کا فرق تھا تب بھی دونوں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے تھے۔ ان دونوں میں کچھ بندھی ٹکی باتیں ہوتی ہیں۔

کابلی کہتا "منّی سسرال جاؤ گی؟" منّی نہیں جانتی تھی کہ سسرال کس کو کہتے ہیں۔ لیکن وہ بھلا چپ ہونے والی تھی وہ تو اُلٹا کابلی سے پوچھتی۔

"تم سسرال جاؤ گے؟"

رحمت گھونسا تان کر کہتا تھا "میں تو سسر کو ماروں گا۔ گھونسے سے"

یہ سن کر منّی خوب ہنستی تھی۔

ہر سال ماگھ کے مہینے میں رحمت اپنے وطن چلا جاتا تھا۔ اس زمانے میں اس کو ایک اک گھر سے روپیہ وصول کرنے جانا پڑتا تھا۔ تو بھی وہ ایک بار

منّی سے ضرور ملاقات کرتا تھا۔

ایک دن میں اپنی کتاب کی اصلاح کر رہا تھا جو چھپنے والی تھی۔ اُسی وقت راستے میں بڑا شور و غل سنائی دیا۔ کھڑے ہو کر دیکھا۔ رحمت کو دو سپاہی باندھے ہوئے لیے جا رہے تھے پیچھے سے لڑکوں اور راہگیروں کا مجمع چلا آرہا تھا۔ رحمت کے کُرتے میں خون کے داغ تھے۔ اور ایک سپاہی کے ہاتھ میں خون سے تر چھری تھی۔ میں نے جلدی سے پھاٹک کے باہر جا کر سپاہیوں کو روک کر پوچھا۔ کیا معاملہ ہے؟

کچھ سپاہیوں سے اور کچھ رحمت سے سُن کر میں سمجھ گیا تھا کہ معاملہ کیا تھا۔ پڑوس کے ایک چپراسی نے رحمت سے ایک چادر لی تھی۔ اُس کے دام اس پہ کچھ باقی تھے۔ وہ اب دام دینے سے انکار کرتا تھا۔ اسی پر جھگڑا ہو رہا تھا۔ رحمت کو غصہ آیا اور اُس نے چپراسی کو ایک چھری مار دی۔

رحمت اُس جھوٹے بے ایمان چپراسی کو سیکڑوں گالیاں دے رہا تھا۔ اسی بیچ میں "کابلی او۔ کابلی" پکارتی ہوئی منّی وہاں آگئی۔

رحمت کا چہرہ دم بھر کے لیے خوشی سے کھل اٹھا منّی نے آتے ہی اس سے پوچھا — تم سسرال جاؤ گے؟

رحمت نے ہنس کر کہا — "ہاں وہیں جا رہا ہوں۔" اُس نے دیکھا اس جواب سے منّی کو ہنسی نہیں آئی۔ تب اُس نے گھونسا دکھا کر کہا — میں سسرے کو مارتا تو ضرور لیکن کیا کروں میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد اس جرم میں رحمت کو سات سال کی سزا ہو گئی۔

اب کئی سال گزر گئے اور منّی لسے بدل گئی اب منّی کی عمر ۱۳ سال تھی۔ اس سال اس کی شادی کا پورا انتظام ہو گیا تھا۔ ایک ہونہار لڑکا کلکتہ میں ہی مل گیا تھا۔ اور جلد شادی ہونے والی تھی۔

آہستہ آہستہ شادی کی تاریخ بھی آگئی۔ صبح بہت ہی سہانی معلوم ہوئی۔ دعوت میں آئے ہوئے لوگوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ میں پڑھنے لکھنے کے کمرے میں بیٹھ کر حساب کتاب دیکھنے لگا اسی وقت رحمت نے آکر مجھے سلام کیا۔

پہلے میں اس کو پہچان نہ سکا، آخر میں اُس کی ہنسی سے میں نے پہچان لیا۔ اس کو دیکھ کر میرے دل کو جیسے دھکا سا لگا مجھے محسوس ہوا کہ جیسے آج اس کا یہاں سے چلا جانا ہی اچھا

ہوگا۔ میں نے اُس سے کہا — "آج میرے یہاں کام ہے۔ میں اُس میں پھنسا ہوا ہوں، آج تم جاؤ پھر آنا۔"

میری یہ بات سُن کر وہ لوٹ پڑا۔ لیکن پھر آکر ہچکچاتے ہوئے بولا — "بابو جی منّی کہاں ہے؟"

میں نے کہا — "آج گھر میں کام ہے۔ منّی سے بھی ملاقات نہ ہو گی۔" اس نے سناٹے میں آکر ایک نظر میری طرف ڈالی۔ اس کے بعد "بابو سلام" کہہ کر چل دیا۔

میرے دل میں جیسے دھکا سا لگا، جی چاہا کہ اس کو بلاؤں۔ اتنے میں دیکھا کہ وہ خود ہی چلا آرہا ہے۔ پاس آکر اس نے کہا "یہ انگور اور کچھ کشمش بادام منّی کے لیے لایا تھا۔ اُس کو دے دیجیے۔"

میں نے اس کو قیمت ادا کرنی چاہی۔ تب اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "آپ کی مہربانی میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے اس کی قیمت نہ دیجیے بابو۔ منّی جیسی ایک لڑکی میری بھی ہے اس لیے مجھے آپ کی منّی سے محبت ہو گئی ہے۔"

اتنا کہہ کر اُس نے کُرتے کے اندر سے نہ جانے کہاں سے ایک میلے کاغذ کی پُڑیا نکالی۔ بڑی احتیاط سے پُڑیا کھول کر میری میز پر رکھ دی۔ اُس کاغذ کے اندر ایک نشانی تھی۔ اپنی لڑکی کی اسی یادگار کو چھاتی سے لگا کر ہر سال رحمت اتنی دور سے کلکتہ میں میوہ بیچنے آیا کرتا تھا۔

یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس وقت میں یہ بھول گیا کہ یہ ایک میوے والا ہے اور میں ایک باعزّت آدمی۔ میں تو یہی سمجھا کہ میں بھی باپ ہوں اور وہ بھی باپ ہی ہے۔

میں نے اُسی وقت منّی کو اندر سے بلوایا۔ اس پر عورتوں نے بہت کچھ اعتراضات کیے، پر میں نے ایک نہ سُنی۔ منّی اچھے گہنے اور کپڑے پہنے آکر شرم کے مارے میرے پاس کھڑی ہو گئی۔

اُس کو دیکھتے ہی کابلی گھبرا سا گیا۔ پہلے جیسی وہ سیدھی بات نہ کر سکا۔ اس کے بعد ہنس کر اس نے کہا — "منّی تو سسرال جائے گی؟"

اب منّی سسرال کے معنی سمجھنے لگی تھی اس وقت وہ پہلے کا سا جواب نہ دے سکی۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

منّی کے چلے جانے پر ایک گہری لمبی سانس لے کر رحمت زمین پہ بیٹھ گیا۔ اس کو یکایک صاف طور سے یہ معلوم ہو گیا کہ اُس کی لڑکی بھی اتنے

(بقیہ ۲۹ پر)

شری چندا اگنی ہوتری



سارناتھ کی سیر

صبح کی شفق پھول رہی تھی۔ سورج کی نرم سنہری کرنیں پیڑوں کی پھنگیوں پر کھیل رہی تھیں۔ پنجاب میل بڑی تیزی کے ساتھ ہانپتی کانپتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن بنارس کو دور سے دیکھتے ہی جیسے اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ مسافر گاڑی سے اُتر کے تانگے والوں کو تلاش کر رہے تھے اور اُن سے مول تول کر رہے تھے اُتر پردیش کے اس قدیم شہر میں سال میں ۳۶۵ دن میلا لگا رہتا ہے۔ یہاں بھارت کے کونے کونے سے یاتری آتے رہتے ہیں۔

میں بھی تانگہ کر کے چل پڑا۔ تانگے والا کہتا جاتا تھا "بچنا بھائی، ہٹ جانا بابو صاحب! ذرا ہاتھ جی بائیں طرف، ہاں ہاں، بچنا میاں جی" اور پھر تیزی سے بھگاتے ہوئے اس نے ایک گیارہ سالہ لڑکے سے کہا جو اتفاق سے سڑک کے بیچوں بیچ آگیا تھا "کیوں، مجھے بھی پھنسائے گا، مرنے کے لئے کوئی اور جگہ نہیں ملی ہے، جو یہاں آگیا ہے"

تانگے والے نے چابک پر گھوڑے کے رسید کی تو گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ بنارس کی چھاؤنی سے ایک سڑک سیدھی سارناتھ کو جاتی ہے۔ میرے ذہن کے پردے پر سارناتھ کی تاریخ آگئی۔ آج سے

ڈھائی ہزار سال پہلے یہ سارناتھ ایک گھنا جنگل تھا۔ ہرن چوکڑی بھرتے تھے۔ جنگل کے دوسرے جانور سارے بن میں کلیلیں کرتے پھرتے تھے اس وقت اس کا نام "مرگ داو" تھا۔ پرانی تاریخوں میں تو اس کا نام ارشیتن لکھا ہے۔

سارناتھ کی مقدس زمین پر گوتم بدھ نے اپنا پہلا پیغام دیا تھا۔ جو پھر دنیا کے کونے کونے میں گونجا۔

میں خیالات میں گم ہو گیا اب دھیان گیا اشوک کی طرف۔ وہ اشوک جس نے کلنگ کے میدان میں دشمن کو شکست دی لیکن پھر اس مار کاٹ سے اس کا دل دہل گیا۔ موریہ خاندان کے اس مہاراجہ نے تلوار سے دیس کو جیتنا چھوڑ کر محبت سے انسان کے دلوں کو جیتنے کا عہد کیا۔ اشوک بدھ مذہب کا پیرو ہو گیا۔ اور اس نے گوتم بدھ کے پیغامات کو گھر گھر پہنچانے کا بیڑا اٹھایا۔ [illegible] شہروں میں تبلیغ کرنے [illegible] اسی طرح دوسرے [illegible]

یہاں بھی سب سے قدیم بدھ یادگاریں ہیں وہ اشوک [illegible] ہیں۔ میں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اور تانگا سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔ اچانک تانگا پھر رکا۔ میں [illegible] سامنے پیڑوں کا جھنڈ اور کچھ پکی عمارتیں نظر آئیں۔ "ارے کیا سارناتھ آگیا" میں [illegible] مشتاق ہو گیا۔ کوچوان اتر پڑا اور بولا۔ "حضور سارناتھ آگیا۔" میں بھی تانگے سے اترا ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ تھوڑی دور پر میرے دوست ایک پیڑ کے نیچے کھڑے نظر آئے۔ میں ان کی طرف لپکا، انھوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا وہ بھی بڑھے۔

—— پاس ہی ایک مینار تھا۔ ستیش نے بتلایا کہ اس کو یہاں کے لوگ "چوکھنڈی استوپ" کہتے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے۔ جہاں گیان حاصل کرنے کے بعد گوتم بدھ اپنے پانچ چیلوں سے ملے تھے۔ میں استوپ کو دیکھنے لگا۔ میری نگاہ اوپر کے ہشت پہل مینار پر اٹک کر رہ گئی ستیش نے کہا "یہ مینار اکبر کا بنوایا ہوا ہے۔ ہمایوں ایک بار سارناتھ آئے تھے۔ یہ ان کے آنے کی یادگار بنا تھا۔ اینٹوں کا بنا ہوا اسی فٹ اونچا یہ کھنڈی استوپ آج بھی اچھی حالت میں ہے۔ بعض مورخین [illegible] اشوک گپت خاندان کے [illegible]

ہے۔ استوپ کے اوپر اکبر کا بنوایا ہوا مینار ہے۔ چوکھنڈی استوپ دیکھ کر ہم شمال کی طرف چلے۔ تقریباً آدھے میل پر سارناتھ کی یادگاریں ہیں۔ اب اشوک کے "دھرم راجیکا استوپ" کا ذکر چھڑا۔ ستیش نے بتایا کہ اب تو کھنڈر ہی دیکھنے کو ملے گا۔ ہم نے اپنی غفلت سے اپنے باپ دادا کی دولت کو مٹی میں ملا دیا۔ بنارس کے راجا چیت سنگھ کے دیوان جگت سنگھ کو بازار بنوانے کی سوجھی۔ اینٹوں کا سوال سامنے آیا۔ اس کو "دھرم راجیکا استوپ" بیکار کا ٹیلا سا نظر آیا وہیں سے اینٹیں کھدوائی گئیں!"

اس تاریخی یادگار کی یہ حالت۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی میرے دل کو مسوس رہا ہو۔ ہم لوگ اس استوپ کے پاس آگئے۔ ستیش نے بتایا۔ اشوک کا بنوایا ہوا استوپ اینٹوں کا تھا۔ اس کی بنیاد گول تھی۔ اس استوپ کے اوپر چار اور استوپ بنے۔ آخری تعمیر بارھویں صدی میں ہوئی۔ یہ استوپ اسی جگہ ہے جہاں گوتم بدھ نے [illegible] پایا تھا [illegible] کے عالم میں [illegible] کو بتایا [illegible] تھا۔

اس میں پتھر کی گول پٹاری ملی۔ اس پٹاری کے اندر ہرے سنگ مرمر کے ڈبے میں گوتم بدھ کی متبرک ہڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سنگ مرمر کا وہ ڈبہ تو مل نہیں سکا۔ مگر پتھر کی پٹاری مل گئی تھی۔ آدمی کچھ کھو کر سیکھتا ہے۔ اس کھدائی میں استوپ تو بگڑا مگر پٹاری ملنے کے بعد لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ استوپوں کی مختصر تاریخ بھی انھوں نے بتائی استوپوں کو سادھی یا یادگار کہہ سکتے ہیں۔ کچھ استوپوں میں بدھ کی ہڈیاں رکھی گئی تھیں اور کچھ استوپ ان کی زندگی سے متعلق جگہوں میں یادگار کے طور پر بنائے گئے تھے۔ یہ استوپ انڈے کی شکل کے بنائے جاتے تھے لیکن وہ کھوکھلے نہ ہوتے تھے ان کے اوپر چاروں طرف ایک چبوترہ سا رہتا تھا۔ اس چبوترے کے بیچ میں ایک چھتری لگی ہوئی تھی۔ استوپ کے چاروں طرف گردا گرد دائرے کی شکل کا راستہ بنا رہتا تھا۔ تاکہ لوگ استوپ کا طواف کر سکیں۔ اس راستے کے چاروں طرف چہار دیواری رہتی تھی۔ چہار دیواری ایک ہی پتھر کو کاٹ کر بنائی جاتی تھی۔ اس پر بدھ کی زندگی کی کہانیاں کھودی جاتی تھیں۔ اس کھدائی میں سنگ تراش کی چھینی کی کرامات دیکھنے کے لائق ہیں۔ استوپ کے پاس ہی اشوک کی ایک ٹوٹی ہوئی لاٹ ہے اشوک

کی لاٹیں ایک ہی پتھر کو کاٹ کر بنائی گئی تھیں۔ ان پر اب ایسی پالش کی گئی جو آج تک نہیں چھوٹی۔ یہاں کی لاٹ کے سرے پر "دھرم چکر" اور چار شیر بنے تھے۔ ان شیروں کے نیچے شیر، ہاتھی، بیل اور گھوڑے کھدے ہوئے ہیں۔ جہاں تک کہ پتھر پر جانوروں کی تصویروں کے نقش کرنے کا سوال ہے آرٹسٹ کا فن بہت ہی مکمل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے زندہ جانور کھڑے ہوئے ہیں۔ یہی چکر ہمارے قومی جھنڈے میں رہتا ہے۔ شیر اور چکر جو ہم اپنے ملک کے سکوں اور ٹکٹوں وغیرہ میں دیکھتے ہیں وہ ہمارے ملک کا سرکاری نشان ہے۔ ہم نے اشوک کی لاٹ کا یہ سرا سارناتھ کے آثارِ قدیمہ کے دفتر میں دیکھا۔ "دھرم راجیکا استوپ" کے پورب میں سارناتھ کے اصل مندر کا کھنڈر ہے۔ یہ گپت خاندان کے عہد میں بنا تھا۔ ہوانگ سانگ ساتویں صدی میں ہندوستان آیا تھا اس نے اپنے سفرنامے میں اس مندر کا ذکر کیا ہے۔ مندر مربع چبوترے پر اینٹوں سے بنا تھا۔ اس کی اونچائی دو سو فٹ تھی۔ اس کے تین طرف مستطیل چوپالیں تھیں۔ مندر میں جانے کا دروازہ پورب سے تھا۔ اسی طرف مندر میں جانے کے لئے سیڑھیاں بنی تھیں اور راستہ پکا تھا۔ مندر کے چاروں طرف پکا صحن تھا۔ مندر کے پاس ہی شمال اور جنوب میں چھوٹے بڑے بہاروں کے کھنڈر ہیں۔ ان بہاروں میں بدھ مت کے سادھو رہتے تھے۔ بہاروں کے بیچ میں چوکور آنگن تھا۔ آنگن کے چاروں طرف سادھوؤں کے رہنے کے لئے کمرے ہوتے تھے۔ کسی زمانے میں یہاں پندرہ سو سے زیادہ سادھو رہتے تھے۔

سارناتھ کے بہار چوتھی صدی سے ۱۲ ویں صدی کے بیچ میں بنے۔ استوپ اور بہار بنوانا ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا۔ دولت مند اور راجا مہاراجا بہار بنوالتے تھے اور سادھوؤں کے گذر بسر کا انتظام کرتے تھے۔ ۱۲ ویں صدی عیسوی کے شروع میں قنوج کے راجا گووند چند کی رانی نے سارناتھ میں بہت بڑا بہار بنوایا۔ اس میں کئی بڑے بڑے آنگن اور اونچے اونچے دروازے تھے۔

ان یادگاروں میں سب سے اچھی حالت میں 'دھمیک استوپ' ہے۔ یہ استوپ زمانے کی چوٹیں سہتا ہوا آج بھی سینہ تانے ہوئے کھڑا ہے۔ کچھ گر تو گیا ہے مگر اب بھی اس کی اونچائی ۱۴۳ فٹ ہے۔ اس کا نچلا حصہ پتھر کا اور اوپر کا اینٹوں کا بنا ہے۔ نچلے حصے میں پتھر پر بہت ہی خوبصورت تصویریں

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)



لال چھتری

جب شیخ غلام حسین شام کو ہوٹل کے دفتر کا کمرہ بند کرنے لگے تو ان کی نظر ایک چھتری پر پڑی جو الماری سے لگی کھڑی تھی۔ اس کا کپڑا لال چمکیلے ریشم کا تھا۔ دستہ سنہرا تھا اور دستے میں ہاتھی دانت کا ایک ٹکڑا جڑا ہوا تھا جس پر ایک بچے کی تصویر بڑی کاریگری سے بنی ہوئی تھی۔ اس دن بہت سے مسافر ہوٹل میں آئے تھے اس لئے شیخ صاحب اس وقت چھتری کے مالک کا کچھ پتہ نہ چلا سکے اور چھتری لئے پہنچ گئے۔ بیوی کو چھتری دکھائی اور کہنے لگے "اس کے لئے اشتہار دینا ہوگا۔ بہت خوب صورت اور قیمتی چھتری ہے۔" بیوی نے کہا "ضرور۔ مگر اس وقت میرے پیٹ میں درد ہے۔ ڈاکٹر کے یہاں جائیے اور کوئی دوا لے آئیے۔"

بادل چھایا ہوا تھا۔ اور مینھ بھی برس رہا تھا اس لئے شیخ صاحب وہی چھتری لئے ہوئے ڈاکٹر کے پاس گئے نسخہ لکھوایا اور وہاں سے دوا فروش کی دکان پر آئے۔ دوا لی اور گھر چلے۔ اب بوندیں تھم گئی تھیں آسمان کھل گیا تھا گھر پہنچ کر انہیں یاد آیا کہ چھتری کہیں بھول آیا ہوں رات بہت ہو چکی تھی اس کی تلاش میں نکلنا اچھا نہ تھا۔ اس لئے وہ سو گئے۔ جب صبح گھر سے باہر نکلے تو راستے میں جگہ جگہ اشتہار بانٹے جا رہے تھے اس پر لکھا تھا کہ سیٹھ ایدل جی کی لال چھتری گم ہو گئی ہے جو آدمی ڈھونڈھ لائے گا انعام پائے گا۔ شیخ صاحب نے اشتہار

دیکھا اور افسوس کرنے لگے۔

رات کو جب دوا فروش دکان بند کرنے لگا تو اس نے چھتری دیکھی اور ایک میز پر رکھدی۔ صبح کو اسی کی دکان پر ایک وکیل صاحب آئے اور نسخہ بنوا کر چلے گئے۔ اتنے میں کوئی آدمی دکان پر چھتری کا اشتہار پھینک گیا جس سے لالہ صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ لگے خیالی پلاؤ پکانے کہ انعام پانچ سو روپے سے کم نہ ہوگا۔ ایڈل جی کتنا بڑا آدمی ہے پھر تو پو بارہ ہیں۔ سو روپے الماریوں پر لگاؤں گا اور چار سو روپے کی دوائیں۔ بس دکان چمک جائے گی۔ لیکن جب اس میز کی طرف گئے جہاں وہ چھتری رکھی ہوئی تھی تو اس کی جگہ ایک اور چھتری دیکھی۔ دوا فروش نے سر پیٹ لیا۔ اس کی تمام امیدیں مٹی میں مل گئیں کیونکہ وکیل صاحب جلدی میں اپنی چھتری چھوڑ گئے اور لال چھتری لے گئے تھے۔ وکیل صاحب کی بیوی کا جس سے انھیں بہت پیار تھا بیمار تھی اس لئے کرائے کی موٹر میں جلدی میں سوار ہو کر دوا لینے آئے تھے۔ گھبراہٹ میں کسی کو کچھ نہیں سوجھتا۔ راستے میں وکیل کو اپنی غلطی معلوم ہوئی اور بول اٹھے "ارے یہ کس کی چھتری آ گئی" پھر بیوی کی بیماری کا ایسا خیال آیا کہ گھر پہنچ کر موٹر سے اترے تو چھتری موٹر ہی میں بھول گئے۔

موٹر چلی گئی۔ جب وکیل صاحب بیوی کو دوا پلا کر دفتر میں بیٹھے تو منشی نے اشتہار دکھایا اور وکیل نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو خوب گالیاں دیں۔

سیٹھ ایڈل جی کے یہاں ایک مہمان آیا ہوا تھا جسے اسٹیشن جانا تھا۔ سیٹھ صاحب کی اپنی موٹر بگڑی ہوئی تھی اس لئے کرائے کی منگائی۔ جب وہ دونوں سوار ہوئے تو ایک سیٹ پر وہ لال چھتری وہاں رکھی ہوئی تھی جس کے لئے انھوں نے انعام دینے کا اشتہار بانٹا تھا۔ سیٹھ صاحب نے انعام کا نوٹ ایک جیب سے نکالا اور مسکرا کر دوسری جیب میں رکھ لیا۔



شہاب ثاقب یا ٹوٹنے والے تارے

برسات کی کسی ایسی رات کو جب آسمان پر ایک بھی بادل نہ ہو تو کسی کھلے میدان میں یا مکان کی چھت پر اپنی چارپائی بچھایئے اور گھنٹہ دو گھنٹہ آسمان کی طرف دیکھتے رہیے۔ یکایک آپ کو ایک شعلہ سا آسمان کی طرف سے آتا ہوا نظر آئے گا۔ لیکن یہ شعلہ جو فضا میں روشنی کی ایک لمبی لکیر سی بناتا ہوا زمین کی طرف آتا ہے ایک لمحے کے اندر ہی آپ کی نظر سے اوجھل ہو جائے گا۔ عام طور پر اس شعلے کو "شہاب ثاقب" یا ٹوٹنے والا تارا کہتے ہیں۔ لیکن در اصل یہ تارا نہیں ہوتا۔ بلکہ مختلف مادوں سے بنا ہوا ایک ٹکڑا ہے جو زیادہ سے زیادہ اخروٹ یا آلوچے کے برابر ہوتا ہے۔ ان ٹکڑوں کو عام طور سے ٹوٹنے والا تارا کہتے ہیں۔

یہ تارے ہماری زمین سے ہزاروں لاکھوں میل دور آسمان کے تاریک اور سرد حصوں میں ان گنت تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن جہاں ان کا فاصلہ زمین سے کم ہوا اور زمین نے ان کو اپنی طرف کھینچا اور پھر تو وہ جیسے دوڑتے ہوئے زمین کے قریب آجاتے ہیں۔ اور پھر اس وقت ان کی رفتار ایک لاکھ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ زمین کے آس پاس کم و بیش تین سو میل تک ہوا کا ایک حلقہ ہے جو ... [illegible]

ہوا کے اس حلقے کے اندر داخل ہوتے ہیں تو ہوا کی رگڑ سے گرم ہو کر جل اٹھتے ہیں اور ہمیں نظر آتے ہیں اگر ہوا کی یہ گرفت نہ ہو تو پھر نہ یہ اس طرح جلیں اور نہ ہمیں نظر آئیں۔ چونکہ یہ تارے یا ٹکڑے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اس لئے آگ لگتے ہی جل کر راکھ بن جاتے ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ ٹوٹتے تارے زمین سے تقریباً سو میل کی دوری پر نظر آتے ہیں۔ ان جلے ہوئے تاروں کا کچھ حصہ تو بھاپ بن کر ہوا میں مل جاتا ہے اور کچھ راکھ بن کر زمین پر گر پڑتا ہے۔ ہمیں قدرت کی اس مصلحت پر خوش ہونا چاہئے کہ اس نے زمین کے چاروں طرف ہوا کا ایک بہت موٹا سا غلاف چڑھا دیا ہے جس میں داخل ہوتے ہی یہ تارے جل کر ختم ہو جاتے ہیں۔ گو یہ تارے بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں مگر یہ چھوٹی چیزیں بھی اگر اتنے فاصلے سے زمین پر گریں تو بہت نقصان ہو۔ غلیل کے چھوٹے سے غلے سے کس قدر زور سے لگتی ہے جب کہ اس کی رفتار بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ پھر یہ تارے تو عام طور پر ۲۵ یا ۳۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے گرتے ہیں۔ ان کی چوٹ سے آدمی تو آدمی زمین پر بسنے والا بڑے سے بڑا جانور بھی مر جائے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ٹوٹنے والے تارے کبھی کبھی دکھائی دیتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ تارے دن رات لاکھوں کی تعداد میں زمین کی طرف آتے ہیں۔ چونکہ دن میں سورج کی روشنی تیز ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ہم کو بالکل نظر نہیں آتے۔ اور رات میں فاصلے کی وجہ سے اکا دکا نظر آتے ہیں۔ پروفیسر نیوٹن کا خیال ہے کہ چوبیس گھنٹے میں ایک کروڑ سے زیادہ تارے ٹوٹتے ہیں۔ اگر ہم رات کے وقت کسی بڑی اور طاقت ور دوربین سے آسمان کی طرف دیکھیں تو ہمیں ایسا نظر آئے گا کہ جیسے آسمان کے اندھیرے میں لاکھوں مہتابیاں یا بان چھوٹ رہے ہیں۔ ہمارے اس مشاہدے سے پروفیسر نیوٹن کے دعوے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

ان ٹوٹنے اور جل جانے والے تاروں کی راکھ ہوا میں مل جاتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام طور پر ہم سب کو ان کی دھول نظر نہیں آتی لیکن سائنس دانوں کی نظروں سے بھلا کوئی چیز چھپ سکتی ہے۔ ان کو جب دنیا کے آباد علاقوں میں ان تاروں کی راکھ ڈھونڈنے میں کامیابی

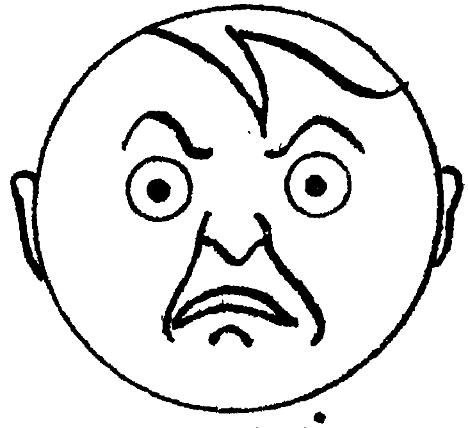
نہ ہوئی تو وہ اس کی کھوج میں برفستانی علاقوں میں گئے، آخر کار گرین لینڈ اور شمال کے دوسرے برفانی علاقوں سے انھوں نے برف کی تہوں میں دبی ہوئی ستاروں کی راکھ کو ڈھونڈ نکالا۔ بعض سائنس دانوں نے ان علاقوں کی سینکڑوں من برف کو پگھلا کر اُس کا پانی اُبالا اور اُس اُبلتے ہوئے پانی سے آکسیجن اور دوسری گیسوں کے علاوہ لوہے اور دوسری دھاتوں کے ذرّات بھی حاصل کئے۔

ٹوٹنے والے تاروں کا وزن چند تولے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور جلنے کے بعد تو ان کی راکھ کا وزن اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی اگر چوبیس گھنٹے کے اندر ٹوٹنے والے تاروں کی راکھ کسی طرح اکٹھا کی جا سکے تو اس کا وزن ایک ہزار من سے زیادہ ہو۔

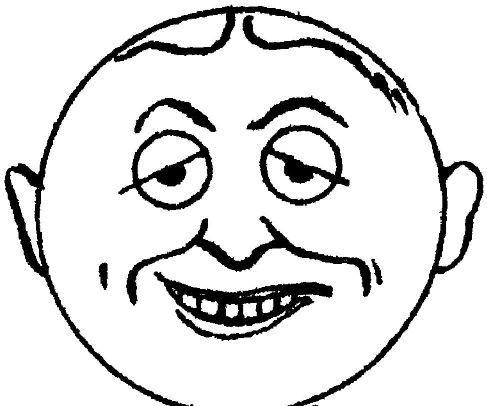
حجرِ شہابی

کبھی کبھی یہ ٹوٹنے والے تارے کافی بڑے بھی ہوتے ہیں۔ ایسے تارے فضا میں جل کر ختم ہونے کے بجائے جب زمین پر گرتے ہیں تو بڑے زور کی آواز ہوتی ہے۔ ایسے تاروں کو "حجرِ شہابی" کہتے ہیں۔ زمین پر گرنے کے بعد یہ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ سطحِ زمین پر جتنے "حجرِ شہابی" اب تک ملے ہیں وہ زیادہ تر پتھر کے ٹکڑوں کی طرح ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض خالص فولاد کے ہیں۔ کچھ برس ہوئے روس کے مشرقی جنگلوں میں ایک 'حجرِ شہابی' کے گرنے سے آس پاس کا کئی کئی میل کا جنگل برباد ہو گیا تھا۔ سینکڑوں بڑے بڑے پیڑ جڑ سے اُکھڑ گئے تھے۔ تاریخ سے تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ 'حجرِ شہابی' سے کبھی کسی انسان کی جان ضائع ہوئی ہو لیکن چین کی ایک پرانی کہانی میں ذکر ہے کہ ایک مرتبہ اس کی زد میں آکر دس آدمی مر گئے تھے۔

ایک 'حجرِ شہابی' پیری نامی ایک کمانڈر کو گرین لینڈ میں ملا تھا۔ اس کا وزن ۱۰۸۰ من کے قریب ہے۔ اس سے بھی بڑا ایک 'حجرِ شہابی' میکسیکو میں ملا ہے اس کا وزن تقریباً ۱۵۰۰ من ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اتنے وزن کی چیز جب لاکھوں میل کی بلندی سے زمین پر گرے گی تو زمین کے اُس حصّے کا کیا حال ہو گا جہاں وہ گرتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے ورنہ ان سے نہ معلوم کتنا نقصان ہوتا۔ اگر ایسے تاروں کی تعداد سال میں سو پچاس بھی ہوتی تو شاید ہماری دُنیا اب تک کبھی کی برباد ہو چکی ہوتی۔



خوف



پھیکی ہنسی

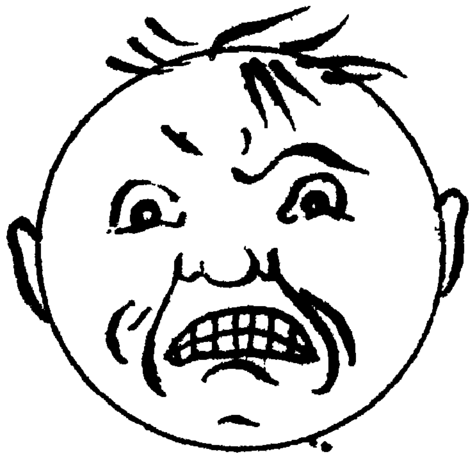
چہرے کی



خوشی کی ہنسی



آنکھ سے اشارا کرنا



غصّہ

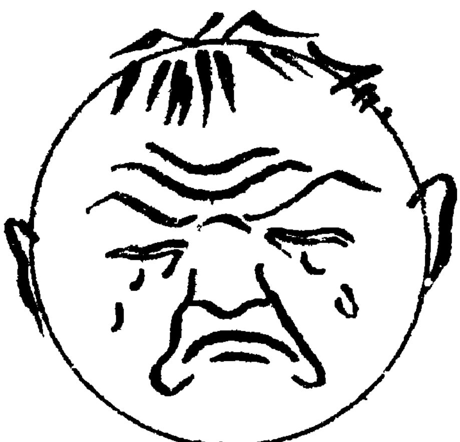


پرخلوص ہنسی

مختلف شکلیں



تعجب اور حیرت



افسردگی



ماسٹر۔ بتاؤ نمک حرام کسے کہتے ہیں۔
لڑکا۔ حرام نمک کھانے والے کو۔

استاد۔ نانا کے نام خط لکھو۔
شاگرد۔ لیکن جناب! وہ تو کبھی کے مر چکے۔

فقیر۔ روزی کمانے کے ایک ہزار طریقے، ایک آنے میں ایک ہزار طریقے بتاؤں گا۔ خدا کے نام پر مجھے ایک آنہ دے دیجئے، اللہ آپ کا بھلا کرے گا۔

اجنبی۔ تم کو جب روزی کمانے کے اتنے طریقے معلوم ہیں تو پھر بھیک کیوں مانگتے ہو؟

فقیر۔ جناب، یہ بھی روزی کمانے کا ایک طریقہ ہے۔

عبدالواحد۔ بیدل پورینہ

لڑکا۔ (ایک مصوّر سے) کل میں نے نمائش میں بہت دیر تک آپ کی تصویر دیکھی۔

مصوّر۔ شکریہ۔

لڑکا۔ شکریے کی بات نہیں۔ در اصل دوسرے مصوّروں کی تصویروں پر بڑی بھیڑ تھی

اُستاد۔ پانچ چھکے کتنے ہوتے ہیں۔

لڑکا۔ تیس۳۰۔

اُستاد۔ چھ پنجے۔

لڑکا۔ ابھی چھ کا پہاڑا یاد نہیں کیا ہے۔

فوجی۔ (دیہاتی سے جو گدھا لئے چلا جارہا تھا) بھائی تم اپنے بھائی کو کہاں پکڑے لئے جارہے ہو۔

دیہاتی۔ حولدار صاحب! کیا کروں کم بخت گھر سے بار بار بھاگ جاتا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں فوج میں بھرتی ہو کر لام پر نہ چلا جائے۔

افسر۔ بندوق صاف کرتے وقت سب سے زیادہ کس چیز کا خیال رکھنا چاہیئے۔

سپاہی۔ نمبر کا۔

افسر۔ کیا مطلب۔

سپاہی۔ تاکہ غلطی سے کسی دوسرے کی بندوق نہ صاف ہو جائے۔

جج۔ تم نے وہ پرانا جوتا کیوں چرایا

چور۔ حضور میں سمجھا تھا کہ وہ نیا ہے۔

بقیہ "کابلی والا"

دنوں میں اتنی بڑی ہو گئی ہو گی۔

میں نے اپنا بکس کھول کر پچاس روپے نکالے اور رحمت کو دے کر کہا ـــــ "رحمت، تم اپنے وطن میں جاکر اپنی لڑکی کو دیکھو اور خدا سے دعا کرو کہ میری منّی آرام سے رہے۔"

یہ روپیہ دے دینے کی وجہ سے مجھے کچھ روشنی اور کچھ دعوت کا سامان کم کر دینا پڑا۔ لیکن اس غریب الوطن کی خوشی نے اس خوشنما تقریب کو حقیقی روشنی سے جگمگا دیا۔

کمنیز فاطمہ



ظالم بادشاہ

کسی زمانے میں فرانس میں ایک بڑا ظالم بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ رعایا اس کے ظلم سے بے حد پریشان تھی لیکن کس کی ہمت تھی جو اس کے خلاف کچھ کہتا۔ اس لیے کہ بادشاہ نے اپنی حفاظت کے لیے ایک بہت بڑی فوج رکھ چھوڑی تھی۔

اس کا ظلم روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اس کے ظلم کا چرچا سارے دیس میں پھیل گیا یہاں تک کہ ایک پسّو نے بھی سُنا۔ یہ پسّو بڑا نیک اور رحمدل تھا۔ اور لوگوں کو خواہ مخواہ نہ کاٹتا تھا۔ اس نے سوچا کہ بادشاہ کا مزاج ٹھیک کرنا مشکل تو نہیں ہے لیکن پھر بھی خطرناک ضرور ہے۔ لیکن اگر اس نے بادشاہ کو ٹھیک کر دیا تو ملک کی ساری رعایا آرام و چین سے زندگی گزارنے لگے گی۔

اس خیال کا آنا تھا کہ پسّو راجا کے محل میں پہنچا اور جس وقت راجا سونے کی تیاری کر رہا تھا وہ اس کے بستر میں گھس گیا پھر اس نے راجا کے بدن میں زور سے کاٹا۔

"ارے یہ کیا چیز ہے" راجا زور سے اُچھل پڑا۔

"میں ایک چھوٹا سا پسّو ہوں، تم کو تمھارے ظلم کی سزا دے رہا ہوں۔" پسّو نے جواب دیا۔

اچھا پستو ہو کر تیری یہ ہمت، اب تجھے اس کا مزا چکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنے سارے بستر کو چھان مارا لیکن اس کو پستو نہ ملنا تھا نہ ملا۔

اس کے بعد راجا پھر بستر پر سونے کے لئے لیٹا اور جیسے ہی وہ لیٹا تھا پستو نے بڑھ کر پھر اس کے کاٹ لیا۔

راجا کو سخت غصہ آیا "نالائق اتنا چھوٹا سا جانور ہو کر ایسی بات کرتا ہے۔ جانتا نہیں کہ میں کتنا بڑا راجا ہوں۔" لیکن اب پستو بالکل خاموش رہا۔ وہ دھیرے دھیرے خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔ اس نے رات بھر راجا کو سونے نہیں دیا۔

صبح جب راجا اٹھا تو غصے کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔ اُس نے اپنے بستر ہی نہیں بلکہ سارے کمرے کا ایک اِک کونا خوب اچھی طرح صاف کروایا راجا کے وزیروں نے خورد بین لے کر سارے کمرے کی چھان بین کی لیکن وہ پستو نہ ملنا تھا نہ ملا۔

شام کو راجا پھر جب بستر پر سونے کے لئے لیٹا تو پستو نے نکل کر پھر کاٹا۔

راجا چلّایا "کون ہے، ناک میں دم کر دیا ہے!"

"میں پستو ہوں۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم میرا کہنا مانو اور اپنے ملک کی رعایا کا پیچھا چھوڑ دو۔"

یہ سُن کر راجا کو بہت غصہ آیا اور وہ بولا "میرے درباریوں، وزیروں اور فوج کے اعلیٰ افسروں کو سامنے پیش کیا جائے۔" اسی وقت سب لوگ آگئے۔ گھر کا کونا کونا تلاش کیا۔ بستر کی چادروں کو پھاڑ بھی ڈالا لیکن پھر بھی وہ پستو نہیں ملا۔ اور ملتا بھی کیسے اس لئے کہ وہ تو راجا کی داڑھی میں چھپ کر بیٹھ جاتا تھا۔

صبح اُٹھ کر راجا نے ایک اعلان نکالا کہ اس کی بادشاہت میں جتنے بھی پستو ہیں وہ سب مار ڈالے جائیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس پستو نے راجا کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جہاں موقع ملا اس کو کہیں نہ کہیں کاٹ لیتا۔ جسم پر دھبّے پڑ گئے اور دو راتوں کے مسلسل جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ اب تو اس کے سامنے کوئی چارا نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ پستو کی شرط مان لے۔ آخر اس نے تھک کر کہا "اچھا کہو کیا کہتے ہو میں تمھاری شرط ماننے کے لئے تیار ہوں۔"

"تم اپنی رعایا کو خوش کرو۔" پستو نے

خوش ہو کر کہا۔

"خوش میں کیسے کر سکتا ہوں" راجا نے پوچھا۔

"تم یہ ملک چھوڑ کر چلے جاؤ" پستو نے جواب دیا۔

"کیا میں اپنے ساتھ اپنی کچھ دولت بھی لے جا سکتا ہوں"

"ہرگز نہیں، اس لیے کہ وہ دولت تمھاری نہیں ہے بلکہ تمھاری رعایا کی ہے"

راجا بہت گڑگڑایا۔ آخر اس پر پستو کو رحم آگیا اور پستو نے اُسے کچھ سونا لے جانے دیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد رعایا ہنسی خوشی رہنے لگی۔ اس لیے کہ پھر رعایا نے اپنی حکومت خود چن کر بنائی اور مزے سے رہنے لگے۔



بقیہ "سارناتھ کی سیر"

کھودی گئی ہیں۔ شاید یہ استوپ گپت عہد یا اس سے بھی پہلے بنا تھا۔ اس استوپ کے پاس ہی ایک نیا مندر ہے یہ جینیوں کا بنوایا ہوا ہے۔ جینیوں کے گیارھویں تیرتھنکر انش ناتھ نے یہیں نروان حاصل کیا تھا۔ ان ہی کے نام پر یہ مندر بنوایا گیا تھا۔ ان پرانی یادگاروں کو دیکھنے کے بعد ہم لوگ مول گندھ کٹی بہار دیکھنے گئے۔ اس نئی عمارت کا آرٹ بھی ہمارے دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس کی دیواروں پر اندر کی طرف ایک جاپانی مصور نے تصویریں بنائی تھیں۔ ان میں بدھ کی زندگی دکھائی گئی ہے۔

تقریباً چار بجے میں لوٹ پڑا۔ راستے میں سوچ رہا تھا کہ سارناتھ پندرہ سو سالوں کی تاریخ چھپائے ہوئے پڑا ہے۔ حضرت عیسیٰ سے تین سو سال پہلے سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک کے پندرہ سولہ سو سال کا تاریخی فنی خزانہ اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ فن تعمیر اور نقاشی کے فن میں ہمارے باپ دادا بڑے ہوشیار اور بلند تھے۔

جلیب احمد

بات کا پاس

حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں مسلمانوں نے بہت سی لڑائیاں لڑیں۔ چنانچہ ایک لڑائی ایرانیوں سے بھی ہوئی۔ اس جنگ میں بڑا کشت وخون ہوا۔ ایرانیوں نے جان کی بازی لگا دی لیکن مسلمان اُن کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور تھے چنانچہ ایرانی ان کا مقابلہ نہ کرسکے اور میداں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بہت سے مارے گئے اور باقی گرفتار ہونا شروع ہوگئے۔

ایرانی لشکر کے سپہ سالار کا نام جابان تھا۔ اتفاق سے ایک مسلمان نے جابان کو بھی گرفتار کرلیا۔ جابان نے اپنی جان بچانے کی خاطر فوراً بات بنا دی اور کہا "میں ایک بوڑھا اور معمولی سا سپاہی ہوں۔ مجھے گرفتار کرکے تم کیا کروگے؟"

اس کو معلوم نہ تھا کہ یہ جابان ہے اور یہی ایرانی لشکر کا سپہ سالار ہے۔ بے چارہ اس کے بہکاوے میں آگیا اور اُسے معاف کردیا۔ لیکن اب اسے باقاعدہ پناہ دینے کا سوال تھا اس لئے بات پکّی کرنے کے لئے وہ اور جابان، اسلامی سپہ سالار حضرت ابو عبیدؓ کے خیمے میں پہنچے۔ لوگوں نے جابان کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ ایرانی لشکر کا سپہ سالار ہے۔ اور جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ

انہیں کے ایک ساتھی نے اسے پناہ دی ہے تو ان کو افسوس ہوا لیکن پھر ان کی سمجھ میں ایک بات آئی۔ انہوں نے اپنے سپہ سالار سے کہا "جابان نے اپنی جان بچانے کے لئے بہانہ بنا کر ہمارے سپاہی کو دھوکا دیا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے"۔

ان کے سپہ سالار ابو عبیدؓ نے ان کی یہ بات سنی تو فرمایا: "جب قوم کے ایک فرد نے جابان کو امان دے دی تو پوری قوم کو اس کی بات کا پاس کرنا چاہیے۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا کہ جابان کو قتل کر دیا جائے۔ وعدہ خلافی اسلام کی شان کے منافی ہے۔

چنانچہ ان کے سپہ سالار ابو عبیدؓ نے جابان کو چھوڑ دیا ــــــ ساتھ ہی اسلامی تاریخ نے ابو عبیدؓ کے اس کارنامے کے لئے اپنے صفحات میں جگہ چھوڑ دی تاکہ آئندہ نسلوں میں اس کی یاد تازہ رہے۔

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں

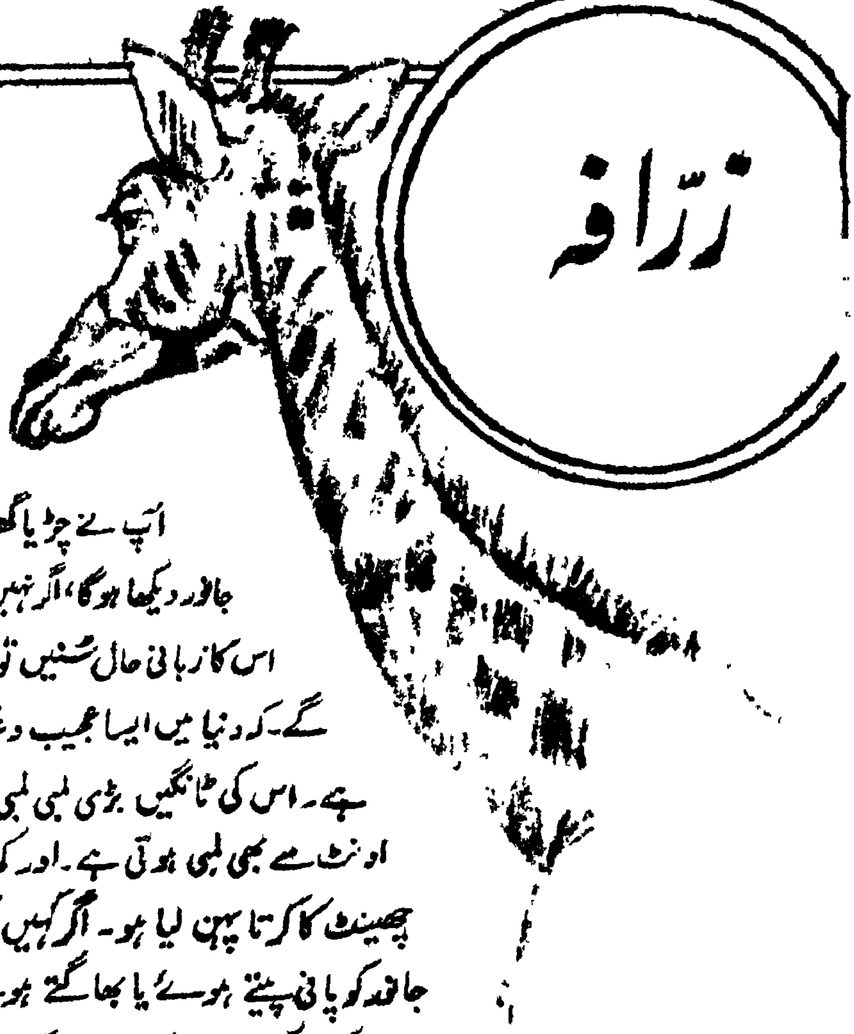
بدلہ

ایک مُلّا جی چلے جا رہے تھے، راستے میں ایک آدمی سے ان کا جھگڑا ہو گیا۔ اس آدمی نے ان کے منہ پر تھپڑ مار دیا اب کیا تھا۔ یہ معاملہ قاضی کی عدالت میں پہنچا۔ قاضی نے یہ فیصلہ دیا کہ مُلّا جی بھی اس آدمی کے تھپڑ مار دیں۔ لیکن مُلّا جی اس فیصلے کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ آخر قاضی نے دوبارہ یہ فیصلہ دیا کہ وہ آدمی جرمانے میں مُلّا جی کو ایک روپیہ لا کر دے۔ وہ آدمی اپنے گھر روپیہ لینے چلا گیا۔ جب دیر ہو گئی اور وہ آدمی نہیں آیا تو مُلّا جی نے قاضی کے تھپڑ مار کر کہا "میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا مجھے اور بھی کام ہیں۔ جب وہ آدمی روپیہ لے کر آئے تو آپ اس تھپڑ کے عوض میں اس سے روپیہ لے لیجئے گا"۔

دلجیت سنگھ آزاد
ٹاٹانگر

زرّافہ

ریحان احمد عباسی



آپ نے چڑیا گھر میں ایک عجیب و غریب جانور دیکھا ہوگا، اگر نہیں دیکھا اور آپ کسی سے اس کا زبانی حال سُنیں تو مشکل ہی سے یقین کریں گے۔ کہ دنیا میں ایسا عجیب و غریب جانور بھی موجود ہے۔ اس کی ٹانگیں بڑی لمبی لمبی ہوتی ہیں اور گردن تو اونٹ سے بھی لمبی ہوتی ہے۔ اور کھال ایسی کہ جیسے کسی نے چھینٹ کا کرتا پہن لیا ہو۔ اگر کہیں آپ اس عجیب و غریب جانور کو پانی پیتے ہوئے یا بھاگتے ہوئے دیکھیں تو اپنی ہنسی نہیں روک سکتے۔ اس دلچسپ جانور کو زرّافہ کہتے ہیں۔

زرّافہ اپنی بڑی گردن اور لمبی لمبی ٹانگوں کی وجہ سے آج کی دنیا کا سب سے لمبا جانور ہے۔ حالانکہ اس کا جسم گھوڑے سے بھی کم ہوتا ہے۔ پیروں سے سینگوں تک اس کی لمبائی اٹھارہ اور بیس فٹ کے درمیان ہوتی ہے۔ اس کی گردن تقریباً ۵ فٹ لمبی ہوتی ہے اور پاؤں کی اونچائی

عام طور پر ۸ فٹ ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور رسیلی ہوتی ہیں۔ اور بہت دور تک دیکھتی ہیں۔ سر چھوٹا سا ہوتا ہے۔ جس پر دو ہڈیاں نکلی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور یہی اس کی سینگ ہوتے۔ یہ سینگ پیدائشی نکلے ہوتے ہیں۔ اس کے سم گھوڑے کی طرح ہوتے ہیں۔ پچھلی ٹانگوں کی بہ نسبت اگلی ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں۔ کھال کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ جسم پر چیتے کی طرح کے خوشنما گل پڑے ہوتے ہیں۔ پیٹ اور پیروں کا رنگ سفیدی مائل ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے زرّافہ بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔

زرّافہ افریقہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایسے مقاموں پر رہتا ہے جو تمام سال خشک رہتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ مہینوں بغیر پانی کے گذر کر لیتا ہے۔ زرّافہ پیڑوں کی پتیاں کھاتا ہے۔ لمبی گردن اور لمبے لمبے پیروں کی وجہ سے اونچے سے اونچے پیڑ کی پتیاں آسانی سے توڑ لیتا ہے۔ اس کی زبان تقریباً ۱½ فٹ لمبی ہوتی ہے جس کی وجہ سے اونچی سے اونچی ٹہنی کی پتیاں نوچنے میں اسے بہت مدد ملتی ہے۔ زرّافہ گھاس بھی کھاتا ہے۔ لمبی ٹانگوں کی وجہ سے گردن زمین تک نہیں پہونچ پاتی اس لئے گھاس کھانے کے لئے اور پانی پینے کے لئے اس کو اپنی اگلی دونوں ٹانگیں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر دائیں بائیں پھیلانی پڑتی ہیں۔ ایسی حالت میں بہت بھدا معلوم ہوتا ہے جس کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔

زرّافہ بھی گائے بھینس کی طرح جگالی کرتا ہے۔ چوں کہ اس کو ہر وقت اپنے دشمنوں کا خطرہ لگا رہتا ہے اس لئے جلدی جلدی پتیاں وغیرہ کھا کر کسی محفوظ جگہ بیٹھ جاتا ہے اور وہیں اپنے کھانے کو پوری طرح چبا چبا کر ہضم کرتا ہے۔

زرّافہ اپنے دشمن کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے یا پیڑوں کے سائے میں چھپ جایا کرتا ہے۔ گھوڑے کی طرح مضبوط ٹانگیں اور سم ہونے کی وجہ سے کافی تیز دوڑ لیتا ہے۔ لمبی لمبی ٹانگیں اور جسم پر چتیاں ہونے کی وجہ سے پیڑوں کے سائے میں بھی آسانی سے چھپ جاتا ہے۔ جب یہ دوڑتا ہے تو اپنی لمبی لمبی ٹانگوں کی وجہ سے بڑا بھدا معلوم ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ زرّافہ بول نہیں سکتا۔ لیکن دراصل یہ بات نہیں ہے۔ اس کی آواز بہت باریک اور ہلکی ہوتی ہے جو قریب ہی سے سنائی دیتی ہے۔ زرّافہ بھی ہرن کی طرح چوکنّا رہتا ہے ذرا سی

آہٹ ہوئی اور اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ کیسی ہی ہلکی آواز ہو وہ سن لیتا ہے۔

زرّافے میں ایک خوبی اور ہے کہ عام جانوروں کی طرح وہ جھگڑالو نہیں ہوتا اور جھگڑوں سے بچتا رہتا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ بزدل ہوتا ہے۔ بلکہ مصیبت پڑنے پر وہ بڑی بہادری سے مقابلہ کرتا ہے۔

افریقہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ زرّافہ اپنی ٹانگوں سے حملہ کر کے شیر تک کو لنگڑا کر دیتا ہے۔ ایسے حملے زرّافے کی مادہ اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے کرتی ہے۔ لیکن شیر تو پھر شیر ہے جو بڑے بڑے مضبوط جانوروں کو مار ڈالتا ہے۔ یہ زرّافے پر پیچھے سے جھپٹتا ہے اور اس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا ہے۔ بے چارہ زرّافہ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن پھر بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے اور مر جاتا ہے۔ شیر پھر اسے تکا بوٹی کر کے کھا لیتا ہے۔

بقیہ "گیدڑ اور تیتر کی دوستی"

نہیں ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی تفریحوں میں اپنی جان کو ساتھ لئے لئے پھرے۔ وہ اپنی جان کو تو اپنے گھر کھانے کی الماری میں بند کر کے آیا ہے۔"

مگرمچھ نے تعجب کے ساتھ پوچھا "کیا یہ بات سچی ہے؟"

تیتر نے کہا "بالکل سچی۔ اور اگر یقین نہ آئے تو اس کو کھا کر دیکھو خواہ مخواہ پریشان ہو گے اور اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔"

مگرمچھ نے ایک سانس بھری اور کہا "یہ تو بہت برا ہوا" اور دونوں کو دریا کے کنارے پہنچا دیا۔

تیتر نے پوچھا "کہو بھئی اب تو خوش ہوئے؟"

گیدڑ نے کہا "اچھے تیتر، تم نے مجھ کو ہنسایا رلایا بھی، اچھا کھانا بھی کھلایا، جان بھی بچائی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم ایک دوست کے لئے ضرورت سے زیادہ چالاک ہو۔" اور اس کے بعد گیدڑ پھر کبھی تیتر کے پاس نہیں آیا۔



اقبال احمد

چکور



ہزاروں برس پہلے کی بات ہے۔ ایک غار میں چار پریاں رہتی تھیں۔ یہ پریاں بہت خوب صورت تھیں۔ اس غار کے اندر اُن کا ایک عالی شان محل بنا ہوا تھا۔ اس محل کی دیواریں سونے کی تھیں اور چھت سنگ مرمر کی۔ اس چھت میں ہزاروں ہیرے جواہرات اور موتی لگے ہوئے تھے جن کی چمک سے غار کے اندر اُجالا رہتا۔ یہ پریاں دن بھر خوب ناچتیں، کودتیں، گیت گاتیں اور جونہی شام ہونے آتی کھا پی کر سو رہتیں۔ انھوں نے چاند یا سورج کی روشنی نہیں دیکھی تھی کیونکہ کبھی غار کے باہر قدم نہ نکالا تھا۔ بچپن ہی میں ان کے دل کے اندر یہ ڈر بٹھا دیا گیا تھا کہ غار کے باہر بڑی تیز روشنی ہے اور اسے دیکھتے ہی ان کی آنکھیں پھوٹ جائیں گی۔

ایک دن اتفاق سے سب سے چھوٹی پری ننھی بیگم رات کو پانی پینے اٹھی۔ پلنگ سے اٹھتے وقت دروازے کے سامنے کچھ روشنی سی معلوم ہوئی۔ ننھی بیگم

نے ایسی روشنی کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس کا دل بہت خوش ہوا۔ پہلے تو وہ جھجکی مگر ہمت کر کے آخر کار دروازے کے قریب آ ہی گئی۔ اس نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے اور یہ روشنی باہر سے آ رہی ہے۔ اس کا دل نہ مانا اور وہ باہر نکل آئی۔ غار سے باہر قدم نکالتے ہی اسے ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیلی نظر آئی۔ آج چودھویں تاریخ کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ اس نے جونہی آسمان کی طرف دیکھا، سینکڑوں چھوٹی چھوٹی چمک دار چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک تھالی کی طرح گول بڑی سی چیز اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ یہ گول تھالی بڑی روشن اور منور تھی۔ وہ تعجب میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی چند لمحوں کے بعد اس نے غور سے دیکھنے کے خیال سے ذرا آگے بڑھ کر نظر جمائی۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ گول چیز بھی اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اس نے سوچا کہ یہ تو میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ میں اسے پکڑ کر اپنے غار میں کیوں نہ لے جاؤں۔ یہ خیال آتے ہی ننھی بیگم آسمان کی طرف اڑی اور اڑتی ہی چلی گئی۔ جب وہ تھکنے لگتی اور واپسی کا خیال کرتی اس وقت اسے ایسا معلوم ہوتا کہ چاند بس تھوڑی ہی دور رہ گیا ہے اور وہ جوش میں آ کر پھر تیزی سے اوپر کی طرف اڑنے لگتی۔ اسی طرح وہ رات بھر اڑتی رہی مگر چاند اس کے ہاتھ نہ آیا۔ آخر کار صبح ہو گئی۔ یکایک سورج نکل آیا اور چاند غائب ہو گیا۔ ننھی بیگم کی آنکھیں سورج کی تیز روشنی سے چکا چوند ہونے لگیں۔ چاند کے اوجھل ہو جانے کا اسے بڑا ہی دکھ ہوا اور وہ بے دم ہو کر زمین پر آ گری تمام دن وہ تھکی ہاری زمین پر پڑی رہی۔ دھوپ کی وجہ سے وہ اپنی آنکھیں بھی نہ کھول سکی۔ دن چھپتے ہی

اسے پھر پچھلی رات کی سی روشنی دکھائی دی۔ وہ چاند کو دیکھتے ہی بے قرار ہو گئی اور اسے پکڑنے کے لئے تیزی سے اوپر کو اڑی مگر صبح کو پہلے کی طرح بے دم اور نڈھال ہو کر پھر زمین پر آ گری۔

اسی طرح تمام رات ننھی بیگم چاند پکڑنے کی کوشش کرتی اور ناکام رہتی۔ چاند ہر دفعہ پچھلے روز سے زیادہ دیر میں نکلتا اور تھوڑا تھوڑا گھٹتا بھی جاتا۔ یہاں تک کہ مہینے کی ۲۸ تاریخ آ پہنچی۔ اس رات تو چاند ذرا سی دیر کے لئے بھی نہ نکلا۔ وہ رات کو بڑی دیر تک آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھی رہی اور آخر کار ناامید ہو کر سو گئی۔ ننھی بیگم کو اپنے غار سے نکلے ہوئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ وہ اپنے غار سے بہت دور جا چکی تھی۔ اب اسے واپس جانے کے لئے راستہ بھی یاد نہ تھا۔ زمین پر پڑے پڑے اس کا رنگ بھی میلا ہو گیا۔ بار بار نیچے گرنے سے بازو بھی زخمی ہو گئے اب اس سے زیادہ اڑا بھی نہ جاتا تھا۔ اور وہ ایک پری بن کر رہ گئی تھی۔

اب جب بھی چاند نکلتا ہے اور وہ دیکھ لیتی ہے تب اسے پکڑنے کے لئے بے چین ہو کر آسمان کا چکر کاٹنے لگتی ہے مگر اب بھی چاند اس کے قریب نہیں آتا اور وہ بے دم ہو کر زمین پر آ گرا کرتی ہے جب لوگ اس پری کو دیکھتے ہیں تو اسے چکور کہتے ہیں۔



بچوں کی کوششیں

"لالچ کا پھل"

کسی زمانے میں لکھنؤ میں ایک سوداگر تھا ایک بار اس کی ایک تھیلی کھو گئی! تھیلی میں چار سو روپے تھے۔ سوداگر نے سارے شہر میں منادی کرادی "جو آدمی میری تھیلی لاکر دے گا۔ اس کو دو سو روپے انعام دوں گا"

یہ تھیلی ایک نائی کو ملی تھی۔ نائی نے منادی کرنے والے سے پوچھا! "بھائی کس کی تھیلی کھو گئی اور اس تھیلی میں کتنے روپے تھے؟" منادی کرنے والے نے کہا! کہ بھائی ہمارے سیٹھ کی تھیلی کھو گئی ہے اس میں چار سو روپے تھے۔

جو آدمی یہ تھیلی لائے گا اس کو سیٹھ جی دو سو روپے انعام کے طور پر دیں گے۔

نائی بڑا ایماندار آدمی تھا اس نے کہا۔ "اچھا سیٹھ جی سے کہہ دینا کہ ان کی تھیلی میرے پاس ہے۔ میرا انعام دے دیں تو میں ان کی تھیلی واپس کر دوں گا۔"

سوداگر کو جب معلوم ہوا۔ تو وہ سوچنے لگا۔ تھیلی کا تو پتہ لگ گیا۔ اب کوئی تدبیر ایسی کرنی چاہیے کہ روپے نہ دینا پڑیں۔ اس کی سمجھ میں ایک تدبیر آئی۔ اس نے نائی کو بلا کر پوچھا "کیوں جی تم کو میری تھیلی ملی ہے؟" نائی نے کہا! "ہاں ملی تو ہے آپ میرا انعام دیجیے، تو میں آپ کی تھیلی واپس کر دوں گا۔"

سوداگر نے کہا "اس تھیلی میں چار سو روپے اور ہیرے کی ایک انگوٹھی تھی، جاؤ، جلدی تھیلی لے آؤ۔ میں تمھارا انعام ابھی دے دوں گا۔"

نائی نے کہا "تھیلی میں صرف چار سو روپے تھے۔ اس میں انگوٹھی تو تھی نہیں۔" اس پر سوداگر نے بگڑ کر کہا! تھی کیوں نہیں! ضرور تھی تم نے اُسے کہیں چھپا دیا ہو گا۔ جاؤ جلدی لے آؤ۔"

نائی قسمیں کھانے لگا۔ لیکن سیٹھ نے اس کی بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی۔ وہ نائی کو دھمکیاں دینے لگا "اگر میری تھیلی واپس نہیں کروگے۔ تو میں قاضی سے جا کر شکایت کر دوں گا"

اب تو نائی کو بھی غصہ آگیا اس نے کہا! آپ جب تک میرا انعام نہیں دیں گے۔ تب تک میں آپ کی تھیلی واپس نہیں کروں گا۔"

آخر سوداگر نے جا کر قاضی سے شکایت کر دی۔ قاضی نے نائی کو بلا کر پوچھا! اس نے کہا "حضور! تھیلی میں صرف چار سو روپے تھے انگوٹھی نہیں تھی۔ سیٹھ جی نے اعلان کیا کہ جو آدمی یہ تھیلی ڈھونڈ کر لا دے گا اسے انعام دوں گا۔ لیکن جب میں نے انعام مانگا تو انگوٹھی کی بات کرنے لگے۔"

اب قاضی نے سوداگر سے پوچھا "بتلاؤ تمھاری انگوٹھی کیسی تھی؟ تم کو کہاں سے ملی؟ اس کا بنانے والا کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟"

اب تو سوداگر بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ اس نے اُلٹا سیدھا جواب دیا جس سے قاضی سمجھ گیا۔ کہ سوداگر جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے سوداگر سے کہا! ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔ نائی کو جو تھیلی ملی ہے وہ تمھاری نہیں ہے تمھاری

تھیلی کسی دوسرے شخص کو ملی ہوگی۔ تم پھر سے منادی کراؤ۔ کہ تمھاری تھیلی میں چار سو روپے اور ایک ہیرے کی انگوٹھی تھی۔" پھر اس نے نائی سے کہا "تم جاؤ وہ تھیلی اس آدمی کی نہیں ہے۔ تم اس تھیلی کو چالیس دن تک اپنے پاس رکھو۔ اس میں سے ایک پیسہ بھی مت خرچ کرنا۔ اگر چالیس دن تک تھیلی والے کا پتہ نہ لگے تو وہ تھیلی تمھاری ہو جائے گی۔"

یہ سن کر بے چارے سوداگر کا منہ لٹک گیا اس لئے کہ اس نے لالچ میں پڑ کر سب کچھ گنوا دیا۔

ڈی۔ احمد۔ بادشاہ جوہر میلوشارم

"ایک درخواست"

حامد میاں کو جب کہیں کوئی کام نہ ملا تو انھوں نے ٹائپ کرنا سیکھ لیا اور ٹائپ کی ایک اچھی سی مشین بھی خرید لی۔ اب انھوں نے ایک دکان کرائے پر لے لی اور اس طرح روزانہ ان کو اتنا کام مل جاتا تھا کہ تین چار روپے کی آمدنی ہو جاتی تھی۔

ایک دن وہ اپنی دکان میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی اندر آیا اور بولا "بھائی صاحب! میرا یہ خط ٹائپ کر دیجیے۔"

حامد میاں بولے "ہاں لائیے، ابھی ٹائپ کئے دیتا ہوں۔ مگر اس کا معاوضہ آٹھ آنے لوں گا۔"

وہ آدمی آٹھ آنہ دینے پر راضی ہو گیا۔ اور اس نے جیب سے خط نکال کر حامد کے سامنے رکھ دیا۔

حامد نے جیسے ہی خط پر نظر ڈالی، اس آدمی نے وہ خط اٹھا لیا اور بولا "ارے یار تم تو اسے پڑھنے لگے۔ پڑھنے کی نہیں ٹھہری۔ پیسے لو اور ٹائپ کرو۔ میں کوئی مفت کرا رہا ہوں۔ تم خط پڑھ کر میرا سارا راز جاننا چاہتے ہو۔"

حامد میاں بولے "بھئی بغیر پڑھے کس طرح ٹائپ کر دوں۔"

اس پر اس آدمی کو جیسے بہت غصہ آیا، بولا "تب پھر کیا جانتے ہیں، آپ ٹائپ کرنا، اگر آٹھ آنے کم ہوں تو نو آنے لے لیجیے، مگر میرا خط نہ پڑھیے۔"

حامد میاں اس کا منہ تکتے رہ گئے، اور وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

جمیل اشرف عثمانی

جھوٹ کی سزا

پُرانے زمانے کا ذکر ہے کہ کسی آدمی کو جھوٹ بولنے کی پاداش میں ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوئی۔ جب جلاد اس کا ہاتھ کاٹنے لگا تو اس آدمی نے کہا کہ "میرا ہاتھ مت کاٹو، میرے ہاتھ میں ایک ایسا ہُنر ہے کہ جو آدمی بھی اُسے سیکھ لے وہ لکھ پتی بن سکتا ہے۔"

پہلے تو اس آدمی کی بات سُن کر سب ہنسے لیکن پھر ایک بوڑھے نے کہا "ہو سکتا ہے کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہو وہ سچ ہو، اس لئے کیوں نہ اس کو آزمالو، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ اگر اس کا دعویٰ جھوٹا ثابت ہو تو شوق سے اُسے سزا دینا، ورنہ پھر اُسے سزا نہ دینا۔"

آخر لوگ اُسے راجا کے پاس لے گئے۔ اس آدمی نے یہی بات راجا سے بھی کہی۔ راجا نے پوچھا "تم کون سا ہُنر جانتے ہو؟"

اس نے جواب دیا "حضور میں سرسوں کے بیج کو بوتا ہوں۔ مہینے بھر میں اس کے پودے اُگ جاتے ہیں اور ان میں پھول بھی آجاتے ہیں۔ اور پھر یہی پھول خالص سونا بن جاتا ہے پھر تین بھر بیج سے تول بھر سونا تیار ہو جاتا ہے۔ آپ ابھی میرا امتحان لے لیجئے۔"

آخرکار سرسوں کے کچھ بیج لائے گئے اور محل کے اندر ایک ہرے بھرے میدان میں خوب اچھی طرح جوتائی ہوئی۔

اب اس آدمی سے کہا گیا کہ تم سرسوں کے بیج لے کر بوؤ۔ یہ سُن کر وہ ہاتھ جوڑ کر راجا کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بولا "سرکار! اس کے لئے ایک شرط یہ ہے کہ اس کا بونے والا کوئی ایسا آدمی ہو جس نے کبھی کوئی جھوٹ نہ بولا ہو اور میں اسی جرم میں پکڑا گیا تھا، اس لئے بہتر ہے کہ یہ کام کسی اور کے سپرد کیا جائے، جو میری نگرانی میں یہ کام کرے۔ اس لئے کہ اگر کوئی جھوٹا آدمی اسے بوئے گا تو فوراً اُس کی جان چلی جائے گی۔"

راجا نے کہا "اچھی بات ہے، یہ کام ہمارے خزانچی کے سپرد کیا جائے۔"

چنانچہ خزانچی دربار میں حاضر کیا گیا۔ خزانچی نے جب یہ سُنا تو ڈرتے ڈرتے بولا "حضور مجھے اس کام سے معاف رکھا جائے، اس لئے کہ میں کئی بار جھوٹ بول چکا ہوں۔"

اب راجا نے اپنے وزیر سے کہا "اگر خزانچی

یہ کام نہیں کر سکتا تو تم خود کرو۔"

وزیر نے کہا "حضور! میں بھی اس کے لائق نہیں، اس لئے کہ مجھ سے بھی یہ غلطی کئی بار ہوئی ہے۔"

اب سب نے راجا کی طرف دیکھا اور اس آدمی نے مسکرا کر راجا سے کہا: "اچھا تو اب یہ کام آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔"

راجا نے کہا "اس خیال کو چھوڑ دو، مجھے سونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ غلطی اتفاق سے مجھ سے بھی ہو گئی ہے۔"

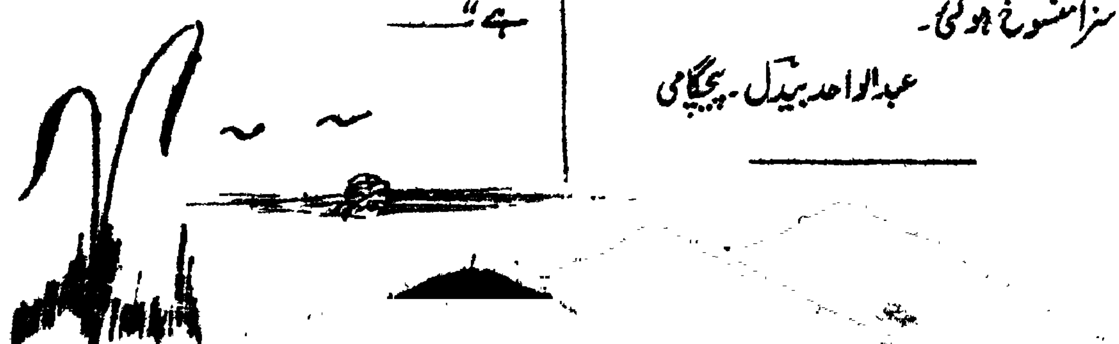
تب اس آدمی نے کہا حضور اگر اس بھرے میدان میں کتنے بڑے بڑے آدمی وہی غلطی کر سکتے ہیں۔ جو مجھ سے ہوئی تو پھر مجھے اکیلے ہی ہاتھ کاٹنے کی سزا کیوں مل رہی ہے؟"

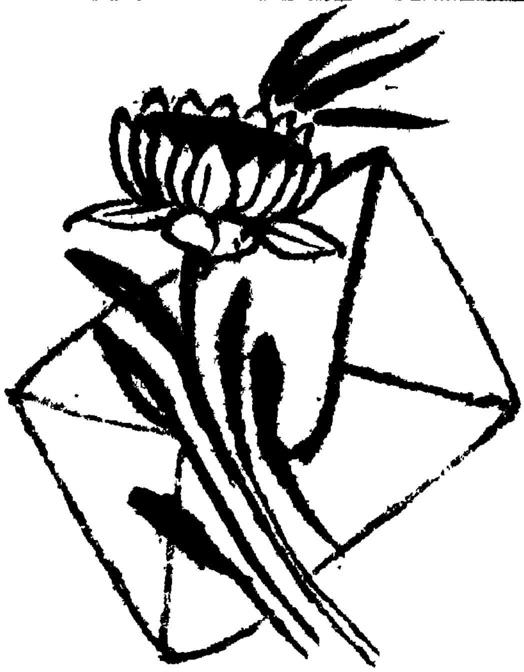
یہ سن کر راجا بہت شرمندہ ہوا اور اس کی سزا منسوخ ہو گئی۔

عبدالواحد بیدل۔ پچگامی

"عجیب بات"

ایک صاحب جو مدراس کے کسی علاقے کے رہنے والے تھے ایک محکمہ میں ملازمت کے لئے آئے۔ اور دوسرے امیدواروں کی طرح ان کا بھی انٹرویو ہوا ــــــ ان سے سوال کیا گیا کہ "ڈاکٹر راجندر پرشاد کون ہیں؟" ــ آپ نے لاعلمی ظاہر کی پھر پوچھا گیا کہ "پنڈت جواہر لال نہرو کون ہیں؟" صاحب موصوف نے کہا: "نہیں معلوم" ــــ آپ سے انٹرویو لینے والے افسر نے کہا: "پنڈت نہرو بھارت کے وزیر اعظم ہیں" ــــ تو آپ نے کہا "وہ دہلی میں رہتے ہیں اور ہم یہاں۔ اتنی دور کی بات ہمیں کس طرح معلوم ہو سکتی ہے" ــــ





باجی کا خط

پیاری بچو!

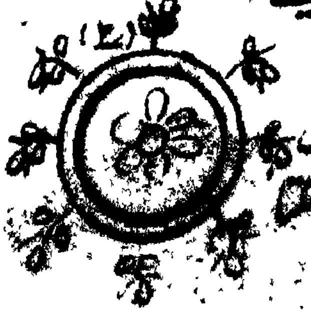
بھئی جاڑے تو ختم ہو گئے۔ اب تو گرمی ... ہے۔ ہلکے پھلکے کپڑے بنانے کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔ گرمی کی سلائی کا کام کس کس نے شروع کر دیا۔

اگر نہیں کیا تو آیئے۔ ہم ہی سے بسم اللہ کیجیے۔

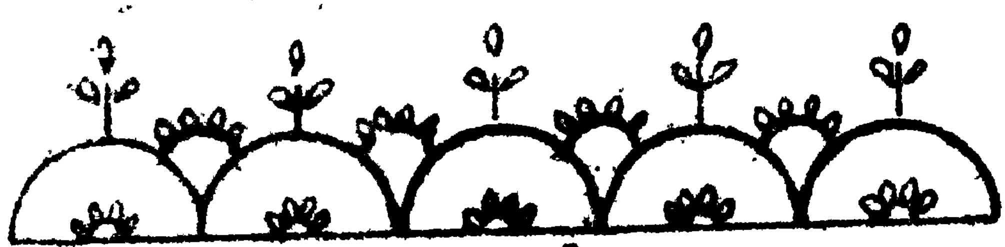
دیکھیے پھول (۱) یہ آپ سفید یا کسی ہلکے رنگ کی قمیض پر بنایئے۔ قمیض یا تو وائل کی ہو یا اس موسم میں پہننے کے لئے لینن کی بنا کر اُس پر بنایئے۔



(۲) یہ پھول بھی قمیض کے دامن یا رومال کے کونے پر بنایا جا سکتا ہے۔



(۳) ساری کے بارڈر پر قمیض کے اور میز پوش کے لئے ہے۔

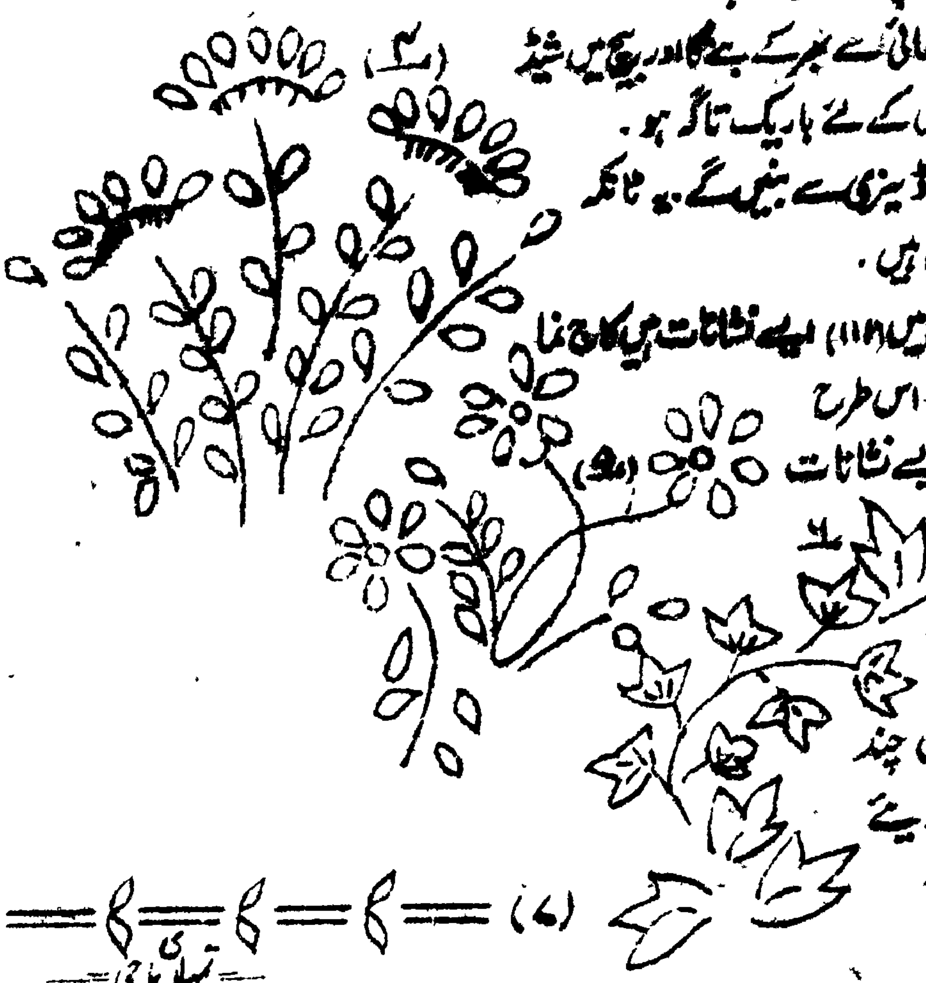


اسی طرح دوسرے پھول ہیں۔ نمبر (۷) قمیض یا میز پوش پر موٹے ڈی۔ ایم۔ سی سے بنائیے۔ تاگہ موٹا ہو اور ۴ رنگوں کا ہو۔

نمبر (۶) سادہ کڑھائی سے بھر کے بنے گا اور بیچ میں شیڈ دیا جائے گا۔ اس کے لئے باریک تاگہ ہو۔

باقی پھول لیزی ڈیزی سے بنیں گے۔ یہ ٹانکہ آپ لوگ سیکھ چکی ہیں۔

نمبر ۲ کا لگیرا جس میں (۱۱۲) ایسے نشانات ہیں کاج نما ٹانکے سے بنائیے۔ اس طرح نمبر ۴ میں جہاں ایسے نشانات ہیں بنے گا۔



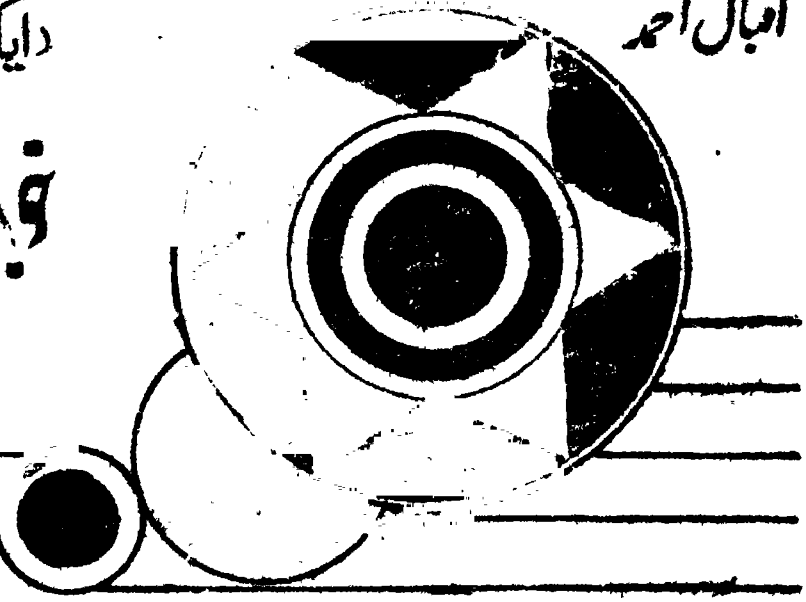
آئندہ پرچے میں چند اور نئے ٹانکے دیئے جائیں گے۔

تہلہ باجی

اقبال احمد

(ایک قسم کہانی)

خوابوں کے محل



کسی زمانے میں ایک بہت غریب آدمی تھا۔ وہ بچارا دن رات کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا لیکن اُسے کوئی کام نہ ملتا تھا۔ ایک دن وہ کام کی تلاش میں چلا جارہا تھا، راستے میں اسے ایک جنگل نظر آیا۔ اس جنگل میں، جھاڑی کے پاس اس نے ایک خرگوش کو دیکھا جو بڑے مزے کی نیند سو رہا تھا۔ خرگوش کی نیند تو مشہور ہی ہے۔ اس نے سوچا اب میں اس کو آسانی سے پکڑ سکتا ہوں، اور پھر اس کے بعد اسے جا کر اسے شہر میں بیچ دوں گا۔ یہ خرگوش بہت خوبصورت ہے۔ شہر کے دولت مند لوگ اس کے دو روپے تو دے ہی سکتے ہیں۔ جب میرے ہاتھ میں یہ دو روپئے ہوں گے تو میں اس سے ایک مرغی کا جوڑا خریدوں گا اور جیسے جیسے مرغی انڈے دیتی جائے گی اسے بیچتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ ایک دن میرے پاس کافی روپئے جمع ہو جائیں گے، اور میں اس سے مرغے اور مرغیاں بڑھاتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ کچھ دنوں کے اندر میرے یہاں کافی مرغیاں ہو جائیں گی۔ اور پھر یہ سب مرغیاں انڈے دیں گی۔ اہا ہا پھر تو میں اتنا روپیہ جمع کروں گا کہ ایک اچھا سا مکان بناؤں گا اور مزے میں رہوں گا۔ لیکن بغیر عورت کے گھر سونا سونا رہے گا اس لئے فوراً کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کروں گا۔ اب تو ہم میاں بیوی مزے میں

رہیں گے۔ پھر تو ہمارے ٹھاٹھ ہوں گے۔ اور اور دو تین سال کے اندر دو ایک بچے بھی ہو جائیں گے جو مجھے "ابا ابا" کہا کریں گے۔

جب یہ بچے بڑے ہو جائیں گے تو پھر میں ان کے لئے زمین خریدوں گا اور میرے لڑکے کھیتی باڑی کا کام کریں گے۔ میری بیوی گھر کا کام کاج کرے گی۔ لڑکیاں کھانا پکائیں گی۔ اور گھریلو کاموں میں ماں کی مدد کریں گی میں اطمینان سے سارے گھر کی نگرانی کروں گا۔ آخر اتنے بڑے گھر کی نگرانی کے لئے بھی تو کوئی نہ کوئی ہونا چاہیے۔ اور مجھ سے زیادہ ہر کام کی نگرانی کون کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ لڑکے پھر لڑکے ہی ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ غریبی کیا بلا ہوتی ہے وہ بڑی فضول خرچی سے پیسہ خرچ کریں گے جہاں ایک آنے سے آسانی سے کام چل سکتا ہے وہاں وہ ایک روپیہ خرچ کریں گے۔ اس لئے مجھے خوب اچھی طرح دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہوگی۔ ان لڑکوں کو غریبوں کا دکھ درد کیا معلوم ہوگا، یہ لوگ اپنے کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے ساتھ ضرور سختی سے پیش آئیں گے۔ اور اس وقت میں ان کو ڈانٹ دوں گا ــــ "ارے بیٹا ذرا سنبھل کے، ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ۔ تم کو معلوم نہیں غریبی کسے کہتے ہیں، میں بھی غریب رہ چکا ہوں۔"

اور جیسے ہی اس کی زبان سے اتنے زور سے آواز نکلی، خرگوش کی آنکھ کھل گئی اور وہ تیزی سے بھاگ نکلا۔ اور ذرا سی دیر میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ بے چارا منھ تکتا رہ گیا ــــ جیسے کوئی محل اڑاڑا دھم سے گر پڑا ہو۔

●

(بقیہ انسانی تہذیب ــ پتھر کے زمانے میں)

کوئی سرد کار نہ تھا۔ اس لئے کاہنوں کو سوچ بچار کرنے اور لوگوں کو سمجھنے کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اوٹ پٹانگ باتیں اکثر صحیح ثابت ہوتیں۔ جب تیر نشانے پر بیٹھتا تو گویا یہ ان کا کارنامہ ہوتا اور اگر بات غلط ثابت ہوتی تو یہ کہتے کہ دیوتا ناراض ہیں! ہوتے ہوتے کاہنوں کو بھی دیوتاؤں کا درجہ مل گیا۔

پہیلیاں

آپ پہیلیاں تو اکثر بوجھتے ہوں گے۔ پہیلیاں ویسے تو آسان معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کو بوجھنے کے لئے دماغ پر زور ڈالنا پڑتا ہے۔ اسی لئے جب کوئی سیدھی سادی بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی تو لوگ اسے پہیلی کہتے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو یہ پہیلیاں مشکل نہیں ہوتیں ذرا سا دماغ پر زور ڈالیئے تو سمجھ میں آجاتی ہیں ایسی ہی پہیلیاں ہم نیچے لکھ رہے ہیں۔ اپنے دماغ پر زور ڈالئے اور سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

ساون بھادوں بہت چلت ہے، ماگھ پوس میں تھوڑی
امیر خسرو یوں کہے تو، بوجھ پہیلی میری

آتا جاتا اس کا بھائے، جس گھر جائے لکڑی کھائے

ایک اچنبھا دیکھو، چل سوکھی لکڑی لاگے پھل
جو کوئی اس پھل کو پاوے، پیڑ چھوڑ کہیں اڑ نہ جاوے

آگے آگے بہنا آئی پیچھے پیچھے بھیا
دانت نکالے بابا آئے برقع اوڑھے بیا

دھوپ سے پیدا ہووے، چھاؤں دیکھے مرجھاوے
اے ری سکھی تجھ سے پوچھوں ہوا لگے مر جائے

کھیت میں اپجے سب کوئی کھاوے
گھر میں ہووے گھر کھا جائے

ایک باپ کے ہیں سو بیٹے
گول مول سب ایک ہی جیسے
چلیں پھریں سب ایک ہی ساتھ
سب کے پیٹ میں ایک ہی آنت

اشتیاق محمد خاں

گیدڑ اور تیتر کی دوستی



ایک گیدڑ اور تیتر میں بڑی دوستی تھی ۔ لیکن گیدڑ بڑا کینہ پرور تھا۔ اس کو تیتر کی دوستی پر بھروسہ نہ تھا ایک دن گیدڑ نے تیتر سے کہا " تم میری دوستی کا دم تو بھرتے ہو لیکن تم ہی بتاؤ تم نے میرے لئے کون سا کام کیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ سچا دوست وہی ہے جو مجھے ہنسا یا رُلا سکے، یا مجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلا سکے، اور اگر ضرورت پڑے اور میری جان خطرے میں ہو تو مجھے بچا بھی سکے۔"

تیتر نے کہا " اچھی بات ہے، تم میرے پیچھے پیچھے آؤ اگر میں تم کو ہنسا نہ دوں تو تم مجھے کھا ڈالو۔"

اب تیتر اڑتا رہا یہاں تک کہ اسے دو مسافر نظر آئے، جو ایک دوسرے کے پیچھے چلے جا رہے تھے دونوں آدمی بہت تھک گئے تھے۔ ایک مسافر اپنے کندھے پر لاٹھی میں کپڑوں کا ایک تھیلا باندھے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں اس کے جوتے تھے۔

تیتر چپ چاپ پہلے مسافر کی لاٹھی کے سرے پر بیٹھ گیا۔ مسافر کو کچھ پتہ نہ چلا۔ دوسرے مسافر نے جو تیتر کو لاٹھی پر بیٹھے دیکھا تو اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس کو مار کر کھایا جائے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اس نے اپنا جوتا زور سے تیتر پر مارا۔ تیتر پھُر سے اُڑ گیا، اور جوتا پہلے والے

مسافر کے لگا۔ اب کیا تھا دونوں میں زور کا جھگڑا ہوا۔ دوسرا مسافر کہتا تھا کہ میں نے جوتا تیتر پر مارا کہ تم پر اور دوسرا کہتا تھا کہ "نہیں، تم نے مجھ ہی پر جوتا مارا ہے" اور اب مجھے بیوقوف بناتے ہو" غرض دونوں میں بڑی مار پیٹ ہوئی یہاں تک کہ دونوں لہو لہان ہو گئے۔

گیدڑ یہ منظر دیکھ کر اپنی ہنسی نہ ضبط کر سکا تیتر سے کہا "کیوں بھائی اب تو خوش ہو"

گیدڑ نے کہا "یہ تو سچ ہے کہ تم نے مجھے ہنسا دیا لیکن بات تو جب ہے کہ مجھے رُلا بھی دو"

تیتر نے جواب دیا "اچھا دیکھا جائے گا۔ لیکن دیکھو وہ ایک شکاری اپنے دو کتوں کے ساتھ سڑک کے کنارے آ رہا ہے۔ تم فوراً اس کھوکھلے درخت میں گھس جاؤ اور مجھ کو دیکھتے رہو۔ پھر اگر تم آٹھ آٹھ آنسو نہ روئے تو کہنا کون کہتا تھا۔

گیدڑ نے ویسا ہی کیا جیسا اس سے کہا گیا تھا۔ وہ برابر تیتر کو دیکھتا رہا۔ تیتر نے جھاڑی کے قریب اپنے پر پھڑپھڑانے شروع کر دیئے اور [illegible]

کتوں کی نظر گیدڑ پر پڑی پہلے تو وہ بھونکے پھر انھوں نے اس پر پنجے مارنے شروع کر دیئے۔ اتنے میں شکاری بھی آ گیا اور اس نے درخت کی جڑ سے گیدڑ کی دم پکڑ کر اس کو باہر گھسیٹ لیا کتوں نے جی بھر کر اس کو نوچا کھسوٹا اور بالآخر مردہ سمجھ کر اس کو چھوڑ دیا۔

گیدڑ چپ سادھ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ تیتر اس کے اوپر پیڑ کی ایک شاخ پر بیٹھا ہوا ہے۔ تیتر نے بےچین ہو کر پوچھا "کیا تم رو رہے ہو؟" گیدڑ نے غصے سے کہا "چپ رہو! میری تو ڈر کے مارے آدھی جان ہی نکل گئی"

کچھ دیر تک گیدڑ وہاں بیٹھا رہا اس کے بعد اس کو بھوک لگنے لگی۔ اس نے پھر تیتر سے کہا "بھئی دیکھو، اب دوستی کرنے کا وقت ہے۔ اگر تم مجھ کو اچھا سا کھانا کھلا دو، تو میں سمجھوں گا کہ واقعی تم میرے سچے دوست ہو"

تیتر نے کہا "اچھی بات۔ بس تم مجھ کو دیکھتے رہو، اور جب وقت آئے تو اپنی مدد آپ [illegible] کر لینا"

[illegible] ذرا سی دیر میں کسانوں کی عورتیں [illegible]

گزریں۔ جو کھیتوں پر اپنے آدمیوں کے لئے کھانا لے جا رہی تھیں۔

تیتر نے خوب زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اور وہ ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی پر اڑ اڑ کر جانے لگا جیسے اس کے چوٹ لگ گئی ہو۔

تمام عورتوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ "یہ زخمی تیتر ہے۔ زخمی تیتر ہے۔ ہم اس کو آسانی سے پکڑ سکتے ہیں۔"

اب عورتیں اس کے پیچھے دوڑیں۔ لیکن چالاک تیتر ان سب کو پریشان کرتا رہا۔ اور آخر میں عورتوں نے اپنے اپنے کھانوں کی سب پوٹلیاں زمین پر رکھ دیں۔ اور غصہ میں آکر یہ طے کر لیا کہ اس کو پکڑ کر ہی چھوڑیں گے۔

گیدڑ کو یہ موقع اچھا ہاتھ آیا۔ وہ آہستہ آہستہ گیا اور سب کھانا جی بھر کر کھا لیا۔

تیتر نے کہا "کیوں بھائی اب تو ٹھیک ہے"

گیدڑ نے کہا "ہاں میں مانتا ہوں کہ مجھ کو اچھا کھانا کھلایا، ہنسایا بھی اور رلایا بھی۔ لیکن دوستی کا ایک بہت بڑا تجربہ ابھی باقی ہے اور وہ یہ کہ ابھی تم کو میری جان بچانی ہے۔"

تیتر نے کہا "شاید نہ بچا سکوں۔ اس لئے کہ میں تو بہت چھوٹا سا ہوں اور کمزور بھی کتنا" اسکے بعد تیتر نے کہا "دیکھو بھئی! اب زیادہ دیر ہو گئی ہے۔ چلو گھر چلیں۔ گھاٹ کا راستہ لمبا ہے اس لئے دریا پار کر کے چلیں گے۔ مگرمچھ میرا دوست ہے وہ اپنے اوپر بٹھا کر لے جائے گا۔"

مگرمچھ نے دونوں کو اپنی پیٹھ پر بٹھا لیا اور تیرنا شروع کر دیا۔ جب دریا کے بیچوں بیچ میں پہنچے تو تیتر نے کہا "مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں مگرمچھ ہمارے ساتھ کچھ دھوکا نہ کرے اور یہ کتنا برا ہو گا اگر وہ ہم کو پانی میں گرا دے۔"

گیدڑ کا چہرہ مارے ڈر کے پیلا پڑ گیا۔

اس نے کہا "برا تو تمہارے لئے بھی ہو گا"

تیتر نے کہا "بالکل نہیں۔ بالکل نہیں۔ میرے تو پر ہیں۔ تمہارے پر نہیں ہیں۔"

گیدڑ کانپنے لگا۔ اور جب مگرمچھ نے کہا کہ "میں بھوکا ہوں۔ اور وہ اُن کو کھانا چاہتا ہے تو تیتر نے چیخ کر کہا۔

"میں ... دوست بتاؤ [illegible]

[illegible]

پیامی معمّا نمبر ۳۲ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل پیامی معمّا نمبر ۳۲:- (۱) ظریف (۲) نماز (۳) عقل (۴) مسرور (۵) پاک (۶) جرم (۷) بعید

اس بار صحیح حل دس موصول ہوئے۔ لہٰذا پہلا انعام مبلغ تیس روپے دس حضرات پر بحساب تین روپے فی کس تقسیم کر دیا گیا۔

٭ (۱) محمد شفیع ضلع دھارواڑ (۲) اکرام علی۔ جمشید پور (۳) نبی بخش۔ کانپور (۴) کریم الدین۔ کانپور (۵) محمد جمیل شاہجہاں پور۔ (۶) صفیہ خاتون۔ بریلی (۷) شمیم احمد۔ پٹنہ (۸) محمد میاں۔ جموں۔ (۹) محمد شریف الدین۔ لکھنؤ (۱۰) محبوب علی۔ گیا۔

ایک غلطی والے ۲۳ حل موصول ہوئے لہٰذا مبلغ بیس روپے کا دوسرا انعام بحساب ۱۰ ارقی کس تقسیم کیا گیا

(ایک غلطی والوں کے نام جگہ کی کمی کے باعث نہیں دیئے جاسکتے)

٭ محمد شفیع صاحب ضلع دھارواڑ اپنا پورا پتہ صاف اور خوش خط لکھ کر روانہ کریں تاکہ ان کا انعام روانہ کرتے وقت دفتر کو کوئی دقت نہ ہو۔

نوٹ

(۱) اپنے حلوں کے ساتھ رسیدی ٹکٹ یا پھٹے ہوئے ٹکٹ نہ روانہ کریں۔ ورنہ آپ کے حل شریک مقابلہ نہیں کیے جائیں گے۔

(۲) اپنا پتہ صاف لکھیں۔ تاکہ انعام وقت پر مل سکے۔

(۳) حل تاریخ مقررہ سے پہلے ہی سپرد ڈاک کر دیا کریں۔

(۴) بغیر ٹکٹ والے حل شریک مقابلہ نہیں کئے جاتے۔

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں

پچاس ۵۰ روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ فی حل ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں اور پانچ حلوں کی فیس چار آنے

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۳۰ روپے || دوسرا انعام ایک غلطی پر ۲۰ روپے

حل اور فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۰ جون ۵۴ء

پیامی معما نمبر ۳۲

۱ ر		■	■	■	■
۲ م		ے	■	■	■
۳	ل	ا	■	■	■
۴	آ	ن	ے	■	■
۵ س	ر		ا	ر	■
٦ م		ل	■	■	■
۷	ا	ع	ق	■	■

(۱) ـ ـ ـ ـ کے بغیر آم اچھا ہی نہیں معلوم ہوتا۔
(رت ـ برس)

(۲) بہت دیر کے ـ ـ ہوئے لوگوں کو بھول جانا قدرتی بات ہے۔ (بچھڑے ـ مرے)

(۳) بدلی ـ ـ ـ دینے والے کا بڑا احسان ہوتا ہے (کھلا ـ ملا)

(۴) دولت ـ ـ ـ کی خواہش ہر ایک کو بہت پھر پانے لانے

(۵) ـ ـ ـ کا کام روکنے کی ہمت کس کو ہو سکتی ہے
(سرکار ـ سردار)

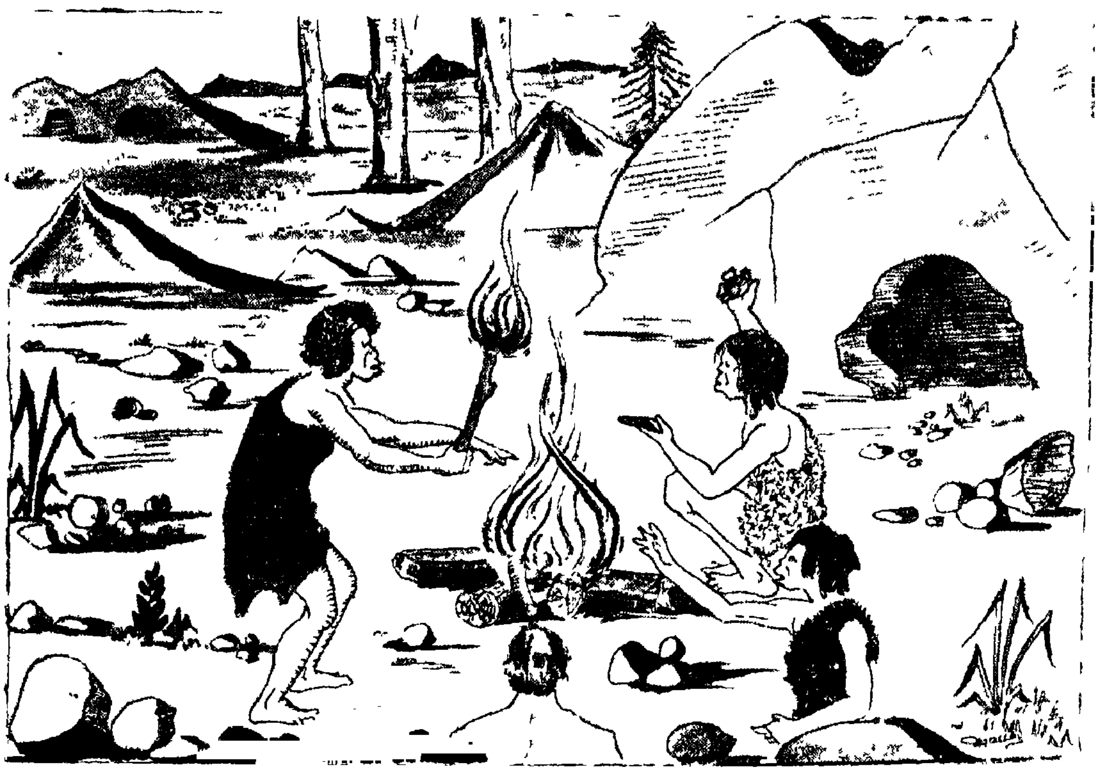
(٦) ـ ـ ـ ـ اچھا ہو تو سامان خرید ہی لیا جاتا ہے۔
(ڈول ـ مال)

(۷) دشمن اگر ـ ـ ـ ہو تو اس کی تعریف کرنا پڑتی ہے
(فائق ـ لائق)

کوپن پیامی معما نمبر ۳۲
نام ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ
پتہ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

کوپن پیامی معما نمبر ۳۲
نام ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ
پتہ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

پتہ: پیامی معما نمبر ۳۲ معرفت ماہنامہ پیام تعلیم
جامعہ نگر ـ دہلی



قدیم انسان نے جب پہلے پہل آگ جلانا سیکھا
اندر کے صفحات میں مشتاق احمد صاحب کا
• مضمون پڑھئے

Regd. No. D. 96
JUNE 1954.




پیام تعلیم
دہلی
ادارہ
حامد علی خاں
اطہر پرویز

دریائی گھوڑا



ہم تو بس جماہی لے رہے تھے

پیامِ تعلیم

حامد علی خاں بی۔ اے (جامعہ)

اطہر پرویز ایم۔ اے (علیگ)

آرٹسٹ۔ گلیڈون میسی

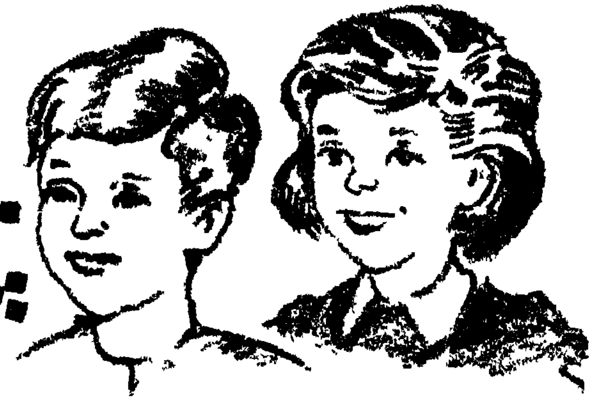
سالانہ چندہ ۴ روپے

فی پرچہ ۶ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی

فہرست



بچوں سے باتیں

خدا خدا کرکے جولائی کا مہینہ آگیا۔ سچ پوچھئے تو ہمارے لئے یہ مہینہ ایک نعمت ہے۔ ایک تو اس چلچلاتی ہوئی دھوپ سے نجات ملی، پھر بھئی ہم کو تو اس لئے بھی پسند ہے کہ اس مہینے میں ہمارے پھلوں کا بادشاہ پھلتا ہے۔ آم — وہی آم جس کے بارے میں ہماری زبان کے شاعر مرزا غالبؔ نے کہا تھا کہ "میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں"۔ اور جب تک لوگ آم کھاتے رہیں گے مرزا غالبؔ کا یہ قول بھی یاد رکھیں گے۔ کیوں! آپ کو بھی مرزا صاحب کی یہ بات پسند آئی۔

لیکن یہ تو جولائی کی کھانے پینے کی نعمت ہوئی، اسی مہینے میں آپ کے مدرسے بھی کھل رہے ہیں، آپ اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملیں گے اور — اپنی اپنی چھٹیوں کا حال سنائیں گے کہ اس عرصے میں کہاں کہاں گئے، کن کن جگہوں کی سیر کی، اور اس زمانے میں کیا کیا تفریحیں رہیں۔ لیکن بھائی ہم کو تو اس لئے اس مہینے کا انتظار تھا کہ جامعہ کا سناٹا ختم ہوگا۔ اور پھر وہی پہلے کی سی رونق ہو جائے گی ورنہ ہم تو اس اکیلے پن سے گھبرا گئے تھے۔

پچھلے دنوں ہمارے یہاں مہمان بھی کم آئے۔ البتہ ریاست بمبئی کے وزیرِ اعلیٰ شری مُرار جی ڈیسائی ہمارا مکتبہ دیکھنے کے لئے جامعہ نگر تشریف لائے۔ آپ نے بڑے غور اور دلچسپی سے مکتبہ جامعہ کی کتابوں کو دیکھا اور درسی کتابوں کے سلسلے میں ہماری کوششوں کو سراہا ——— آپ نے ہمارے ساتھ تقریباً دو گھنٹے گزارے۔

---

۲۹ رمئی کو جامعہ ملّیہ کے وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب صاحب جرمنی تشریف لے گئے۔ آپ تقریباً چار ماہ جرمنی میں قیام کریں گے۔ آپ اقوامِ متحدہ کے تہذیبی ادارے یونسکو کے کاموں کے سلسلے میں یہ وقت جرمنی میں گزاریں گے اور پھر دلّی واپس آئیں گے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے دنوں مارچ اپریل کا زمانہ ہمارے لئے بڑی معروفیت کا زمانہ رہا ہے اس لئے کہ اس زمانے میں دلّی اسٹیٹ کے محکمہ تعلیمات کے لئے مکتبہ میں کتابوں کی تیاری کا کام ہوا تھا۔ آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ دلّی حکومت نے اس تعلیمی سال کے لئے ہماری چھپّن کتابیں منظور فرمائی ہیں۔ جو جولائی سے دلّی کے مدرسوں میں پڑھائی جائیں گی۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہماری حکومت نے بچّوں کے ادب کے سلسلے میں بھی گہری دلچسپی لینی شروع کردی ہے۔ چنانچہ اس سال سے حکومت ہند کے محکمہ تعلیمات نے بچّوں کی ادب پر انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے لکھنے والے بچّوں کے لئے بہت کم لکھتے ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر حکومت اس طرح بچّوں کی کتابوں کی حوصلہ افزائی کرے گی تو ہمارے لکھنے والے بچّوں کے لئے زیادہ سے زیادہ کتابیں لکھیں گے اور بچّوں کا ادب دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گا۔

ہم مرکزی حکومت کے محکمۂ تعلیم کی ان کوششوں کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ حکومت ہر سال اس طرح اچھی کتابوں پر انعامات دے گی۔ اور بچّوں کے ادب کو ترقی دینے میں ہمارا ہاتھ بٹائے گی۔

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک — چکبست

یہ پیاری انجمن ہم کو مبارک　　یہ الفت کا چمن ہم کو مبارک
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

یہاں کی خاک ہم کو کیمیا ہے　　یہ سونے سے بھی قیمت میں سوا ہے
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

جو چڑیاں صبح کو گاتی ہیں اکثر　　اسی کا راگ ہے ان کی زباں پر
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وہ ساون کے مہینے کی گھٹائیں　　وہ کوئل اور پپیہے کی صدائیں
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وہ اک مستی کا عالم بادلوں میں　　وہ پھولوں کا مہکنا جنگلوں میں
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وہ چشمے اور وہ امرت سا پانی　　وہ گنگا اور جمنا کی روانی
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

درختوں پر وہ چڑیوں کا چہکنا　　وہ بیلے اور چنبیلی کا مہکنا
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

اسی کی خاک سے لیتے ہیں محصول　　یہی دیتا ہے غلّہ اور پھل پھول
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وطن کا جن بزرگوں سے ہوا نام　　اسی مٹی میں وہ کرتے ہیں آرام
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

(۱۹۱۶ء)



پروفیسر رئیس احمد

ہوا چلی

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جب بارش ہونے کے بعد ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو باہر کھیلنے میں کتنا مزا آتا ہے۔ مگر جب گرمیوں کی دوپہر میں گرم ہوا چلتی ہے تو کھیلنے کودنے اور پڑھنے لکھنے میں جی نہیں لگتا اور لوگ اکثر اس وقت سو جاتے ہیں۔ آپ نے گرمیوں کے موسم میں اکثر شام کو بڑے زور سے ہوا چلتے دیکھی ہوگی۔ اس تیز ہوا کو آندھی کہتے ہیں اور اس میں کتنی دھول اور پتیاں اُڑ اُڑ کر آتی ہیں۔ کبھی کبھی تو اتنی تیز ہوا چلتی ہے کہ چھپّر بھی اُڑ جاتے ہیں۔

اور ہاں آپ نے یہ بھی سُنا ہوگا کہ بائیسکل کے پہیئے میں ہوا بھری جاتی ہے۔ غبارے میں بھی لوگ منہ سے ہوا بھرتے ہیں تو غبّارہ پھٹ جاتا ہے اور آپ منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ چلنے والی ہوا آتی کہاں سے ہے۔ یا وہ ہوا جو خالی ٹیوب، یا غبارے میں بھری جاتی ہے، یہ کہاں رہتی ہے۔ ذرا اپنے کسی بڑے بھائی بہن سے یہ سوال پوچھئے کہ یہ ہوا کہاں سے آتی ہے۔

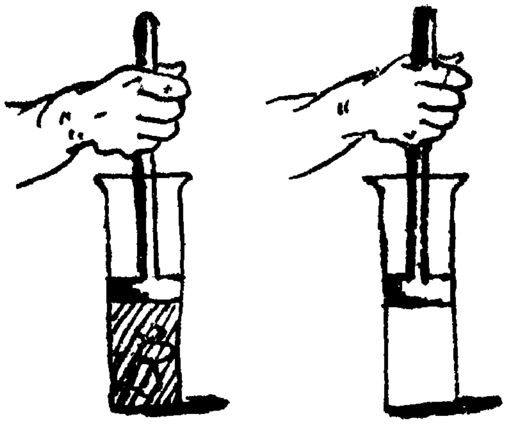
آئیے ہم آپ کو اس کا جواب بتائے دیتے ہیں۔ اگر آپ کی بڑی بہن یا بھائی آپ کے

سوال کا جواب نہ دے سکیں تو آپ ان کو سمجھا دیجئے گا۔ اس طرح وہ آپ کی عقلمندی کے قائل ہو جائیں گے۔

یہ ہوا تو ہر جگہ موجود رہتی ہے۔ ہم انسان ہوا میں اس طرح رہتے ہیں جیسے پانی میں مچھلیاں۔ یعنی ہمارے چاروں طرف ہر وقت ہوا رہتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ آپ جہاں بیٹھے ہوں اگر وہاں سے ہٹ جائیں، تو آپ کی جگہ فوراً بھر جائے گی۔ اگر آپ میز پر سے کتاب اُٹھالیں تو اس کتاب کی جگہ پر پھر ہوا آجائے گی۔ حد تو یہ ہے کہ خالی بوتل کے اندر بھی ہوا ہوتی ہے۔

آپ کے بھائی اگر آپ کی بات کا یقین نہ کریں اور کہیں کہ خالی بوتل میں کیسے ہوا ہوتی ہے کہ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے، چھو نہیں سکتے۔ تو پھر اتنی عجیب بات کا یقین کریں تو کیوں کریں۔

آیئے ہم سمجھائے دیتے ہیں ایک بڑا سا گلاس لیجئے اور اس میں ایک موٹی سی ڈاٹ گھسانے کی کوشش کیجئے، آپ کی آسانی کے لئے یہاں تصویر بھی ہے اسے

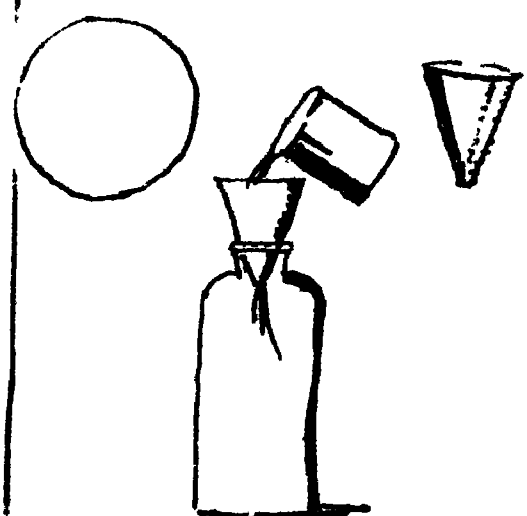


(۲) (۱)

دیکھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ پہلی تصویر میں گلاس کے اندر کچھ لکڑی کے ٹکڑے بھر دیئے گئے ہیں اور اس لئے ڈاٹ ان پر آکر رک جاتی ہے اور زیادہ اندر نہیں جا سکتی۔

اب دوسری تصویر دیکھئے اس کے اندر بھی ڈاٹ اندر نہیں گھس پاتی حالانکہ اس گلاس میں کوئی چیز نظر بھی نہیں آرہی ہے۔ پھر کیا بات ہے کہ ڈاٹ اندر نہیں گھستی وجہ یہ ہے کہ اس گلاس میں ہوا ہے جو جگہ گھیرے ہوئے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بائیسکل کے پمپ کو بھی آپ آسانی سے نیچے نہیں دبا پاتے۔ ڈاٹ کے نیچے ہوا ہوتی ہے جو ڈاٹ کو آگے بڑھنے نہیں دیتی اب شاید آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے۔ مگر اس کے سمجھنے کا ایک اور طریقہ ہے۔ آپ ایک معمولی شیشی لیجئے اور اس کے منھ پر کاغذ کی ایک قیف بنا کر رکھ دیجئے۔ جیسے سامنے والی تصویر میں دکھایا



کیا ہے۔ اب آپ قیف کے ذریعے شیشے میں پانی بھرنے کی کوشش کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ حالانکہ شیشی کا منہ قیف کے اندر کھلا ہوا ہے، سارا پانی "قیف" کا قیف ہی میں رہتا ہے اور شیشی میں نہیں جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیشی میں تو ہوا پہلے سے موجود ہے۔ جب وہ ہوا کسی راستے سے باہر نکل جائے گی جب ہی پانی شیشی میں اتر سکے گا۔

آپ یہ تو جانتے ہیں جب صراحی میں پانی لیا جاتا ہے تو قُل قُل آواز ہوتی ہے۔ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ آواز کیوں نکلتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صراحی سے جب پانی نکلتا ہے تو اس کی جگہ فوراً ہوا گھیر لینے کی کوشش کرتی ہے۔ جب ہوا زور سے اندر گھستی ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے۔

اس سے آپ یہ تو سمجھ گئے کہ ہر جگہ ہوا موجود ہے۔ اور ہم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اور ہمارے سینے میں ناک کے ذریعے گھس جاتی ہے۔ ہم پھونک مار کر نکالیں تو اسے غبارے میں بھر سکتے ہیں۔ پمپ کے ذریعے بائیسکل اور موٹر کے

ٹیوب میں یا فٹ بال بھر سکتے ہیں۔ یہ ہوا کنویں کے اندر بھی رہتی ہے اور اگر آپ قطب مینار پر جائیں تو وہاں آپ کا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ اور قطب مینار ہی کیا، جتنا اونچا ہوائی جہاز اُڑتا ہے وہاں تک بھی ہوا ہوتی ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ اتنی ساری ہوا کا بوجھ ہر وقت آپ اپنے سر پر اٹھائے رہتے ہیں۔ ہم سب اپنے سر پر اتنا بوجھ یا اتنی بڑی ہوا کا مینار لئے پھرتے ہیں اور اس مینار کا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے مثلاً آپ کی کتاب پر تقریباً ۸ من ہوا کا بوجھ رکھا ہوا ہے۔

یہ آسانی سے مان لینے والی بات نہیں ہے اور ہم آپ ایک بہت ہی دلچسپ تماشا دکھا کر یہ بات ثابت کریں گے۔ مگر حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اتنی ہوا کا بوجھ ہم کو کتاب اُٹھانے میں محسوس کیوں نہیں ہوتا۔ آٹھ من تو بہت ہوتے ہیں۔ یہ تو چار یا پانچ موٹے موٹے آدمیوں کے برابر کا وزن ہے۔ دراصل یہ بوجھ اس لئے معلوم نہیں ہوتا کہ ہوا تو چاروں طرف ہے اور اس لئے وہ چاروں طرف سے برابر بوجھ ڈالتی ہے۔ اور جب یکساں بوجھ ہر طرف سے پڑتا ہے تو معلوم نہیں ہوتا۔ جیسے آپ نے رسّا کشی کے کھیل میں دیکھا ہوگا کہ جب دونوں طرف سے لوگ برابر کا زور لگا کر رسّا کھینچتے ہیں تو وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسّے کو کوئی کھینچ ہی نہیں رہا ہے۔

ہاں اس کھیل میں اگر ایک طرف کے لوگ بڑے زور سے گر پڑیں گے۔ اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ رسّے پر پہلے زور لگا ہوا تھا۔

بالکل اسی طرح جب ہوا چاروں طرف برابر کا زور اور دباؤ ڈالتی ہے تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اگر ایک طرف کا بھی زور ختم ہو جائے تو ہوا کے بوجھ کی حقیقت معلوم ہو جائے۔

آئیے اب ایک اور تماشا دیکھیں۔

ایک معمولی کنستر لیجئے۔ جس میں ڈھکن بھی لگا ہوا ہو، مگر ڈھکن میں ایک سوراخ ہو۔ اس کنستر میں کچھ پانی لے کر گرم کیجئے۔ تھوڑی دیر میں بھاپ بننے لگے گی، یہ بھاپ پانی کے اوپر کی

ہوا کو بالکل کنستر کے باہر نکال دے گی۔
اب ڈھکن کے سوراخ کو کس کر ڈاٹ سے بند کر دیجئے۔ ابھی تک کوئی خاص بات دیکھنے میں نہیں آئے گی، کیونکہ جتنا ہوا کا دباؤ باہر سے ہو گا اتنا ہی کنستر کے اندر کی بھاپ کا ہو گا۔ اب آپ اس کنستر کو جلدی سے ٹھنڈے پانی کی ایک ناند میں ڈبو دیجئے اک دم کنستر پچکی ہو جائے گا۔ معلوم ہو گا کہ جیسے ہاتھی کا پاؤں اس پر پڑ گیا ہے۔

یہ کنستر اس لئے پچکی ہو گیا کہ ٹھنڈے پانی میں ڈالنے کی وجہ سے اندر کی بھاپ کا دباؤ باہر کی ہوا کے دباؤ سے بہت کم ہو گیا۔ چنانچہ ہوا کے دباؤ نے اپنا اثر دکھایا۔

یہ ہوا کا دباؤ ہمارے لئے بڑے کام کی چیز ہے۔ آپ نے آنکھ میں دوا ڈالنے کی نلکی تو دیکھی ہو گی۔ اس میں دوا کا پانی چڑھانے کے لئے نلکی کا ربر پہلے ہاتھ سے دبا لیتے ہیں تو اس میں سے ہوا نکل جاتی ہے تب نلکی کا منہ دوا میں ڈال دیتے ہیں اور دبے ہوئے ربر کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں تو جس جگہ سے ہوا نکل گئی تھی اس جگہ دوا چڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ جگہ خالی نہیں رہ سکتی۔ جو چیز بھی ہو گی وہ اس میں چڑھ جائے گی۔ اور باہر کی ہوا دوا کو اس جگہ ڈھکیل دے گی۔

●

("بارش کیسے ہوتی ہے" کا بقیہ)

کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ ہوا میں موجود بادلوں کو کسی طرح ٹھنڈا کر دے۔ یہ کام وہ عام طور پر جہاز کے ذریعے ان بادلوں پر برف پھینک کر کرتے ہیں۔ اس طرح بادلوں کا درجۂ حرارت کم ہو جاتا ہے۔ اور کئی مربع میل تک کے علاقے میں بارش ہو جاتی ہے۔

اس قسم کی مصنوعی بارش صرف وہی ممالک کر سکتے ہیں جن کے پاس کافی دولت ہوتی ہے کیونکہ اس میں کافی روپیہ کا خرچ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کسانوں کی ساری امیدیں قدرتی بارش سے وابستہ ہیں۔ اگر ایک سال بھی بارش ٹھیک سے نہ ہو تو وہ بھوک کا شکار ہو جائے گا۔ اسی لئے بارش شروع ہوتے ہی اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ اور وہ منہ اندھیرے ہی ہل بیل لے کر کھیتوں کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

ڈاک کا انوکھا ٹکٹ



آپ نے ڈاک کے یادگاری ٹکٹ تو بہت دیکھے ہوں گے۔ پچھلے دنوں ہمارے ہی ملک میں ہمارے بڑے بڑے شاعروں کے یادگاری ٹکٹ شائع ہوئے تھے جیسے شاعرِ اعظم رابندرناتھ ٹیگور، میرا بائی، کالی داس، سورداس، غالب وغیرہ کے۔ اس کے علاوہ ابھی پچھلے سال جب ریلوے کا سو سالہ جشن منایا گیا تو اس وقت ریلوے کے یادگاری ٹکٹ بھی چھپے تھے۔ اسی طرح ایک بار مہاتما گاندھی کی جینتی کے موقع پر ان کے یادگاری ٹکٹ شائع کیے گئے تھے جو بے حد خوبصورت تھے۔ آپ نے یہ سب ٹکٹ تو دیکھے ہی ہوں گے۔

آج ہم آپ کو ایک بہت عجیب و غریب ٹکٹ کا حال سناتے ہیں یہ ٹکٹ پچھلے سال اگست میں جاپان سے جاری ہوا تھا۔ اس ٹکٹ میں انوکھی بات جو ہمیں اور آپ کو چونکا دینے والی ہے وہ ہے کتے کی تصویر۔ اس ٹکٹ پر ایک کتے کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ آپ ضرور پوچھیں گے کہ کتے کی تصویر کیوں بنائی گئی تھی۔ بھئی اس کتے میں ضرور کوئی خاص بات ہوگی ورنہ پھر اس کو اتنی عزت کیوں دی جاتی۔ اس کے پیچھے ایک بہت دلچسپ کہانی ہے۔ آئیے ہم

آپ کو یہ کہانی سنائیں۔

اس کتے کا نام "ہاچی" ہے۔ ہاچی کا تعلق کتوں کی ایک خاص نسل سے ہے جس کا نام 'اکیتا' ہے۔ جاپانی ساڑھے تین سو سال سے اس نسل کے کتوں کی پرورش کر رہے ہیں۔ یہ نسل بڑی وفادار ہوتی ہے اور اپنی وفاداری کی بدولت سارے جاپان میں مشہور ہے۔

ہاچی کا تعلق اسی اکیتا نسل سے تھا۔ یہ کتا ۱۰ر نومبر ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوا اور جب یہ ابھی چھوٹا سا پلا ہی تھا کہ اس کے مالک نے اسے ڈاکٹر ویدا اکیا برو کے ہاتھ بیچ دیا۔ ڈاکٹر ویدا اکیا برو ٹوکیو یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور ٹوکیو کے جنوبی مغربی حصے میں شبویا ریلوے اسٹیشن کے پاس رہتے تھے۔ جب ہاچی کی عمر ایک سال کی ہوگئی تو وہ اپنے مالک کے ساتھ روزانہ صبح صبح اسٹیشن پر جاتا۔ ڈاکٹر ویدا گاڑی آنے پر اس میں بیٹھ کر یونیورسٹی چلے جاتے اور ہاچی اسٹیشن پر شام تک ان کا انتظار کرتا رہتا۔ جب گاڑی آتی اور پروفیسر صاحب اُترتے تو وہ ان کے ساتھ گھر واپس آتا۔ ہاچی کا یہ روز کا معمول تھا۔ اور اس معمول میں کبھی فرق نہ پڑتا۔

اتفاقاً ایک دن ڈاکٹر ویدا اکیا برو جب صبح کے وقت گاڑی میں بیٹھ کر یونیورسٹی چلے گئے تو وہیں ان کی طبیعت خراب ہوگئی پروفیسر صاحب اسپتال پہنچا دیے گئے جہاں ان کا انتقال ہوگیا۔ ہاچی اپنی عادت کے مطابق اسٹیشن پر بیٹھا رہا۔ جب شام کی گاڑی سے وہ نہیں آئے تو وہ پریشان ہوگیا۔ لیکن پھر بھی وہ نا امید نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح روزانہ صبح کے وقت اسٹیشن آتا اور شام کو گاڑی کے وقت تک بیٹھا انتظار کرتا رہتا۔ اور پھر منہ لٹکائے ہوئے واپس آ جاتا۔

اس طرح وہ سات سال تک روزانہ بلاناغہ اپنے مالک کے انتظار میں اسٹیشن جاتا رہا۔ یہاں تک کہ اسٹیشن کے لوگوں کی نظر بھی اس پر پڑی۔ اب تو دھیرے دھیرے ہاچی کی شہرت زور پکڑنے لگی۔ ایک روزانہ اخبار "آساہی شم بن" کے نمائندے نے اس کی ساری داستان معلوم کی کہ وہ کب سے، کس طرح اور کیوں اسٹیشن آتا ہے۔ اس نے اپنے اخبار میں ایک بہت اچھا سا مضمون لکھا

جس کی شرح تھی "سات سال تک اپنے مالک کا انتظار"۔

اس مضمون کا اخبار میں چھپنا تھا کہ ہاچی کا نام ملک کے کونے کونے میں پہنچ گیا۔ اب تو روز سیکڑوں جاپانی شیبویا اسٹیشن جانے جیسے وہ جگہ کوئی تیرتھ استھان ہو۔ ہاچی کو دیکھنے کے لئے انسانوں کا تانتا بندھا رہتا لیکن ہاچی ان باتوں سے بے خبر اپنے مالک کا انتظار کرتا رہتا۔ اب تو سارے جاپان میں ہاچی کا نام مشہور ہو گیا۔

جون ۱۹۳۳ء میں جاپان کے ایک مشہور فن کار آدواکیرا نے جاپان کی ایک نمائش کے لئے ہاچی کا مجسمہ تیار کیا۔ یہ مجسمہ اتنا مقبول ہوا کہ جاپانیوں نے اس کا ایک بڑا پیتل کا ویسا ہی مجسمہ بنوانے کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ یہ مجسمہ شیبویا اسٹیشن کے سامنے لگوا دیا جائے۔ چند روز میں یہ مجسمہ بھی تیار ہو گیا اور ۲۱ اپریل ۱۹۳۴ء کو اس کی نقاب کشائی کی گئی۔ کہتے ہیں کہ مجسموں کی نقاب کشائی کے وقت جاپان میں کبھی انسانوں کا اتنا بڑا مجمع اکٹھا نہ ہوا تھا جتنا ۲۱ اپریل کو ہاچی کے مجسمے کی نقاب کشائی کے دن۔

پھر اسی طرح کا ایک مجسمہ اودیٹے کے شہریوں نے بنوایا۔ کیونکہ ہاچی ان کے شہر میں پیدا ہوا تھا۔ اب تو ہاچی کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہاچی کے نام سے جاپانیوں نے چیزیں بنانی شروع کر دیں۔ ہاچی چاکلیٹ، ہاچی بسکٹ، ہاچی کھلونے، غرض بے شمار چیزیں اس کے نام سے بنیں۔ اور یہی نہیں جاپان کے شاعروں نے ہاچی کی وفاداری پر بڑی خوبصورت نظمیں لکھیں اور چند روز کے اندر اس کے گیت عام لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے۔ یہاں تک کہ ایک فلم میں بھی ہاچی کو پیش کیا گیا۔

لیکن اتنی عزت کے بعد بھی ہاچی اپنی جگہ پر ویسا ہی رہا وہ اپنے مالک کو نہ بھولا اور برابر اسی طرح روزانہ اسٹیشن پر اپنے مالک کا انتظار کرتا رہا۔ اور اس کا یہ سلسلہ ۱۰ سال تک جاری رہا، جب تک کہ وہ مر نہیں گیا۔ ۸ مارچ ۱۹۳۵ء کو ۱۲ سال کی عمر میں ہاچی مر گیا۔ لیکن جاپانیوں کے

دل میں، ان کے گیتوں اور نظموں میں ہاچی ابھی تک زندہ ہے۔

ہاچی کا جسم ٹوکیو کے قومی میوزیم میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اور وہاں وہ اس طرح کھڑا ہوا ہے جیسے اسے اب بھی اپنے مالک کا انتظار ہے۔

جاپان کی حکومت نے ہاچی کے نام کے یادگاری ٹکٹ جاری کر کے ہاچی کی وفاداری کی کہانی کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔

اپنے پیامِ تعلیم پر ۲ آنہ بچائیے

حسب ذیل خریداروں کا سالانہ چندہ جولائی کے پرچے کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ اگر آپ اپنا چندہ منی آرڈر سے بھیجیں تو آپ کے صرف چار روپے دو آنے خرچ ہوں گے ورنہ پھر وی، پی پر چار روپے دس آنے خرچ ہوں گے۔

خریداری نمبر ۱۰- ریڈنگ روم۔ اُجین

خریداری نمبر ۱۲- پرائمری اسکول عزیز پور

〃 ۳۲۹- سکریٹری بزم ادب درواہ

〃 ۵۳- ہیڈ ماسٹر اسکول۔ بالاپور

〃 ۶۱۴ محمد عارف الرحمٰن۔ ایوت محل

〃 ۴۷ اے، ایل عارف زادہ بمبئی ۹۰

〃 ۴۴۹۔ گورنمنٹ اسکول کلگام

〃 ۵۹۸- رحمانیہ اسکول الچھ پور

〃 ۴۴۲- ذاکچہ ضلع کل شاہ پور گجرات

〃 ۴۴۳- سکندر۔ حیدرآباد

〃 ۴۴۴ مڈل اسکول۔ رنگم پیٹھ

〃 ۴۴۵- سوامتپا ہوگر۔ ہبلی

〃 ۴۵۱-۴۴۶- ہیڈ ماسٹر گیا۔ (۶ پرچے)

〃 ۴۴۰- سکریٹری فردوس۔ کسگی بیجاپور

〃 ۶۵۴- کے، ایچ، ہوبلی، کولہا۔

〃 ۶۵۵- گورنمنٹ اسکول ارمر (دکن)

〃 ۶۵۶- محمد ادریس۔ لار ضلع دیوریا۔

〃 ۶۵۷- ہندستانی اسکول جماعت چہارم کوہیر

〃 ۱۲۵ ہیڈ ماسٹر اسکول۔ کھام گاؤں

〃 ۳۴۰- دلشاد علی جعفری۔ اُجین

〃 ۶۴۹- ہیڈ ماسٹر اسکول امر کھیڑ (برار)

ریحان احمد

دریائی گھوڑا



آپ نے گھوڑے تو بہت دیکھے ہوں گے اور شاید اُن پر سواری بھی کی ہو، لیکن دریائی گھوڑا بہت عجیب و غریب جانور ہے۔ یوں سمجھئے کہ دنیا میں اس سے بڑا کوئی جانور نہیں ہوتا اس لئے کہ یہ ہاتھی سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ ہاتھی اس کے سامنے بچّہ سا نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ جانور پہلے ہمارے مُلک میں بھی ہوتا تھا لیکن اب تو صرف افریقہ ہی میں پایا جاتا ہے۔ افریقہ کی حکومتیں اس انوکھے جانور کا بڑا خیال رکھتی ہیں، اور کیوں نہ خیال رکھّیں اس لئے کہ اگر افریقہ میں بھی ان کی نسل ختم ہوگئی تو پھر دُنیا سے ان کا نام و نشان ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا۔

ہندستان میں ایک عجیب و غریب جانور کی ہڈیاں نکلی ہیں جس سے معلوم ہوا کہ یہ جانور پہلے ہمارے مُلک میں بھی ہوتا تھا۔

دریائی گھوڑے کی لمبائی پندرہ فٹ ہوتی ہے اور اونچائی تقریباً ۵ فٹ

اس کا وزن ۱۱۵ من سے بھی زائد ہوتا ہے۔ ہاتھی کا وزن عام طور پر چالیس من کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ اس طرح دریائی گھوڑے کا وزن ہاتھی سے تقریباً تگنا زیادہ ہوا۔ اس کی ٹانگیں چھوٹی چھوٹی مگر بہت مضبوط اور موٹی ہوتی ہیں۔ پاؤں میں چار اُنگلیاں ہوتی ہیں۔ جن میں خوب موٹے موٹے ناخن ہوتے ہیں۔ آپ یہ سُن کر تو اور بھی دَنگ رہ جائیں گے کہ اس کی کھال تقریباً ½۱ انچ موٹی ہوتی ہے۔ کھال کا رنگ بھورا ہوتا ہے۔ دُم کے سرے پر چند بالوں کے علاوہ اس کے باقی جسم پر کہیں بال نہیں ہوتے۔ کھال میں چھوٹے چھوٹے مسام ہوتے ہیں جن میں سے ہر وقت پسینہ نکلتا رہتا ہے۔ جو تیل کی طرح چکنا ہوتا ہے اس کے کان چھوٹے اور آنکھیں بڑی بڑی ہوتی ہیں۔ تھوتنی بے ڈول سی۔ مُنہ بھی بہت بڑا اور ڈراؤنا ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب جمائی لیتا ہے تو اس کو دیکھ کر اور بھی ڈر لگتا ہے جن میں بڑے بڑے دانت ہوتے ہیں نچلے ہونٹ کے دانت نکیلے ہوتے ہیں۔ اس کے دانت ہاتھی دانت سے بھی زیادہ قیمتی اور کارآمد ہوتے ہیں۔ اور ہاتھی کے مقابلے میں سخت اور مضبوط ہوتے ہیں۔

دریائی گھوڑا پانی میں رہنا بہت پسند کرتا ہے اور اپنا زیادہ وقت پانی میں ہی گزارتا ہے اسی لیے اس کا نام دریائی گھوڑا ہے۔ دن میں تو مستقل طور پر پانی میں رہتا ہے۔ صرف رات کے وقت خشکی پر آتا ہے اور وہ بھی کھانے کی تلاش میں اس لیے کہ اس کی غذا خشکی پر بھی ہوتی ہے۔ اس کے پیروں کے چوڑے پنجے گیلی زمین پر چلنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ وہ گھاس پات کھاتا ہے۔ لیکن کھاتا بہت ہے۔ ایک دریائی گھوڑا ایک وقت میں ڈیڑھ من سے بھی زیادہ چارا کھا لیتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ جتنا آپ کا وزن بھی نہیں ہے، اس سے زیادہ اس کی ایک وقت کی خوراک ہے۔ گنے کے چھوٹے پودے ان کا من پسند کھاجا ہے۔ یہ دریائی گھوڑے سب اکٹھے ہو کر بیس پچیس کی جھنڈ میں کھانے کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ جس کھیت میں جا گھستے ہیں اس کی صفائی کر دیتے ہیں۔ ایک تو کھاتے خوب ہیں مگر اس سے بھی زیادہ پیروں سے

روند ڈالتے ہیں۔ بعض اوقات کھانے کی تلاش میں آٹھ آٹھ نو نو میل دریا سے دور نکل جاتے ہیں۔

دریائی گھوڑے کے جسم کی بناوٹ اس کے پانی میں رہنے کے لئے بہت موزوں ہے۔ اس کے منہ پر ابھری ہوئی آنکھیں اور ناک کے نتھنے اسے پانی میں تیرنے اور چھپنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ جب وہ تیرتا ہے تو اس وقت صرف اس کی آنکھیں اور ناک باہر نکلی رہتی ہیں۔ باقی تمام جسم پانی میں چھپ جاتا ہے اور یہ اس طرح بغیر کسی ڈر یا خطرے کے مزے سے تیرتا رہتا ہے اتنا بڑا اور وزنی ہونے کے باوجود دریائی گھوڑا بہت اچھا تیراک ہوتا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ پانی میں بھی تیرتا ہے اور خشکی میں بھی خوب بھاگتا ہے اس کے لئے تری اور خشکی دونوں برابر ہوتے ہیں۔

خشکی کے جانوروں کی طرح اس کے بھی پھیپھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن دریائی گھوڑا پانی کے اندر بغیر سانس لئے تقریباً دس منٹ یا اس سے بھی کچھ زیادہ ٹھہر لیتا ہے۔ وہ ایک ڈبکی لگاتا ہے اور آٹھ دس منٹ کے لئے غائب ہو جاتا ہے۔ خشکی کے جانوروں کے لئے پانی میں اتنی دیر ٹھہرنا ناممکن ہے۔ یہ اپنے کان اور ناک بند کرنے کے بعد پانی کے اندر کی سطح پر اسی طرح آرام سے چل لیتا ہے جس طرح خشکی پر پیروں سے چلا کرتا ہے۔

دریائی گھوڑے کا منہ جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی چوڑا بھی ہوتا ہے یہ اپنے منہ کو بہت ہی چوڑا کھول سکتا ہے۔ بظاہر بہت خونخوار معلوم ہوتا ہے مگر بغیر چھیڑے کسی کو نہیں ستاتا اور بے حد سیدھا ہوتا ہے۔

مادہ اپنے بچوں کے ساتھ اسی طرح پیار کرتی ہے اور کھیلتی ہے جس طرح کتا اپنے بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے وہ انھیں اپنے ساتھ پانی میں لے جاتی ہے اور تیرنا سکھاتی ہے پانی زیادہ ہو اور بچے تھک جائیں تو اپنی کمر پر چڑھا لیتی ہے

دریائی گھوڑے کی ایک قسم اور بھی ہے۔ یہ اس سے بھی بڑا ہوتا ہے صرف ۲½ فیٹ اور چھ فیٹ لمبا ہوتا ہے اس کا بھی وزن پانچ من کے قریب ہوتا ہے اور اس کی حیثیت دریائی گھوڑوں کے درمیان بونوں کی سی گنی جاتی ہے۔ اور یہ ہاتھی سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ لیکن دریائی گھوڑے سے ملتا جلتا ہے۔

مرتضیٰ احسن بلگرامی

چالاک گیدڑ

کسی جنگل میں ایک شیر رہا کرتا تھا۔ اس کے دو نوکر تھے۔ ایک بھیڑیا اور دوسرا گیدڑ۔ ایک دن شیر نے جنگل میں ایک اونٹنی کو دیکھا۔ شیر نے اس کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ اس کے پیٹ میں سے ایک بچہ نکلا۔ اونٹنی کا گوشت کھا کر شیر اور اس کے سارے گھر کا پیٹ بھر گیا۔ تب وہ شیر اس اونٹنی کے بچے کو اپنے گھر لے گیا اور اس سے بولا "اب تجھ کو مرنے کا کوئی ڈر نہیں۔ میں یا جنگل کا کوئی اور جانور تجھے کچھ نہیں کہے گا۔ تو بڑے مزے میں اس جنگل میں رہ۔"

اب تو وہ سبھی بڑے مزے میں مل جل کر رہنے لگے۔ اونٹ کا بچہ ذرا سی دیر کے لئے بھی شیر سے الگ نہ ہوتا تھا۔ ایک بار اس شیر کی لڑائی جنگل کے ایک بڑے ہاتھی سے ہوگئی۔ یہ ہاتھی بڑا بہادر تھا۔ اس نے اپنے دانتوں سے شیر کو بہت بری طرح زخمی کر دیا۔ اس کے لئے چلنا پھرنا بھی دو بھر ہوگیا۔ آخر ایک دن بھوک سے تنگ آکر اس نے ان تینوں سے کہا "تم سب کسی جانور کو مار کر لاؤ۔ تاکہ میں اُسے خود بھی کھاؤں اور تم [illegible]ؤں۔"

یہ سُن کر وہ شام تک جنگل میں گھومتے رہے لیکن انھیں کوئی جانور نہیں ملا۔ اس پر گیدڑ نے سوچا کہ اگر اونٹ کے بچے کو مارا جائے تو پھر دونوں تک تو بھوک مٹ ہی سکتی ہے۔ لیکن وہ اپنا دوست بھی ہے۔ اس لئے شیر بھلا اُسے کیسے مارے گا۔ لیکن بات تو جب ہے کہ میں اپنی چالاکی سے اسے مروادوں۔ یہ سوچ کر وہ اونٹ کے بچے سے بولا۔

"ہمارے مالک بھوک سے مر رہے ہیں۔ اگر وہ مر گئے تو ہم بھی مر جائیں گے اس لئے کہ ہم تو ان کے سہارے ہی یہاں پڑے ہوئے ہیں۔"

اونٹ نے کہا "تجھے جو کچھ کہنا ہے جلدی کہہ۔ انھوں نے میرے اوپر بڑا احسان کیا ہے۔ تو بتا میں ان کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ اس طرح میں اگر کوئی نیکی کا کام کروں گا تو مجھے اس کا پھل ملے گا۔"

اس پر گیدڑ بولا "تو مالک کو بچانے کے لئے اپنی جان دے دے۔ اگلے جنم میں تجھے اس کا پھل ملے گا۔"

یہ سُن کر اونٹ فوراً راضی ہو گیا۔ پھر گیدڑ اسے شیر کے پاس لے گیا اور ساری باتیں سمجھا کر بولا "اونٹ آپ کے لئے اپنی جان دینے کے لئے تیار ہے تاکہ دوسرے جنم میں اس کا پھل ملے۔" شیر تیار ہو گیا۔ اب گیدڑ اور بھیڑیئے نے مل کر اونٹ کو مار ڈالا۔ شیر انھیں رکھوالی کرنے کے خیال سے چھوڑ کر دریا کے کنارے نہانے اور پوجا پاٹ کرنے کے لئے چلا گیا۔ اب گیدڑ سوچنے لگا کہ کسی طرح اس اونٹ کو اکیلا ہی ہڑپ کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر اس نے بھیڑیئے سے کہا "تو بھوکا ہے جب تک شیر نہ آجائے تو اس اونٹ کو کھا۔ ان کے سامنے میں تجھے بے قصور ثابت کر دوں گا۔" یہ سن کر بھیڑیئے نے تھوڑا سا گوشت کھایا لیکن فوراً ہی شیر آگیا۔ اور گیدڑ کے اشارا کرنے پر دور بھاگ گیا۔ شیر نے آکر دیکھا تو کلیجہ غائب تھا۔ اس نے غصے میں بھر کر پوچھا "اس اونٹ کو کس نے منہ لگایا؟" یہ سُن کر بھیڑیا گیدڑ کا منہ دیکھنے لگا۔ گیدڑ ہنس کر بولا "میرا منہ کیا دیکھتا ہے۔ اس وقت تو میرے منع کرنے پر بھی نہ مانا، اب اس کی سزا بھگت۔"

یہ سُن کر وہ بھیڑیا مرنے کے ڈر سے

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر دیکھئے)

لطیفے

حمید۔ کیوں رام آج کون سا دن ہے۔
رام۔ تم بیوقوف! اس وقت دن نہیں رات ہے۔

حفیظ الدین عمر کھیڑ

کریم۔ ارے تم نے فینل کی گولی کھالی!
موہن۔ اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ اس سے میں کیڑوں سے بچا رہوں گا۔

ماسٹر۔ ارے نسیم! یہ تمھاری کتاب کیسی ہو گئی۔ کہاں پانی میں ڈال دیا تھا۔
نسیم۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ گندی ہو گئی ہے۔ اس لئے میں نے دھو ڈالی۔

اس، اے سعید۔ پورینہ

ایک دن کسی شہر کا دولت مند آدمی مر گیا۔ حضرت شیخ چلی بھی روتے ہوئے دہاڑیں مارتے اس کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ سب لوگوں کی توجہ ان کی طرف ہو گئی۔ کسی نے ان سے پوچھا "کیا آپ مرحوم کے بہت قریبی رشتہ دار ہیں۔
شیخ چلی نے سسکتے ہوئے جواب دیا "اسی کا تو رونا ہے، کاش وہ ہمارے رشتے دار ہوتے تو ساری عمر چین سے گزر جاتی۔

دلجیت سنگھ آزاد۔ جمشید پور

استاد۔ بچو! اپنے بڑوں کا ادب کیا کرو۔ جھوٹ مت بولا کرو اور ہمیشہ نیک کام کیا کرو۔
شارق۔ ماسٹر صاحب، اس سے کیا فائدہ ہوگا۔
استاد۔ جنت ملے گی۔

شارق۔ ماسٹر صاحب گرمی میں تو جنت میں واقعی نینی تال کا مزا آجائے گا لیکن سردی کے زمانے میں کیا ہوگا۔ سردی میں تو لوگ پہاڑ بھی چھوڑ دیتے ہیں۔

سعیدہ فاطمہ۔ کانپور

آقا۔ کیوں بھئی، یہ ٹائر کیسے پھٹا۔

ڈرائیور۔ ایک بوتل پہیئے تلے آگئی تھی۔

آقا۔ تو تم اندھے تھے کہ بوتل دیکھ نہ سکے۔

ڈرائیور۔ صاحب بوتل ایک آدمی کی جیب میں تھی۔

اسکاؤٹ ماسٹر۔ اگر تم کو فوراً اسپتال پہنچنا ہو تو کیا کروگے۔

اسکاؤٹ۔ فوراً کھڑکی پر سے چھلانگ لگاؤں گا۔ چوٹ آئے گی اور مجھے لوگ فوراً اسپتال لے جائیں گے۔

اُستاد۔ بتاؤ پان کھانے سے کوئی فائدہ ہوتا ہے۔

طالب علم۔ جی ہاں عورتوں کا لپ اسٹک کا خرچ ہی بچتا ہے۔

ایم۔عرفان گدی۔ چکردھرپور

عظیم۔ دادا جان! ایک آدمی باہر چلّا رہا ہے اس کو ایک آنہ دے دیجئے۔

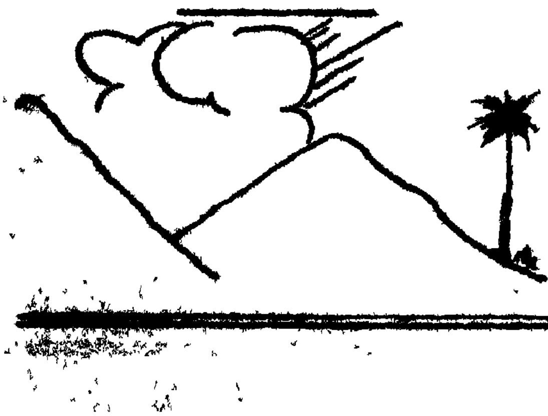
دادا جان۔ (اکنی دے کر) مگر وہ کون ہے؟

عظیم۔ آئس کریم والا۔

ساجدہ۔ میرا بیٹا تو پاس ہوگیا ہے مگر حمیدہ! تمھارے بچے کا کیا ہوا۔

حمیدہ۔ وہ تو ہر مضمون میں پاس ہوگیا سوائے تاریخ کے۔ وجہ یہ تھی کہ ایسے سوال آئے جو اس کے کیا میری پیدائش سے پہلے کے تھے۔

محمد شمیم جیراجپوری



اطہر پرویز



مصنوعی چاول

چاول ایشیا کے لوگوں کی خاص غذا ہے اور ہمارے ملک میں بھی تو بہت چاول کھایا جاتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اُتر پردیش، پنجاب، دہلی، اور مدھیہ بھارت کے علاوہ اکثر صوبوں کے رہنے والوں کا گزارا چاول ہی پر ہوتا ہے۔ ایشیا کے دوسرے ممالک جیسے برما، ہند چین، چین، جاپان کی تو خاص غذا چاول ہی ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایشیا کی آبادی کا زیادہ حصہ چاول ہی کھاتا ہے۔

لیکن ایشیا میں چاول کی پیداوار اتنی نہیں ہے کہ یہاں کے باشندے اسی پر گزارا کر سکیں۔ اس لئے کافی چاول مغربی ممالک سے آتا ہے۔ اسی لئے لوگ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح چاول کی اس محتاجی کا سلسلہ ختم ہو۔ اور انسان مصنوعی چاول بنانے کی کوشش میں عرصے سے لگا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۰ء میں جاپان کے لوگوں کو کامیابی ہوگئی۔ انھوں نے گیہوں کا آٹا اور چاول کے سفوف (جو چاول پر پالش کرتے ہوئے نکلتا ہے) سے ملا جلا کر یہ مصنوعی چاول تیار کر لیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۳ء میں تو اس چاول کے بنانے

کی ایک باقاعدہ مشین بھی بن گئی۔ مشین بنا تھا کہ جیسے سارا کام آسان ہوگیا۔ آجکل تو جاپان میں اس کی حیثیت باقاعدہ ایک صنعت کی سی ہو گئی اور جاپان کے تاجر بھی اس میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اس میں زیادہ خرچ بھی نہیں ہوتا۔ مصنوعی چاول بنانے کی مشین پر کل ملاکر پانچ ہزار روپیہ خرچ ہوتا ہے اور یہ مشین دن بھر میں ۴۸ من چاول تیار کرتی ہے۔

جاپانی حکومت بھی اس نئی صنعت میں بڑی دلچسپی لے رہی ہے۔ کیونکہ اسے یقین ہے کہ اگر یہ صنعت ترقی کر گئی تو نہ صرف یہ کہ جاپان کے لوگوں کو کھانے پینے کی پریشانی نہ رہے گی بلکہ دوسرے ملکوں سے اس کی بڑی کامیاب تجارت ہو سکتی ہے۔

دوسرے ملکوں سے جو چاول منگایا جاتا تھا وہ چاول جاپان میں آکر ایک روپئے سیر پڑتا تھا۔ لیکن یہ مصنوعی چاول اس کے آدھے دام پہ بازار میں بکتا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس چاول کے ذائقے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ کو بتایا نہ جائے تو آپ کو خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ مشین کا بنا ہوا چاول ہے۔ ابھی حال ہی کا واقعہ ہے کہ جاپان کے وزرا کی ایک دعوت میں یہ چاول بھی دستر خوان پر آیا۔ وزیروں نے خوب شوق سے کھایا اور کسی کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ وہ نقلی چاول کھا رہے ہیں۔ جب ان کو بتایا گیا تو وہ حیران رہ گئے، اس لئے کہ ذائقے میں ذرا بھی تو فرق نہ تھا۔

اس ایجاد کا نہ صرف جاپانیوں پر اثر پڑا ہے بلکہ اس کا اثر پورے ایشیا پر پڑے گا اور جب یہ کافی تعداد میں تیار ہوگا اور بازار میں عام طور پر بکنے لگے گا تو ایشیا کے ملکوں سے بھوک اور قحط کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا۔

جاپان کے سائنس دان اس اہم ایجاد کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ماجد حسن فریدی

چینی کہاوتیں

مسلمانوں کے پیغمبر حضرت محمدؐ کا کہنا تھا کہ "علم حاصل کرو چاہے اس کے لئے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے" اُن کا یہ قول اب ایک کہاوت بن گیا ہے۔ یہ اب سے سیکڑوں برس پُرانی بات ہے۔ چین دُنیا کے سب سے بڑے اور پُرانے ملکوں میں سے ایک ہے۔ وہ اب سے سیکڑوں برس پہلے بھی اپنے علم و فن میں ایسا ہی مشہور تھا جیسے آج کل ہے۔

کسی ملک کی کہاوتیں اس ملک کی بُرائیاں دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اسکاٹ لینڈ کے باشندوں کا خیال ہے کہ انسان کی تمام بُرائیاں اور کمزوریاں آپس کے طنز اور کہاوتوں ہی سے دور ہو سکتی ہیں۔ جرمنی کے ایک بڑے فلسفی گوئٹے کا قول ہے کہ "لوگ جن چیزوں پر ہنستے ہیں وہی ان کی سیرت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اور ہنسی ہنسی میں لوگ اپنی بُرائیاں دور کر لیتے ہیں۔ کہاوتیں ہم لوگوں میں بھی مشہور ہیں اور عام ہیں۔

مثلاً

"اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی"

"خالی مت بیٹھ کچھ کیا کر کپڑے ہی ادھیڑ کر سیا کر"

"جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔"

ہم میں سے ہر ایک نے یہ کہاوتیں سُنی ہوں گی۔ ان کہاوتوں کے اندر انسان کے سیکڑوں سال کے تجربے شامل ہیں۔ اور ہم ان کو بچپن ہی سے اپنے بڑے بوڑھوں سے سُنتے چلے آرہے ہیں۔ جنھوں نے ہماری طرح ان کو اپنے بزرگوں سے سُنا ہوگا۔ ان کہاوتوں میں زندگی کی سچائی چھپی ہوئی ہے اور ہمیں بھی خود اپنی زندگی میں ان کی سچائی کا ثبوت ملتا رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ پھر ہم بھی موقع ملنے پر ان کو بولتے رہتے ہیں۔

کہاوت کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مختصر ہو اور جامع ہو۔ اس خوبصورتی سے کہی گئی ہو کہ سُننے والا پھڑک اُٹھے۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جس کی وجہ سے کہاوتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔ ظرافت کی چاشنی سے ان میں اور مزا آجاتا ہے اور لوگ انھیں خوب مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔

ہمارے ملک کی طرح دوسرے ملکوں میں بھی کہاوتیں مشہور ہیں۔ انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور چین کی کہاوتیں خاص طور پر مشہور ہیں۔

چینی کہاوتیں وہاں کے لوگوں کی روحانی ذہنی، باطنی زندگی، تہذیب وتمدّن اور قوم کے سوچنے سمجھنے کے طریقے اور نسلی خصوصیتوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان سے چینیوں کی ذہنیت اور ظرافت ٹپکتی ہے۔ ان کہاوتوں میں زندگی کے بڑے بڑے پیچیدہ مسئلے اور زندگی کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔ کچھ کہاوتیں دیکھئے!۔

"اپنی کامیابی کا ذکر ان لوگوں سے نہ کرو جو خود ناکام رہے ہیں اور کامیابی کے وقت اپنی ناکامیوں کو نہ بھولو۔"

اس میں کتنی بڑی بات کہی ہے۔ آپ جب کسی مہم میں کامیاب ہوتے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور اس کا اظہار کرتے ہیں ہر ایک کو خوشخبری سُناتے ہیں۔ آپ کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ آپ کی یہ خوشخبری کسی ناکام آدمی کے لئے کتنی تکلیف دہ ہے۔ وہ تو پہلے ہی سے رنجیدہ ہے اس خبر نے تو اس کے زخموں پر اور نمک کا کام کیا۔ اور اگر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں تو آپ کو خوش ہونے سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ آپ

خود اس سے پہلے کتنی مرتبہ ناکام رہ چکے ہیں۔ اسی لئے تو کہتے ہیں "کام کرنے سے پہلے اس کا انجام سوچ لو۔"

سماجی زندگی سے متعلق ایک کہاوت دیکھئے :-

"کسی پر احسان کروگے تو کوئی تم پر احسان کریگا"۔ ایسی ہی کہاوت ہمارے ہاں بھی مشہور ہے "من تُرا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"۔ یعنی آپ میری تعریف کریں گے تو میں آپ کی تعریف کروں گا۔ چاہے آپ اس کے مستحق ہوں یا نہ ہوں۔ آپ کسی سے نیکی کا برتاؤ کریں گے تو وہ آپ کا احسان مند ہوگا۔ اور پھر نیکی کا بدلہ نیکی سے دے گا۔

"دوسروں کی بُرائیوں سے وہی سلوک کرو جو اپنی بُرائیوں سے کرتے ہو۔"

اگر آپ کے اندر کوئی عیب ہے تو آپ اسے چھپاتے ہیں۔ آپ کو چاہیئے کہ دوسروں کے عیب دیکھ کر ان کا سب سے ذکر نہ کریں۔ انھیں بھی اپنے عیبوں کی طرح چھپائیں۔

"اپنے عمل میں ثابت قدم رہئے مگر مزاج میں نرم۔"

"اپنے ساتھیوں سے ملائمت برتئے مگر اپنے ساتھ سختی۔"

چینی کہاوتیں حقیقت اور سچائی سے بھری ہیں۔ ایک اور کہاوت سنئے :-

"کوئی بُت ساز بُت پرست نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا بُت کس چیز کا بنا ہے۔"

کتنی گہری بات کہی ہے۔ چینی بُت پرست نہیں ہوتے۔ پُرانے زمانے میں چینی بت پرست تھے مگر اب وہاں بُت پرستی ختم ہوتی جارہی ہے۔

"ایک کُتّا کسی چیز پر بھونکتا ہے اور باقی کُتّے اس پر بھونکتے ہیں۔"

"غلطی کے بغیر سچائی کا نام تک نہ ہوتا۔"

"جو شخص شیر پر سوار ہوتا ہے اُتر نہیں سکتا۔"

بعض چینی کہاوتوں میں عام لوگوں کے روحانی اور اخلاقی پہلو نمایاں ہیں۔

"گھر پر ٹھیریئے اور والدین کی پوجا کیجئے۔ دور دراز جاکر دیوتاؤں کی پرستش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

کیسی باریک بات کہی ہے۔ آپ نے سُنا ہوگا پُرانے لوگ کہا کرتے ہیں۔ ماں کے پیروں کے نیچے جنّت ہے اور باپ کے پاؤں کے نیچے جنّت کا دروازہ۔ ماں باپ کی خدمت کرلی اور انھیں خوش کرلیا تو خدا بھی خوش اور اس کا پیارا رسول بھی راضی۔ کیا ضرورت ہے کہ مارے مارے پھریں اور دیوتاؤں کی عبادت کریں۔ گھر ہی میں گنگا بہہ رہی ہے یہیں اشنان کرلیں۔

"اگر تم راست باز اور بُرائیوں سے پاک ہو تو تمھیں کسی دیوتا سے گناہ بخشوانے کے لئے دعا کرنے کی کیا ضرورت ہے"

"زمین پر ایک نیک آدمی کا اضافہ بہشت میں ایک فرشتہ کے اضافے سے بہتر ہے"

"جو بُرائی کرتا ہے اور اس کے شہرت دینے سے ڈرتا ہے اس کے بدلے میں نیکی کا بیج ہے۔ جو نیکی کرتا ہے اور اسے شہرت دینے کا خواہش مند ہے اس کی نیکی میں بدی کی جڑ ہے"

ایسی بہت سی کہاوتیں چینیوں میں مشہور ہیں۔ ان میں جو سبق پوشیدہ ہیں کاش ان سے ہم کچھ سبق سیکھ سکیں۔

بقیہ چالاک گیدڑ

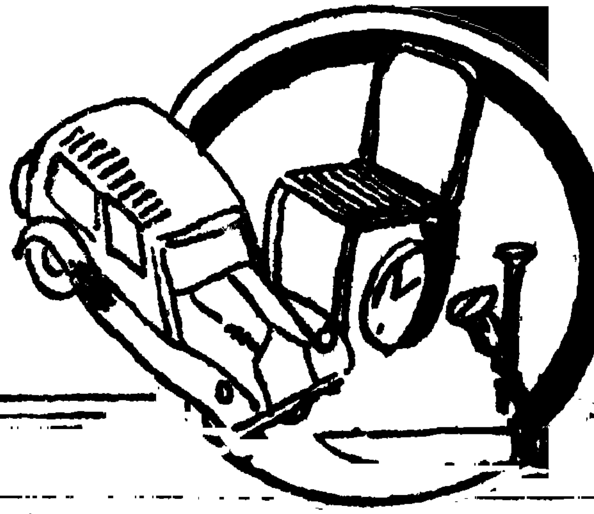
وہاں سے بھاگ گیا۔

اسی وقت اونٹوں کا ایک قافلہ ادھر آیا سب سے پہلے جو اونٹ تھا اس کے گلے میں گھنٹہ بندھا ہوا تھا اس کی آواز سن کر شیر گیدڑ سے بولا "ارے پتہ تو لگا یہ آواز کیسی ہے۔ ہم نے ایسی آواز پہلے تو کبھی نہیں سُنی"

گیدڑ تھوڑی دور جاکر لوٹ آیا اور بولا "اگر آپ بھاگ سکیں تو فوراً بھاگ جائیے، پاس کی بستی کا راجا آپ سے ناراض ہے۔ آپ نے اس کے ایک اونٹ کو مارا ہے اس کے بدلے میں وہ سو اونٹ لینے آرہا ہے۔ اس کے ساتھ مرے ہوئے اونٹ کے دادا بھی ہیں، وہ ایک بڑی فوج لے کر بدلہ لینے کے لئے آرہے ہیں"

یہ سن کر وہ شیر بھی اپنی جان بچانے کے لئے وہاں سے بھاگ گیا۔ اب گیدڑ نے اکیلے بیٹھ کر اس اونٹ کا گوشت کھایا۔

معین الدین



ہماری صنعتیں

پُرانے زمانے میں انسان کی ضروریات صرف کھانے پینے تک ہی محدود تھیں۔ لیکن جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا۔ اس کی ضرورتیں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ اور در اصل انسان کی ترقی کے جانچنے کا معیار یہی ضروریات ہیں۔ انسان کو اچھی زندگی گزارنے کے لئے دسیوں قسم کی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جو کانوں سے نکلتی ہیں یا کارخانوں میں بنتی ہیں یا لوگ اپنے اپنے گھر میں بیٹھ کر تیار کرتے ہیں۔

آپ کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں کپڑے، جوتے، میز، کرسی، قلم، دواؤں، کھانے پینے کے برتنوں اور طرح طرح کی دوسری چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

ان چیزوں کے تیار کرنے کے وسائل کو صنعت کہتے ہیں۔ یہ صنعتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔

کانوں سے کوئلہ، لوہا، اور تانبا وغیرہ نکالنے کو کان کنی کہتے ہیں۔

کانوں سے نکالی ہوئی دھاتوں سے مشین، پُرزے، چاقو، چھری وغیرہ اور کپاس اور

اون سے کپڑا بنانے کے کام اور اس طرح کی دوسری کچی چیزوں سے سامان تیار کرنے کو اشیاء سازی کی صنعتیں کہتے ہیں۔

کان کنی کی صنعتیں :۔ ہمارے دیس میں کان کنی کے کام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ ان کانوں سے پتھر کا کوئلہ، لوہا، مینگنیز، ابرق، تانبا اور سونا وغیرہ نکلتا ہے۔ پتھر کے کوئلے کی زیادہ تر مقدار بنگال اور بہار کی کانوں سے حاصل ہوتی ہے۔ انھیں کانوں سے لوہا بھی نکالا جاتا ہے۔ اسی طرح مینگنیز بھی بہت زیادہ مقدار میں کانوں سے نکالا جاتا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ مینگنیز ہمارے ملک ہی میں نکلتی ہے۔ اور ہمارے یہاں مدھیہ پردیش کے صوبے میں نکلتی ہے مینگنیز شیشے اور فولاد کے کارخانوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ابرق بھی دنیا میں سب سے زیادہ ہندستان میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا استعمال تار اور وائرلیس کے آلوں کے بنانے میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی معدنیات ہیں جو ملک کے مختلف حصوں سے نکالی جاتی ہیں۔ لیکن ہماری ضرورتیں دن بدن بڑھتی جارہی ہیں اس لئے ان کی پیداوار ہماری ضرورتوں کے مقابلے میں ناکافی ہے۔ چنانچہ پانچ سالہ منصوبے میں کان کنی کے کام کو اور زیادہ ترقی دینے کا انتظام کیا گیا ہے۔

اشیاء سازی کی صنعتیں :۔

کپڑے کی صنعت ہمارے ملک کی بنیادی صنعتوں میں سے ایک ہے۔ اس صنعت نے دیکھتے دیکھتے حیرت انگیز ترقی کر لی ہے یہاں تک کہ اب ہم اگر چاہیں تو باہر سے کپڑا نہ منگائیں اور اپنی ملوں کے بنائے ہوئے کپڑے سے ہی اپنی ضرورتوں کو پورا کرسکتے ہیں۔

ہمارے دیس میں کپڑے بننے کی بہت سی ملیں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بمبئی میں ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اگر پورے ملک کی ملوں کی تعداد کو ۱۰۰ مان لیا جائے تو ۴۰ ملیں صرف بمبئی ہی میں ہیں۔ اس کے علاوہ احمدآباد شولاپور، ناگپور، کانپور اور دہلی وغیرہ میں بھی کپڑے کے کارخانے ہیں۔ مدراس میں بھی سوتی کپڑے کی ملیں ہیں اور یہاں کا کپڑا بہت اچھا

ہوتا ہے۔ اور ملک بھر میں پسند کیا جاتا ہے۔ ہمارے دیس کی ان ملوں کا کپڑا دوسرے ملکوں میں بھی بھیجا جاتا ہے۔

پٹ سن کے کارخانے:۔

ہمارے دیس کی ایک بڑی صنعت پٹ سن کی ہے۔ پٹ سے مختلف چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ چونکہ پٹ سن صرف ہندستان میں ہی پیدا ہوتا ہے اس لئے اس کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ ہمارے ملک میں پٹ سن کے کل ۱۱۴ کارخانے ہیں جن میں سے ۱۰۰ کارخانے صرف مغربی بنگال میں ہیں۔ اس لئے کہ بنگال میں سب سے زیادہ پٹ سن پیدا ہوتا ہے۔ بنگال کے علاوہ مشرقی بہار میں بھی اس کی کچھ پیداوار ہوتی ہے۔

لوہے اور فولاد کے کارخانے:۔

لوہے کے کارخانے زیادہ تر بہار میں ہیں۔ یہاں تک کہ جمشید پور میں لوہے اور فولاد کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ جس میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں۔ اس کارخانے کی بھٹی بہت بڑی ہے اور کبھی نہیں بجھتی۔ اس لئے کہ اگر بجھ جائے تو اس کے جلانے میں کئی دن لگ جائیں۔ یہاں جست کی چادریں، تار، کیلیں، ریل گاڑیاں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں بنانے کے کارخانے ہیں۔ میسور میں بھی ایک لوہے اور فولاد کا کارخانہ ہے۔ لیکن ملک کی ضرورت کے لحاظ سے یہ ابھی کافی نہیں ہیں۔ آخر ہمارا ملک بڑا بھی تو کتنا ہے اور اس میں کروڑوں آدمی بستے ہیں۔ اس لئے آبادی کو دیکھتے ہوئے ان کو ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ حکومت نے ان کاموں کو ترقی دینے کے لئے قرض دینے کا انتظام کیا ہے جس کے مطابق بنگال کی ایک کمپنی کو بہت سا روپیہ قرضے کے طور پر دیا ہے۔ تاکہ لوہے اور فولاد کی صنعت کو زیادہ ترقی ہو اور باہر کے دیسوں سے نہ منگانا پڑے۔ اور ہماری دولت ہمارے ملک کے اندر ہی رہے۔

انجینیرنگ کے کارخانے:۔

ہمارے دیس میں انجینیرنگ کے کارخانے پہلے نہیں تھے۔ اس لحاظ سے یہ صنعت ابھی نئی نئی ہے۔ اس لئے کہ گراموفون، سوئیاں، ریڈیو، بجلی کا سامان اور اس طرح کے دوسرے سامان باہر سے منگانے پڑتے تھے لیکن پچھلے

چند سالوں میں اس کے بہت سے کارخانے کھل گئے ہیں۔ جن میں اس طرح کی چیزیں بننے لگی ہیں۔

دواؤں کے کارخانے:-

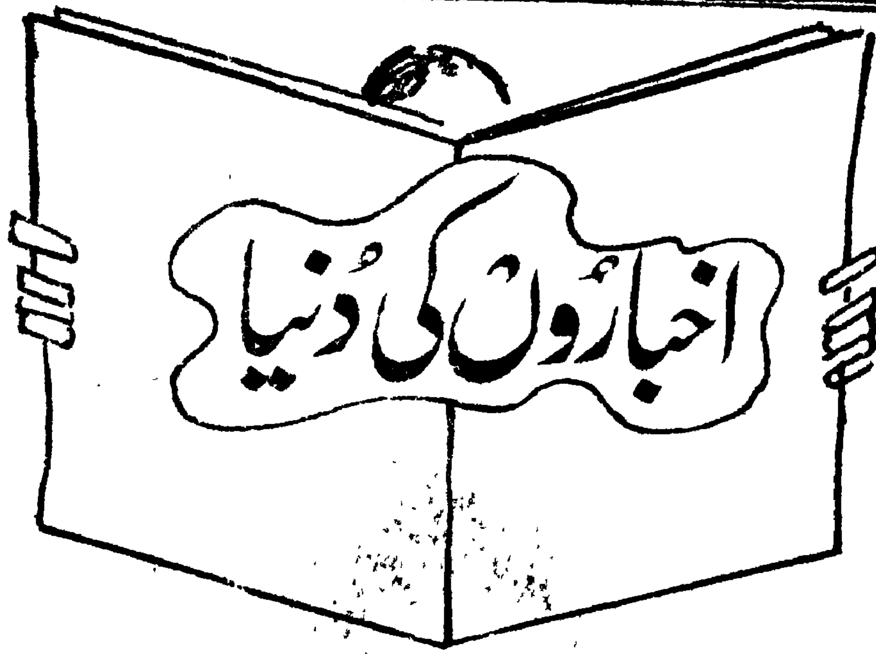
انگریزی دوائیں، انجکشن اور دوسری ضروری چیزیں ہمیں پہلے زیادہ تر باہر کے دیسوں سے ہی منگانی پڑتی تھیں۔ لیکن اب مدراس اور کلکتے میں اس کے بہت سے کارخانے کھل گئے ہیں اور یہ دوائیں یہاں تیار ہو رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے بہت سی دوائیں اپنے دیس میں بننے لگی ہیں۔

ان کارخانوں کے علاوہ چمڑے رنگنے، شکر بنانے، نمک اور سیمنٹ کے بہت سے کارخانے ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں کاغذ بنانے کے کارخانوں کی تعداد بھی کافی بڑھی ہے۔ جن میں کاغذ اور کاغذ کی دوسری چیزیں بنتی ہیں۔

چائے کی صنعت سے ہمارے ملک کو بہت آمدنی ہوتی ہے۔ کیونکہ باہر کے دیسوں میں اس کی بہت مانگ ہے۔ آسام اور دارجلنگ چائے کے کارخانوں کے لئے بہت مشہور ہیں۔ چائے کے کارخانے بڑھانے اور اس کاروبار کو ترقی دینے کے لئے ۱۹۴۹ء میں ایک بورڈ ایکٹ (CENTRAL BOORD ACT) کے تحت بنایا گیا جس میں ماہرین اسے ترقی دینے کے لئے لگے ہوئے ہیں۔

ہمارے یہاں قہوہ بھی بہت پیدا ہوتا ہے۔ جنوبی ہندستان قہوے کے لئے بہت مشہور ہے۔ ہمارے دیس سے ہر سال قہوے کی بڑی مقدار باہر کے ملکوں میں بھیجی جاتی ہے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس سال ہمارے ملک میں قہوے کی اتنی پیداوار ہوئی ہے کہ کئی سال سے نہیں ہوئی تھی۔

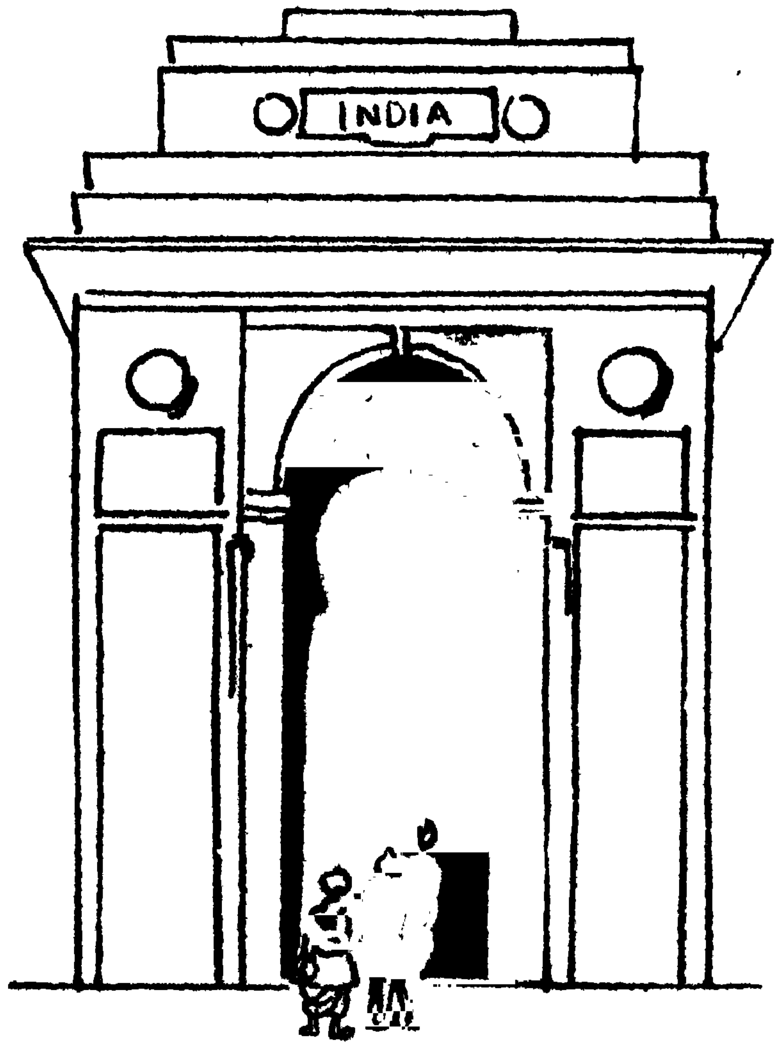
جنوبی ہندستان میں ربر کے بہت سے باغات ہیں۔ یہاں سے ربر باہر بھیجی جاتی ہے۔ کیونکہ ہندستان کی پیداوار یہاں کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی۔



جب شروع شروع میں ریڈیو کی ایجاد ہوئی تو لوگوں نے سوچا کہ اب ریڈیو کی مقبولیت کی بنا پر اخباروں پر بڑا خراب اثر پڑے گا۔ اس لیے کہ جب عام لوگ ریڈیو سننا شروع کردیں گے تو دنیا بھر کی خبریں پل بھر میں ساری دُنیا میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جائیں گی۔ لیکن چند ہی روز کے اندر لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ ریڈیو اخباروں کی جگہ نہ لے سکا۔ اس کی حیثیت اخباروں سے بالکل مختلف ہوگئی ہے چنانچہ جیسے جیسے دُنیا ترقی کرتی گئی۔ اخباروں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔

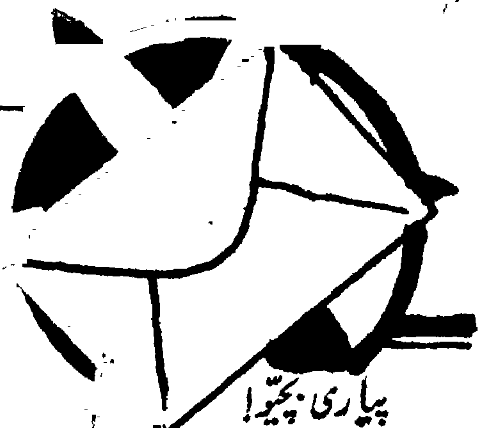
ابھی حال ہی میں اقوام متحدہ کے ایک ادارے یونیسکو نے اخباروں کے اعداد شمار شائع کئے ہیں جس کے مطابق ۱۹۵۲ء میں دنیا بھر کے اخباروں کی مجموعی تعداد ۷۵۲۰ ہے جن کی اشاعت ۲۱۷،۰۰۰،۰۰۰ ہے۔ اس طرح ایک ہزار آدمیوں پر ۸۸ اخباروں کی اوسط ہے۔

لیکن اخباروں کی اتنی ترقی کے باوجود ابھی ۵۳ ممالک ایسے ہیں جہاں ایک بھی روزانہ اخبار نہیں شائع ہوتا۔ ان ۵۳ ملکوں کی آبادی ۳ کروڑ ۸۰ لاکھ ہے۔



پہلے بڑے لمبے قد کے آدمی ہوتے تھے اسی لئے تو اتنا بڑا پھاٹک بنا ہے

باجی کا خط



پیاری بچیو!

یہ عید تو آپ نے خوب مزے میں گزاری۔ بڑے اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوں گے۔ خوب سوئیاں کھائی ہوں گی۔ لیکن عید کا مزا تو یہ ہے کہ اس کے بعد اگلی عید کا انتظار شروع ہو گیا ہے اور اب تو بقرعید کو صرف ڈیڑھ مہینا اور رہ گیا ہے۔ آج کل تو اسکول بھی بند ہیں۔ پھر کیا ہے۔ اس زمانے میں تفریح کرنے میں بڑا مزا آتا ہے۔

لیکن ان چھٹیوں میں گھرداری بھی خوب ہوتی ہے۔ سارے سال کی سلائی ان ہی چھٹیوں کے لئے رکھی رہتی ہیں۔

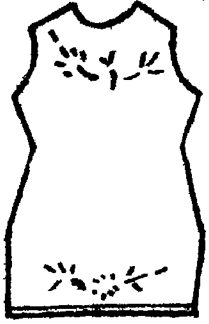
آپ لوگوں میں سے بہت سی بچیاں سی رہی ہوں گی۔ پھر عید بھی تھی۔ نئے کپڑے سلے ہوں گے اور اپنی سہیلیوں کو تحفہ دینے کے لئے آپ نے غلاف، میز پوش اور رومال تیار کئے ہوں گے۔ سہیلیوں کو جو اپنے ہاتھ کے تحفے دینے میں لطف آتا ہے وہ کسی چیز میں نہیں آتا۔ لاکھ بازار سے خریدیئے مگر وہ بات کہاں۔ آپ بھی تو جب کوئی ایسا تحفہ پاتی ہیں تو کتنی خوش ہوتی ہیں۔

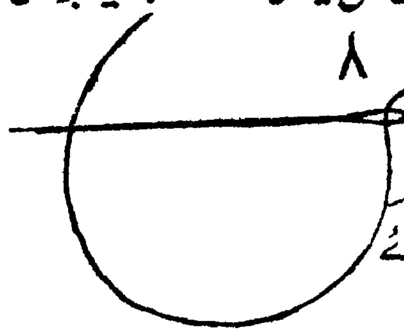
لیجئے ہماری طرف سے بھی ایک تحفہ قبول کیجئے۔ اگرچہ آپ تک دیر میں پہونچ رہا ہے۔

یہ پھول قمیض کے دامن یا گلے پر بنائیں۔ اس کے کئی حصے ہیں ایک پھول رومال کے کونے پر بن سکتا ہے۔

یہ سفید یا بہت ہلکے رنگ کی جارجٹ وائل یا آرگنڈی پر بنائیے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ پھول کو اُلٹی طرف اُتار دیجئے۔ اور اُلٹی طرف ہی (۱) پتی پر جو کانٹا بنا ہوا ہے بنائیے اسی طرح پورا پھول بنے گا پھول ۲ فلائی اسٹچ یا مکھی ٹانکے سے بنائیے جو اس طرح بنے گا۔

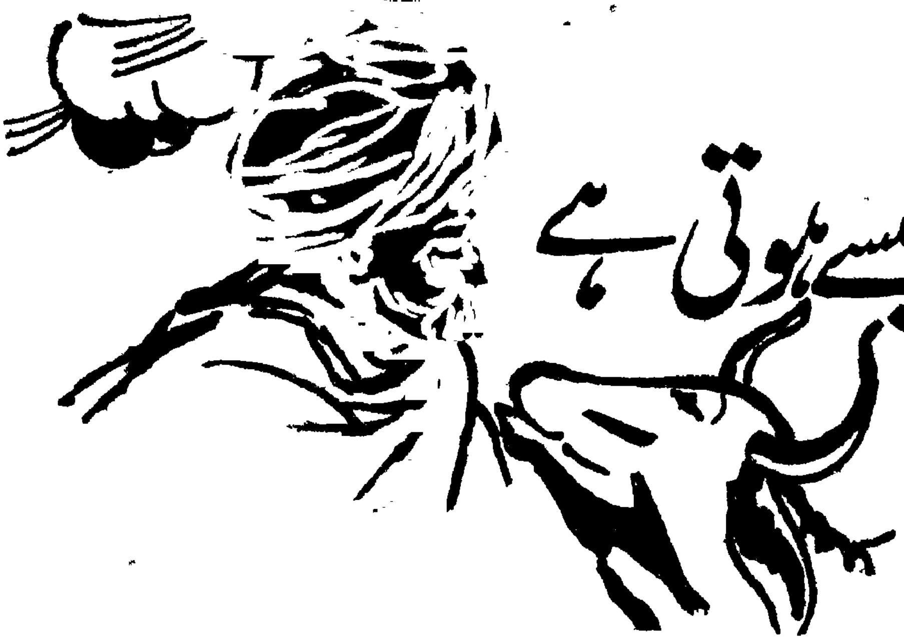




آج کل اس طرح کی کڑھائی جس کو شیڈو ایمبرائڈری کہتے ہیں بہت عام ہو گیا ہے۔ جیسے دیکھو قمیض کے گھیر گلے رومال یا ساری کے پلو بارڈر پر بنائے ہوئے ہے۔

اس کے لئے گہرے اور خوشنما رنگ لیجئے۔ دونوں بڑے پھول گہرے نارنجی، پتیاں ہری، کلیاں فیروزی اور پھول ۲ فالسئی بنائیے۔ بناتے وقت صفائی کا خیال رکھیے۔ امید ہے آپ کو اپنا تحفہ پسند آئے گا





بارش کیسے ہوتی ہے

محسن حامد

بارش کا مہینا آگیا۔ کسانوں کا دل خوشی کے مارے جھوم جھوم اٹھا۔ اس نے اپنے ہل بیل لئے اور کھیت جوتنے کے لئے روانہ ہوگیا۔ ساون کیا آیا ہر گاؤں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ابھی تک ہماری زمین مُردے کی طرح بے جان پڑی تھی اور اب پانی پڑتے ہی اک دم سے جی اٹھی۔ ہری ہری دوب نے زمین سے سر نکال کر چاروں طرف مخملی فرش بچھا دیا۔ درختوں اور پودوں نے نہا دھو کر نیا جوڑا بدل ڈالا۔ اور خوب صاف شفاف ہو گئے۔ ندی نالے بہنے لگے۔ پیڑوں میں جھولے پڑ گئے، اور ہر طرف ساون گایا جانے لگا۔ اور مینڈکوں کی ٹرٹر سنائی دینے لگی۔

آیئے آج ہم آپ کو یہ بتائیں کہ یہ بارش جو سوکھی زمین کو سر سبز کرتی ہے، کسان کے دل کو امید سے بھر دیتی ہے؛ اور گرمی سے ستائے ہوئے انسان کو تپش سے چھٹکارا دلاتی ہے کیونکر اور کیسے ہوتی ہے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ گرمی کے زمانے میں تالاب ندی اور نالے خشک ہو جاتے ہیں۔ دریا گھٹتے گھٹتے چھوٹی چھوٹی ندیوں میں بدل جاتے ہیں۔ اور پھر نالے بھی کبھی کبھی سوکھ جاتے ہیں۔

لیکن کیا آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ تالاب، ندی اور دریاؤں کا پانی آخر چلا کہاں جاتا ہے؟ اس کا جواب دینا کچھ زیادہ مشکل نہیں اور آپ فوراً کہیں گے کہ یہ پانی بھاپ بن کر ہوا میں اُڑ جاتا ہے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ تالابوں ندیوں اور دریاؤں کا کچھ پانی بھاپ بن کر بھی اُڑ جاتا ہے۔ دریاؤں کا بیشتر پانی سمندر تک کا سفر کرتا ہے۔ لیکن سمندر میں پہنچ کر بارش کے پانی کا یہ سفر ختم نہیں ہوتا بلکہ یہاں بھی سورج کی تپش سے بھاپ بن بن کر ہوا میں اُڑتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خط استوا کے قریب کے علاقے ہیں جہاں سال بھر خوب گرمی پڑتی ہے پانی بھی خوب برستا ہے۔

نہ صرف ہوائیں سمندر سے ہی بھاپ بن کر جمع ہوتی رہتی ہیں بلکہ درختوں اور پودوں سے بھی کافی پانی بھاپ بن کر فضا میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ سمندروں، دریاؤں، جھیلوں اور پیڑ پودوں سے اُٹھی ہوئی یہ بھاپ جب اونچائی پر پہنچتی ہے تو خوب سرد ہو جاتی ہے اور بادلوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جن کو آپ آج کل آسمان پر عجیب وغریب شکلوں میں اُڑتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اب اگر ان بادلوں کو اور زیادہ ٹھنڈا ہونے کا موقع ملے تو یہ پانی کے قطروں میں تبدیل ہو جائیں اور اس طرح بارش ہو جاتی ہے۔ مثلاً خطِ استوا کے آس پاس کے علاقہ کو ہی لے لیجیے، اس علاقہ میں عام طور پر روزانہ سہ پہر کو بارش ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دن بھر کی تپش سے کثیر مقدار میں پانی بھاپ بن کر ہوا میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ اور جب سہ پہر کو گرمی کم ہو جاتی ہے اور درجہ حرارت نیچے گر جاتا ہے تو یہ بادل سرد ہو کر برس پڑتے ہیں۔

پہاڑی علاقوں میں جہاں سمندر سے ہوائیں آتی ہیں زیادہ بارش سے ہونے کی بھی ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ پہاڑ ان ہواؤں کا راستہ روک کر ان کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہتے ہیں تو یہ بادل اور اونچے اُٹھتے ہیں۔ اونچائی پر پہنچنے کے بعد یہ بادل جلد ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور اس طرح اس علاقے میں خوب بارش ہوتی ہے۔

آپ نے سُنا ہوگا کہ امریکہ اور آسٹریلیا میں مصنوعی بارش بھی ہوتی ہے۔ مصنوعی بارش برسانا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ سائنس داں

(بقیہ صفحہ ۴۹ پر دیکھیے)

راشد حسن قادری



بچّے کا شوق

انگلستان کے بادشاہ جارج سوم کے زمانے میں جیمس کُک نامی ایک مشہور ملّاح گذرا ہے۔ اس کا باپ ایک کھیت پر کام کرتا تھا۔ اس کی آمدنی کم تھی اور کنبہ زیادہ۔ اسی لیے اس کا خرچ بھی زیادہ تھا۔ وہ محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے بال بچّوں کا پیٹ پالتا تھا۔

جیمس کے ماں باپ بہت غریب تھے۔ اس لیے اس کو بجائے اس کے کہ کسی اسکول میں داخل کیا جاتا ایک کھیت پر کام کرنے کو بھیج دیا گیا۔ جیمس کی ماں اس سے بہت محبّت کرتی تھی اور اس کو اس کا افسوس بھی تھا کہ جیمس کو تعلیم نہیں دی گئی اس لیے اس نے خود ہی اسے پڑھانا شروع کیا۔ جب جیمس آٹھ برس کا ہوا تو اس کا باپ کسی دوسرے گاؤں چلا گیا اور وہاں اسے پہلے سے اچھی مزدوری ملنے لگی۔ اب اس نے جیمس کو ایک چھوٹے سے اسکول میں داخل کر دیا۔ اسکول میں چار سال تک تعلیم پانے کے بعد وہ ایک گاؤں میں جو وہاں سے پندرہ میل پر تھا ایک دوکان پر نوکر ہوگیا۔ دوکان پر اس کے ذمّے جھاڑو دینے اور سب چیزوں کو احتیاط سے رکھنے کا کام تھا۔ جیمس کا آقا بہت سخت اور بے رحم آدمی تھا وہ اسے اکثر مارتا اور کھانا بھی

اچھا اور کافی نہ دیتا تھا۔ جیمس رات کو میز کے نیچے سو رہتا اور صبح اٹھ کر جھاڑو وغیرہ دیتا اور اپنے کام میں لگ جاتا۔ مگر وہ اپنی اس ملازمت سے بالکل خوش نہ تھا بلکہ مدّت سے اس کی آرزو تھی کہ ملّاح بنے۔ سمندر کا دلچسپ نظارہ اور موجوں کا زور شور دیکھ کر اس کو بھی جوش آجاتا۔ جب دوکان سے چھٹّی ملتی سمندر کے کنارے مچھلیوں کا شکار کھیلتا حقیقت میں وہ ملّاح بننے کے لئے ہی پیدا ہوا تھا۔ وہ بڑے شوق سے بہادر ملّاحوں اور کپتانوں کے قصّے سنتا اور دل میں سوچتا کہ وہ بھی ایک دن ایسے ہی بڑے اور اچھے کام کرکے دکھائے گا۔

آخر سمندر کا شوق جیمس کے دل میں روز بروز بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن صبح سویرے اٹھ کر اپنے کپڑے رومال میں باندھ کر بندرگاہ کی طرف چل پڑا جو اُس گاؤں سے نو دس میل کے فاصلہ پر تھا۔ صبح کو اس کے آقا نے دیکھا کہ دوکان کے دروازے سب بند ہیں نہ صفائی ہوئی ہے نہ چیزیں قاعدے کے مطابق رکھی ہوئی ہیں۔ وہ سمجھا کہ لڑکا ابھی تک سو رہا ہے اس لئے چپکے چپکے بید لے کر جیمس کی میز کے پاس گیا تاکہ سوتے ہی میں مارنا شروع کردے کہ اب تک اپنا کام کیوں نہیں کیا، لیکن میز کے پاس پہنچ کر اس کو حیرت ہوئی کہ جیمس لاپتا ہے۔ اس کا بستر اسی طرح کھلا پڑا تھا۔

جیمس کو بندرگاہ تک پہونچنے میں بڑی بڑی تکلیفیں ہوئیں کیونکہ اس کے پاس کھانے پینے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ مگر وہ لڑکا بہادر تھا اور ارادے کا پکا۔ جو ٹھان لیتا، کرکے چھوڑتا تھا۔ آخر بندرگاہ پر پہونچا اور وہاں قلیوں میں بھرتی ہوگیا وہ جہاز کے لئے کوئلہ ڈھویا کرتا تھا۔ یہ کام بڑا ذلیل تھا۔ مگر جیمس اس سے بھی خوش تھا اور سوچتا تھا کہ اب جس طرح میں ایک قلی ہوں اور افسروں کی خوشامد کرتا رہتا ہوں اسی طرح اگر محنت کرتا رہوں گا تو ایک دن خود امیر کبیر بن جاؤں گا اور لوگ میری خوشامد کریں گے۔

جیمس چند سال تک اسی طرح محنت اور شوق سے کام کرتا رہا۔ اس کے افسر اس کی محنت سے بہت خوش تھے آخر ترقی کرتے کرتے وہ شاہی بحری ملازمت میں داخل ہوگیا اور

اور اس نے اپنی محنت سے ثابت کر دیا کہ وہ کیسا عمدہ اور قابل ملّاح ہے۔ آخر ترقی کرتے کرتے وہ ایک جہاز کا کپتان ہو گیا پھر وہ ایک بحری سفر میں بحر الکاہل بھی گیا۔ اس زمانے میں لوگ اس جگہ سے بہت کم واقف تھے۔ اور اس کا سمندری سفر بہت طویل اور خطرناک تھا مگر جیمس چونکہ بہادر باہمت اور مستقل مزاج تھا اس وجہ سے وہ بغیر کسی خوف کے اُس خطرناک سفر پر آمادہ ہو گیا۔ راستے میں بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا ہوا۔ کئی دفعہ ہوا مخالف ہو گئی اور سخت طوفان آیا مگر جیمس ذرا نہ گھبرایا اور نہایت دلیری کے ساتھ اپنے جہاز کو بچالے گیا۔ اس نے آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کے بھی سفر کئے۔ اس سے پہلے مہذب دنیا میں آسٹریلیا کے برّ اعظم کا علم کسی کو بھی نہ تھا۔ آسٹریلیا کی دریافت کا سہرا جیمس کک کے سر ہے۔

جیمس کک نے رائل سوسائٹی لندن کے کہنے پر سمندر کے نقشے تیار کئے، اور بعد کی سمندری مہموں میں اُسے بھیجا گیا۔

کک نے مل ملا کر تین بار بڑے لمبے لمبے سمندری سفر کئے۔ پہلا سفر بحر الکاہل کا، دوسرا دائرۂ قطب جنوبی کا جہاں ابھی تک کوئی نہیں گیا تھا۔ اس سفر سے دنیا کے نقشے کی تکمیل میں بڑی مدد ملی۔

حالانکہ اب اس کی عمر ۴۸ سال کی ہو گئی تھی لیکن پھر بھی اس عمر میں اس کا سیاحت کا شوق ختم نہ ہوا تھا۔ وہ بحر الکاہل کی طرف پھر روانہ ہوا۔

اس سفر کے دوران میں اس نے ایک جزیرے میں قیام کیا۔ یہاں کے باشندوں سے یوں تو اس کی کافی دوستی ہو گئی تھی۔ لیکن اتفاقاً ایک دن اس کی ایک ناؤ چوری ہو گئی۔ کک نے اس سلسلے میں اس کی تحقیقات کرنی چاہی لیکن کسی نے ایک دن اس کو دھوکا دے کر جان سے مار دیا۔ اس طرح وہ سیّاح مارا گیا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں شاید ہی مل سکے گی۔

جیمس کک ایک ایسی محبت اور ہمدردی کے ساتھ کام لیتا تھا کہ اس کے ماتحت ملّاح اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس نے اپنے ملک و قوم کے لئے ایسی ایسی خدمتیں کیں جن کو انگریز آج تک یاد کرتے ہیں۔

مختلف بچے

ہم جہاں رہتے ہیں

اس بار ہم خاص طور پر بچوں کے یہ تین مضامین شائع کر رہے ہیں جن میں بچوں نے یا تو ان جگہوں کا حال لکھا ہے یا یہاں کے تاریخی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جسے انھوں نے نہ صرف یہ کہ دیکھا ہی ہے بلکہ وہ یہاں رہتے بھی ہیں۔ اگر پیامی بچے اس طرح کے مختصر مضامین لکھ کر بھیجیں تو ہم اس سلسلے کو جاری رکھ سکتے ہیں۔

ادارہ

آبشار اہربل

یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ گرمیوں میں کشمیر کا دارالخلافہ سرینگر رہتا ہے۔ آپ نے کشمیر کی خوبصورتی کا ذکر بھی سنا ہی ہوگا۔ آیئے میں آج آپ کو یہاں کے ایک مشہور اور دلکش آبشار کا حال سناؤں۔ چونکہ میری مادری زبان کشمیری ہے اس لئے مجھے اندازہ نہیں ہے کہ

میں اپنے خیالات کا پورا پورا اظہار کرسکوں گا یا نہیں۔ البتہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں گا۔ میں کشمیر کے ایک چھوٹے سے گاؤں کوریل میں رہتا ہوں۔ میرا گاؤں سرینگر سے ۷۵ میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی علاقے میں واقع ہے۔ اور آبشار اہر بل ہمارے گاؤں سے ۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے اس طرح پر سرینگر سے لے کر آبشار تک کا فاصلہ ۲۶ میل ہے۔ یہ آبشار قدرت کے عجائبات کا ایک نمونہ ہے۔ دریائے ویشو کشمیر کا تیز رفتار دریا ہے۔ جو جھیل کونسر ناگ سے نکل کر پہاڑی علاقہ میں بل کھاتا ہوا بہتا ہے۔ اور علاقہ ٹنگا مرگ کے "خزانہ بل" نامی گاؤں کے پاس تقریباً ۸۰ فٹ بلند آبشار بناتا ہے۔ اس آبشار کے اردگرد بہت بلندی والے پہاڑ ہیں اور ان پہاڑوں پر کائیرو اور بدلو کے درخت عجب ہی بہار دکھاتے ہیں۔ آبشار کے شور وغل کی آواز تقریباً ایک میل سے سنائی دیتی ہے۔ آبشار کا پانی بلندی سے گرنے کی وجہ سے ۱۰۰ فٹ کی بلندی تک چھینٹیں اڑاتا ہے۔ اور بہت دفعہ قوس قزح بھی بناتا ہے۔ آبشار کا نظارہ دیکھنے کے لیے دور دراز ملکوں کے لوگ آتے ہیں۔ اکثر لوگ آبشار کے کنارے کھانا پکاتے ہیں اس کے پاس ہی ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس ہے۔ ریسٹ ہاؤس کے اردگرد کا علاقہ خزانہ بل کہلاتا ہے۔ خزانہ بل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں پہلے مغل سلطنت کا دارالخلافہ تھا اور ان کے وقت کے ہی چند خزانے یہاں دفن ہیں۔ اہر بل کے نزدیک ہی گندھک کے پانی کا چشمہ ہے۔ جہاں روزانہ خارش والے مریضوں کا تانتا لگا رہتا ہے یہ لوگ چشمے کے پانی سے نہا کر صحت یاب ہوتے ہیں اگر آپ کو بھی کشمیر آنے کا موقع ملے تو اس آبشار کو ضرور دیکھیے۔ آج کل اس آبشار تک لوگ جیپ کار سے بھی آتے ہیں۔

مسعود احمد

عمر دس سال

شیر شاہ سوری

تاریخ کے طالب علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندستان کے بادشاہوں میں شیر شاہ سوری بڑا بہادر اور انصاف پسند بادشاہ گزرا ہے۔

جس نے ہندستان کی ترقی اور بہتری کے لئے بڑے بڑے کارنامے کئے ہیں۔ اس نے کلکتے سے پشاور تک ایک پکی سڑک بنوائی ہے، جس کو گرانڈ ٹرنک روڈ کہتے ہیں۔ اس سڑک کی خصوصیت یہ ہے کہ ہندستان کے بڑے اہم شہروں سے گزرتی ہے۔ جیسے گیا۔ مرزاپور۔ الہ آباد۔ کانپور۔ علی گڑھ۔ دہلی وغیرہ اور اسی سڑک کی ایک شاخ دہلی سے کلکتے جاتے آتے وقت ریلوے لائن سے تھوڑے فاصلے پر یہ بڑی سڑک دکھائی دیتی ہے۔ جگہ جگہ پر بہت شاندار پل بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان پلوں کو دیکھ کر یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے یہاں آج سے سیکڑوں برس پہلے بھی تعمیرات کا فن بہت اونچا ہو گیا تھا۔ ان پلوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ابھی چند سال پہلے ہی بنے ہیں۔ اس عالی دماغ بادشاہ کی آخری یادگار اس کا روضہ ہے جو میرے وطن سہسرام (بہار) میں ہے۔ جس کو دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ اس روضے کی خوبصورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کی بناوٹ اور خوشنمائی کا اندازہ اس بات سے اچھی طرح کیا جا سکتا ہے کہ اصل گنبد زمین کی سطح سے قریب قریب ایک سو فٹ اونچا ہے اور گنبد کے چاروں طرف برجیں بنی ہوئی ہیں۔ جو روضہ کی خوبصورتی کو اور زیادہ بڑھا رہی ہیں۔ یہ روضہ دو منزلہ ہے معمولی اور سادہ پتھر کا بنا ہوا ہے اس پر جگہ جگہ بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ محرابوں میں قرآن شریف کی آیتیں کھدی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ جس چیز نے اس روضے کی خوبصورتی میں چار چاند لگائے وہ یہ ہے کہ یہ عالی شان روضہ ایک بہت بڑے تالاب کے بیچ میں بنایا گیا ہے۔ روضے کے چاروں طرف کی سیڑھیاں پانی کی سطح سے ملی رہتی ہیں۔ یہ عظیم الشان تالاب ہمیشہ صاف ستھرے پانی سے لبریز رہتا ہے۔ اس کے چاروں طرف پکا گھاٹ بنا ہوا ہے۔ اس تالاب کا پانی بہت پاک سمجھا جاتا ہے کیونکہ نہر کے ذریعے دریائے گنگا کا پانی اس میں آتا ہے۔ شہر کی چوتھائی آبادی اس تالاب کا پانی پیتی ہے اس میں غوطے لگا کر نہانے کی ممانعت ہے البتہ اس سے پانی لے کر دوسرے گھاٹ پر لے جا کر نہاتے

ہیں۔ استعمال کیا ہوا پانی پختہ نالی میں گِر کر بہہ جاتا ہے۔ اس تالاب کی مغربی سمت پر ایک بہت بڑی عیدگاہ کی مسجد بنی ہوتی ہے تالاب کے شمالی جانب ایک پُرانی مسجد بنی ہوئی ہے مشرقی سمت میں خوبصورت بارہ دری بنی ہوئی ہے جس میں آج کل قومی لائبریری قائم کر دی گئی ہے۔ تالاب کے جنوبی کنارے پر ایک بہت، خوشنما باغ ہے۔ اس طرف آجکل جھولے وغیرہ کھیل کے سامان لگے ہوئے ہیں غرض شیر شاہ کا یہ روضہ اور تالاب۔ عیدگاہ اور بارہ دری۔ باغ اور تفریحی سامان اور یہ حسین منظر کسی دوسرے تاریخی مقام پر بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ ہمیں اپنے سہسرام پر فخر ہے۔

محمد سمیع اللہ سہسرامی (بہار) عمر ۹ سال

شانتی نکیتن

آیئے ہمارا شانتی نکیتن دیکھئے۔ شانتی نکیتن کے معنی ہیں "امن و سکون کا گھر" یہ بنگال میں بھولپور سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں آپ کو را بندر ناتھ ٹیگور کا اسکول ملے گا۔ اس کا نام وشو بھارتی ہے۔ بچے اور بڑے اس مدرسے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ دنیا کے ہر حصے سے عالم فاضل آتے رہتے ہیں اور یہاں کے طلبار کو تعلیم دیتے رہتے ہیں پڑھانے کے علاوہ خود بھی مختلف مضامین کا مطالعہ کرتے کرتے ہیں۔ ایک شخص کو آپ تبت کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے پائیں گے تو دوسرے کو چین کی کتابوں کا مطالعہ کرتے۔ تیسرے کو جاپان کی نظموں کا تو چوتھے کو املی کے بارے میں۔

شاعر اعظم را بندر ناتھ نے ۱۹۰۱ء میں یہ مدرسہ قائم کیا۔ اس سے ان کے والد مہارشی دیوندر ناتھ ٹیگور بڑے خوش ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ مدرسہ ترقی کرے گا۔ سب سے پہلے را بندر ناتھ کے والد نے یہ جگہ تلاش کی تھی۔ ایک دن سفر کرتے کرتے اوسر میدان میں پہونچے۔ یہاں صرف دو درخت اُگے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس زمین کو بہت پسند کیا کیونکہ یہ شہر سے کافی فاصلے پر تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک عمدہ جگہ ہوگی جہاں خدا کی عبادت بھی اچھی طرح کی جا سکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تب وہ ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے اور انھوں نے فوراً ارادہ کرلیا کہ وہ اس زمین کو خرید کر وہاں ایک آشرم بنائیں گے۔ انھوں نے اسے خرید لیا اور مکان کا نام شانتی نکیتن رکھا۔ بعد میں کسی نے انھیں بتلایا کہ یہاں ڈاکو آیا کرتے ہیں۔ وہ اس سے خوفزدہ نہیں ہوئے۔ کچھ مدت کے بعد ڈاکو پکڑے گئے۔ ان کے سردار نے جب مہارشی کے عمدہ کاموں کو دیکھا تو اس نے توبہ کی اور اپنا طریق زندگی چھوڑدیا۔ اور ایک اچھا آدمی بن گیا۔ مہارشی نے اس زمین کو خریدا اور وہاں درخت لگائے۔ اور پھول پھل کے باغ لگائے۔ انھوں نے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنوائیں تاکہ وہاں پر لوگ آکر بس جائیں۔

رابندر ناتھ نے اس اسکول کو دسمبر ۱۹۰۱ء میں قائم کیا تھا۔ پہلے پہل اس میں صرف چار یا پانچ طالب علم تھے۔ لیکن اب تو یہ بہت مشہور و معروف ہوگیا ہے شانتی نکیتن میں کھلی ہوا میں پڑھائی ہوتی ہے۔ لڑکے زمین پر بیٹھتے ہیں اور اپنے استادوں کی باتوں کو غور سے سُنتے ہیں۔ اکثر اپنے لکھے ہوئے ڈرامے کھیلتے ہیں۔ یا رابندر ناتھ کے لکھے ہوئے ڈرامے کھیلتے ہیں۔ ٹیگور بہت بڑے شاعر تھے۔ صبح شام کو طلبا کو سکوت اختیار کرکے خدا کی عبادت کرنی پڑتی ہے۔ سال میں دو لمبی چھٹیاں ملتی ہیں۔ بدھ، کرائسٹ، محمد، چیتنیہ، رام موہن رائے اور دیگر لوگوں کی پیدائش کے موقع پر آدھے دن کی چھٹی ملتی ہے۔ شانتی نکیتن میں طلبار اور اُستاد ایک ہی ساتھ دوست کی طرح رہتے ہیں

شانتی نکیتن میں سب کچھ ملتا ہے۔ اپنی ضرورتوں کے لئے شہر میں نہیں جانا پڑتا ہے۔ اس کا اپنا خاص فارم ہے جہاں مویشی ہیں۔ اپنا ڈاک خانہ۔ اپنا اسپتال۔ اپنا کارخانہ۔ اپنا چھاپہ خانہ۔ اور کپڑا بنانے کی مشینیں ہیں۔ یہاں ایک بہت اچھا کتب خانہ بھی ہے۔ یہاں سے کتابیں ساری دُنیا میں بھیجی جاتی ہیں۔ رابندر ناتھ نے بہت سی اچھی کتابیں اس کتب خانے میں دی تھیں۔

اس اسکول میں بچّوں کو ہر چیز کی دیکھ ریکھ خود ہی کرنی پڑتی ہے۔ وہ پڑھنے، لکھنے،

ڈراما کرنے اور گانے کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھوں کا استعمال کرنا بھی سکھایا جاتا ہے سب متعلم قریب کے گاؤں میں جاتے ہیں اور غریب گاؤں والوں کو پڑھاتے ہیں اور ان کو لکھنے پڑھنے۔ صفائی رکھنے۔ تندرست رہنے اور اپنے دولت کا مناسب استعمال کرنا سکھاتے ہیں۔ وہ ان کو اپنی زمین۔ جانوروں اور گھروں کی دیکھ بھال کرنا بھی سکھاتے ہیں۔

جب شانتی نکیتن میں کوئی لڑکا غلطی کرتا ہے تو اس کو استادوں کے ذریعہ سزا نہیں دی جاتی ہے۔ وہ ایک عدالت کے سامنے لے جایا جاتا ہے جس میں دوسرے طلباء منصف کا کام کرتے ہیں۔ یہ عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ ملزم کو کس طرح کی سزا دی جانی چاہئے کسی بھی طالب علم کو کبھی مار نہیں پڑتی۔

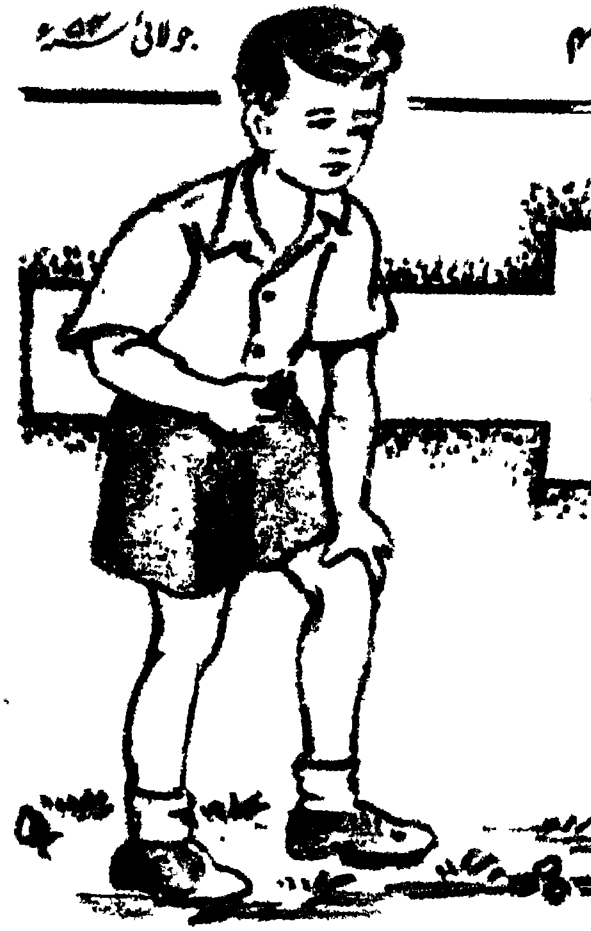
اس مدرسے میں بڑے اچھے طریقے سے وقت صرف کیا جاتا ہے طلباء ہر روز علی الصباح چار بجے اُٹھتے ہیں۔ منہ ہاتھ دھوکر اپنا کمرہ صاف کرتے ہیں۔ اس کے بعد کھلی ہوا میں کثرت کرتے ہیں۔ تب غسل کرتے ہیں اور اس کے بعد انھیں کچھ فرصت ملتی ہے جس میں وہ اپنی خواہش کے مطابق جو چاہیں کرتے ہیں۔ کلاس میں جانے سے پہلے وہ ایک ساتھ جمع ہوتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔ اور پھر مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔ وہ دوپہر کے کھانے سے پہلے چار یا پانچ گھنٹے پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد ان کو آرام کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ تب وہ دو بجے سے پانچ بجے تک اسکول جاتے ہیں۔ شام کے وقت وہ پھر کثرت کرتے ہیں۔ وہاں کی شام بڑی خوشگوار ہوتی ہے۔ طلباء اپنے عبادت کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ تب کھانے کا گھنٹا آتا ہے۔ طلباء ایک دوسرے کو قصہ کہانی سُناتے ہیں۔ جب رابندرناتھ ٹیگور وہاں رہتے تھے تو وہ اپنی لکھی ہوئی کہانیاں سُنایا کرتے تھے۔ ہر روز قصے نہیں کہے جاتے۔ اکثر شاموں کو وہ گانا سنتے ہیں یا ڈراما کھیلتے ہیں یا تقریریں کرتے ہیں۔

یہ رابندرناتھ کے اسکول کی زندگی ہے۔ وہ اپنے اسکول کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ اور اپنے وقت کا سب سے بڑا حصہ یہیں صرف کیا کرتے تھے۔ ان کو بچوں کے ساتھ رہنے میں بڑا لطف آتا تھا ان کو

ان کے ساتھ باتیں کرنے، کھیلنے، گانا سننے اور قصے کہانیوں میں بڑا مزا ملتا تھا۔ ان کو اصلی چین یہیں ملتا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ ہر بچے کو تین اُستادوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلا سورج، ستارے، پھول اور درخت ہیں۔ تب اسے اپنے ساتھیوں سے سیکھنا چاہئے۔ اور بے شک ہر لڑکے کو کتابوں اور اُستادوں سے سیکھنا چاہئے۔ رابندر ناتھ اپنے اسکول کو بہت ہی مفید بنانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو نوجوان عورت یا مرد یہاں سے نکل کر دنیا میں جائیں دلیر اور قابل ہوں اور ان کو ایسی شخصیت ہونی چاہئے جن کا ان کے وطن کو فخر ہو۔

یہ مدرسہ ہر دوسرے اسکول سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر سال بہت سے لوگ آتے ہیں۔ دنیا کے ہر حصے سے آتے ہیں اور بعض تو یہاں بہت مدت تک قیام کرتے ہیں۔ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں رہ کر ہندستان کے بارے میں بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

عبدالواحد بیدل عمر ۱۵ سال



بچوں کی کوششیں

چغل خور لومڑی

ایک دفعہ ایک شیر بیمار ہوا۔ اس کی مزاج پُرسی کو جنگل کے تمام جانور آئے۔ کسی وجہ سے بھیڑیا دوسرے جانوروں کے ساتھ نہ آ سکا لومڑی نے چغلی کھائی کہ بھیڑیا نہیں آیا ہے۔ شیر کو بہت غصہ آیا اور کہا جب وہ آئے تو مجھے بتلا دینا۔ میں اس کو سزا دوں گا۔ کسی نے بھیڑیئے سے یہ سب باتیں بتلا دیں۔ جب بھیڑیا آیا تو اس سے شیر نے پوچھا تم کہاں گئے تھے۔ بھیڑیئے نے جواب دیا میں نے جیسے ہی خبر سُنی تو آپ کے لئے دوا تلاش کرنے چلا گیا۔ شیر نے کہا تم نے کوئی چیز حاصل کی ہے؟ بھیڑیئے نے کہا "مجھے جنگل کے بڑے حکیم صاحب نے بتلایا ہے کہ لومڑی کی ٹانگ کا گوشت آپ کے لئے مفید ہوگا۔ یہ سُن کر شیر نے لومڑی کی پنڈلی کا گوشت نوچ لیا۔ لومڑی کی ٹانگ سے خون بہنے لگا اس عرصہ میں بھیڑیا وہاں سے کھسک گیا جب وہ لومڑی

کے پاس سے گزرا تو اس نے لومڑی سے کہا لے لومڑی صاحبہ جب آپ بادشاہ کے قریب ہوں تو سوچ سمجھ کر بات کیا کیجیے، کسی کی چغلی کھانے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا ہے۔

جمیل اشرف نعمانی

ڈرنا کیوں؟

ایک معمولی بیوپاری تھا اُس نے رفتہ رفتہ ترقی کی اور بہت مال و دولت کما لیا جب وہ اپنے کاروبار میں خوب کامیاب ہو گیا تو اُس نے سوچا کہ دوسرے ممالک میں جا کر تجارت کرے۔ چنانچہ وہ اپنے بال بچوں سے رخصت ہو کر روانہ ہوا۔ پھر وہ جہاز پر اپنا مال چڑھا کر خود بھی سوار ہو گیا۔ جہاز بندرگاہ سے روانہ ہوا اور آہستہ آہستہ سمندر کی لہروں کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس سے پہلے وہ پانی کے جہاز پر کبھی نہیں بیٹھا تھا۔ اس کے لیے یہ نئی اور انوکھی بات تھی۔ جہاز کے چاروں طرف سمندر کا نیلا پانی اور اوپر نیلا آکاش دیکھ کر پہلے تو وہ بہت خوش ہوا۔ سمندر کی ان چنچل لہروں کے ساتھ اس کا من بھی خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہوا تیز ہو گئی اور سمندر کی لہریں اوپر اُٹھنے لگیں۔ پانی کے جھکولوں سے جہاز ڈگمگانے لگا۔ اب تو سوداگر گھبرانے لگا۔ اس کا چہرہ پریشانی اور گھبراہٹ کی وجہ سے پیلا پڑ گیا۔ پھر اُس نے دل ہی دل میں سوچا" شاید اب جہاز ڈوب جائے گا اور ہم بھی مر جائیں گے۔ اور اس طرح اس کے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔"
اب تو وہ دہاڑیں مار مار کر رونے اور چلّانے لگا۔ اُس کے رونے اور چلّانے کی آواز سُن کر کچھ ملّاح اس کے قریب آئے اور اس کو سمجھانے لگے۔ ملّاحوں نے کہا آپ گھبرائیے مت جہاز نہیں ڈوبے گا۔ تھوڑی دیر میں ہوا تھم جائے گی اور سمندر بھی شانت ہو جائے گا۔ سوداگر نے آنسو پونچھتے ہوئے ملّاحوں سے پوچھا تم لوگ کیوں نہیں ڈرتے۔

ملّاح نے کہا" ہم لوگ کیوں ڈریں۔ ہم رات دن جہاز پر رہتے ہیں۔ ہمارے باپ دادا بھی جہازی تھے اور انھیں جہازوں پر ان کی بھی موت ہوئی۔

سوداگر بالکل گھبرا گیا اور بولا "تم بھی عجیب آدمی ہو کر اس کے بعد بھی جہاز پر کام کرتے ہو۔ تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ اگر اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو یہ کام چھوڑ دو۔ ورنہ تمھاری موت بھی اسی طرح جہاز پر ہوگی۔"

سوداگر کی یہ بات سُن کر ملّاح بہت ہنسے اور انھوں نے سوداگر سے کہا کہ آپ بھی ہماری ایک بات کا جواب دیجئے، آپ کے باپ دادا کہاں مرے۔

سوداگر نے کہا "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ وہ بھی کوئی تمھاری طرح بیوقوف تھے۔ جو مرنے کے لئے سمندری جہاز پر آتے انھوں نے اپنے گھر میں پلنگ پر جان دی۔"

ایک ملّاح نے جو ان میں سب سے زیادہ تیز تھا کہا کہ "تعجب ہے کہ پھر بھی آپ اپنے گھر میں رہتے ہیں اور حالانکہ آپ خود بھی جانتے ہیں کہ ان کی موت اسی گھر اور پلنگ پر [illegible] گئے۔"

اب تو سوداگر سمجھ گیا اور پھر اُس نے ڈرنے کا نام بھی نہیں لیا اور بے فکر ہو کر [illegible] رہا۔

حفیظ الدین عمر کھیڑ

خالہ لڈو کیسے ہیں

کسی جنگل میں ایک لومڑی رہتی تھی۔ اس کے پڑوس میں ایک خرگوش بھی رہا کرتا تھا جو بہت سیدھا سادا تھا۔ لیکن لومڑی بڑی چالاک اور تیز تھی۔

ایک دن لومڑی اور خرگوش نے مل کر کھیر پکائی۔ جب کھیر پک کر تیار ہو گئی تو لومڑی نے خرگوش سے کہا کہ "تم بہت چھوٹے ہو اس لئے تم اس چھوٹے سے پتے پر رکھ کر کھیر کھاؤ۔"

خرگوش نے کہا "ہاں خالہ تمھارا کہنا ٹھیک ہے کہ میں چھوٹا ہوں لیکن یہ پتّہ تو بہت چھوٹا ہے۔ اس پر کھیر کیسے آ سکتی ہے۔ مگر لومڑی نہ مانی اس نے بیر کے پتے پر خرگوش کو کھیر دے دی۔ بیچارا خرگوش بہت گڑگڑایا مگر لومڑی بڑی سخت دل تھی وہ ایک نہ مانی۔

اب لومڑی نے خوب مزا لے لے کر کھیر کھائی۔ اور کھانے کے بعد پیڑ کے نیچے اطمینان سے سو گئی۔ خرگوش کا پیٹ تو اتنی کھیر کھا کر بھرا نہیں تھا اس کو خوب زور دن

سے بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ گاؤں چلنا چاہیئے۔ وہاں ضرور کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ اب وہ دوڑتا ہوا گاؤں میں پہنچا۔ پہلا جھونپڑا ایک بڑھیا کا تھا۔ اس نے بڑھیا سے بڑی منت سماجت کی۔ بڑھیا نے ترس کھا کر خرگوش کو تھوڑا سا چاول دیا۔ بڑھیا کے پاس سے وہ بنیئے کی دکان پر گیا۔ اس نے بنیئے سے بھی منت سماجت کی۔ بنیئے نے اسے تھوڑا سا گڑ اور گھی دیا۔ یہ سب سامان لے کر خرگوش جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک باورچی ملا۔ اس نے باورچی سے بڑی عاجزی سے کہا کہ "بھائی باورچی میرے لئے اس چاول، گھی اور گڑ کی کوئی مزیدار چیز پکا دو۔ باورچی کو بھی اس پر رحم آگیا۔ اس نے اس کے لئے بڑے مزیدار لڈو پکا کر دیئے۔ اب تو خرگوش بڑے مزے سے واپس اپنے پیڑ کے پاس آیا اور پیڑ پر چڑھ کر مزا لے لے کر لڈو کھانے لگا۔ لومڑی کو اس کی کیا خبر تھی وہ تو ابھی تک سو رہی تھی۔ خرگوش کو شرارت جو سوجھی تو اس نے لڈو کا ایک ٹکڑا اٹھا کر لومڑی کی طرف پھینکا۔

لومڑی اٹھ بیٹھی۔ اس نے جو یہ لڈو کا ٹکڑا دیکھا تو جھٹ منہ میں ڈال لیا۔ مگر لڈو کا ٹکڑا چھوٹا سا تھا اس نے منہ میں لیا تو بس ذرا سی دیر میں ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ خرگوش میاں قہقہہ لگا کر ہنسے۔ خرگوش کے قہقہے کی آواز سن کر لومڑی نے جو اوپر نظر اٹھائی تو کیا دیکھتی ہے کہ خرگوش میاں مزے میں لڈو اڑا رہے ہیں۔

لومڑی نے کہا "خرگوش بھیا دو چار لڈو مجھے بھی دے دو، میرا جی بھی اسے کھانے کو چاہتا ہے"۔

خرگوش نے جواب دیا کہ "خالہ بی! یہاں سے کچھ دور پر ایک گاؤں ہے۔ گاؤں کے نکڑ پر بڑھیا کا گھر ہے وہیں چاول ملتا ہے مگر ذرا بڑھیا کو برا بھلا کہنا ہوگا۔ اسی طرح اس کے پاس ہی بنیئے کی دکان ہے۔ تم بنیئے کو بھی دو چار گالیاں سنانا وہ تم کو گھی اور گڑ دے گا۔

یہ سن کر لومڑی گاؤں پہنچی اور اس نے بڑھیا کو خوب گالی کوسنے دیئے۔ اور چاول مانگے۔ یہ سن کر بڑھیا کو بہت غصہ آیا!

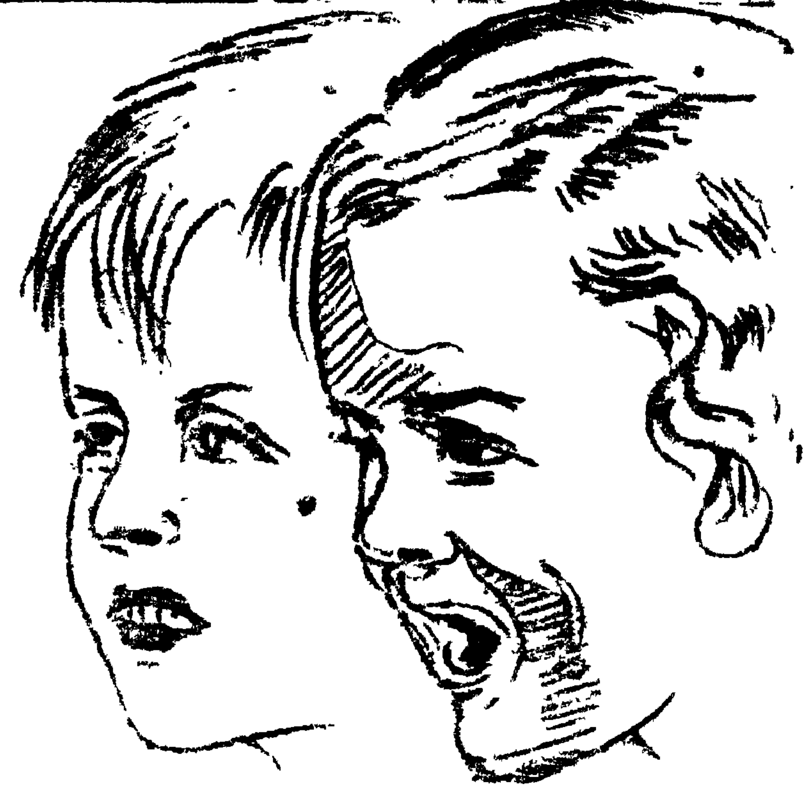
چولھے کی گرم راکھ لاکر لومڑی کے اوپر ڈال دی۔ گرم راکھ سے لومڑی کا سارا بدن جھلس گیا۔ وہاں سے وہ بھاگتی ہوئی بنیے کی دُکان پر پہنچی اور لگی بنیے کو اسی طرح کے کوسنے دینے۔ بنیے نے اُٹھاکر جو لومڑی کے پتھر مارا تو وہ لہو لہان ہو گئی۔ وہاں سے بے چاری بھاگتی ہوئی جنگل میں آئی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر خرگوش کو اس پر رحم آگیا اور اس نے جنگل سے کچھ جڑی بوٹی لاکر لومڑی کا علاج کیا۔ چند روز میں لومڑی بالکل اچھی ہو گئی۔ خرگوش نے اس سے کہا "خالہ یاد رکھو کہ آئندہ اب کسی کے ساتھ بُرائی نہ کرو گی۔ ورنہ تم کو بُرائی کا پھل بھگتنا پڑے گا"

پیر محمد رزاق قاضی
مگٹ خان ہبلی

ہمارے چند ایجنٹ

۱۔ عثمانیہ بک ڈپو۔ کلکتہ
۲۔ فیمس بک ہاؤس۔ برہان پور
۳۔ کتاب منزل۔ پٹنہ
۴۔ محمد حنیف۔ محمد علی روڈ۔ بمبئی
۵۔ اسٹار اینڈ کو۔ حیدرآباد۔ دکن
۶۔ صاحب رام۔ اورنگ آباد
۷۔ نواب عبدالرحیم راے پور
۸۔ شمیم اختر۔ کشن گنج
۹۔ کتابی دنیا۔ آسنسول
۱۰۔ کامل محمد قریشی۔ دھار
۱۱۔ اندکار نیوز ایجنسی۔ بیجاپور
۱۲۔ چودھری محمد حسین۔ کلیان شریف
۱۳۔ پیوپلس بک ہاؤس۔ راے پور
۱۴۔ محمد اشرف محمد یعقوب۔ پیلی بھیت
۱۵۔ میلی نھل محمد۔ پیرنٹل ماما
۱۶۔ عبدالحمید۔ نیچھ
۱۷۔ محمد عرفان اللہ گدی۔ چکردھرپور
۱۸۔ عبدالباری۔ کریم نگر
۱۹۔ شیخ عبدالعزیز۔ اکولا
۲۰۔ سید عبدالقادر۔ تادپتھ
۲۱۔ مکتبہ جامعہ۔ بمبئی ۳



مزیدار کہانیاں

ایک بار کسی کسان کی گائے بیمار ہوگئی۔ وہ اپنے دوست کے پاس پہنچا اور بولا "بھئی پچھلے سال جب تمھاری گائے بیمار ہوئی تھی تو تم نے اُسے کیا دیا تھا؟" اس نے جواب دیا "تارپین کا تیل۔"

کسان نے گھر جاکر اپنی گائے کو بھی تارپین کا تیل پلا دیا۔ اگلے دن اس کی گائے مر گئی۔ وہ اپنے دوست پر بے حد ناراض ہوا اور بولا "تم نے مجھے کیسی دوا بتائی کہ میری گائے مر گئی۔"

اس کا دوست ہنسا اور بولا "تم نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اپنی گائے کو کون سی دوا دی۔ سو میں نے بتا دیا کہ تارپین کا تیل۔ میں نے اپنی گائے کو بھی تیل دیا تھا اور اس کے پیچھے کے بعد وہ گائے مر گئی۔"

بیچارا کسان اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

علیم درّانی

میں نے اخبار میں ایک اشتہار پڑھا "مکھی مارنے کی نادر مشین چار روپے میں"۔ یہ اشتہار پڑھتے ہی میں نے اس کا آرڈر بھیج دیا۔ چند روز میں میرے پاس چار روپے بارہ آنے کا وی۔ پی آگیا۔ میں نے اسے چھڑا لیا۔ اب جو کھول کر دیکھا تو اس پارسل میں دو پتھر نکلے۔ میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اسی میں ایک کاغذ تھا جس پر استعمال کا طریقہ لکھا تھا۔ "سب سے پہلے ایک پتھر نیچے رکھ دیجیے۔ پھر مکھی پکڑ کر لائیے۔ اور اس پر مکھی رکھ دیجیے۔ اور دوسرا پتھر اُٹھا کر اس پر مار دیجیے۔ اگر آپ کا نشانہ خطا نہ ہوا تو مکھی یقیناً مر جائے گی۔"

انور حسین

ایک تھے گپی، وہ بڑی اونچی اونچی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے اپنے دوست سے کہا۔ "بھائی آج جنگل میں میں نے ایک پیڑ پر ایک ہزار سانپ دیکھے۔ ان کے دوست نے کہا۔ "بھئی تم سے کتنی بار کہا کہ جھوٹ نہ بولا کرو۔ مگر تم ہو کہ مانتے نہیں، اب بھلا بتاؤ، کہیں ایک پیڑ پر ایک ہزار سانپ بھی بیٹھ سکتے ہیں۔"

گپی میاں نے مسکراتے ہوئے کہا "بھئی یہ تو میں نے ایک بات کہی۔ گفتگو میں تھوڑا بہت فرق ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن اس پر پانچ سو سانپ تو ضرور ہوں گے۔"

ان کے دوست نے حیرت سے کہا "پانچ سو سانپ! ارے میاں غضب کرتے ہو۔"

گپی میاں پھر سنبھل گئے اور بولے "بھئی پانچ سو تو نہیں، لیکن سو سانپ تو ضرور ہوں گے۔"

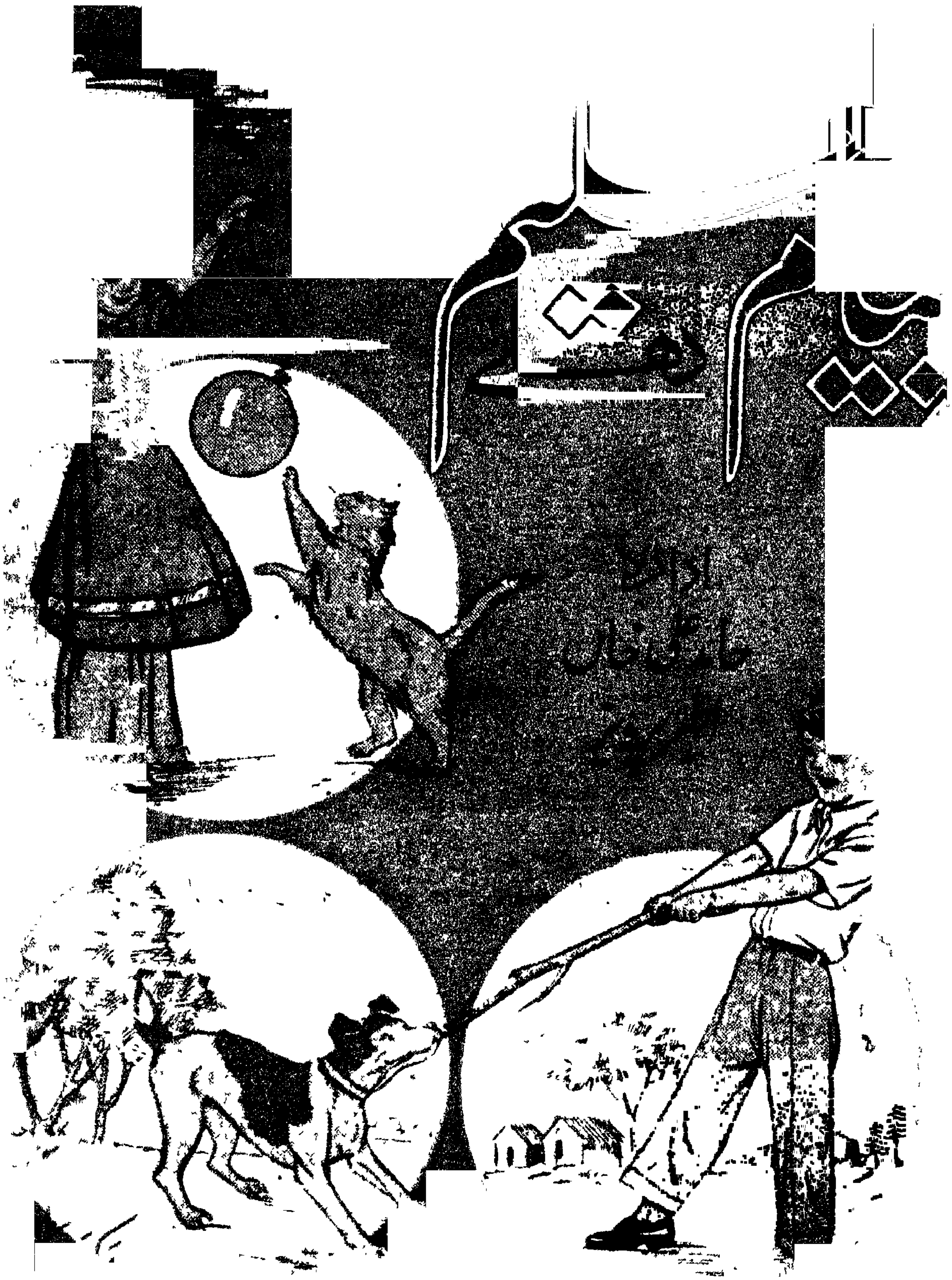
"کیا تم نے گنے تھے کہ وہ سو کی تعداد میں تھے" گپی میاں کے دوست نے کہا۔

گپی میاں نے بڑے مزے میں اپنا سر کھجایا اور بولے "بھئی سو تو نہیں تھے وہ میں نے یونہی کہا لیکن ایک کالی ناگن پھن پھیلائے کھڑی تھی۔"

ان کے دوست کو اب تو بڑے زور سے ہنسی آئی اور بولے "بھئی ہم نے تو سنا ہے کہ ناگن اپنا پھن اس طرح نہیں پھیلاتی۔ گپی میاں نے کہا بھائی آپ خواہ مخواہ بحث کرنے لگے۔ یہ بھی کوئی بحث کی بات ہے۔ میں جنگل کی طرف سے آ رہا تھا۔ ایک پیڑ کے پتے بڑے زوروں سے کھڑکھڑا رہے تھے۔ مجھے تو یقین ہے کہ ضرور اس میں کوئی کیڑا تھا۔



کون سا کھلونا لوں





چین کے وزیر اعظم مسٹر چو ان لائی آگرے میں تاج محل کے سامنے
آپ نے اردو میں کہا " تاج محل بہت اچھا ہے "

پیامِ تعلیم

فہرست

اور اس کے علاوہ بچوں سے باتیں، لطیفے، معمے وغیرہ

سالانہ چندہ ـــــ ۴ روپے
فی پرچہ ـــــ ۶ آنے

ادارہ

حامد علی خاں بی۔اے (جامعہ)

اطہر پرویز ایم۔اے (علیگ)

آرٹسٹ: گلیڈون میسی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی



بچوں سے باتیں

جولائی کا پہلا ہفتہ یوں تو سارے دیس میں خوشی کا ہفتہ تھا لیکن ۳ جولائی کی صبح کو ہم خاص طور پر بے حد خوش تھے اور کیوں نہ ہوتے، اچانک بارہ گھنٹے پہلے ہمیں یہ خبر ملی کہ ہمارے پڑوسی ملک چین کے وزیر اعظم مسٹر چو ان لائی، جامعہ دیکھنے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ مسٹر چو ان لائی، جنیوا سے اپنے ملک واپس جا رہے تھے، لیکن ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو کی خاص دعوت پر آپ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ آپ نے یہاں تین دن گزارے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے جامعہ بھی آئے۔ بدقسمتی سے جامعہ میں چھٹیاں تھیں، بچے اپنے اپنے گھر گئے ہوئے تھے۔ بس گنتی کے لوگ رہ گئے تھے۔ لیکن اتنے بڑے مہمان کی آمد سے پورے جامعہ نگر میں زندگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ یوں تو ہماری تعداد کم تھی لیکن ہم سب نے دل سے اس بڑے مہمان کا استقبال کیا۔

جون کے مہینے میں بچوں کی ایک ٹرین چار سو بچوں اور دو سو استادوں کو لے کر دہلی سے کشمیر گئی تھی۔

۵ر جولائی کو وہ تمام بچے واپس آگئے۔ بچوں کی سیر کا یہ پروگرام ایک حد تک کامیاب رہا۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ دہلی اسٹیٹ ٹیچرز ایسوسی ایشن اس طرح کے آئندہ تمام پروگرام کچھ بہتر انتظام اور زیادہ سُوجھ بُوجھ سے کرتی رہے گی۔

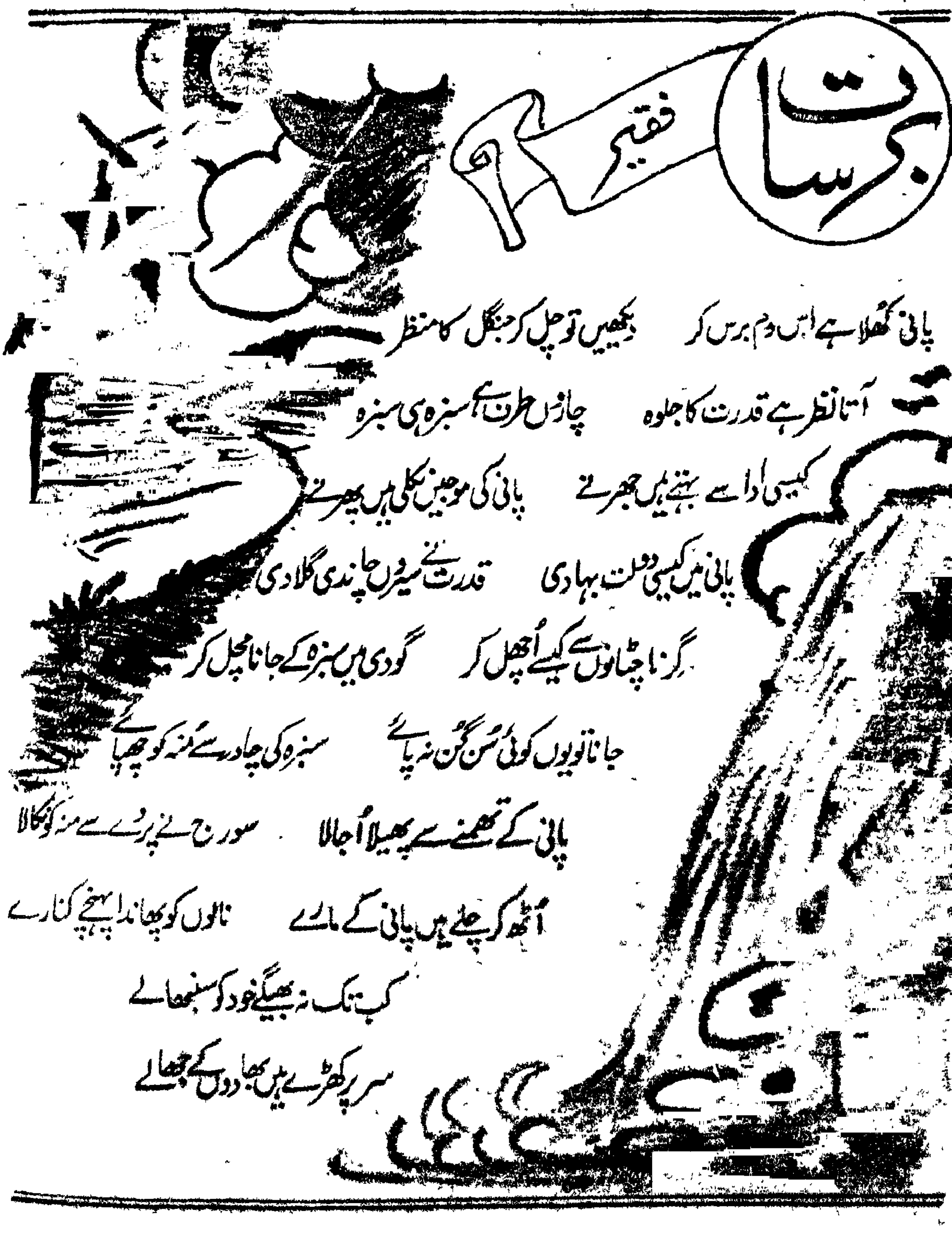
ہم اس پرچے میں کشمیر کے حسین مناظر کی کچھ تصویریں بھی شائع کر رہے ہیں۔ یہ تصویریں ہمارے ایک پیامی مستحسن حامد صاحب نے خاص طور پر ہمارے لئے کھینچی ہیں۔ آپ بھی اس جماعت کے ساتھ کشمیر کی سَیر کو گئے تھے۔

۱۵ر جولائی کو جامعہ کھل گئی۔ گویا جامعہ نگر میں پھر سے بہار آگئی۔ جامعہ کھلتے ہی داخلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور بچھڑے ہوئے رفیق ایک دوسرے کے گلے سے گلے ملے۔

اس مہینے جامعہ کے ایک ہر دلعزیز ساتھی جناب مجاہد حسین زیدی صاحب علیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جرمنی تشریف لے گئے ہیں۔ آپ ثانوی مدرسے میں تاریخ کے اُستاد ہیں۔ ہم اُن کی کامیابی کے لئے دُعا کرتے ہیں۔

لیکن جہاں ایک طرف ہم کو مجاہد صاحب کی کمی محسوس ہو رہی ہے، وہیں ہمیں محمد اکرام صاحب کے آنے کی خوشی بھی ہے۔ آپ ۵ سال پہلے جامعہ سے انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ آپ نے ایک سال انگلستان میں گزارا، پھر چار سال امریکہ میں رہے۔ ہم پیامِ تعلیم کے ادارے اور جامعہ کے سب ساتھیوں کی جانب سے اُن کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

سالنامے کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہو رہی ہیں۔ ارادہ ہے کہ اس بار بڑا اچھا سالنامہ شائع کیا جائے، جس کو دیکھ کر آپ پھڑک اُٹھیں۔ آپ کو یہ خوشی ہوگی کہ اس سالنامے کے لئے ہندستان کے اچھے اچھے لکھنے والوں کے مضامین بھی حاصل کر رہے ہیں۔



برسات

فقیر

پانی کھلا ہے اس دم برس کر　　　دیکھیں تو چل کر جنگل کا منظر

آتا نظر ہے قدرت کا جلوہ　　　چاروں طرف ہے سبزہ ہی سبزہ

کیسی ادا سے بہتے ہیں جھرنے　　　پانی کی موجیں نکلی ہیں بھرنے

پانی میں کیسی دولت بہادی　　　قدرت نے سیروں چاندی گلادی

گرنا چٹانوں سے کیسے اچھل کر　　　گودی میں سبزہ کے جانا مچل کر

جانا تو یوں کوئی سن گن نہ پائے　　　سبزہ کی چادر سے منہ کو چھپائے

پانی کے تھمنے سے پھیلا اجالا　　　سورج نے پردے سے منہ کو نکالا

اٹھ کر چلے ہیں پانی کے مارے　　　نالوں کو پھاندا پہنچے کنارے

کب تک نہ بھیگے خود کو سنبھالے

سر پر کھڑے ہیں بھادوں کے جھالے

محمد حفیظ الدین

گلستاں کی کہانیاں

ہمارے ملک کے پچھم میں ایک دیس ہے، ایران ـــ ہے تو چھوٹا سا، لیکن پرانے زمانے سے اس کا نام دور نزدیک مشہور ہے۔ اس ملک میں ایک شہر ہے شیراز، بہت خوبصورت۔ س شہر کی مٹی سے بڑے بڑے نامی پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک سعدیؒ بھی ہیں۔ اُن کا ورا نام شیخ مصلح الدین سعدی ہے، لیکن وہ عام طور پر شیخ سعدیؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ ن کی کتاب "گلستاں" فارسی کی پانچ بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اور باقی چار کتابیں یں، دیوانِ حافظؔ، مثنوی مولانا روم، شاہنامہ فردوسی، اور رباعیاتِ عمر خیامؔ ـــ گلستاں ا ترجمہ دُنیا کی بہت سی زبانوں میں ہوا ہے۔ سچ مچ اس میں نصیحت کے ایسے پھول کھلے یں کہ جو اُن پر کان دھرے گا، ان کو اپنے کانوں کا کرن پھول بنائے گا۔ اس کی زندگی ہمیشہ اچھائیوں کے پھولوں سے مہکتی رہے گی۔

شیخ سعدیؒ نے سو سے زیادہ عمر پائی۔ وہ ہر قسم کے آدمیوں سے ملے ہر قسم کی سوسائٹی ں گئے۔ یہ کتاب ان کی زندگی کے ایسے تجربات کا نچوڑ ہے۔

اب آپ اُن کی لکھی ہوئی چند کہانیاں خود پڑھیے۔ اس سے آپ ان کی قابلیت کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے۔

تمام انسان ایک جسم کی طرح ہیں:-

دمشق شہر کی مسجد کے احاطے میں حضرت یحیٰی کی قبر ہے۔ میں وہاں خدا کی یاد میں بیٹھا ہوا تھا۔ عرب کا ایک بادشاہ آیا، جو بے انصافی میں مشہور تھا، اس نے نماز پڑھی اور اپنی بات پوری ہونے کی دُعا مانگی۔ ترجمہ شعر

امیر غریب سب اس دروازے کی مٹی پر ناک رگڑتے ہیں۔

جو جتنے زیادہ مال دار ہیں وہ اتنے ہی محتاج ہیں۔

پھر میری طرف مُڑ کر کہا، درویشوں میں سچائی ہوتی ہے۔ اور اُن کی دعا میں اثر، مجھے ایک سخت دُشمن سے پالا پڑا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مجھ پر بھی آپ کی کچھ مہربانی ہو جائے۔

میں نے اس سے کہا: "کمزور رعیت پر مہربانی کر، تاکہ طاقت ور دشمن سے تو تکلیف نہ اُٹھائے۔ (شعر)

طاقت ور کے ہاتھ سے غریب کمزور کا پنجہ ٹوٹے، بڑی بے رحمی کی بات ہے۔ جو گرے پڑوں پر مہربانی نہیں کرتا اسے اس وقت سے ڈرنا چاہیے، کہ کبھی اس کا پاؤں پھسلے تو کوئی اسے سہارا نہ دے گا۔

جو بُرائی کا بیج بو کر اچھے پھل کی امید رکھتا ہے وہ پاگل ہے۔

اپنے کانوں سے روئی نکال، مخلوق کی بات سُن اور انصاف کر۔ اگر تو ایسا نہیں کرتا تو جان لے کہ ایک دن انصاف کا بھی آنے والا ہے۔

آدم کی اولاد جسم کے حصّوں کی طرح ہیں
کیونکہ وہ ایک ہی چیز سے بنے ہوئے ہیں۔
اگر جسم کے ایک حصّے میں درد ہوتا ہے تو
دوسرے حصّے بھی بے چین ہو جاتے ہیں
اگر تو دوسرے کی تکلیف سے بے پرواہ ہے
تو پھر تیرے لیے انسان کا نام زیب نہیں دیتا۔

ظالم کا سونا اچھا ہے:-

ایک ظالم بادشاہ نے کسی بزرگ سے

پوچھا کہ کون سی عبادت سب سے اچھی ہے؟ انھوں نے جواب دیا: تیرا دوپہر کے وقت سو جانا۔ کہ اتنی دیر کے لئے تو خدا کے بندے تیرے ظلم سے بچے رہیں گے۔

(شعر) ایک ظالم کو میں نے دوپہر میں سوتے دیکھا!
میں نے کہا، یہ فتنہ ہے اس کا سونا اچھا ہے

اور جس آدمی کا جاگنے سے سونا اچھا ہے
ایسی بُری زندگی والے کا مرجانا اچھا ہے

بادشاہ کی نوکری کا انجام:-

میرے پُرانے ساتھیوں میں سے ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ آجکل میرا حال بہت بُرا ہو رہا ہے۔ بال بچے بہت ہیں اور آمدنی کم۔ مجھ میں بھوکا رہنے کی ہمت نہیں۔ کئی بار میرے جی میں آیا کہ پردیس چلا جاؤں وہاں جیسے تیسے زندگی گزار دوں۔ وہاں کسی پر میرے اچھے، بُرے کا حال نہ کھلے گا۔ ایسی جگہ (شعر)

اگر بھوکا سو جائے تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
اگر مرجائے تو کوئی رونے والا نہیں

مگر میں ڈرتا ہوں کہ دشمن میرے پیچھے مجھ پر ہنسیں گے کہ میں نے اپنے گھر والوں سے آنکھیں پھیر لیں۔ (شعر)

ایسے بے شرم کی صورت نہ دیکھنی چاہیئے جو
اپنے آرام کی فکر نہ کرتا ہو اور بیوی بچوں کو
تکلیف اٹھانے کے لئے پیچھے چھوڑ جاتا ہو

دوست! تم جانتے ہو کہ مجھے حساب میں کچھ دخل ہے۔ اگر تمھاری سفارش سے کوئی سرکاری نوکری مل جائے تو مجھے بڑا اطمینان ہو جائے گا۔ اور تمھارا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔

میں نے کہا "بھائی صاحب بادشاہوں کے چلن میں دو باتیں ہیں امید اور ڈر، یعنی روٹی کی امید اور بوٹی کا ڈر۔ عقل مندوں کی رائے کے خلاف روٹی کے لئے بوٹی بوٹی ہو جانے کا خطرہ مول نہ لینا چاہیئے۔

غریب کے پاس کوئی زمین اور باغ کا ٹیکس مانگنے نہیں آتا۔ یا تو اپنی گدڑی میں مست رہو اور تکلیف اُٹھاؤ یا پھر فکر اور جھڑکیوں میں زندگی گزارنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

میرے اس دوست نے کہا یار تم نے

میری بات کا ٹھیک جواب نہیں دیا۔ یہ بات تو مجھ پر پوری نہیں اُترتی ۔ بھئی ڈرے تو وہ جو بے ایمانی کرتا ہے ۔ بھلا ہمیں کس بات کا خوف ہے۔ (شعر)

سچائی خدا کو بھی پسند ہے، اور ہم نے تو کبھی نہیں سنا
سیدھی سڑک پر چلنے والا کبھی اپنی راہ سے بھٹکا ہو۔

عقل مندوں نے کہا کہ ان چار آدمیوں ہوا ؟ میں سے یہ چار آدمی اپنی جان بچاتے پھرتے ہیں۔ پولس سے لٹیرے، چوکیدار سے چور، چغل خور سے چھپ کر کام کرنے والے، اور داروغہ سے بدمعاش۔ (شعر)

جس کا بہی کھاتہ صحیح ہے اسے جانچ پڑتال کرنے والے سے کیا ڈر، اگر تمہارا چال چلن درست ہے تو پھر کس کا خوف۔ دھوبی میلے کچیلے کپڑوں ہی کو پتھر پر پٹکتا ہے۔

میں نے ایک بار پھر یہ کہانی کہہ کر بات سمجھانی چاہی ۔ کہ تم نے اس لومڑی کا قصہ سُنا ہوگا جو گھبرائی ہوئی گرتی پڑتی بھاگی چلی جارہی تھی۔ کسی نے پوچھا "بی لومڑی تم اتنی پریشان کیوں ہو آخر کچھ بتاؤ بھی تو" لومڑی بولی "میں نے یہ سُنا ہے کہ شیروں کو پکڑا جارہا ہے"۔ پوچھنے والوں نے ہنستے ہوئے کہا "اری بیوقوف! تجھ میں اور شیر میں کیا بات ملتی جلتی ہے تجھے کوئی شیر کیسے سمجھ لے گا۔ جو تو ڈر کے مارے مری جاتی ہے"۔ کہنے لگی "چپ رہ، تو کیا جانے کہ اگر کوئی بُرا، ویسے ہی کہہ دے کہ یہ شیر ہے اور میں پکڑی جاؤں تو پھر کسے غرض پڑی ہے کہ سچی بات کی جانچ پڑتال کرے۔ اور اگر ایسا ہوا بھی تو فارسی مثل کے مطابق "تریاق (سانپ کاٹے کی دوا) کے عراق سے آنے تک جس کو سانپ نے کاٹا ہے وہ تو چل بسے گا"۔

میرے دوست! مانا کہ تو قابل، ایمان دار، اور سچا ہے مگر دشمن اور بُرا چاہنے والے تو اس فکر میں لگے رہتے ہیں نہ جانے بادشاہ سے کیا لگائی بجھائی کردیں پھر کس کا کلیجہ ہے کہ اُسے سچی بات سمجھائے۔ بس اسی میں خیریت ہے کہ اس کام میں تو ہاتھ نہ ڈال۔ صبر سے کونے میں پڑا رہ امیروں رئیسوں کی نوکری کا لالچ نہ کر۔ شعر

اگرچہ سمندر کے درمیان بہت سے فائدے ہیں

لیکن اگر تو سلامتی چاہتا ہے تو پھر کنارے ہی پر رہ۔

میرے ساتھی کو یہ باتیں بُری لگیں جل کر کہنے لگا "واہ، آپ بھی کیا سمجھ بوجھ کی باتیں کر رہے ہیں۔ داناؤں نے سچ کہا ہے کہ دوست جیل میں بھی مدد پہنچاتے ہیں اور کام آتے ہیں اور دشمن دسترخوان پر بھی دوستی جتاتا ہے۔

میں سمجھ گیا کہ اب زیادہ کہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی غرض اٹکی ہوئی ہے اس لئے میری بات سُن رہا ہے۔ اگر میری نصیحت اس کے دل میں نہیں اُتر رہی ہے۔ میں اسے دیوان صاحب کے پاس لے گیا۔ ان سے پہلے سے میری جان پہچان تھی۔ میں نے کہہ سُن کر اسے نوکر رکھوا دیا۔ اس نے کام اچھا کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں اپنی سمجھ بوجھ سے افسروں کے دلوں میں جگہ کر لی۔ بڑھتے بڑھتے بادشاہ کا مصاحب بن گیا۔ بادشاہ اس پر بھروسہ کرنے لگا، میں نے اس کو مبارک باد دی۔

سختیاں جھیلنے کے بعد آدمی کو سُکھ ملتا ہے
آبِ حیات اندھیرے سے لانا پڑتا ہے
زمانے کی کڑواہٹ سے گھبرانا نہ چاہیئے
اگرچہ صبر کڑوا ہوتا ہے مگر اس کا پھل میٹھا

اس کے بعد ایک عرصہ تک مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں ایک جماعت کے ساتھ مکے حج کرنے چلا گیا۔ جب لوٹا تو منزل سے کچھ پہلے میرا دوست میرے استقبال کے لئے آیا ہوا تھا۔ مگر عجب حال میں، کپڑے فقیروں کے سے اور منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا "کیا حال ہے" کہنے لگا "تمہاری بات بالکل دُرست نکلی۔ حسد کرنے والوں نے مجھ پر غبن کا الزام لگایا۔ بادشاہ نے کچے کانوں سے سُنا، ذرا بھی تحقیقات نہ کی۔ پُرانے دوستوں نے سچ بات نہ کہی اور خاموش ہو گئے۔

جب آدمی کے اچھے دن ہوتے ہیں اور اس کا رُتبہ بڑا ہوتا ہے تو سب ادب سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے جُھکتے ہیں، اگر اس پر بُرا وقت آتا ہے تو ہر ایک اس کے سر پر لات مارتا ہے۔

مختصر یہ کہ دشمنوں کی چالوں میں آ کر جیل کاٹنی پڑی۔ اب حاجیوں کے قافلے کے صحیح سلامت آنے کی خوشی میں، کچھ قیدیوں کے ساتھ مجھے بھی چھوڑ دیا گیا ہے اس وقت تمھاری بات سمجھ میں نہ آئی تھی اب سمجھ میں آ گئی۔

میں نے کہا "اگر بچھو کے کاٹنے کی تکلیف نہیں برداشت کر سکتے تو اس کے بِل میں اُنگلی نہ ڈالو"

مجیب احمد خاں

سورج گرہن

کئی دن کی شدید گرمی کے بعد آج سہ پہر کو خوب بارش ہوگئی۔ وہی ہوا جو دوپہر تک لُو تھی پانی برسنے کے بعد ٹھنڈی اور خوش گوار بن گئی تھی۔ بارش کے بعد فضا نکھر آئی تھی لوگ اپنی اپنی چارپائیاں صحن میں ڈالے تاروں بھرے خوبصورت آسمان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ محمود بھی اپنے والد کے پاس لیٹا ہوا تھا اور حسبِ عادت طرح طرح کے سوالات کر رہا تھا۔ یکایک اُس نے اپنے ابا سے کہا۔

محمود۔ ابا! پچھلے بدھ کو اسکول میں سورج گرہن کی چھٹی ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ شام کو سورج گرہن پڑنے پر ضرور دیکھوں گا۔ مگر اُس دن آسمان پر ایسے بادل چھائے کہ کچھ دکھائی بھی نہ دیا۔ اُس وقت یہ بھی سوچا تھا کہ سورج گرہن کے بارے میں آپ سے پوچھوں گا مگر پھر یاد ہی نہ رہا۔

ابا۔ خیر اُس وقت نہ سہی اب سہی۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے۔

محمود۔ اچھا پہلے تو یہی بتائیے کہ سورج پر گرہن پڑتا ہی کیوں ہے؟

ابا:۔ بھئی یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ چاند زمین کے چاروں طرف چکر لگاتا رہتا ہے۔

محمود:۔ جی ہاں یہ تو مجھے معلوم ہے۔

ابا:۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ زمین اور چاند دونوں اپنے اپنے راستوں پر چلتے ہوئے سورج کے چاروں طرف چکر لگاتے ہیں۔

محمود:۔ جی ہاں، یہ بھی معلوم ہے۔

ابا:۔ اچھا تو جب زمین اور چاند سورج کے چاروں طرف چکر لگاتے ہیں تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چاند، زمین اور سورج کے بیچ میں آکر سورج کو اپنی آڑ میں کر لیتا ہے۔ بس اُس وقت زمین کے بعض حصے کے رہنے والوں کو سورج کچھ حصہ یا پورا سورج نہیں دکھائی دیتا۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ سورج پر گرہن لگ رہا ہے۔ اگر چاند پورے سورج کو چھپا لیتا ہے تو پورا سورج گرہن پڑتا ہے اور اگر اس کے کسی حصے کو چھپاتا ہے تو معمولی سورج گرہن کہلاتا ہے۔

محمود:۔ ہاں۔ ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اس بار پورا سورج گرہن پڑا تھا۔ اس لئے یہ بہت اہم تھا۔ بھلا اس میں اہمیت کی کیا بات ہے؟

ابا:۔ بات یہ ہے بیٹا کہ یوں تو سال میں کم از کم دو مرتبہ معمولی سورج گرہن ضرور پڑتا ہے اور دنیا کے کسی نہ کسی جگہ سے ضرور دکھائی دیتا ہے۔ مگر پورا سورج گرہن برسوں بعد کبھی کبھار پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ زمین کے مقابلے میں چاند بہت چھوٹا ہے۔ اس لئے اس کا وہ سایہ بھی زمین پر پڑتا ہے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اس سایہ کا قطر کبھی بھی ۱۵۰ میل سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس لئے پورا سورج گرہن صرف تھوڑی ہی دیر کے لئے دکھائی دیتا ہے۔ پورے گرہن کے موقع پر چھ سات منٹ سے زیادہ پورا سورج چاند کی اوٹ میں نہیں رہ پاتا۔

محمود:۔ صرف اتنی ہی دیر کے لئے کیوں چھپتا ہے۔ زیادہ دیر کے لئے کیوں نہیں؟

ابا:۔ بات یہ ہے کہ چاند اور زمین دونوں ہی اپنے اپنے راستے پر چلتے رہتے ہیں اس لئے چاند کے ساتھ اس کا سایہ بھی جو گرہن کے وقت زمین پر پڑتا ہے چلتا رہتا ہے ـــــ تم نے بادل کے سایہ کو زمین پر چلتے ہوئے دیکھا ہی ہوگا بس بالکل اسی طرح چاند کا سایہ بھی چلتا ہے جب یہ سایہ ہٹ جاتا ہے تو سورج دکھائی دینے لگتا ہے۔ زمین اور چاند کی رفتار ہے ہی اتنی تیز کہ چاند چھ سات منٹ سے زیادہ سورج کو اپنی آڑ میں نہیں چھپا سکتا۔

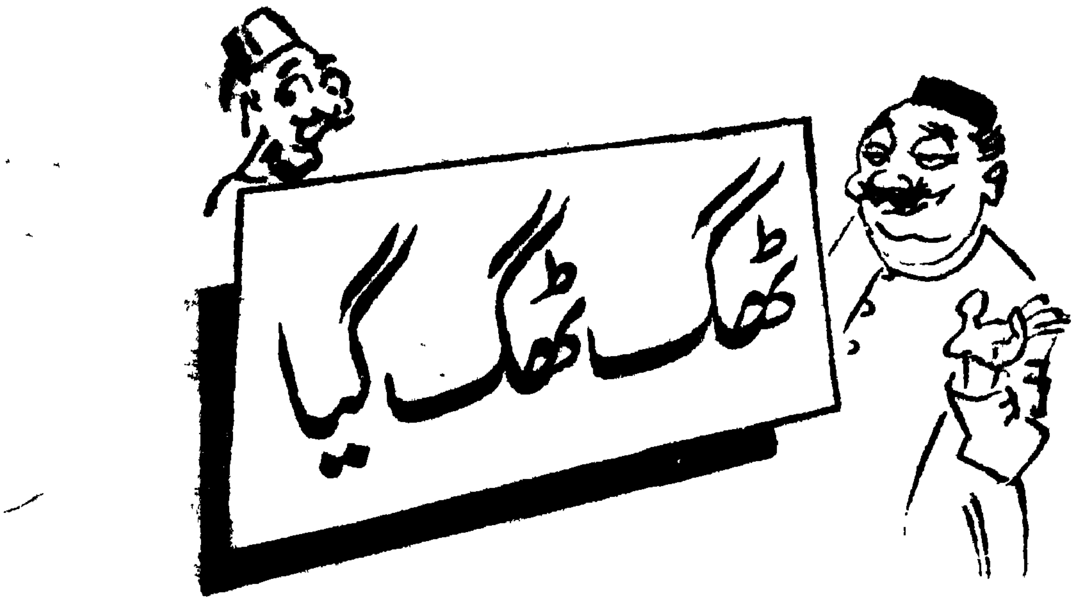
محمود:۔ اچھے ابا۔ یہ تو اب میری سمجھ میں آگیا کہ سورج گرہن کیوں اور کیسے پڑتا ہے۔ مگر وہ اہمیت والی بات رہی جاتی ہے کہ پورے سورج گرہن کو معمولی سورج گرہن کے مقابلے میں اہم کیوں سمجھا جاتا ہے۔ مجھے تو کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔

ابا:۔ بات تو تم نے بالکل ٹھیک پوچھی۔ در اصل ہم اور تم جیسے عام لوگوں کے لئے اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے مگر سائنسدانوں کے لئے یہ بڑی اہم بات ہے۔ خاص طور پر ایسے سائنسدانوں کے لئے جو سورج کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ سورج کے متعلق بہت سی معلومات تو حاصل کر لی گئی ہیں لیکن بہت سی باتیں ابھی تک معلوم نہیں ہو سکیں۔ اُس کی تیز روشنی، چمک اور گرمی اپنے بھیدوں کو سائنسدانوں پر ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ پورے سورج گرہن کے موقع پر اس کی چمک اور گرمی کو چاند روک لیتا ہے۔ اس لئے سائنسدان اپنے موقع کے منتظر رہتے ہیں۔ جب کبھی مکمل سورج گرہن پڑتا ہے تو دور دور کے ملکوں کے سائنسداں اس جگہ اکٹھا ہوتے ہیں جہاں پورا سورج گرہن دکھائی دینے والا ہوتا ہے۔ بڑی بڑی دوربینوں سے سورج کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور خاص قسم کے قیمتی کیمروں سے اُس کی تصویریں اتاری جاتی ہیں اور پھر اپنے مشاہدے اور ان تصویروں کی مدد سے سورج کے بھیدوں کو معلوم کرنے کی کوشش

کرتے ہیں۔ یہ سورج گرہن ہندوستان میں تقریباً ۵۶ برس کے بعد دکھائی دیا تھا۔ ہندوستان کے شہر جودھپور سے وسط امریکہ کے ایک شہر "نبراسکا" تک تقریباً آٹھ ہزار میل لمبی اور ۸۰ میل چوڑی پٹی پر واقع تمام جگہوں کے لوگوں کو پورا سورج گرہن دکھائی دیا ہوگا۔ اس پٹی کے بہت سی جگہوں پر سائنسداں اپنے ساز و سامان کے ساتھ اکٹھا ہوئے تھے ہندوستان کے ۱۴ سائنسداں جودھپور کے ایک گاؤں پھلودی گئے اور انھوں نے وہاں کے ہائی اسکول کی چھت پر اپنی دوربینیں اور کیمرے نصب کئے۔ پھلودی میں ۶ بج کر ۳۲ منٹ پر سورج گرہن پڑنا شروع ہوا تھا اور ۷ بج کر ۲۶ منٹ پر ایک منٹ ۸ سیکنڈ کے لئے پورا سورج گرہن میں آگیا تھا۔ پھلودی میں سورج غروب ہونے کا وقت ۷ بج کر ۲۵ منٹ تھا اس لئے جس وقت پورا سورج گرہن میں آیا تو وہ ڈوبنے کے بالکل قریب تھا۔ اس لئے ہمارے سائنسداں اس کی اچھی اور خاطر خواہ تصویریں نہ اُتار سکے۔ اس بات کا ہمارے سائنسدانوں کو بہت افسوس ہے۔

محمود:۔ یہ تو بہت بُرا ہوا اتنی برسوں کے بعد تو بیچاروں کو ایک موقع ملا لیکن اس موقع سے پورا پورا فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکا۔

ابا:۔ ہاں ہے تو یہی بات لیکن سائنسداں اپنی دُھن کے پکے ہوتے ہیں وہ ایسی باتوں سے ہمت نہیں ہارتے۔ اُنھوں نے اِس موقع سے جتنا بھی فائدہ ممکن تھا اُٹھایا۔ سورج کا مشاہدہ کیا اور کچھ تصویریں بھی لیں۔ اور اب ابھی سے دوسرے مکمل سورج گرہن کا انتظار کرنا اور اُس کے لئے اور زیادہ مکمل تیاریاں شروع کردی ہیں۔



آؤ بچو! تمھیں ایک کہانی سنائیں یہ کہانی ایک ٹھگ کی ہے۔ ابھی تک تو تم نے ٹھگ کو دوسرے ہی کو ٹھگتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ لیکن بچارا ایک ٹھگ دوسرے ٹھگ سے ٹھگ گیا۔ ہاں تو سنو اس ٹھگ کی کہانی۔

ابھی کچھ ہی برسوں کی بات ہے کہ ایک ٹھگ دہلی شہر میں رہتا تھا اور وہ نئی نئی ترکیبوں سے دوسروں کو ٹھگا کرتا تھا۔ لیکن کچھ دنوں سے اس کا کام بند تھا۔ کیوں کہ اس کے دماغ میں کوئی نئی ترکیب نہ آئی تھی۔ آخر ایک دن بہت سوچنے کے بعد اس کے دماغ میں ایک نئی ترکیب دوسروں کو ٹھگنے کی آئی۔ اور جس کو سوچ کر وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ دوسرے دن اس نے چاروں طرف اعلان کرایا کہ کوئی بھی کیسی ہی خبر مجھے سنا دے، اگر وہ مجھے معلوم نہ ہوگی۔ تو میں اُس خبر سنانے والے کو ایک لاکھ روپیہ انعام دوں گا۔ لیکن خبر سنانے سے پیشتر خبر سنانے والے کو ایک سو روپے بطور فیس جمع کرکے ہی خبر سنانا چاہیے۔ اس اعلان کو سن کر بہت سے لوگوں نے اسے معلوم نہ ہونے والی خبریں سنانے کی کوشش کی اور وہ اپنے

سو سو روپے ہار گئے۔ کیوں کہ ہر ایک خبر کو سُن کر وہ کہہ دیتا کہ "ہاں یہ خبر تو میں بھی جانتا ہوں" اس طرح وہ ہر آدمی سے ایک سو روپے ٹھگ لیتا تھا۔

تھوڑے ہی دنوں میں یہ خبر ایک دوسرے ٹھگ کو معلوم ہوئی اور اس کے ساتھیوں کو بھی معلوم ہوئی جو کہ کان پور میں رہتا تھا۔ یہ ٹھگ بھی اپنے قرب وجوار میں کافی مشہور تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اس ٹھگ کو غیرت دلائی کہ اگر تم نے اس دہلی والے ٹھگ کو اپنے پیشے میں نہ ہرایا تو تم نے کچھ نہ کیا۔ اس کا اثر کان پوری ٹھگ پر کافی ہوا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اطمینان دلایا کہ وہ ضرور ضرور دہلی والے ٹھگ کو اپنے پیشہ میں نیچا دکھائے گا اور وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر دہلی پہنچ گیا اور ایک شان دار ہوٹل میں قیام کیا۔ دوسرے دن اس نے دہلی والے ٹھگ کو اپنا آدمی بھیج کر اپنے آنے کی خبر دی کہ میں تمھیں نئی خبر سنانے آیا ہوں۔ پہلے ٹھگ نے دوسرے ٹھگ کے آئے ہوئے آدمی سے کہلا بھیجا کہ کل اپنے مالک کو ہمارے یہاں خبر سنانے کی تیاری سے آنے کو کہہ دو ہم تیار رہیں گے۔

دوسرے دن دہلی والے ٹھگ نے ایک بڑے میدان میں شہر کے کچھ بڑے آدمیوں کو جمع کیا۔ اس کے علاوہ تماشہ دیکھنے والوں کی بھی بھیڑ لگی تھی۔ مقررہ وقت پر کانپوری ٹھگ نئی موٹر کار میں اپنے ساتھیوں سمیت اپنے ٹھگ کی بتائی ہوئی جگہ پر آدھمکا۔ پہلے ٹھگ نے دوسرے ٹھگ کا پُرجوش استقبال کیا۔ اور ان کو اپنی اپنی جگہوں پر بٹھایا۔ دوسرے ٹھگ نے سب لوگوں کے سامنے سو روپے پہلے ٹھگ کو دیئے۔ اور پہلے ٹھگ نے ایک لاکھ روپے گن کر ایک صندوق میں رکھے اور اُسے دوسرے لوگوں کے پاس رکھ دیا جب یہ سب ہو گیا تو دوسرے ٹھگ نے پہلے والے ٹھگ سے نئی خبر سنانے کی اجازت مانگی۔ پہلے ٹھگ نے دوسرے ٹھگ سے کہا کہ اب شوق سے سنائیے۔

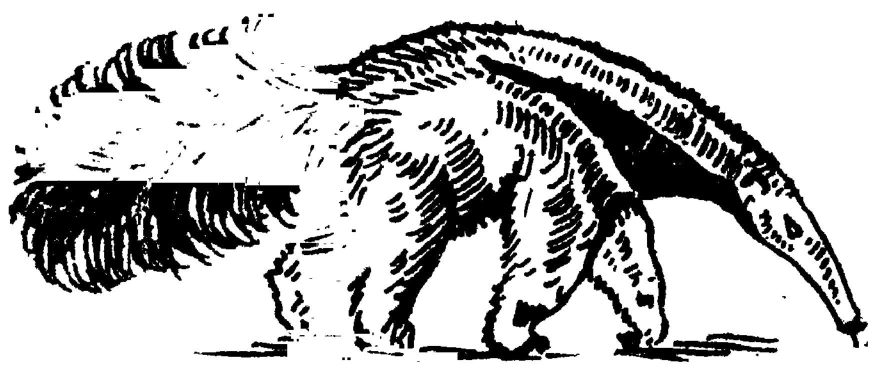
اب دوسرے ٹھگ نے خبر سُنانی شروع کی "جناب آپ کے اور میرے والدین آپس میں کتنی دوستی تھی وہ دونوں لنگوٹیا یار تھے" پہلا ٹھگ بولا "جی ہاں جناب یہ بات

مجھے بھی معلوم ہے" دوسرا ٹھگ "بہت دن ہوئے جب دونوں مقدس مقامات کی زیارت کو گئے، اور ان کے ساتھ آپ بھی گئے تھے"۔
پہلا ٹھگ "جی ہاں یہ بات مجھے معلوم ہے"۔
دوسرا ٹھگ بولا "اس وقت میرے والد کے پاس دو لاکھ روپے تھے لیکن ہیضہ سے بچاروں کی موت ہوگئی اور مرتے وقت انہوں نے وہ روپے آپ کے والد کو دیئے تھے۔ غالباً یہ بات تو آپ جانتے ہی ہوں گے"۔
پہلا ٹھگ "ہاں مجھے معلوم ہے" دوسرا ٹھگ پھر بولا "لیکن افسوس ظالم موت نے آپ کے والد کو بھی نہ چھوڑا اور لوٹتے وقت وہ بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے، اور مرتے وقت انھوں نے وہ رقم مجھے دینے کے لئے آپ کو سونپ دی تھی"۔ پہلا ٹھگ گھبرا کر بولا "جناب آپ غلطی کر رہے ہیں"۔ کیوں کہ اس کو تو نئی خبر سننے کے بعد یہ کہنے کی عادت تھی کہ ہاں یہ بات مجھے بھی معلوم ہے تو اسے دو لاکھ روپے دینا پڑتے اگر وہ یہ کہتا کہ مجھے یہ خبر نہیں معلوم تو ایک لاکھ دینے پڑتے۔ اسی بیچ میں دوسرا ٹھگ بولا "جناب جھوٹ موٹ دھاندلی مت کیجئے۔ اگر آپ کو یہ بات معلوم ہے تو وہ دو لاکھ روپے مجھے عنایت کیجئے۔ اگر آپ کو یہ بات نہیں معلوم ہے تو یہ نئی بات ہے اور اسے مان کر آپ مجھے ایک لاکھ روپے دیں۔ پہلا ٹھگ بہت سٹ پٹایا۔ جس بات کا اس کو ڈر تھا وہی ہوئی اس لئے لیکن.....
لیکن کہتا ہوا ان لوگوں کے قبضے سے اپنا صندوق اٹھا کر بھاگ جانے کی کوشش کی۔ جن لوگوں کے پاس صندوق رکھا ہوا تھا۔ مگر دوسرے ٹھگ کے ساتھی بھلا کب چوکنے والے تھے۔ انھوں نے پہلے ٹھگ سے صندوق چھین لیا۔ اور موٹر میں جا بیٹھے۔ دوسرا ٹھگ موٹر میں بیٹھ کر بولا "جناب معاف کیجئے گا آپ کو میری یہ خبر معلوم نہ تھی اس لئے آپ کے اعلان کے مطابق ایک لاکھ روپے مجھے مل گئے۔ پر ہاں اگر آپ کو یہ خبر معلوم ہے تو میرے بقیہ روپے آپ اپنے نوکر سے بھیجنے کی مہربانی کریں۔ مجھے آپ پر پورا یقین ہے"۔ پوں... پوں...... بھر بھر...... بھر دھول اڑاتی ہوئی موٹر گاڑی چل دی۔ پہلے ٹھگ نے ایک حسرت ناک نگاہ تماشائیوں پر ڈالی شاید

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر دیکھئے)

ریحان احمد

چیونٹی خور



انسانوں کی طرح جانوروں کے بھی دانت ہوتے ہیں۔ جو جانور گھاس پات کھاتے ہیں ان کے دانت چپٹے ہوتے ہیں اور جو گوشت کھاتے ہیں ان کے نکیلے۔ چند جانور ایسے بھی ہیں جو ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں کھاتے اس لئے ایسے جانوروں کے دانت بھی نہیں ہوتے۔ بغیر دانتوں والے جانوروں میں سے ایک جانور چیونٹی خور ہے۔ چیونٹی خور ایسے علاقوں میں پایا جاتا ہے جہاں گرمی اور بارش بہت زیادہ ہوتی ہے۔

چیونٹی خور اپنی لمبی بالوں والی دُم اور اپنی لمبی پتلی گردن کی وجہ سے ایک نرالا جانور ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا رنگ بھورا ہوتا ہے سینہ پر ایک لمبی کالی دھاری ہوتی ہے۔ پنجے اور اگلے پیر سفیدی مائل ہوتے ہیں پیر چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس کے اگلے پیر کے پنجے پیچھے کی طرف مُڑے ہوتے ہیں۔ جن میں بڑے بڑے ناخن ہوتے ہیں۔ پنجے پیچھے کی طرف مُڑے ہونے کی وجہ سے اسے تیز چلنے میں مشکل پیش آتی ہے آپ خود ہی سوچیے، اگر آپ پیچھے کی طرف چلیں تو کتنی دقت ہوگی آپ بھی تیز نہیں چل سکیں گے۔

یہی حال اس کا بھی ہوتا ہے۔

چیونٹی خور کا مُنہ نلکی کی طرح لمبا ہوتا ہے۔ اس کی زبان بھی قابلِ بیان ہے۔ زبان بہت لمبی اور لیسدار ہوتی ہے۔ کھاتے وقت اگر آپ اس کو دیکھیں تو یہی سمجھیں کہ لال رنگ کا ایک پتلا سا سنپولیا (سانپ کا بچّہ) اس کے مُنہ کے نیچے بڑی تیزی سے حرکت کر رہا ہے۔

اس کے نام ہی سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ یہ کھانا کیا ہے۔ یہ چیونٹیاں اور دیمک کھاتا ہے۔ چیونٹی خور کوئی چھوٹا موٹا جانور تو ہے نہیں۔ بڑے قسم کا چیونٹی خور اپنی دُم کے ساتھ تقریباً سات فیٹ تک لمبا ہوتا ہے۔ جس میں سے تین فیٹ سے زیادہ تو صرف اس کی دُم ہی ہوتی ہے۔ اس کے جسم پر ریچھ کی طرح لمبے لمبے بال ہوتے ہیں اور دُم تو بالکل بالوں کا گچھا ہوتی ہے۔

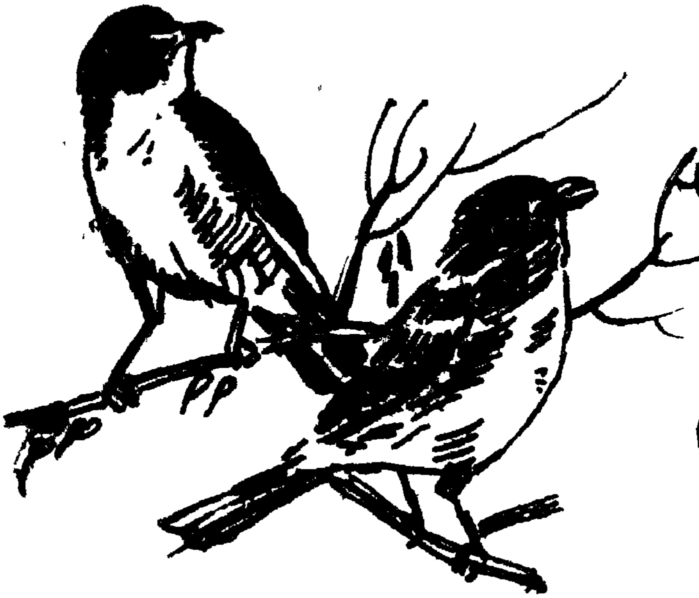
اب سوچنے کی بات ہے کہ اتنے بڑے جانور کے لئے جو صرف چیونٹیاں ہی کھاتا ہو ایک وقت کے کھانے کے لئے کتنی چیونٹیوں کی ضرورت پڑتی ہوگی اس کا حساب لگانا مشکل ہے لیکن پھر بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک وقت کے کھانے کے لئے ڈیڑھ لاکھ سے بھی زیادہ چیونٹیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ زمین پر پھرتی ہوئی چیونٹیاں یا دیمک کسی بھی حالت میں اس کا پیٹ نہیں بھر سکتیں۔ یہ چیونٹیوں کی رہنے کی جگہ کی تلاش میں رہتا ہے دیمک وغیرہ کے رہنے کی جگہ کو بامی کہتے ہیں۔ بامی مٹی کا اُونچا ٹیلا سا ہوتی ہے۔

چیونٹی خور اپنے پنجوں سے بامی کو کھودتا ہے اور جب اس میں سے دیمک نکلنے لگتی ہے تو اپنی لمبی اور پتلی گردن سوراخ کے اندر ڈال کر اُوپر کی طرف سانس کھینچتا ہے اس طرح بہت سی چیونٹیاں ایک دم سے اس کے مُنہ میں آجاتی ہیں۔ لمبی اور لیسدار زبان ہونے کی وجہ سے کھانے میں بہت مدد ملتی ہے۔ چیونٹیاں اس میں چپک جاتی ہیں اس طرح وہ آسانی سے اپنا پیٹ بھر لیتا ہے۔

چیونٹی خور دن میں دشمنوں کے ڈر سے باہر نہیں نکلتا۔ کھانے کی تلاش میں بھی دن کے بجائے رات ہی کو نکلتا ہے۔ چیونٹی خور لڑاکو

(بقیہ صفحہ ۴۷ پر ملاحظہ ہو)

نظام الدین



شہ زوری کا انجام

کسی جنگل میں ایک جوڑا چڑیا اور چڑے کا رہتا تھا، نہایت آرام و اطمینان کے ساتھ سب سے الگ تھلگ دن بھر اِدھر اُدھر دانہ چگتے شام کو اپنے گھونسلے میں جاکر سو رہتے، روزانہ کا یہی معمول تھا۔

اتفاق سے اسی جنگل میں ایک جوڑا ہاتھی بھی کہیں سے آگیا تھا، وہ بھی اِدھر اُدھر گھوما کرتا، درختوں کی شاخوں کو توڑ کر کھاتا اور چھوٹے چھوٹے درختوں کو تو جڑ ہی سے اکھاڑ کے کھا جاتا اس کی وجہ سے اکثر کمزور جانور سخت پریشان رہتے کیوں کہ چھوٹے جانوروں کے گھونسلے محفوظ نہیں رہ گئے تھے۔ بسا اوقات ان کے گھونسلے بھی ہاتھیوں کے شہ زوری کے نذر ہو جاتے اور انھیں محسوس تک نہ ہوتا۔

اس ستم کا اثر غریب چڑوں پر بھی پڑا کیوں کہ جس درخت میں ان کا گھونسلہ تھا اس درخت کے نیچے بھی وہ ہاتھی آنے لگا اور اس نے شاخوں کو توڑنا اور ہلانا شروع کر دیا۔ اب اس کالی بلا سے کون کہتا کہ جس کو تم کھیل سمجھتے ہو اس سے کتنی زندگیاں زیر و زبر

ہوتی ہیں، مجبوراً سب کچھ سہنا پڑتا تھا اور اپنے وطنِ عزیز کی خاطر ہر دُشواریاں برداشت کرنی پڑتی تھی۔ عجیب مصیبت میں جان تھی۔ لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، دُکھ جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو وہی علاج بھی ثابت ہوتا ہے۔ آخر کوئی کہاں تک برداشت کرتا۔

ہوا یہ کہ جس زمانہ میں چڑیوں نے انڈہ دے کر اپنے گھونسلے میں سینا شروع کیا تھا اور طرح طرح کی اُمیدیں اپنے جی میں لیے ہوئے تھیں کہ جب بچّے نکل آئے گا تو یہ کریں گے وہ کریں گے اسی دُھن میں رات دن ایک کیئے ہوئے تھیں، ہاتھی نے آکر تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا یعنی جس شاخ پر آشیانہ تھا اسی شاخ کو پکڑ کر اتنی زور سے ہلایا کہ انڈہ نیچے آ رہا اور ٹوٹ پھوٹ گیا۔ چڑی تو خیر اُڑ گئی لیکن اس کی دُنیا تباہ ہوگئی۔ آخر کار مجبور ہو کر اس نے ہاتھی سے کہا کہ یہ کہاں کی شرافت اور مردانگی ہے کہ میرے شوہر کی عدم موجودگی میں میرے انڈوں کو تباہ و برباد کر دیا، وہ ہوتے تب تم ایسا ایسا کرتے تو پتہ چلتا، جس دن اس سے سابقہ پڑے گا اُسی دن آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا، ہاتھی نے یہ جلی کٹی سُنی تو پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اور نہایت غصّہ میں آکر کہا کہ اچھا اگر یہی بات ہے تو کل اپنے مرد کو روک لینا میں وقت پر آؤں گا۔ یہ کہہ کر چلا گیا۔ شام کو جب چڑا آیا تو چڑیا نے اس سے سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ چڑے نے بھی بہت افسوس کیا اور پھر مقابلے کی ٹھان لی کہ اس روز روز کی دانتا کِل کِل سے نجات مل جائے۔

دوسرے دن ہاتھی چنگھاڑتا ہوا آیا اور کہا کہ بُلاؤ کہاں ہے تیرا مرد، آج تیری جڑ بنیاد نہ ختم کر دوں تو کہنا، چڑا بھی تیار بیٹھا تھا اُڑ کر آیا اور مُقابلہ شروع ہو گیا۔ ہاتھی بار بار سونڈ اُٹھا کر پکڑنا چاہتا کہ کسی طرح زد میں آ جائے تو مسل دوں اور چڑا نہایت چالاکی سے طرح دے کر ہر مرتبہ اس کی آنکھ پر چونچ مار دیتا۔ ہاتھی جھلّا اُٹھا کہ یہ حقیر سی چڑیا مجھ سے مقابلہ کر رہی ہے۔ اور کسی طرح قابو میں نہیں آ رہی ہے۔

لیکن کیا کرتا بے بس تھا جب پکڑنا چاہے چڑا اُڑ کر چکر لگا دے۔ چڑا بھی موقع کی تاک میں تھا ایک مرتبہ ہاتھی نے سونڈ اٹھا کر چاہا کہ پکڑ لے، چڑے نے دیکھا کہ موقع اچھا ہے ایک دَم نشانہ باندھ کے اس کی سونڈ کے اندر گھس گیا اور دماغ کے پاس پہونچ کر اپنے پنجوں سے کھرونچے لگانا اور چونچ سے ٹھونگ لگانا شروع کر دیا۔ اب ہاتھی لاچار تھا، کوئی بات نہ سمجھ میں آتی تھی کہ اب کیا کرے۔ مجبور ہوکے دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ اور بالکل بے دَم ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب مَرا تب مَرا، ہتھنی نے جب یہ سُنا بے تحاشا بھاگی ہوئی آئی، دیکھا کہ اس کا شوہر جاں بلب ہے تو چڑیا سے لگی خوشامد کرنے کہ بہن میرا سُہاگ اُجڑ جائے گا میری عزّت رکھ لو اب کبھی کوئی بات تمھارے خلاف نہ ہوگی میں معافی چاہتی ہوں۔ چڑیا کا دل پسیج گیا۔ گئی اور اپنے شوہر سے کہا کہ اب چھوڑ دو یہ اپنی کرتوت کو پہونچ گیا، اب دوبارہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ چڑا سونڈ سے نکل آیا ایک شان فتح مندی لیے ہوئے، اور ہاتھی بھی اُٹھا لیکن شرم کے مارے آنکھیں جھکی ہوئی، اس کے بعد سے ہاتھی نے تہیہ کر لیا کہ اب کسی کو نہیں ستائے گا اور کسی کو کمزور و حقیر نہیں جانے گا، اور جب تک زندہ رہا اس کو نباہا اور سارے جانور جنگل میں امن و چین سے رہنے لگے۔

"ٹھگ ٹھگ گیا" کا بقیہ

کوئی اس کی مدد کرے مگر کسی نے نہ کی۔ کیوں کہ آج اُسے دوسروں کے ٹھگنے کا انعام مل گیا تھا۔ دھیرے دھیرے موٹر آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ پہلا ٹھگ ہائے کرکے زمین پر گر گیا۔

بچارا ٹھگ ٹھگ گیا۔ ہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔ دوسروں کو بے وقوف بنانے والے خود بے وقوف بن جاتے ہیں۔

از خالد صدیقی ہمیرپور

محمود پرویز کاکوی



برسات

جغرافیائی حیثیت سے ایک سال میں چار موسم ہوتے ہیں۔ موسم گرما، موسم بہار، موسم سرما اور موسم خزاں! ـــــ مگر ہمارے دیس میں عموماً تین ہی موسم گنے جاتے ہیں۔ یعنی جاڑا، گرمی اور برسات! ـــــ اور ہر موسم چار چار مہینے کا ہوتا ہے۔ جاڑے کا موسم نومبر سے فروری تک! گرمی کا موسم مارچ سے جون تک! اور برسات کا موسم جولائی سے اکتوبر تک!

آج کل برسات کا موسم ہے۔ گرمی کے موسم میں سورج کی گرم گرم شعاعوں سے بحر ہند اور بحر بنگال کا پانی کھول جاتا ہے۔ اور اس میں بھاپ پیدا ہوتی ہے۔ آخر جون سے بھارت کی طرف ایک موسمی ہوا چلتی ہے، جسے "دکھنی پچھمی ہوا" کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ دکھن اور پچھم کی طرف سے آتی ہے ـــــ جب یہ ہوا بحر ہند سے گذرتی ہے تو اپنے ساتھ ان بھاپوں کو لے لیتی ہے جو سورج کی گرمی سے ان میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور آگے جا کر مغربی ساحلی میدانوں سے ٹکراتی ہے اور اوپر کو اٹھنے لگتی ہے۔ چونکہ یہ پہاڑ زیادہ اونچے نہیں ہیں اس لئے ان چوٹیوں پر ٹھنڈک زیادہ نہیں ہوتی۔ ٹھنڈک

نہ ہونے کی وجہ سے بھاپ منجمد کم ہوتی ہے۔ اس لئے ان علاقوں میں بارش اچھی طرح نہیں ہو پاتی ــــ تب یہ ہوا آگے بڑھتی ہے اور جب بحرالکاہل میں پہنچتی ہے تو یہاں بھی بھاپ کو ساتھ لے لیتی ہے اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ آگے جاکر ہمالیہ پہاڑ سے ملتا ہے۔ اسی رکاوٹ کی وجہ سے وہ ہمالیہ کی چوٹیوں کی طرف اُٹھنے لگتی ہے۔ چونکہ ہمالیہ کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں، اس لئے وہاں کافی ٹھنڈک ہونے کی وجہ سے بھاپ منجمد ہوجاتی ہے۔ اب وزنی ہونے کی وجہ سے ہوا اپنے کاندھوں پر اسے نہیں سنبھال سکتی۔ لہٰذا یہ زمین پر برس پڑتی ہے ــــ اسی کو ہم بارش کہتے ہیں۔

یہ موسمی ہوا ہمالیہ کے دامن کے سہارے پنجاب اور راجپوتانہ تک چلتی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ بارش آسام میں ہوتی ہے اس کے بعد یہ ہوا جیسے جیسے پچھم کی طرف بڑھتی ہے۔ ویسے ویسے بارش کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے۔ آپ اسی بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جہاں چیراپونجی (آسام) میں ۴۶۵ انچ بارش ہوتی ہے وہاں پوربی پنجاب اور راجپوتانہ میں تقریباً ۸/۳ انچ بارش ہوتی ہے، اس موسمی ہوا سے نوّے فی صدی بارش بنگال، بہار، آسام اور بمبئی میں ہوتی ہے ــــ

اب آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ برسات "پچھمی دکھنی موسمی ہوا" کا نتیجہ ہے ــــ آیئے! اب میں اس کی اہمیت اور دوسری باتوں پر روشنی ڈالوں گا۔

ممکن ہے آپ اسے مذاق سمجھیں کہ اس وقت پانی کے جو ننھے ننھے قطرے اوپر سے گرتے ہیں، وہ حقیقی معنوں میں قطرے ہی نہیں ہیں بلکہ موتی ہیں گراں بہا موتی! ہماری سرزمین کے لئے! ہمارے ملک کے لئے! اور ہماری ملکی ترقی کے لئے! ــــ کیوں؟ اس لئے کہ ہمارا دیس کھیتی باڑی کا دیس ہے۔ یہاں کے تقریباً ۸۰ فی صدی لوگوں کا ذریعۂ معاش کاشتکاری ہے اور کاشتکاری ہی ہماری روح ہے۔ مگر کاشتکاری کے لئے تو کافی پانی چاہئے۔ اور ہمارے دیس میں آب پاشی کے ذرائع ابھی محدود ہیں۔ لہٰذا ہمیں قدرتی بارش

پر ہی بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس بارش کے قطروں سے ہماری معاشی حالت پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔ اور ہمارے دیش کا دامن ہرے بھرے پودوں سے بھر جاتا ہے۔

آپ ان قطروں کی اہمیت کو اس طرح سمجھئے کہ جس سال بارش نہیں ہوتی ہے، اس سال غلّہ بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ اور غلّے کی کمی کی وجہ سے قحط پڑ جانے کا امکان رہتا ہے۔ اور جب قحط پڑتا ہے تو، ہماری گورمنٹ کو کافی پریشانی اُٹھانی پڑتی ہے۔ قحط کو دور کرنے کے لئے اس کو کافی روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ مالگذاری کو معاف کر دینے کی وجہ سے آمدنی میں بھی کمی ہو جاتی ہے۔ اس سے اس کی مالی حالت کو نقصان پہنچتا ہے۔ تجارت پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ غلّہ سونے کے مول بکنے لگتا ہے۔ ہندوستان کی غریب جنتا میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ مہنگا غلّہ خرید سکے۔ لہٰذا وہ بھوکوں مرنے لگتی ہے۔ اسی طرح کتنی جانیں موت کا شکار ہونے لگتی ہیں۔ ایک پریشانی کا دور آجاتا ہے۔ لوٹ مار مچ جاتی ہے۔ خام مال کی کمی سے کارخانوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ قحط کی وجہ سے لوگوں میں خریدنے کی قوت کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے کارخانوں کا تیار کیا ہوا مال کھپتا نہیں۔ اور ان کی حالت روز بروز خراب ہونے لگتی ہے۔ رسل و رسائل اور آمد و رفت میں کمی آجانے سے ریلوے بھی گھاٹے میں رہتی ہے — غرض یہ کہ بارش نہ ہونے سے کیا کیا آفتیں آتی ہیں — اب آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ہمارے دیس میں بارش کی کتنی اہمیت ہے — اب اگر ان قطروں کو موتی کہا جائے تو کوئی بے جا بات نہ ہوگی۔

بھارت میں یہ موسم بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے آپ اوپر لکھی ہوئی باتوں سے اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ اور یہ موسم ہے بھی پسند کے لائق! فطرت جتنی حسین اس موسم میں نظر آتی ہے، اتنی کسی اور موسم میں نہیں! —

سر سبز زمین پر ہرے بھرے لہلہاتے پودے! چمن میں رنگ برنگ کے پھول اور ان کی خوبصورتی! ان کی بھینی بھینی خوشبو! —

نازک کلیوں کا وہ رہ رہ کے چٹکنا! اور پھر ہنستے ہوئے پھول کا نکل آنا!۔ درختوں کی پتلی پتلی ڈالیوں پر ننھی منّی چڑیوں کی چہکار! نغمہ سرائی..... یعنی ایک حمد! خالق کائنات کی! ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کا چلنا اور اپنے ساتھ پھولوں کی نکہت کو چُرا کر لانا ——— صاف شفاف نیلگوں آسمان پر مسکراتے ہوئے تارے اور چمکتا ہوا چاند! ——— اور پانی کی سطح پر ان کی دلکش روشنی! ——— اور ناگاناً بدلیوں کی آمد، مہیب منظر، گھٹاٹوپ اندھیرا اور بوندا باندی! پھر زوروں کی بارش! ——— یہ سب کیا ہیں؟ خداوند تعالیٰ کی قدرت کا شاہکار! ایک سبق! ایک اشارہ! اپنے بندوں کے لئے! تاکہ بندہ اس کی عظمت کو پہچانے اور اس جلیل القدر ہستی کے سامنے خود کو جھکا دے!۔

"نپولین" کا بقیہ

نپولین کی بڑھتی ہوئی طاقت پورے یورپ کے لئے خطرناک تھی۔ اسی لئے چھوٹی بڑی سب حکومتیں نپولین کے خلاف مل گئیں۔ پندرہ سال حکومت کرنے کے بعد نپولین نے ایک انگریزی حکومت سے شکست کھائی۔ اور گرفتار ہوا۔ اس کی گرفتاری کے بعد بادشاہ لوئی کا بھائی بادشاہ بنایا گیا۔

گرفتاری کو ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ وہ جیل سے بھاگ کھڑا ہوا ——— پیرس پہنچا ——— عوام اور فوج پھر اس کے ساتھ تھے۔ بادشاہ وہاں سے بھاگ گیا۔ اور نپولین پھر فرانس کا بادشاہ تھا ——— لیکن اب اس کی فوج میں وہ قوت نہ تھی۔ اور مقابلہ میں پورا یورپ ——— آخر ایک دن وہ شکست کھا گیا۔ اور سینٹ ہلینا میں قید کر دیا گیا۔ جہاں اپنی زندگی کا باقی حصہ گزار کر دُنیا کا یہ بڑا سپہ سالار اور فاتح دُنیا سے چلا گیا۔ انیس سال بعد اس کی لاش پیرس لائی گئی۔ اور اسے بڑی شان سے دفن کیا گیا۔

خوف

سلیمان اطہر



آج شام کے کھانے پر ابّا میاں نے امّی سے کہا: "دیکھو بھئی کل پروفیسر جوزف امریکہ سے آرہے ہیں اور میں نے انھیں کل شام کو اپنے یہاں کھانے کی دعوت دی ہے۔ دیکھنا انتظام اچھا ہو اور پکوان بھی مزیدار ہو کیونکہ جوزف ہیں تو ہندوستانی مگر دُنیا دیکھ آئے ہیں۔"

"ہاں ہاں آپ بے فکر رہیں ہرگز کوئی ایسی ویسی بات نہ ہوگی۔ اور کھانا بھی اتنا لذیذ ہوگا کہ پروفیسر صاحب بھی "واہ وا" کہہ دیں گے۔" امّی نے جواب دیا۔

"کون پروفیسر جوزف ابّا؟" میں نے ابّا سے سوال کیا۔

"بھئی تم کیا جانو انھیں کیونکہ یہ آج سے کوئی ۸، ۹ سال پہلے امریکہ گئے تھے اور اس وقت تم تھے چھوٹے سے۔ البتہ وہ تمھیں جانتے ہوں گے۔" ابّا میاں نے مجھے سمجھایا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

دوسرے روز صبح سویرے سے ہی امّی نے دعوت کا انتظام شروع کردیا اور شام

کے ۵، ۶ بجے تک پورا انتظام ہوگیا۔ اور مہانوں کی موٹریں ہمارے مکان کے احاطے میں آنی شروع ہوگئیں سات بجے تک سارے مہمان آچکے تھے۔ ابا میاں نے مجھے ایک صاحب کی طرف اشارہ کرکے بتایا یہی پروفیسر جوزف ہیں۔ پروفیسر جوزف اونچے قد کے ایک صحت مند انسان تھے۔

ڈیڑھ، دو گھنٹے میں ہم سب کھانے سے فارغ ہوچکے تھے اور برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کررہے تھے۔ پروفیسر جوزف نے مجھے اپنے قریب بُلا بٹھایا باتوں ہی باتوں میں ابا میاں نے پروفیسر صاحب سے مخاطب ہوکر کہا "ہاں تو یار سُناؤ کوئی مزیدار واقعہ کہ بس دل پھڑک ہی تو جائے"۔ پروفیسر صاحب کہنے لگے اب تمھیں ایک ایسا واقعہ سُناؤنگا جو ہمیشہ مجھے کھٹکتا رہا ہے اور آج بھی جب کبھی میں وہ واقعہ یاد کرتا ہوں تو جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

—— "اچھا!"

ہوگی صاحب نے تعجب سے پوچھا

"تو پھر وہی سُنائیے"۔

"ہاں تو سُنئے"—— پروفیسر صاحب نے کہنا شروع کیا۔ ہم امریکہ میں جس جگہ رہا کرتے تھے وہاں پر اسپین کا ایک اور شخص بھی رہا کرتا تھا۔ جس کا نام تھا کارڈف—— کارڈف تھا تو بڑا ہی دلچسپ ساتھی لیکن اُس کی ایک عادت تھی جسے خواہ آپ بُرائی سمجھئے یا کمزوری—— وہ یہ کہ کارڈف بھُوتوں، جنوں اور روحوں وغیرہ سے بے انتہا ڈرتا تھا۔ آپ پوچھیں گے کہ اسپین جیسے ملک میں رہ کر ان پرانے خیالات اور توہمات میں کیسے گھرا ہوا تھا—— بات یہ تھی وہ اسپین کے غیر تعلیمیا فتہ گھرانے کا آدمی تھا۔ حتیٰ کہ اگر باتوں میں بھی کبھی روحوں وغیرہ کا ذکر آتا تو کارڈف سہم جاتا۔ میں اور میرے ساتھیوں نے تو شروع شروع میں اِدھر کوئی توجہ نہ دی لیکن دھیرے دھیرے ہم لوگ کارڈف کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھانے لگے وہ اس طرح کہ جب کبھی ہمارا جی کوئی خاص چیز کھانے کو چاہتا یا کسی اچھی فلم کے دیکھنے کے لئے ہماری طبیعت مچل

جاتی تو کارڈف کو مجبور کرتے۔ اگر وہ راضی نہ ہوتا تو اُسے بھوتوں اور روحوں کا خوف دلاتے اور مجبوراً کارڈف کو اپنی ہار ماننی پڑتی۔ یہاں تک کہ بعض بعض اوقات پیسے نہ ہونے کی صورت میں اُس کو یا تو کہیں سے قرض لانا پڑتا یا اپنی کسی چیز کو بیچنا پڑتا میں نے کئی مرتبہ اپنے ساتھیوں کو منع بھی کیا کہ اس کو اس طرح نہ پریشان کریں اور لوگوں نے تو میری بات مان لی لیکن ہمارے دو اور ساتھی تھے۔ لارنس اور جان جو لندن کے رہنے والے تھے اور میری اس بات کو ماننے کے لئے کبھی تیار نہ تھے۔ کارڈف اُن کے خوف سے کہیں نہ کہیں سے اور کسی نہ کسی طریقے سے رقم فراہم ہی کرلیتا۔ ایک دو مرتبہ تو میں اور میرے دو ہندوستانی ساتھی منوہن اور مجید نے کارڈف کو رقم دے دی۔"

"ایک مرتبہ ایسا ہوا" ——— پروفیسر نے قصّہ جاری رکھا ——— "ایک سینما ہال میں ایک اچھی سی فلم چل رہی تھی۔ لارنس اور جان نے کارڈف کو فلم دکھانے کے لئے مجبور کیا۔ مہینے کی آخری تاریخ تھی اور ہم لوگوں کو اپنا الاؤنس پہلی تاریخ کو ملتا تھا۔ کارڈف کے پاس اُس وقت پیسے نہیں تھے اس لئے وہ انکار کرتا رہا اور اتفاق ہی سمجھئے کہ اس وقت میرے، مجید اور منوہن کے پاس بھی پیسے نہ تھے اور کارڈف کہیں سے لا بھی نہیں سکتا تھا اس لئے اس کو مجبوراً لارنس اور جان کی بات ٹالنی ہی پڑی لیکن اُس نے اتنا وعدہ تو پھر بھی کر لیا کہ اُس کا الاؤنس ملتے ہی وہ انھیں فلم دکھائے گا۔

مگر نہ جانے خدا کو کیا منظور تھا ———

لارنس اور جان کے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ اُس رات کو ہی اُنھوں نے کہیں سے ایک بے ہنگم سا لباس اکٹھا کیا جس کو دیکھکر واقعی ڈر لگتا تھا اور آکر کمرے میں بیٹھ کر کارڈف کا انتظار کرنے لگے کیونکہ کارڈف اِس وقت کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اس دوران میں میں نے اور مجید نے کئی مرتبہ لارنس اور جان کو اِس حرکت سے باز رکھنا چاہا لیکن وہ نہ مانے۔ اتنے میں باہر برآمدے میں جوتوں کی آواز سنائی دی۔

(بقیہ دیکھئے صفحہ ۳۴ پر)



صفدر نقوی

نپولین اعظم

اب سے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے ایک شہنشاہ تھا۔ وہ فرانس پر حکومت کرتا تھا۔۔۔ یورپ کا نام سنا ہے آپ نے۔ جی ہاں وہی برِاعظم جس میں انگریزوں کا ملک انگلستان ہے۔ اس زمانے میں جتنے بھی ملک تھے، ان میں ایک بادشاہ ہوتا تھا اور باقی سب رعایا۔ ہاں تو ایک شہنشاہ تھا۔ اس کا نام تھا نپولین ــــ یہ بات سچ ہے کہ بادشاہوں کو صرف اپنی فکر ہوتی تھی۔ رعایا کی فکر نہیں۔ اپنے آرام کا خیال رکھتا ہے چاہے رعایا بھوکی مرے۔ اور بھئی بھوکی رعایا یونہی تو قابو میں نہیں رہتی ــــ کچھ لوگوں کو امیر بنایا جاتا ہے۔ انھیں جاگیریں دی جاتی ہیں۔ اور امیر جاگیردار فوج کے لیے سپاہی دیتے ہیں۔ اور فوج کے ذریعے بھوکے عوام کو قابو میں رکھا جاتا ہے ــــ پر بھئی نپولین میں یہ بات نہ تھی۔ اس کے یہاں امیر غریب سب برابر تھے۔ چھوٹا آدمی ترقی کر کے بڑا آدمی بن سکتا تھا۔ نپولین اپنی رعایا کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا۔ اس کی رعایا اس سے محبت کرتی تھی۔ نپولین ہر بات میں رعایا کی خوشی کا

خیال رکھتا تھا۔ اور رعایا اس سے خوش تھی۔

نیپولین جتنے دن بادشاہ رہا دوسرے ملکوں سے لڑتا ہی رہا ـــــ اس کے سپاہی دشمن سے لڑتے تھے۔ تکلیفیں اٹھاتے تھے۔ وہ بھی سپاہیوں کے ساتھ تکلیفیں اُٹھاتا تھا۔ سپاہیوں کے ساتھ ساتھ لڑتا تھا۔ وہ خود بھی سپاہی تھا۔ اور سپاہی اس کے لئے جان دینے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔

شہنشاہ نیپولین کسی بادشاہ کا بیٹا نہ تھا۔ ایک معمولی امیر کا بیٹا تھا۔ اٹلی کے قریب ایک جزیرے کارسیکا میں پیدا ہوا تھا۔ اب سے لگ بھگ ایک سو پچاسی سال پہلے۔ اس کی ماں بہت اچھی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو بہادر لوگوں کی کہانیاں سُناتی تھی۔ اور نیپولین ان کہانیوں کو بڑے شوق سے سُنتا تھا۔

فرانس پر ان دنوں لوئی خاندان کا اٹھارہواں بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ کارسیکا پر بھی اس نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس لئے اسکی رعایا اس کے ظلم وستم سے عاجز آگئی تھی۔ اور عام لوگ اس سے ناراض تھے۔ چنانچہ اس کو شاہی گدی سے ہٹا دینا چاہتے تھے۔

نیپولین کے ماں باپ بھی انقلابیوں کے ساتھ تھے۔ اس لئے اُس کا بچپن انقلابیوں کی گود میں گذرا۔ وہ بچپن ہی سے ذہین تھا۔ اپنی بات کا پکا تھا۔ بہادر تھا۔ اس نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں ایک فوجی اسکول میں باقاعدہ تعلیم پائی۔ اور انقلابیوں کے ساتھ کام کرنے لگا۔ جب اس کی عمر بیس سال کی ہوئی، اس وقت فرانس میں رعایا نے بادشاہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ رعایا کی فتح ہوئی۔ بادشاہ لوئی اور اس کی ملکہ کو پھانسی دی گئی۔ اب عام لوگوں نے اپنی حکومت قائم کی۔ یہ دنیا کی پہلی جمہوری حکومت تھی ـــــ ایک مجلس بنی جس میں پانچ ممبر تھے۔ یہ مجلس عوام کی نمائندہ تھی۔ مجلس ہی حکومت کے سب کام انجام دیتی تھی۔

اُنہی دنوں فرانس کی فوج، اٹلی میں لڑنے کے لئے گئی۔ نیپولین بھی اُسی فوج میں تھا۔ وہاں اس نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے اور اپنی ہوشیاری سے وہ کارنامے

کئے کہ وہ فوج کے ایک حصّہ کا کماندار بنا دیا گیا۔ سپاہی اس سے محبت کرنے لگے۔ اور پھر تو کچھ ہی دنوں کے اندر فرانس میں ہر ایک کی زبان پر اس کا نام آگیا — مجلس کے پانچوں ممبروں کو نیپولین کی ذات سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ انھوں نے مناسب سمجھا کہ نیپولین فرانس سے باہر رہے — اور اسے انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے مصر بھیج دیا گیا۔ مصر کی لڑائیوں نے تو اس شہرت میں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ پورا برّاعظم یورپ حیران تھا، اور فرانس خوش۔ فرانسیسی لوگ اپنے اس بہادر سپہ سالار پر فخر کرتے تھے۔

نیپولین مصر کی جنگ کے بعد فرانس واپس پہنچا۔ لوگوں نے بڑے جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا۔ اس پر اعتماد ظاہر کیا۔ "حاکموں کی مجلس" کے کام سے لوگ مطمئن نہیں تھے۔ اس لئے لوگوں نے اسے توڑ دیا۔ نیپولین نئی حکومت کا سب سے بڑا حاکم بنا دیا گیا رفتہ رفتہ سارے اختیارات نیپولین نے اپنے ہاتھ میں لے لئے اور فرانس کا شہنشاہ بن گیا۔ اور اس طرح فرانس میں پھر شاہی حکومت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

نیپولین فرانس کا شہنشاہ بن بیٹھا لیکن اس نے شہنشاہیت کی سب باتیں نہ سیکھیں۔ اس نے عوام پر ظلم کرنا نہ سیکھا۔ ان کی طرف سے بے توجہ رہنا نہ سیکھا۔ انھیں بھوکا مار کر عیش کرنا نہ سیکھا — نیپولین نے جمہوریت کا خاتمہ تو کر دیا۔ لیکن اس کی اچھائیاں ختم نہ کیں — زمین کے مالک کسان ہی رہے چھوٹے بڑے، شریف رذیل کا فرق نہیں ہوا۔ سب لوگ برابر ہی رہے — لوگوں کو کرنے کے لئے کام دیا۔ اور کھانے کو روٹی۔ وہ شہنشاہ تھا۔ اور لوگ اسے شہنشاہ کہہ کر فخر کرتے تھے۔

نیپولین معمولی سپاہی سے ترقی کر کے شہنشاہ بن گیا — اتفاقاً نہیں — حالات اور واقعات کو دیکھکر اس نے اپنے لئے یہی سوچا تھا — اور پھر نیپولین کا سوچنا — جو سوچ لیا سو سوچ لیا۔ جو ارادہ کر لیا سو کر لیا۔ اب دُنیا کی کوئی مشکل اس کے سامنے نہیں آسکتی۔ روپیہ، دولت، فوج، افسر

یہاں تک کہ وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اسے صرف ایک دُھن تھی کہ جو کچھ سوچا ہے اسے پورا کروں۔ اور جب ایک کام ختم ہوگیا تو دوسرا فوراً تیار۔ یہ نہیں کہ سوچ رہے ہیں کہ اب کیا کریں —— فرانس کا شہنشاہ بن کر۔ حکومت کو ٹھیک ٹھاک کرکے پورا یورپ فتح کرنے کی ٹھانی۔ اب پورا یورپ ایک طرف اور اکیلا فرانس ایک طرف —— چند ہی سال میں آسٹریا، جرمنی، اسپین، بلجیم اور ہالینڈ کو فتح کرلیا۔ روس کی راجدھانی ماسکو پر بھی فرانس کا جھنڈا لہرا آیا۔ فرانس کا یہ فولادی انسان پہلے جنگ اور فتح کا پورا نقشہ اپنے ذہن میں بناتا۔ پھر سولہ سولہ، سترہ سترہ گھنٹے لگاتار گھوڑے پر بیٹھے اور کئی کئی دن بغیر کھائے پیئے اور سوئے کام میں لگا رہتا اس کے لئے معمولی بات تھی۔ پورا یورپ اس کی تلوار اور اس کے ارادے سے کانپنے لگا۔

نیپولین نے تقریباً پندرہ سال حکومت کی۔ اپنی زندگی میں ساٹھ کے قریب لڑائیاں لڑیں —— وہ انسانی خون بہانے کا شوقین نہیں تھا۔ لیکن جنگ فتح کرنے کے لئے دُنیا کے سب انسانوں کا خون بہانے میں بھی اِسے ہچکچاہٹ نہ ہوتی —— اس کے سامنے صرف مقصد ہوتا تھا۔ اور مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔

بہادری، ہمت، ارادے کی مضبوطی نے نیپولین کو دُنیا کا بہت بڑا فاتح بنایا —— لیکن نہیں —— اس کو اتنا بڑا بنانے میں اس بات کو بھی دخل ہے کہ اس نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا —— اس نے اپنے سکریٹری سے کہا تھا کہ:۔

"جہاں تک ممکن ہو میرے سونے کے کمرے میں مت آؤ۔ —— اگر کوئی خوشی کی خبر مجھ تک پہنچانی ہے تو کوئی جلدی نہیں جب سوکر اُٹھوں گا سن لوں گا —— لیکن اگر کوئی فکر کی خبر ہے تو مجھے فوراً جگا دو۔ ایک لمحہ میں بھی حالات کا رُخ بدل سکتا ہے۔"

(بقیہ دیکھئے صفحہ ۲۵ پر)

لطیفے



فوج میں داخلے کے لئے امتحان میں ایک آدمی سے ڈاکٹر نے پوچھا "اگر تمہارا ایک کان کٹ جائے، تو کیا ہوگا؟"

اس آدمی نے کہا "میں سن نہیں سکوں گا۔"

ڈاکٹر نے کہا "اگر تمہارے دونوں کان کٹ جائیں تو کیا ہوگا۔"

اس آدمی نے کہا "میں دیکھ نہ سکوں گا۔"

ڈاکٹر نے کہا "بڑے بیوقوف آدمی ہو۔ میں کہیں یہ کہہ رہا ہوں کہ آنکھ پھوٹ جائے گی۔ تم اپنے کانوں سے دیکھتے ہو؟"

اس آدمی نے کہا "دونوں کانوں کے کٹ جانے سے ٹوپی جو نیچے آجائے گی۔ تو آنکھ نہ چھپ جائے گی۔"

کریم۔ ارے موہن! تم نے فنائل کی گولی کیوں کھالی۔

موہن۔ کپڑے میں فنائل کی گولی رکھنے سے کیڑے نہیں لگتے۔ اس لئے میں نے کھالی تاکہ میرے جسم کے جراثیم ختم ہوجائیں

ایس اے حیدر۔ پورنیہ

لڑکا۔ ماسٹر صاحب! آج دن بھر سورج نہیں نکلا، کیا بات ہے۔

ماسٹر۔ اس لئے کہ آج دن بھر پانی برستا رہا۔ سورج نہیں نکلا۔

لڑکا۔ ماسٹر صاحب! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب رات کو نکلے گا۔

ایک دن مُلّا جی اذان دیتے دیتے دوڑنے لگے۔ لوگوں نے مُلّا جی سے دوڑنے کی وجہ پوچھی۔ مُلّا جی نے کہا "میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ میری آواز کتنی دور پہنچتی ہے

دلجیت سنگھ آزاد

اُستاد۔ لڑکی کی جمع کیا ہے۔

شاگرد۔ (جلدی سے) لکڑیاں۔

دی، احمد۔ بادشاہ جوہر

بیٹا۔ پیڑ پر یہ کیا ہے۔

باپ۔ بیٹا چمگادڑ لٹک رہی ہے۔

بیٹا۔ پکنے کے بعد اس کا مزا کیسا ہوتا ہے۔

ریحان احمد۔

موکل۔ وکیل صاحب! رامو پر میرا پچاس روپیہ چاہیئے وہ ادا نہیں کرتا آپ مشورہ دیجئے۔

وکیل۔ کیا تم نے اس کا حساب اسے دکھایا۔

موکل۔ جی ہاں

وکیل۔ تو اس نے کیا کہا۔

موکل۔ اس نے کہا جاؤ جہنم میں۔

وکیل۔ پھر تم نے کیا کیا۔

موکل۔ میں آپ کے گھر چلا آیا۔

باپ۔ بیٹا تم اپنی کلاس میں سب سے پیچھے کیوں رہتے ہو۔

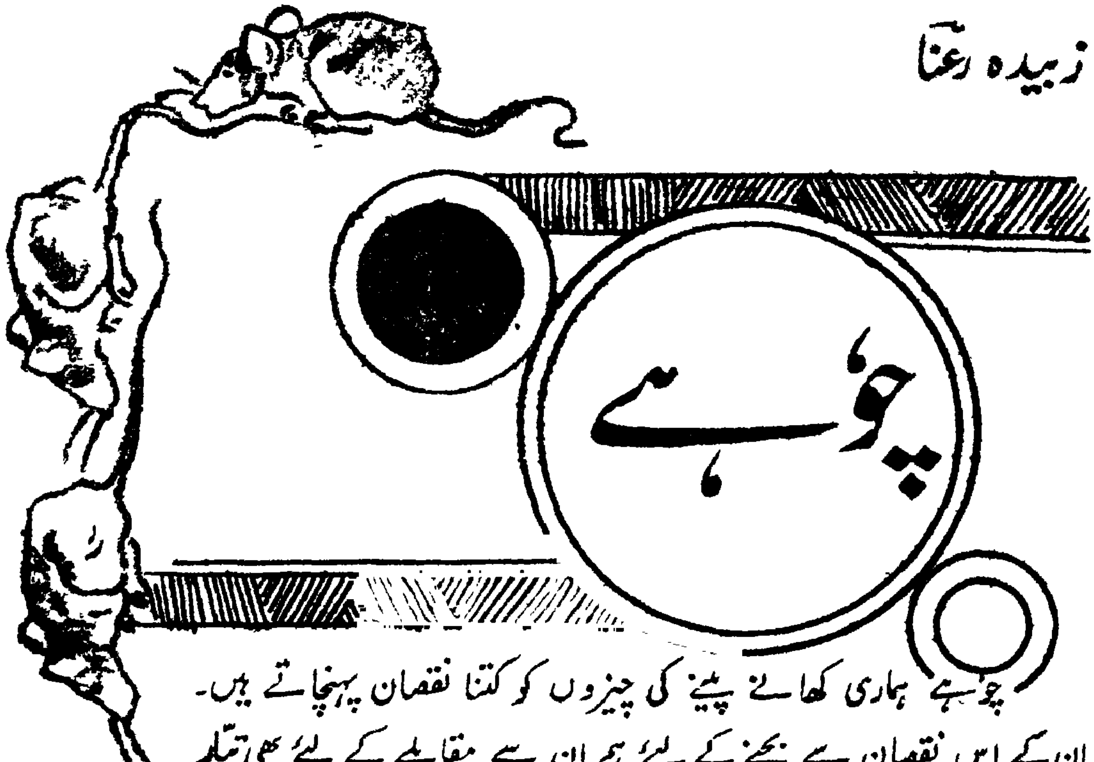
بیٹا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہی بات جو آگے سنائی دیتی ہے وہ پیچھے بھی، کوئی فرق نہیں پڑتا۔

فرحت ہاشمی

بتائیے تو جانیں کے جوابات

۱۔ چاند۔ ۲۔ آپ کا سایہ۔ ۳۔ آپ کا دماغ۔ ۴۔ تالا۔ ۵۔ آنکھ۔ ۶۔ ناریل۔ ۷۔ آٹے کی چکی۔ ۸۔ ہوا۔

زبیدہ رعنا



چوہے

چوہے ہماری کھانے پینے کی چیزوں کو کتنا نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان کے اس نقصان سے بچنے کے لئے ہم ان سے مقابلے کے لئے بھی تیار ہوجاتے ہیں۔ اور ان کے مارنے کی کتنی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ چوہے بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ بھی اپنی جان بچانے کے لئے نئے نئے طریقے سوچ لیتے ہیں۔

عام طور پر چوہے ٹولیوں کی شکل میں رہتے ہیں۔ جب کبھی یہ پرانا گھر چھوڑ کر کسی نئے گھر کی تلاش میں نکلتے ہیں تو یہ ٹولیاں ایک فیصلہ کر لیتی ہیں۔ اور پھر ہزاروں کی تعداد میں نکل پڑتے ہیں۔

ایک روز میں ایک پیڑ کے نیچے کھڑی ہوئی تھی۔ مجھ سے کچھ فاصلہ پر ایک کھیت تھا۔ میری نظر اس پر پڑی تو چوہوں کی ایک ٹولی اس کھیت کو پار کر رہی تھی وہ سب ایک قطار میں ایک فوج کے مانند چلے جا رہے تھے۔ ان میں نہ کوئی آگے تھا اور نہ پیچھے۔ ان میں جوان بوڑھے چھوٹے بڑے بھورے کالے ہر قسم کے چوہے تھے۔

لیکن میں نے ایک چیز دیکھی جو بڑی حیرت انگیز تھی۔

دو چوہے سب سے پیچھے آہستہ آہستہ میرے پاس سے گزرے وہ جب میرے بالکل قریب آگئے تو میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹے سے تنکے سے ایک چوہا دوسرے کی رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ دونوں اس تنکے کے سروں کو اپنے مُنہ میں پکڑے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو بہت غور سے دیکھا ان میں ایک بڑا اور بوڑھا چوہا تھا۔ جو اندھا تھا۔ دوسرا چوہا اس تنکے کی مدد سے اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔

یہ جذبہ جانوروں میں دیکھکر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ آج کے انسان میں یہ جذبہ کس قدر سرد پڑ چکا ہے۔



"خوف" کا بقیہ

جان بھوت کا لباس پہن کر تیار ہو گیا اور دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ جونہی کارڈف نے دروازے میں قدم رکھا، جان نے ایک ڈراؤنی آواز نکالی اور کارڈف کے سامنے آگیا۔

کارڈف فوراً گر گیا۔

میں اور مجید کارڈف کے قریب گئے مگر.........مگر......."

"مگر ــــ کیا؟" کسی نے پوچھا۔

مگر اُس کے دل کی حرکت بند ہو گئی تھی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جُدا ہو چکا تھا ــــ "آہ کارڈف" پروفیسر نے ایک آہ کھینچی اور خاموش ہو گئے "تو پھر کیا جان پر مقدمہ نہیں چلایا گیا اُسے اپنے کیے کی سزا نہیں ملی؟" ابا میاں نے پوچھا "ہاں مقدمہ تو چلایا گیا ــــ" پروفیسر جوزف کہنے لگے ــــ "مگر نہ معلوم کیا دھاندلی ہوئی فیصلہ لارنس اور جان کے حق میں سُنا دیا گیا۔"

اطہر پرویز



کاغذ کی کہانی

"آپ کے ہاتھ میں جو چیز ہے، اس کا خیال رکھئے گا، یہ سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ اگر دُنیا سے کاغذ کا خاتمہ ہو جائے، تو تہذیب و تمدّن کا شیرازہ بکھر جائے۔ کاغذ، علم اور جہالت، حکومت اور افراتفری، غلامی اور آزادی کے درمیان پُل کا کام کرتا ہے۔ اس کے بغیر لوگوں کے دلوں کی اُمنگ ختم ہو جائیگی۔ ہم کو جاننا چاہیے، کہ کاغذ کی اہمیت بڑی ہے۔"

یہ الفاظ برطانیہ کی سب سے بڑی لائبریری "برٹش میوزیم" کے دارالمطالعے کی دیوار پر لگے ہوئے ہیں۔ جہاں مُردے زندوں سے باتیں کرتے ہیں، ان کو رُلاتے ہیں، ہنساتے ہیں اور ان کا پیغام ان کتابوں کے ذریعے پہنچتا ہے۔

سب سے پہلے جب آدمیوں نے لکھنا پڑھنا سیکھا تو اُس وقت کاغذ تو تھا نہیں اس لئے لوگ پتھروں اور چٹانوں پر کھود کر لکھتے تھے۔ تب پھر لوگوں نے مٹی سے اینٹیں تیار کیں اور اس پر کھدائی سے لکھنا شروع کیا۔ پُرانے زمانے کے کتبے ایسے ہی پتھروں

اور اینٹوں پر آج بھی کہیں کہیں ملتے ہیں۔ میلوں تک پتھر کی چٹانیں ہی قدیم انسان کا کاغذ بنی رہیں۔ لیکن اس پر لکھنا کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ آپ خود بھی لگا سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انسان عرصے تک اسی چکر میں لگا رہا کہ کسی طرح لکھنے میں آسانی پیدا ہو سکے۔ آخر اس نے پیڑوں کے پتوں اور چھالوں پر لکھنا سیکھا۔ ان پتوں پر لکھی ہوئی کتنی قدیم کتابیں ہمارے ملک میں آج تک محفوظ ہیں۔ پیڑوں اور چھالوں پر لکھنے کا طریقہ نہ صرف یہ کہ ہمارے ملک میں رائج تھا بلکہ ساری دُنیا میں لوگ اسی طرح لکھا کرتے تھے۔ لیکن دھیرے دھیرے لوگوں نے سوچا کہ اب چھالوں اور پتوں پر لکھنے سے کام نہیں بنے گا۔ اب انھوں نے چمڑے پر یا چمڑے اور چھال کو ملا کر ایک نئی چیز تیار کی جسے 'پارچمنٹ' کہتے ہیں، اس پر لکھنا شروع کر دیا۔ یہ 'پارچمنٹ' کھردرا ہونے کی وجہ سے کافی مفید سمجھا جاتا تھا۔ بعض پچھڑے ہوئے ملکوں میں تو لوگ اب بھی اسی پر لکھتے ہیں۔ پارچمنٹ پر لکھی ہوئی قانون کی کتابیں آج بھی محفوظ ہیں۔

لیکن در اصل اس سے کاغذ کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ کاغذ تو بعد میں آیا۔ سب سے پہلے کاغذ کی ایجاد چین میں ہوئی۔ پھر یہ فن چین سے 'نیپال' اور نیپال سے ہندوستان آیا۔ عربوں اور مصریوں نے بھی چین سے ہی کاغذ بنانا سیکھا۔ پھر مصر سے یہ فن اسپین اور اسپین سے سارے یورپ میں پھیلا۔ یہ کاغذ بھی پیڑوں کی چھال سے تیار کیا جاتا تھا یہ اتنا سفید اور چکنا بھی نہ ہوتا تھا بلکہ مٹیلا، موٹا اور بہت کھردرا ہوتا تھا۔ لیکن مصر کے لوگ ایک خاص قسم کے پیڑ سے کاغذ تیار کرتے تھے جسے 'پیاپرس' کہتے ہیں۔ اسی 'پیاپرس' سے ہی انگریزی زبان میں کاغذ کا نام 'پیپر' پڑا۔

چینی" کاغذ کی ایجاد سے پہلے بانس کے تختوں پر لکھا کرتے تھے۔ یا پھر ریشم پر لکھتے تھے۔ لیکن پہلی صدی عیسوی میں چینیوں نے وہ کاغذ بنایا، جس کو ہم آج کے کاغذ کا باوا آدم کہہ سکتے ہیں۔ یہ کاغذ پرانے کپڑوں اور مچھلی کے پرانے جالوں سے تیار کیا گیا تھا

سر آریل اسٹین نامی ایک انگریز کو چین کی سیاحی کرتے ہوئے ایک جگہ بانس کے تختوں، ریشم اور کاغذ پر لکھے ہوئے بہت سے کتبے ایک جگہ ملے۔ یہ زبان بمشکل تمام پڑھی جاسکی۔ کہتے ہیں کہ یہ دُنیا کے سب سے قدیم کتبے ہیں۔

چینیوں نے جس پیڑ سے کاغذ بنانا سیکھا اُس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس سے ریشم بھی بنتا ہے۔ کاغذ کی اس ایجاد کے بارے میں یورپ والوں کو سات سو سال تک کچھ نہ معلوم ہوسکا۔ یہ تو محض ایک اتفاق تھا کہ اس ایجاد کی خبر یورپ والوں کو معلوم ہوگئی۔ کہتے ہیں کہ ۷۵۱ صدی عیسوی میں سمرقند کے عرب حاکم نے کچھ کاغذ بنانے والوں کو ایک جنگ میں گرفتار کرلیا اور اِن ہی لوگوں نے عربوں کو کاغذ بنانا سکھایا۔ کسی لڑائی کا انسانی تہذیب و تمدّن پر اتنا گہرا اثر نہیں پڑا جتنا اس لڑائی کا۔ غرض عربوں کی تلوار کے بل پر کاغذ سمرقند پہنچا یہی تلوار اسے یورپ بھی لے گئی۔

پہلے تو کاغذ صرف پھٹے پرانے کپڑوں سے تیار ہوتا تھا لیکن بعد میں لکڑی سے تیار کیا جانے لگا اور آج کل تو یہ عالم ہے کہ یورپ کے بڑے بڑے ناشروں کے اپنے اپنے جنگلات ہوتے ہیں۔ ہزاروں برس پہلے جب انسان نے کاغذ کا تصور بھی نہ کیا تھا ایک کیڑا تھا جس نے اپنے بل میں کاغذ بنانے کا کام شروع کردیا ہے۔ در اصل یہ کیڑا ہی کاغذ کا سب سے پہلا موجد تھا۔ یہ کیڑا سڑے گلے درخت میں اپنا بل بناتا تھا اور اسی کے بُرادے سے ۱۷۶۵ء میں ایک آدمی کے دل میں لکڑی سے کاغذ بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس طرح لوگوں نے اس کیڑے سے موجودہ قسم کا کاغذ بنانا سیکھا۔

اب آیئے آپ کو کاغذ بنانے کا طریقہ بھی بتائیں۔ جس چیز سے کاغذ بنایا جاتا تھا اس کو پہلے پانی میں ڈال کر خوب سڑایا جاتا ہے، سڑ جانے کے بعد اس کی "لگدی" بنائی جاتی ہے۔ لگدی کو روٹی کی طرح پتلا پتلا بیل کر سکھا لیا جاتا ہے۔ لیکن کاغذ بنانے کا یہ طریقہ گھریلو قسم کا ہے۔ آج کل کے ترقی یافتہ زمانے میں جب کہ کاغذ کی ضرورت

اتنی بڑھ گئی ہے اگر صرف ہاتھ ہی سے کاغذ بنایا جائے تو کس طرح کام چلے گا۔ اور یہی ضرورت تھی جس کی وجہ سے مشین کے ذریعے کاغذ تیار کرنے کا سوال پیدا ہوا اور پھر دھیرے دھیرے کاغذ کی ملیں ہر ملک میں بن گئیں۔

فرانس میں لوئی رابرٹ نامی ایک شخص نے کاغذ بنانے کی سب سے پہلی مشین تیار کی اب رابرٹ لوئی کی اس مشین میں آہستہ آہستہ تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ انگلینڈ کے ایک شخص مسٹر ٹیٹ نے کاغذ بنانے کا پہلا کارخانہ کھولا اس کارخانے میں گودڑ کو کوٹ پیس کر کاغذ بنایا جاتا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے یہ کارخانے ترقی کرتے گئے۔ یہاں تک کہ آج دنیا میں کاغذ تیار کرنے کے سیکڑوں کارخانے ہیں۔

آج کل کاغذ اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ گودڑ، بانس یا گھاس کو مشینوں سے کوٹ پیس کر میدے سے بھی زیادہ باریک بنا لیا جاتا ہے۔ پھر اس کو ایک دوسری مشین سے گلایا جاتا ہے۔ پھر یہ مشین اس کو میلوں لمبے کاغذ میں بدل دیتی ہے۔ کاغذ کے اس تھان کو سکھا کر ریم اور دستوں کی شکل میں بازاروں میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

کاغذ پر اخبار، کتابیں اور رسالے چھپتے ہیں۔ دنیا بھر میں ہر روز لاکھوں ٹن کاغذ، کتابیں اور اخبار چھاپنے کے کام آتا ہے۔

اگر کاغذ نہ ہو تو ہمارا علم اور ہماری تہذیب اتنی ترقی نہ کرسکتی۔ کاغذ انسان کے لیے بڑی نعمت ہے۔



بچوں کی کوششیں

احمد میاں کی عقلمندی

احمد میاں اپنا روپیہ چوری سے بچانے کے لئے ایسی جگہ رکھتے کہ جہاں سے کسی کو پتہ نہ چل سکے۔ وہ روزانہ چھُپ چھُپاکر جاتے ـــــ اور جب دیکھتے کہ اب کوئی اس کو نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ چُپ چاپ یہ روپے ایک گڑھے میں ڈال دیتے۔

ایک دن پڑوس کے ایک بنئے نے اُسے روپے رکھتے ہوئے دیکھ لیا وہ سیدھا پہنچا اور اس نے گڑھے میں سے وہ روپے نکال لئے اور گھر واپس آیا۔ اس میں کُل ملا کر ۸۲ روپے تھے۔

اگلے دن جب احمد میاں روپیہ رکھنے پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ گڑھے میں تو ایک روپیہ بھی نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر احمد میاں گھبرا گئے لیکن ان کو خیال آیا کہ کل جب وہ روپیہ رکھنے جارہا تھا تو اس نے دیکھا کہ بنیا اُسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اور واپسی کے بعد بھی بنئے نے اسے بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اب اس کو یقین ہوگیا کہ ضرور بنئے نے ہی یہ روپے نکالے ہیں۔ اس کے

سمجھ میں ایک ترکیب آئی اور سیدھا بنئے کے پاس پہنچا اور اس سے بولا "سیٹھ جی ذرا میرا ایک حساب تو کاغذ پر لکھ دو"۔ سیٹھ جی نے کاغذ اٹھاکر پوچھا "کہو کیا لکھوں"؟

احمد میاں نے کہا "سیٹھ جی لکھ دیجئے کہ آج تک کے ۸۲ روپے اور آج کے ۴۶ روپے، کل ملاکر ۱۲۸ ہوگئے" اس میں ۳۰ منی کی اماں کے اور جمع کر دیجئے۔ اب ہوجائیں گے ۱۵۸ روپے بس یہ حساب مجھے دیدیجئے۔

اس نے کاغذ لے کر بنئے کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوگیا۔ اب بنئے نے سوچا کہ ضرور اس آدمی کے پاس اتنے روپے اور ہیں بہتر ہے کہ یہ ۸۲ روپے ابھی رکھتا آؤں جب یہ ۴۶ اور ۳۰ روپے اس میں اور شامل کردے تب پھر اکٹھا نکال لاؤں گا۔ یہ سوچ کر وہ سیدھا یہ روپے لے کر گڑھے کے پاس پہنچا اور اس بنئے یہ روپے وہاں گڑھے میں ڈال دیئے۔

اگلے دن احمد میاں پہنچے تو دیکھا کہ گڑھے میں ۸۲ روپے پڑے ملے۔ اس نے وہ روپے نکال لئے اور بنئے کا شکریہ ادا کیا۔

دلجیت سنگھ آزاد۔ ٹاٹانگر

"سمجھدار کسان"

ایک غریب کسان تھا۔ اس کے گھر کے پاس ہی ایک سپاہی رہا کرتا تھا۔ وہ سپاہی بہت امیر تھا۔ ایک دن اس نے اپنے پڑوسی سپاہی سے کہا "بھائی، آج کل میں بھوکا رہتا ہوں اگر تم مجھے کچھ گیہوں دیدو، جب میری فصل تیار ہوگی تو میں یہ گیہوں تم کو واپس کردوں گا۔ سپاہی نے اسے سیر بھر گیہوں دیدیا۔ کسان نے وہ گیہوں لاکر اپنے کھیت میں بو دیئے۔ چھ مہینے میں گیہوں کی فصل کٹ کر تیار ہوئی۔ وہ کسان بہت خوش ہوا۔ کٹائی کے بعد اس نے سیر بھر گیہوں سپاہی کو واپس کردیا۔ تھوڑے گیہوں بیچنے کے بعد سپاہی کے پاس کافی روپیہ ہوگیا۔ اس نے اس روپے سے اور غلہ بو دیا۔ کچھ دنوں بعد اسکے پاس کافی زمین ہوگئی اور وہ مزے میں رہنے لگا۔ گاؤں والے اس سے خوش تھے۔ اس لئے کہ وہ پڑوسیوں سے اچھی طرح پیش آتا۔ اور جب کبھی کوئی پریشان ہوتا تو وہ اس کی ضرور مدد کرتا۔

سعدیہ، جامعہ نگر

"برسات کا ایک دن"

صبح ہی سے بادل ہوا کے دوش پر اٹکھیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ بادِ صبا کے جھونکے دلوں کو مسرت بخش رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پتے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ درختوں پر نکھار تھا۔ گرمی اپنا بوریا بستر لے کر اپنے گھر روانہ ہو چکی تھی۔ لوگوں نے صبح ہی سے جمنا کے کنارے آنا شروع کر دیا تھا۔ زرق برق کپڑے پہنے تتلیوں کی مانند جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ آج کا موسم بھی اور دنوں کی بہ نسبت اچھا تھا کالے کالے بادل مست ہاتھیوں کی طرح جھومتے ہوئے، چلے آرہے تھے۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کبھی کبھی پھوار بھی پڑنے لگتی تھی۔ اچھی موسلا دھار پانی برسنے لگتا تھا۔

میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا ہوا سامنے کا دلفریب نظارہ دیکھ رہا تھا۔ سامنے باغ تھا۔ جس میں بیٹھے ہوئے، پرندے عجیب کشش سے نغمے الاپ رہے تھے۔ کمرے میں باغ کے پھولوں کی مہک عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔ میرے دل میں اُمنگ تھی اور چہرے پر مُسکراہٹ۔ میرا بھی دل چاہا کہ چل کر جمنا کی سیر کر آؤں۔ بستر سے اُٹھا، کپڑے پہنے، ہاتھوں میں چھڑی لی اور جمنا کی طرف چل پڑا۔ راستے میں لوگ ساون کے گیت گاتے چلے جا رہے تھے۔ دہلی کے کارخندار اپنی ریڑیوں میں بیٹھے، ٹیڑھی ٹوپی لگائے، خوشی سے پوں پوں ہارن بجاتے ہوئے، چلے آرہے تھے۔

کھیتیاں کھڑی جھوم رہی تھیں۔ فصلیں پک چکی تھیں۔ پاس کے گاؤں میں بچے شور مچاتے ہوئے، کھیل رہے تھے۔ گاؤں کی لڑکیاں بغل میں مٹکا دبائے، پنگھٹ سے پانی لینے جا رہی تھیں۔ کسان آج بڑے مزے میں آکر گا رہے تھے۔ کہیں کہیں کیچڑ کے باعث بچوں کا پاؤں پھسل جاتا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آرہا تھا۔ درخت بھی خوشی کے مارے جھوم رہے تھے۔ آج بڈھے بھی جوانوں کی طرح مونچھوں پر

تانڈو ے رہے تھے۔ تمام مخلوق خوش نظر آرہی تھی۔ دور سے جمنا کا پانی عجب سماں پیدا کر رہا تھا۔ کہ اتنے میں جمنا کا پھاٹک آگیا۔

خدا کی پناہ! کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پانی خوشی میں آکر دروں سے گر رہا تھا۔ جگہ جگہ لوگ بیٹھے تھے۔ کہیں گانا بجانا ہو رہا تھا تو کوئی چہل قدمی کرتا نظر آرہا تھا۔ شاعر بیٹھے ہوئے جھوم جھوم کر نظمیں اور غزلیں گا رہے تھے۔ ایک طرف "کالے بادل برسو رے" کی تان الاپی جارہی تھی تو دوسری طرف گرما گرم پکوڑیوں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ پانی کی موجیں آپس میں گلے مل مل کر ایک دوسرے کو برسات کی آمد پر مبارک دے رہی تھیں۔

ایک طرف لڑکیاں جھولوں پر ملار گا رہی تھیں۔

امّاں میرے ابّا کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بابا تو بڈھا ری — کہ ساون آیا
امّاں میرے بھیّا کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھیّا تو بالا ری — کہ ساون آیا
امّاں میرے ماموں کو بھیجو ری — کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری — کہ ساون آیا

آپس میں پینگ بڑھانے کے مقابلے ہو رہے تھے۔ چھوٹے بچے بھی چلّا چلّا کر اپنی بہنوں سے کہہ رہے تھے۔ باجی ہم بھی بیٹھیں گے۔ لڑکیاں بھی آج بن ٹھن کر آئی تھیں درخت بھی آج خوشی سے جھک جھک کر لوگوں کا سواگت کر رہے تھے۔ سامنے سے پانی گرنے کی مسلسل آواز آرہی تھی جو آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ آج عورتیں سولہ سنگار کیے جمنا پر ساون کی رم جھم، برکھا کی بہار لوٹ رہی تھیں۔ شاخوں میں جھولے پڑے تھے۔ کوئی جمنا کے کنارے بیٹھی لہروں سے کھیل رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوا۔ پانی کی ہلکی ہلکی پھوار، پہاڑیوں کی نکھری ہوئی ہریاول لہروں کے دلفریب جھکولے۔ موسم کو خوش گوار بنائے ہوئے تھے۔

پاس ہی ایک باغ تھا۔ جس سے کوئل کی کوکو اور پپیہے کی پی پی کی صدائیں ہوا میں منتشر ہوئی جاتی تھیں۔ جمنا کا پانی

بھی پوری تیزی سے اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔ مچھلیاں بھی خوشی میں جمنا سے سر نکال کر برسات کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔ جانور تک اس موسم میں خوش نظر آرہے تھے۔ بندروں کی الگ ایک کانفرنس ہو رہی تھی۔ خوب چیخ چیخ کر گیت گائے جارہے تھے۔ بندر کے بچے بھی تان میں تان ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔

لیجے! وہ بارش شروع ہوگئی۔ لوگ بھاگ درختوں اور ہوا گھروں کے نیچے پناہ لے رہے ہیں۔ کبھی کبھی بجلی بھی چمک چمک کر اپنے وجود کا یقین دلا رہی تھی۔

وقت دیکھا تو بارہ بج چکے تھے۔ اب میں نے سوچا کہ وقت کافی ہو چکا ہے۔ اس لئے گھر چلنا چاہیئے۔ چنانچہ میں گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑنے لگی تھی۔ دل میں وہی جوش وہی ولولہ اور وہی اُمنگ تھی جو نہر جانے سے پہلے تھی۔

رضا حسین زیدی

حاضر جوابی

نوشیرواں کے دربار میں بزرجمہر کی بڑی مان دان تھی۔ بزرجمہر کا قول تھا کہ سویرے اُٹھنا دُنیا میں انسان کی سب سے اچھی عادت ہے۔ وہ خود سویرے اُٹھا کرتے تھے اور وہاں سے سیدھے نوشیرواں کے پاس جاتے۔

ایک دن نوشیرواں نے دربار کے لوگوں میں ایک آدمی سے چپکے سے کہا کہ "کل صبح تڑکے جب بزرجمہر یہاں آنے کے لئے گھر سے روانہ ہو تو اُس پر حملہ کر دیا جائے اور جو کچھ ہو، چھین لیا جائے"۔ چنانچہ اگلے دن سویرے سویرے جیسے ہی بزرجمہر گھر سے نکلے اُن پر دو آدمیوں نے حملہ کر دیا۔ اور ان کو لُوٹ لیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے وہ دیر سے دربار میں پہنچے۔

نوشیرواں نے دیر میں آنے کی وجہ پوچھی تو بزرجمہر نے سارا حال کہہ سُنایا۔ اور بتایا کہ کس طرح بدماشوں نے ان کے ساتھ ظلم کیا۔

نوشیرواں نے بڑی ہمدردی کی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یہ سب کچھ صبح تڑکے اُٹھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ کیسے کہتے ہیں کہ صبح اُٹھنے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

بزرجمہر نے کہا "میں اب بھی یہی کہنے کے لئے تیار ہوں کہ صبح تڑکے اُٹھنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ میں ذرا دیر سے اُٹھا اس لئے میں گھاٹے میں رہا۔ ڈاکو مجھ سے پہلے اُٹھے اس لئے اُنھوں نے مجکو لوٹ کر مال دولت پایا۔

نوشیرواں یہ جواب سُن کر لاجواب ہوگیا اور درباری بزرجمہر کی عقلمندی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔

محمد معین الدین، حاجی پوری

عجیب خزانہ

ایک بادشاہ اپنی تینوں لڑکیوں سے یہ سُننا چاہتا تھا کہ اسے کون کتنا پیار کرتا ہے۔ یہ سوال اس نے بڑی لڑکی سے پوچھا۔ بڑی لڑکی نے جواب دیا "میرے ابا آپ کی بادشاہت میں جتنا بھی سونا ہے میں ان سب سے زیادہ آپ کو پیار کرتی ہوں" اس جواب سے خوش ہوکر وہ دوسری لڑکی کی طرف مخاطب ہوئے۔ اس نے کہا "پیارے ابا! میں آپ کو دُنیا میں تمام بیش قیمت جواہرات سے زیادہ پیار کرتی ہوں" تب بادشاہ نے وہی سوال اپنی سب سے چھوٹی لڑکی سے کیا۔ وہ سب سے زیادہ اسی سے پیار کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اور بھی اچھے اور میٹھے الفاظ استعمال کرے گی۔ لیکن سب سے چھوٹی شہزادی نے اپنے والد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کہا "میرے پیارے ابا جان! میں آپ کو نمک سے زیادہ پیار کرتی ہوں"

بادشاہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے چلّا کر کہا ــــ "کیا تو اپنی محبت کا اندازہ معمولی نمک سے کرتی ہے؟ تیری بہنوں نے سونے اور جواہرات کی بات کہی ہے۔ کیا تیرے پاس اس سے بڑھ کر کچھ بھی نہ تھا؟"

شاہزادی نے سر ہلادیا اور پھر جواب

دیا۔" جی ہاں ابّا جان! میں آپ کو نمک سے زیادہ پیار کرتی ہوں۔" اس پر بادشاہ چڑھ گئے، اور چھوٹی شہزادی سے ناراض ہوگئے۔

دوسرے دن کھانے کے وقت اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی تمام تشتریوں کو چکھا۔ لیکن کوئی کھانا بھی پسند نہ آیا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ سارا کھانا بدمزہ ہوگیا۔

آخر میں بادشاہ بڑے غصے سے چلّا پڑے ——"باورچی کو بلاؤ۔ میں اس غلطی کی وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" یہ سُن کر سب سے چھوٹی شاہزادی بولی "ابّا جان! میں اس معاملے کو سمجھا سکتی ہوں۔ میں نے ہی نمک نہ چھوڑنے کا حکم دیا تھا۔ آپ نے دیکھا۔ سونا اور جواہرات ایسی چیزیں ہیں جن کے بغیر کام چل سکتا ہے لیکن بغیر نمک کا کھانا بے مزہ ہو جاتا ہے۔ میں آپ کو نمک سے زیادہ پیار کرتی ہوں۔ کیونکہ آپ کے بغیر میری زندگی میں اندھیرا ہو جائیگا۔"

چھوٹی شہزادی ٹھیک کہتی تھی۔ ہمارے کھانے میں نمک کی ایک خاص مقدار ہونی چاہیے تاکہ اس کا مزہ بڑھ جائے۔ نمک تندرستی کیلئے اچھا ہوتا ہے۔

عبدالواحد بیدل، بجگاچھی پورنیہ

"چیونٹی خور" کا بقیہ مضمون

جانور نہیں لیکن پھر بھی اس کے اگلے پیروں میں کافی طاقت ہوتی ہے۔ موقع پڑنے پر آدمی تک کو اپنے پنجوں میں دبا کر مار ڈالتا ہے۔

چیونٹی خور پیڑ پر نہیں چڑھ سکتا۔ آرام کرنے یا سونے کے لئے یہ گول مٹول ہوکر زمین پر لیٹ جاتا ہے اور اپنی گچھے دار دُم کو چھتری کی طرح اُوپر کر لیتا ہے۔ دھوپ اور بارش سے بچنے کے لئے بھی یہی ترکیب کام میں لاتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ بالکل گھاس کا ڈھیر معلوم ہوتا ہے۔ دشمن سے بچاؤ کے لئے یہ اس کی قدرتی امداد ہے۔

دفتر سے خط وکتابت کرتے وقت

اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں۔

مینا نے کپڑے سکھائے



تحسین حامد

چڑیوں کی دُنیا



یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ چڑیاں کس طرح رہتی اور اپنا پیٹ پالتی ہیں۔ لیکن کیا آپ نے چڑیاں پالی ہیں اور ان کے انڈوں اور بچوّں کو غور سے دیکھا ہے۔ لیکن یہ تو آپ پھر بھی نہیں جان سکتے کہ یہ چڑیاں کس طرح اپنے بچوّں کو چلنا پھرنا اور اُڑنا سکھاتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ چڑیاں پنجرے میں رہ کر آپ کی مرضی کی پابند ہو جاتی ہیں اور اپنے طور طریقوں سے کچھ نہیں کر سکتیں۔ ان کے کاموں ان کے قدرتی رہنے سہنے کو تو ہم اسی وقت جان سکتے ہیں۔ جب ہم یہ دیکھیں کہ گھونسلوں میں رہنے والی چڑیاں کس طرح رہتی سہتی اور اپنے بچوّں کا پیٹ پالتی ہیں۔

چڑیاں بھی آدمیوں کی طرح رات کو اپنے بال بچوّں کو لے کر اپنے اپنے گھونسلوں میں آرام کرتی ہیں۔ اگر کوئی آدمی کسی جنگل میں رات کو جائے تو اس کو بستی کی اس خاموشی میں کبھی کبھی کوئی آواز سُنائی دیتی ہے۔ چڑیوں میں کوئی پہرے دار نہیں ہوتا۔ البتہ چور ضرور ہوتے ہیں۔ ان اُڑنے والے چوروں میں دو سے تو آپ بھی واقف ہوں گے۔ ایک تو چمگادڑ اور

دوسرا اُلّو۔ چمگادڑ کو تو لوگ پرندہ نہیں سمجھتے کیونکہ اِس کے دانت بھی ہوتے ہیں اور یہ اپنے بچّوں کو دودھ پلاتی ہے۔ رات کو جب یہ چور بولتے ہیں تو چڑیوں کے بچّے ڈر کر اپنی ماں کے پروں کے نیچے چھُپ کر بھی سکڑ جاتے ہیں

صبح ہوتے ہی چڑیاں انگڑائی لینے اور پر پھڑ پھڑانے لگتی ہیں۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اپنے گھونسلوں سے نکل کر پیڑوں کی چوٹی پر پہنچ جاتی ہیں گویا سورج دیوتا کا شکریہ ادا کر رہی ہیں۔ اور اُن کی کرنیں ان کا خیر مقدم کرتی ہیں۔ اب یہ اپنی غذا کی تلاش میں نکلتی ہیں کیوں کہ ان کے گھونسلوں میں تو کچھ جمع نہیں ہوتا۔ یہ تو ان لاچار اور غریب آدمیوں کی طرح ہیں، جس کا کام روز کنویں کھودنا اور روز پانی پینا ہے۔

چڑیاں بھی دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ چڑیاں ہیں جن کی چونچ سخت نہیں ہوتی۔ یہ چڑیاں ننھے منّے کیڑے مکوڑے کھاتی ہیں۔ دوسری چڑیاں وہ ہیں جن کی چونچ کڑی ہوتی ہے۔ یہ اناج سے بھی زیادہ سخت چیزوں کو توڑ کر کھاتی ہیں۔ جس وقت چڑیاں اپنے بچّوں کے لئے غذا لے کر اپنے گھونسلے میں داخل ہوتی ہیں۔ اُس وقت ان کی بولی اور آہٹ سُنتے ہی ان کے بچّے چوں چوں کرتے ہوئے مُنہ کھولتے ہیں۔ اگر کسی چڑیا کے ایک سے زیادہ بچّے ہوتے ہیں تو وہ ہر ایک کے لئے باری باری غذا لاتی ہیں۔

بُلبُل کو تو آپ نے اکثر دیکھا ہوگا۔ یہ ایک ایسی چڑیا ہے جو سردی کے زمانے میں ٹھنڈے ملکوں میں چلی جاتی ہے۔ اور گرمی شروع ہوتے ہی پھر اُسی گاؤں بلکہ اپنے اُسی پیڑ پر یا اسی جگہ اپنا گھونسلہ بناتی ہے۔ جہاں اُس نے پچھلے سال بنایا تھا۔ ایک آدمی نے یہ بات معلوم کرنے کے لئے ایک بُلبُل پر ایک ایسا نشان لگا دیا جو کسی طرح نہ مٹ سکتا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ یہ چڑیا سردی کے زمانے میں کہیں اُڑ گئی۔ پھر گرمی آتے ہی اُسی پیڑ پر واپس آگئی۔

کوئل اور ابلکھا صبح تڑکے ہی اُٹھنے والی چڑیوں میں ہیں۔ لوا کو بھی لوگ بہت

سویرے اٹھنے والی چڑیا کہتے ہیں۔ ابلکھا پہلے تو پیڑ کی ڈالیوں پر پھدکتی اورچہچہاتی ہے۔ اُس کے بعد کھانے کی تلاش میں نکل جاتی ہے۔ یہ چڑیاں اپنے اور اپنے بچّوں کے کھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے لے جاتی ہیں۔ اس کے ایک بار کھانا لانے سے اس کے بچّوں کا پیٹ نہیں بھرتا۔ بلکہ اکثر تو وہ دن بھر ہی غذا لاتی رہتی ہے۔ ایک بار ایک آدمی نے بڑے غور سے دیکھا کہ یہ چڑیاں دن میں کتنی بار اپنے بچّوں کے لئے کھانے لاتی ہیں۔ اُس نے دیکھا کہ دو ابلکھا چڑیاں دن بھر میں تین سو بار اپنے گھونسلے سے کیڑے مکوڑے کی کھوج میں گئیں اور کچھ نہ کچھ لے کر لوٹیں۔ یہ چڑیاں اپنے بچّوں کی بڑی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہیں۔

ایک بار دیکھا گیا کہ تین چڑیاں ایک ساتھ کھانا لے کر ایک ہی گھونسلے پر جا بیٹھیں اور بچّوں کے ساتھ کھیلنے لگیں۔ اس میں سے دو تو انھیں بچّوں کے ماں باپ تھے۔ تیسری چڑیا بھولے سے اُس گھونسلے پر آگئی تھی۔ ان دونوں چڑیوں نے اس سے کچھ بھی نہ کہا۔ کیونکہ وہ جان گئی تھیں کہ یہ چڑیا غذا لائی ہے۔ اور ہمارے بچّوں کو کھلائے گی۔ اگر یہ چڑیا کسی اور مطلب سے آتی تو وہ دونوں اس کو اُسی دم مار بھگاتیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ چڑیوں میں بھی چالاکی ہوتی ہے۔

جب چڑیوں کے بچّے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور کیڑے مکوڑے یا اناج ہضم نہیں کر سکتے۔ تب ان کے ماں باپ ہضم کیا ہوا کھانا اُسے کھلاتے ہیں۔ کبوتر اپنے کھائے ہوئے کھانے سے ایک طرح کا دودھ بناتے ہیں۔ اور جب اُنھیں دودھ پلانا ہوتا ہے تب وہ اپنا مُنہ کھول دیتے ہیں۔ اور بچّے اپنی چونچ اس کے اندر کر دیتے ہیں۔ اس طرح کبوتر اس دودھ کو منہ سے اُگلتے ہیں اور بچّے اُسے پیتے جاتے ہیں۔ جب یہ بچّے کچھ بڑے ہو جاتے ہیں تب کبوتر ان کو کھایا ہوا اناج۔ جو کہ زیادہ ہضم ہو جاتا ہے اُسی طرح کھلاتے ہیں اور پھر دھیرے دھیرے چھوٹے چھوٹے اناج کے ٹکڑے کھلاتے ہیں۔

کیڑے کوڑے کھانے والی چڑیاں پیڑ پودوں پر بھی تو احسان کرتی ہیں۔ پدّی کے انڈوں سے چھ سات بچّے نکلتے ہیں اور نر اور مادہ، پدی دونوں ان بچوّں کے لئے کھیتوں سے ایسے کیڑے پکڑ کر لاتی ہیں جو کہ پتّوں کو جن پر پیڑوں کی زندگی کا دارومدار ہے کھا جاتے ہیں۔ یہ چڑیاں دن میں بارہ گھنٹے تک بچوّں کے کھانے کے لئے کیڑے لایا کرتی ہیں۔ اگر نر اور مادہ دونوں ہر گھنٹے میں تمیں تمیں کیڑے لائیں تو ایک دن میں وہ ۷۲۰ کیڑے صاف کر دیں گی۔ اُن کے بچّے تقریباً بیسؔ دن میں بڑے ہوجاتے ہیں۔ اس لئے بیس دنوں میں یہ بچّے ۱۴۴۰۰ کیڑے کھا جاتے ہیں۔ جب اِن بچوّں کے بال بچّے ہوتے ہیں تب تو یہ اَن گنت کیڑے ختم کر ڈالتے ہیں۔

لوگوں نے اس بات کا پورا علم حاصل کر لیا ہے کہ چڑیوں کی نسل رینگنے والے جانوروں مثلاً چھپکلی، گرگٹ سے تعلق رکھتی ہے۔ اِن کے اگلے پیر بڑھ کر ڈینے اور پَر بن گئے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اُس وقت ہوگا جب ہم اُسے غور سے دیکھیں کہ چڑیوں کے بچّے جس انڈے سے نکلتے ہیں اور جب تک پوری طور سے بڑھ نہیں جاتے اُس وقت تک اُن کی شکل میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں پَر نکلنے کے پہلے اُن کے جسم میں انگوٹھے اور اُنگلیاں اور آنکھ دکھائی دیتی ہیں۔ یہی رینگنے جانوروں کے اگلے پَیر ہوجاتے ہیں اور چڑیوں کے ڈینے۔

ایک زمانہ تھا جب کہ چڑیاں اُڑ نہیں سکتی تھیں۔ بس تھوڑا بہت پھدکتی تھیں اور اپنے پچھلے یا اگلے پیروں کے بَل رینگتی یا پیڑوں پر چڑھتی تھیں اُس وقت اُن کے پر زیادہ اُڑنے کے لائق نہ تھے۔ چڑیوں کے ڈینے میں جب پر نکل آئے تب اُن کو ناخن کی ضرورت نہ رہی۔ اور وہ اپنے آپ اُڑ گئے۔ بعض چڑیوں کے پیروں کے کانٹے بہت سے رینگنے والے جانداروں سے ملتے ہیں۔

اگر آپ غور سے چڑیوں کو دیکھیں تو آپ کو چڑیوں کی دُنیا میں عجیب و غریب چیزیں ملیں گی

بتائیے تو جانیں؟

۱۔ وہ کون ہے کہ جب پیدا ہوتا ہے تو سینگ ہوتے ہیں، جوان ہوتا ہے تو وہ سینگ جھڑ جاتے ہیں، لیکن بڑھاپے میں مرنے سے پہلے پھر آپ ہی آپ سینگ آجاتے ہیں؟

۲۔ وہ کون ہے جس کی شکل انسان جیسی ہے، ہات، پاؤں، سر، ناک، کان، سب ہی تو موجود ہیں۔ آپ کے ساتھ رہتا ہے، لیکن نہ کھاتا ہے نہ پیتا، بتائیے تو وہ کون ہے؟

۳۔ وہ کون ہے جو آندھی سے زیادہ تیز ہے، جہاں جی چاہے چلا جاتا ہے جس کو چلنے کے لئے نہ ساتھی کی ضرورت ہے نہ راستے کی۔ وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے لیکن ایک کے قبضے میں ہے؟

۴۔ وہ کون ہے جو ہے تو چھوٹا سا لیکن بڑی سے بڑی کوٹھی کی حفاظت کرتا ہے؟

۵۔ وہ کون ہیں، جو آپس میں بہنیں ہیں، پاس پاس رہتی ہیں مگر ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکتی ہیں نہ مل سکتی ہیں؟

۶۔ وہ کون ہے جو رہتی ہے پیڑ پر، لیکن چڑیا نہیں ہے۔ تین آنکھیں ہیں لیکن شیو بھگوان بھی نہیں ہے۔ گیروے کپڑے پہنتی ہے، پر سنیاسی نہیں ہے۔ خود پانی سے لبریز ہے لیکن نہ بادل ہے اور نہ پیالہ ہی؟

۷۔ وہ کون ہے جو منوں ناج کھاتی ہے لیکن پانی بالکل نہیں پیتی؟

۸۔ وہ کیا چیز ہے جس کا نہ کوئی رنگ ہے اور نہ کوئی شکل۔ نہ کوئی اس کی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ کیا آپ اس کو خلا کہہ دیں گے۔ لیکن بھائی نہ تو یہ خلا ہے اور نہ آسمان۔ جلدی سے اس کا نام لیجئے، اس کے بغیر میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔

(جواب صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

پیامی معمّا نمبر ۳۳ کا شاندار نتیجہ

اس بار صحیح حل ۲۰ موصول ہوئے۔ لہذا پہلا انعام مبلغ ۵ عہ فی کس تقسیم کردیا گیا۔

(۱) محی الدین۔ پٹنہ (۲) محمد شریف۔ ایرسنپورہ (۳) جمیلہ خاتون۔ مدراس (۴) زہرہ۔ حیدرآباد (۵) محمد اسرار۔ دہلی کینٹ (۶) موہن سنگھ۔ ٹاٹانگر (۷) بھیم سنگھ۔ ٹاٹانگر (۸) فیاض علی بمبئی (۹) ریاض علی۔ بمبئی (۱۰) محمد شریف۔ بارہ بنکی (۱۱) عبدالحکیم آگرہ (۱۲) محمد عثمان۔ امیر نانہ (۱۳) خلیل احمد۔ ناگپور (۱۴) محمود عالم۔ احمد آباد (۱۵) کلثوم بیگم۔ رامپور (۱۶) محمد سعید۔ برہانپور (۱۷) کلیم الدین پٹنہ (۱۸) نور محمد بمبئی (۱۹) رحمت اللہ۔ کلکتہ (۲۰) عزیز احمد۔ کانپور۔

نوٹ:۔ ایک غلطی والے ۳۹ حل موصول ہوئے لہذا مبلغ بیس روپے کا دوسرا انعام بحساب ۸ر فی کس تقسیم کردیا گیا۔

پیامی معمّا نمبر ۳۴ کا کامیاب نتیجہ

صحیح حل: (۱) عہد (۲) خودی (۳) گیت (۴) رشک (۵) تدبیر (۶) شرافت (۷) راحت

مبلغ تیس روپے کا پہلا انعام ایک ہی خوش نصیب کو ملا

پتو میاں۔ ۱۹ ہربنس اسٹریٹ۔ راجگڑھ روڈ، لاہور

ایک غلطی والے ۲۱ حل موصول ہوئے۔ لہذا مبلغ بیس روپیہ کا دوسرا انعام بحساب ۱۵ار فی کس تقسیم کیا گیا۔

۱۔ کلدیپ لعل۔ جموں ۲۔ جمال الدین پٹنہ ۳۔ شمیم احمد۔ بارہ بنکی ۴۔ اسماعیل بھائی۔ بمبئی ۵۔ کریم الدین۔ پٹنہ ۶۔ شریف احمد۔ الہ آباد ۷۔ خورشید انور اوجین ۸۔ للو میاں۔ لاہور ۹۔ ہیرالال۔ دہلی ۱۰۔ شفیع الدین۔ بریلی ۱۱۔ کریم الدین۔ بریلی ۱۲۔ بلقیس جہاں۔ آگرہ ۱۳۔ قسیم محمد خاں۔ جودھپور ۱۴۔ محمد اجمل۔ لاہور ۱۵۔ محمد ابراہیم۔ کانپور ۱۶۔ محمد سلیم۔ نیمچ کینٹ ۱۷۔ پروین فاطمہ۔ آگرہ ۱۸۔ سردار جہاں۔ آگرہ ۱۹۔ انجم۔ شولاپور ۲۰۔ انوار احمد۔ کانپور ۲۱۔ محمد شکیل۔ جبل پور

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔	پچاس ۵۰ روپے کے نقد انعامات	فیس داخلہ فی حل ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں اور پانچ حلوں کی فیس چار آنے

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۳۰ روپے || دوسرا انعام ایک غلطی پر ۲۰ روپے

★ حل اور فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۰ اگست ۱۹۵۴ء

پیامی معمّا نمبر ۳۵

۱ پ	ی	ا	م	
۲ ن	ی	ت		
۳		ا		
۴ م	ت	ا		ر
۵ ـُ	ا	ج		
۶	ہ	ر		
۷ پ		ل	ی	

اشارے

۱۔ بچوں کا پیارا ماہنامہ ۔ ۔ ۔ تعلیم

۲۔ بغیر معلوم کئے کسی آدمی کو ۔ ۔ ۔ سمجھ لینا عقل مندی کی نشانی نہیں۔ (نیک ۔ نیچ)

۳۔ دلوں میں ۔ ۔ ۔ ہو تو بگڑے کام بھی بن جاتے ہیں (صفائی ۔ سچائی)

۴۔ ۔ ۔ ۔ کو وطن بہت یاد آتا ہے (مسافر ۔ مہاجر)

۵۔ اسے حاصل کرنے کے بعد پھر چین مشکل ہی سے مل پاتا ہے۔ (راج ۔ تاج)

۶۔ اس سے کام بن بھی جاتے ہیں (رہبر ۔ قہر)

۷۔ اس سے بارش کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ (بدلی ۔ بجلی)

ٹوکن پیامی معمّا نمبر ۳۵

نام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ٹوکن پیامی معمّا نمبر ۳۵

نام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

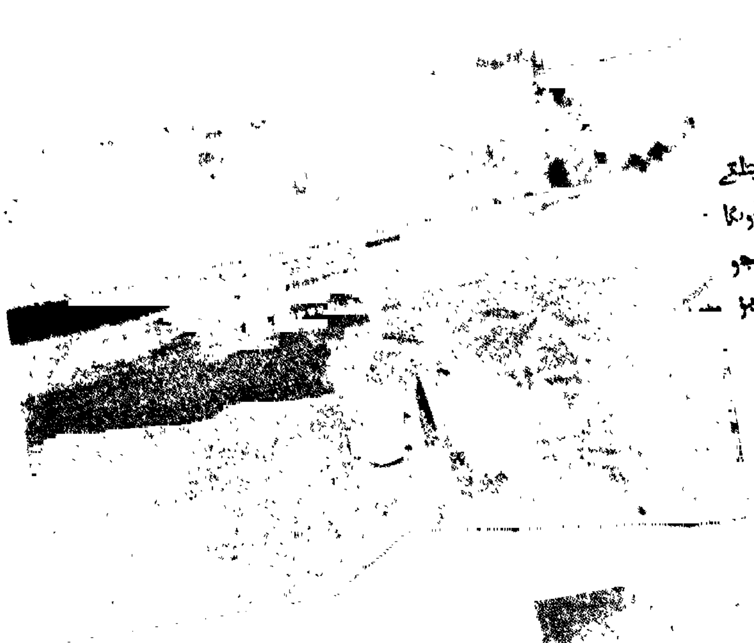
پتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حل اور فیس بھیجنے کا پتہ

پیامی معمّا ۳۵ ۔ ماہنامہ پیام تعلیم ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دہلی

پرنٹر پبلشر :۔ حامد علی خاں

مطبوعہ :۔ کوہ نور پرنٹنگ پریس ۔ دہلی



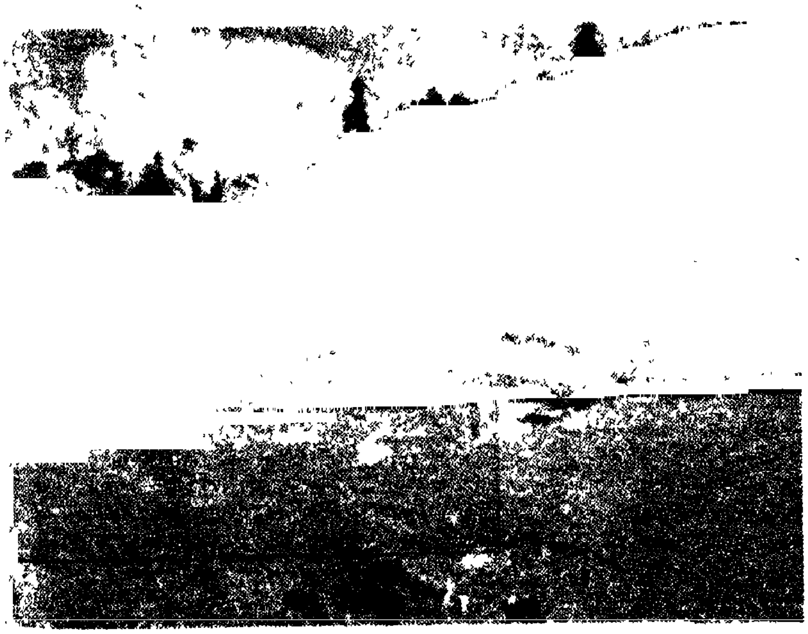
ب میں چلتے
ر جنھیں تورنگا ۔
ں اور شکارے جو
میں خوب تیز ۔
ں



نہضت ۔لھمانی
ہا
شمکر اچاریہ کا مندر ۔ ۔ری نگر
دو چونہوی صدی قبل مسیح
میں بنا

کشمیر کے دو حسین مناظر






پیام تعلیم
دہلی
ادارہ
حامد علی خاں
اطہر پرویز



کملا نہرو

اندر کے صفحات میں آپ کے بارے میں شریمتی اندرا گاندھی کا مضمون پڑھئے



پرنٹر پبلشر: حامد علی خاں

پیامِ تعلیم

فہرست

اور اس کے علاوہ بچوں سے باتیں، لطیفے، کہانیاں اور معمے وغیرہ

سالانہ چندہ ـــــ ۴ روپے

فی پرچہ ـــــ ۶ آنے

ادارہ

حامد علی خاں بی۔ اے (جامعہ)

اطہر پرویز ایم۔ اے (علیگ)

آرٹسٹ گلیڈون میسی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی

بچّوں سے باتیں

۱۵ راگست کو دیس بھر میں آزادی کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ ہمارے وزیرِ آعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے لال قلعے میں جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی اور ایک بہت اچھی تقریر کی، آپ کی اس تقریر میں ملک کی سات سال ترقّی کا ذکر تھا۔

اس کے بعد مہاتما گاندھی کی سمادھی پر دلّی کے رہنے والوں اور مُلک کے رہنماؤں نے پھول چڑھائے اور مختلف اسکولوں کے بچّے بھی باپو کی سمادھی پر گئے۔ پھر شام کے وقت بچّوں نے کوٹلے کے میدان میں ایک دلچسپ پروگرام پیش کیا، اس میں جامعہ کے بچّوں نے بھی حصّہ لیا۔ اس طرح یہ دن بڑی اچھی طرح اور شان سے گزرا۔

آپ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ کلکتے سے اردو کی درسی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں، جو ہمارے دیس کی مختلف ریاستوں میں سرکاری طور پر منظور ہیں اور وہاں کے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

بمبئی کی اردو کی ساتویں کتاب میں ایک سبق ہے "ایورسٹ کی مہم"۔ یہ مضمون ایورسٹ کی فتح سے پہلے لکھا گیا تھا۔ لیکن فتح ہونے کے بعد بھی ہم اس سبق میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتے تھے، کیونکہ سرکاری قانون کے مُطابق ہم منظور کی ہوئی کتابوں میں روز روز

تبدیلیاں نہیں کرسکتے۔ اس کے لئے سرکاری اجازت لینی ضروری ہے ۔ چنانچہ ایورسٹ کی فتح کے بعد بھی اس مضمون میں ابھی تک یہی چھپتا رہا کہ "کاش یہ کام ہندوستان کا کوئی سپوت انجام دیتا۔"

اس سلسلے میں میونسپل اردو اسکول روی وار پیٹھ، پونا کی ساتویں جماعت کے طلبا ء نے ہمیں ایک بہت دلچسپ خط لکھا۔ جس میں ہمیں یہ اطلاع دی کہ "ایورسٹ کی فتح کا سہرا تین سنگھ نامی ایک ہندستانی کے سر ہے۔ آپ کی خواہش پوری ہوئی اس لئے اب آپ ہمیں مٹھائی کھلائیے۔"

اس خط پر ساتویں جماعت کے تمام طلباء کے دستخط تھے۔ ہمیں خط پڑھ کر خوشی ہوئی کہ بچے اپنے سبق سے اتنی دلچسپی لیتے ہیں۔

ہم اردو اسکول روی وار پیٹھ پونا کے ہیڈ ماسٹر صاحب اور ساتویں جماعت کے لائق اُستاد صاحب کو خاص طور پر مُبارکباد دیتے ہیں جن کے مدرسے اور جماعت میں تعلیم بے صحیح معنی میں اتنی گہری دلچسپی لی جاتی ہے

بچوں کا مُنھ میٹھا کرنے کے لئے ہم نے مٹھائی فوراً ہی روانہ کردی تھی۔

آپ کا پیامِ تعلیم ہندُستان کی مختلف ریاستوں میں سرکاری طور پر منظور ہے ۔ اِسی لئے بہت سے اسکول اِسے خریدتے بھی ہیں ۔ لیکن بعض اسکول ایسے بھی ہیں جن کے ہیڈ ماسٹر صاحبان پیامِ تعلیم کو بہت پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ گیا ضلع اسکول گیا کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے طلباء کے لئے اتنا پسند کیا کہ اسکول کی چھ جماعتوں کے لئے جاری کرادیا ہے ۔

ہم دوسرے اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ بھی اپنے اسکولوں کے لئے "پیامِ تعلیم" جاری کرائیں ۔ تاکہ ہم اسے آپ کے لئے اور زیادہ دلچسپ اور مفید بنا سکیں ۔ آپ اپنے درجے کے اُستادوں سے کہئے کہ وہ بھی آپ کی جماعت کے لئے "پیامِ تعلیم"

منگوائیں تاکہ آپ کی ساری جماعت اس رسالے کو پڑھ کر فائدہ اُٹھا سکے۔

اس مہینے میں بھی ہمارے یہاں کچھ غیر ملکی مہمان تشریف لائے۔ ۲۰ر اگست کو ڈاکٹر اسمتھ اور اُن کے کچھ ساتھی آئے۔ ڈاکٹر اسمتھ کی گنتی امریکہ کی درسی کتابوں کی تصنیف و تالیف کے ماہرین میں ہوتی ہے۔ آپ نے ہماری درسی کتابوں کے کام کے طریقے کو بغور دیکھا اور پسند کیا۔ ہمیں اُمید ہے کہ اُن کے مُفید مشوروں سے ہم بچّوں کے لئے کتابیں لکھنے کے طریقے کو عنقریب اور بہتر بنا سکیں گے۔

۲۳ر اگست کی شام کو مکتبہ جامعہ میں ایک بہت مُفید جلسہ ہوا۔ جس میں امریکہ کے ماہر تعلیم مسٹر ویلس ایچ ماسنر، مسٹر براؤن اور ہمارے اُستادوں کے مدرسے کے اُستاد ڈاکٹر محمد اکرام خاں صاحب نے "درسی کتابوں کی تیاری" کے بارے میں نہایت اچھے اچھے مشورے دیئے۔

مختلف درجوں کے طلبا کے لئے الفاظ کے انتخاب کے سلسلے میں یہ بحث بڑی دلچسپ اور معلوماتی تھی۔ حاضرین جلسہ میں سب ہی لوگ ایسے تھے جو ایک عرصہ سے تعلیمی میدان میں کام کررہے ہیں۔ وزارت تعلیم ہند کے سردار سوہن سنگھ صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ آپ نے بھی اس سلسلے میں ہمیں مناسب اور مفید مشورے دیئے۔

ہم تمام حضرات کے دل سے شکر گزار ہیں۔

کوثر والے

نجم آفندی

ہمارے نبی صلعم کے پیارے نواسے جن کا نام حضرت امام حسین علیہ السلام تھا اور اپنے نانا صلعم کی گودی میں کھیل کود کر پلے بڑھے تھے، آپؐ کی وفات کے بعد یزیدی لشکر نے محرم ۶۰ھ میں کربلا کے بَن میں بھوکا، پیاسا۔ بغیر لاؤ لشکر، بے ساز و سامان ہونے کے باوجود حضرت امام حسینؑ کو معہ اُن کے ۷۲ بہترین ساتھیوں کے شہید کر ڈالا۔ محرم کی یادگار اسی سلسلہ میں ہر سال ہوتی ہے اور دُنیا کے ہر حصّہ میں لوگ ۱۰ محرم کو امامؑ کے غم میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کی نیکی اور بھلی باتوں کو یاد کرتے اور ساری دُنیا کو اچھی تعلیم کا سبق دیتے ہیں۔ جب حر ریاحی فوجِ یزید کا سپہ سالار سب سے پہلی مرتبہ امام حسینؑ کے ساتھیوں کو روکنے آیا تھا اور کربلا کے میدان کے قریب اُس سے حضرت حسینؑ سے مُلاقات ہوئی تھی تو حر ریاحی اور اُس کی فوج کے پاس پانی بالکل نہ رہا تھا۔

——— یہ تاریخی واقعہ ہے اور اسے حضرت نجم آفندی نے بچوں کے لئے لکھا ہے۔

سیّدہ تصدّق بلگرامی

ملک عرب کا تپتا جنگل   دھوپ سے ذرّہ ذرّہ بے کل
قہر کی گرمی وقت ستم کا   خشک ہے پانی دیدۂ نم کا
شعلہ بکف ہیں لُو کے تھپیڑے   ڈوب رہے ہیں خشکی میں بیڑے
رو بہ رضا ہیں چند مُسافر   راہِ طلب میں صابر و شاکر
مصحفِ حق کے بِکھرے پارے   فرشِ زمیں پر چاند ستارے
گورے چہرے، زُلفیں کالی   پیوست ابرو، آنکھ غزالی

تن میں اُجلے اُجلے جامے سب کے سروں پر سبز عمامے
لانبے نیزے، تیغیں دو دھاری گھوڑے جیسے باد بہاری
مکّے والے، مدینے والے اپنے نبیؐ کے رشتے والے
ساری خدا کی شان کی باتیں آپس میں قرآن کی باتیں
فخر عجم کے، فخر عرب کے شاہ شہیداں آگے سب کے
ایک کے پیچھے ایک عماری ناقوں کے اوپر بی بیاں ساری
گود میں ننھے ننھے بچّے جیسے گلوں میں موتی سچّے

(۲)

چھوٹا سا اِک شامی لشکر حرؓ ریاحی جس کا افسر
اُن کا رستہ روکنے آیا شیر دلوں کو لوٹنے آیا
آیا۔ لیکن پیاس کا مارا مرنے کے وسواس کا مارا
سب کے لبوں پر پیاس سے جانیں مُنہ سے باہر خشک زبانیں

(۳)

اب پتلا حال جو دیکھا دُشمن کو پامال جو دیکھا
جوش میں آئے "کوثر والے" ابرِ کرم کے برسے جھالے
ایک خیال و خواب تھا پانی کوسوں تک نایاب تھا پانی
بچّوں کا بھی دھیان نہ آیا خوب پلایا۔ خوب لُٹایا
مشک ہر اِک مُنھ کھول رہی تھی تشنہ لبوں سے بول رہی تھی
عام کرم کی شان دکھائی گھوڑوں کی بھی پیاس بجھائی

ایک نہ رکھّا قطرہ پانی
واہ ری ہمّت، واہ رے ساقی



اندرا گاندھی

میری ماں

(شریمتی اندرا گاندھی پنڈت جواہر لال نہرو کی صاحبزادی ہیں۔ آپ نے اپنی ماں، شریمتی کملا نہرو کے بارے میں حال ہی میں آل انڈیا ریڈیو سے تقریر کی تھی۔ اس میں انھوں نے اپنی ماں کے بارے میں بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ اس کو پڑھنے کے بعد آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ ہمارے پنڈت جی پر ان کی بیوی شریمتی کملا نہرو کا کتنا اثر پڑا ہے۔ ہم اس مضمون کو آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے شائع کر رہے ہیں)

ادارہ

"میری ماں" اس سلسلے میں بیٹی کے لئے کچھ کہنا کتنا مشکل ہے۔ دل میں ہزاروں تصویریں آتی ہیں، کون سی آپ کے سامنے رکھوں۔ اپنے غم کو بھلانے کے لئے برسوں سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن آج آپ کے سامنے ان کا پردہ کھولتی ہوں۔ کوئی خاص بات تو بتلا نہیں

سکتی۔ کیونکہ ہماری زندگی لوگوں کے سامنے کھلی ہوئی کتاب کی طرح پڑی ہے اور آپ بھی اس سے واقف ہوں گے۔ سب سے پہلی بات جو مجھے یاد ہے وہ اس زمانے کی ہے جب گاندھی جی کچھ برسوں سے ہندوستان میں آئے تھے اور ستیہ گرہ، سودیشی اور کھادی جیسے انقلابی خیال پیدا ہوئے تھے ان کا اثر میرے والد یعنی پنڈت جواہر لال نہرو اور دادا یعنی پنڈت موتی لال نہرو پر بڑا گہرا پڑا۔ دعوتیں بند ہوئیں۔ مخمل اور ساٹن نہ صرف اتار دئے گئے بلکہ یہ جوڑے پر خوب چمکتی رنگ برنگ کی گدڑی بنا کر جلا بھی دیئے گئے۔ کھادی پہننے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور وہ کھادی بھی کیسی تھی، کھردری ٹاٹ جیسی موٹی ماں کا سارا جسم چھل جاتا تھا۔ لیکن اس لباس میں بھی ان کی خوبصورتی اور نزاکت پھول جیسی کھلتی تھی۔

گہنے کپڑے کا ان کو کبھی شوق نہ تھا۔ بچپن میں اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیلتی اور گھومتی پھرتی تھی۔ کیونکہ ان کی بہن ان سے بہت چھوٹی تھیں۔ اسی عادت کی وجہ سے ایک بار ان کو کافی پریشانی بھی اٹھانی پڑی۔ جب وہ نو یا دس سال کی تھیں تو کچھ دنوں کے لئے سارا خاندان جے پور گیا۔ وہاں پر سخت پردہ تھا اور کملا جی سے کہا گیا کہ وہ صرف ڈولی میں بیٹھ کر باہر جا سکیں گی۔ رونے پیٹنے سے کچھ نہیں ہوا، لیکن جس کو ابھی تک پوری آزادی تھی وہ اس قید میں کیسے رہے۔ جب دیکھا کہ ان کا چہرہ اترتا جا رہا ہے اور دن بدن وزن گھٹ رہا ہے تو میری نانی بہت گھبرائیں۔ آخر انھوں نے ایک ترکیب سوچی۔ اس دن سے روزانہ صبح وہ اپنے بھائی کے کپڑے پہن کر اور بالوں کو پگڑی میں چھپا کر بھائیوں کے ساتھ گھومنے جاتی تھی۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلا لیکن ان کے دماغ پر اس کا گہرا اثر پڑا اور وہ ہمیشہ پردے کے خلاف رہیں۔

ایک بار اور بھی انھوں نے مردانہ کپڑے پہنے۔ یہ بات سنہ ۱۹۳۰ء کی ہے جب وہ کانگریس کی والنٹیر بنی تھیں۔ مجھے بھی بچپن میں اکثر لڑکوں کے کپڑے پہناتی تھیں۔ اس سے لوگوں کو بڑی حیرت ہوتی تھی۔ اکثر لوگ

مجھ سے پوچھتے تھے " تمھارا بھائی کہاں ہے؟" میں جواب دیتی کہ " میرا کوئی بھائی نہیں ہے" تو کہتے ۔ " واہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے" یہ اشارہ میری ماں کی طرف ہی ہوتا ۔

سترہ برس کی عمر میں جب وہ اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر " آنند بھون " کی چمک دار دنیا میں آئیں تو ان کو کیا معلوم تھا کہ انھیں کس لمبے اور دکھ بھرے راستے پر چلنا ہوگا ۔

اس وقت تو میرے دادا (پنڈت موتی لال نہرو) کی وکالت خوب چل رہی تھی اور وہ صوبے کے سب سے بڑے آدمیوں میں گنے جاتے تھے ۔ وہ بڑے دل و دماغ کے آدمی تھے ۔ شوقین طبیعت تھے ، جتنا کماتے تھے اسی انداز سے خرچ کرتے تھے ۔ ہمارا گھر ہمیشہ مہمانوں سے بھرا رہتا تھا ۔ طرح طرح کے لوگ ، بڑے بڑے افسر ، مصنف ، شاعر ، انگریز ہندوستانی وغیرہ ـــ روز دعوتیں ہوتیں ، اور دادا جی کی خوشی سے گھر گونج اٹھتا ۔ گھر کے دو حصے تھے ایک طرف انگریزی قسم کے بیٹھنے اٹھنے اور کھانے کے کمرے تھے ۔ اور دوسری طرف دیسی طریقے کے ۔ روز دونوں طرح کے کھانے تیار ہوتے ۔ میری پھوپی کی میڈن انگریز تھی اور ہمارا موٹر ڈرائیور بھی ایک انگریز مسٹر ڈکسن نامی تھا ۔ کشمیری گھروں میں عورتیں پردہ نہیں کرتیں اور میری دادی ولائت گھوم آئی تھیں ۔ گھر کی دیکھ بھال اور مہمان نوازی کا بوجھ زیادہ تر میری ماں پر پڑا ۔ نئے طریقے سیکھ رہی تھی کہ زندگی پلٹ گئی اور سارا خاندان بڑے زوروں سے کانگریسی تحریک میں حصہ لینے لگا ۔ طرح طرح کی تکلیفیں شروع ہوئیں لیکن انھوں نے اپنے حوصلے اور ہمت سے گاندھی جی پر بھی کچھ اثر ڈالا ۔ کیونکہ گاندھی جی نے خاص طور پر عورتوں سے اپیل کی کہ وہ بھی باہر نکلیں اور کام کا بوجھ اٹھانے میں اپنے بھائیوں کی مدد کریں ۔ ماں اپنے بچپن کا وعدہ بھولی نہیں تھیں ۔ وعدہ تھا زندگی میں جہاں بھی جائیں عورتوں کو پردے سے نکالنے کا اور انھیں یہ سمجھانے کا کہ وہ اپنے حقوق کے لئے کس طرح لڑیں ۔ ان کے کہنے سے ہزاروں عورتیں کانگریس کا کام کرنے نکلیں ۔ ماں کو اب بیماری گھیر رہی تھی تب بھی وہ کانگریس کی والنٹیر بنیں اور اسی طرح لوگوں میں کام کرتی رہیں ۔ بعد میں

جب لیڈروں کو گرفتار کیا جانے لگا تو وہ اور بھی حوصلے کے ساتھ کام میں لگ گئیں اور انھوں نے الہ آباد شہر اور ضلع کی تنظیم کا کام اتنی اچھی طرح نبھایا کہ سب دنگ رہ گئے۔ سب نے ان کی قابلیت کی داد دی، ان کے شوہر جواہر لال جی اور سسر موتی لال جی تو یہ دیکھ کر پھولے نہیں سماتے تھے۔ لیکن سب کو بس ایک ہی فکر تھی۔ ان کی صحت آہستہ آہستہ خراب ہو رہی تھی، مگر وہ کسی کی سنتیں بھی کب تھیں۔ سنہ ۳۰ء میں وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ممبر ہوئیں اور کچھ دنوں کے بعد ہی گرفتار کر لی گئیں۔ گرفتاری کی خبر رات ہی کو مل گئی تھی۔ اس رات ہم سب جاگتے رہے ایسے موقع پر بھی انھیں دوسروں ہی کا خیال رہتا، جو بھی کام ادھورے رہ گئے تھے انھیں پورا کرنے کے لئے کوشش کرتیں تاکہ ان کے جانے کے بعد کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

کہتے ہیں کہ جب انسان پر دکھ اور مصیبت پڑتی ہے تب ہی اس کا اصلی چہرہ منظر آتا ہے جو کمزور ہوتے ہیں تو یہ دکھ درد ان کی کمر توڑ دیتا ہے لیکن جو بہادر ہوتے ہیں وہ اس دکھ سے کچھ سبق سیکھ کر اور آگے بڑھتے ہیں اور پھر ان میں سے چھپی ہوئی طاقت اور سندرتی حسن چمک اٹھتا ہے۔ کملا جی ایک ایسی ہی شخصیت تھیں۔ ڈانٹتی تو وہ کبھی بھی نہ تھیں یہاں تک کہ اونچی آواز تک سے نہ بولتیں۔ لیکن ان کا اثر ایسا تھا کہ جو کہتیں وہی ہوتا تھا۔ ہمارے یہاں پنڈت مدن موہن مالوی کے بھتیجے سنسکرت پڑھانے آتے تھے وہ ماں کی بہت عزت کرتے اور ان سے ڈرتے بھی تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی کہ اتنی سبک اور دبلی پتلی عورت سے ڈر کیسا۔ پنڈت جی کہتے "ارے تمھیں نہیں معلوم یہ بڑی طاقت کی دیوی ہیں جو چاہیں کر سکتی ہیں۔" اس پر ماں ہمیشہ ہنستی تھیں۔ لیکن کوئی طاقت ان میں ضرور تھی کیونکہ جو بھی ان سے ملتا اس پر گہرا اثر پڑتا۔ میرا تو خیال ہے کہ میرے والد پر بھی ان کے گہرے خیالات کا گہرا اثر پڑا۔ اکثر ان کے پاس سادھو مہاتما بھی آکر بیٹھتے تھے۔ عام طور پر جیسے پوجا پاٹ ہوتا ہے اس سے وہ بہت بگڑتی تھیں، کہتی تھیں کہ جو لوگ ایشور کا نام لیتے ہیں، لیکن

دل میں طرح طرح کی باتیں سوچتے رہتے ہیں، ان کو ہی ظاہری مذہب کی ضرورت ہوتی ہے۔ مندر جانا بھی اسی وجہ سے پسند نہیں کرتی تھیں لیکن میری ماں بڑی عبادت گذار تھیں۔ روز ہم لوگوں کو گیتا اور رامائن پڑھاتی تھیں، جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی گئی ان کی عبادت بھی بڑھتی گئی ایک اندرونی طاقت بھی بڑھتی گئی۔ بعد میں وہ اکثر ندی کے کنارے گھنٹوں بیٹھی رہتیں۔

خدمت کا جذبہ تو ان میں تھا ہی غریبوں کی پڑھائی اور ان کی صحت سے خاص طور پر دلچسپی لیتیں۔ ۱۹۲۸ء میں جب میرے دادا نے اپنا بڑا گھر کانگریس کو دیدیا اور اس کا نام "سوراج بھون" رکھ دیا تو ماں نے اس کے ایک حصے میں اپنا اسپتال کھولا۔ ۳۶ برس کی عمر میں انھوں نے اپنے گھر اور پیارے ملک سے ہزاروں میل دور وفات پائی۔ وہ آخر تک مسکراتی رہیں اور اُلٹے ہم لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ ان کی آخری خواہش تھی کہ ان کا اسپتال بند نہ ہونے پائے اسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے مہاتما گاندھی پنڈت مدن موہن مالوی اور دوسرے لوگوں نے ان کی یادگار کے طور پر الٰہ آباد میں عورتوں کے لئے اسپتال کھول دیا۔ جو کملا نہرو اسپتال کے نام سے مشہور ہے۔ سینکڑوں میل سے یہاں مریض آتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اپنی زندگی میں وہ جیسی خدمت کرتی تھیں ویسی ہی خدمت اب بھی ان کے نام سے ہو رہی ہے۔

(ریڈیو، دہلی)

اشرف النساء اشرف

ریڈیائی ڈراما

سکندر کے دربار میں

داستان گو: سکندر اعظم پورے جاہ و جلال کے ساتھ تخت شاہی پر جلوہ افروز ہے۔ حاضرین دربار اپنے اپنے مرتبہ کے لحاظ سے باادب بیٹھے ہیں۔ سلطنت کے کاموں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے اتنے میں چوبدار آکر عرض کرتا ہے۔

چوبدار: عالم پناہ کا اقبال بلند ہو۔ سپہ سالار چند سپاہیوں کے ساتھ ایک ڈاکو کو لئے ہوئے آئے ہیں اور حضور کے دربار میں آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

سکندر: آنے دو۔

(قدموں کی آواز)

افسر: جب تک کہ اس زمین پر آسمان کا سایہ رہے۔ فتح اور نصرت ہمیشہ قدم چومے۔ اقبال شہنشاہی کے باعث آج وہی ڈاکو حضور کی خدمت میں پیش ہے جس کے سبب ساری رعایا پریشان تھی۔

سکندر: تو کیا یہ وہی سفاک ڈاکو ہے۔ جس نے ہماری سلطنت میں طوفان مچا

رکھا ہے۔

ڈاکو: تعجب ہے۔ جہاں پناہ جیسا سمجھدار مجھ کو سفاک اور لٹیرا قرار دے رہا ہے۔ عالم پناہ نہ میں سفاک ہوں، نہ ڈاکو۔ میں بھی آپ ہی جیسا شہ زور اور بہادر ہوں۔

سکندر: بدتمیز! تو ڈاکو ہے۔ رہزن ہے، قاتل ہے۔ تو تو ظلم کا پُتلا ہے۔ ایک آفت ہے۔ جس سے میری کمزور رعایا حیران و پریشان ہے۔ اس ظلم کے بعد بھی تجھے اپنی عزّتِ نفس کا خیال ہے۔ آج تیرے ظلم کی تجھ کو سزا ملے گی۔

ڈاکو: خداوند! اس وقت آپ تخت و تاج کے مالک ہیں اور میں ایک مجبور قیدی کی حیثیت سے پیش ہوں۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ اگر آپ کا ستارہ گردش میں آجائے تو پھر آپ مجھ سے بھی گئی گزری حالت پر پہنچ سکتے ہیں۔ اس وقت میں آپ کے ہاتھ میں ہوں۔ آپ کے ایک اشارے پر میرا سر میرے بدن سے جُدا ہوجائے گا۔ لیکن میں سچّی بات کہنے سے کبھی نہیں رہ سکتا۔

سکندر: کون سی سچّی بات؟

ڈاکو: سچ تو یہ ہے کہ جتنے الزامات آپ مجھ پر لگا رہے ہیں اُن کے آپ بھی میرے برابر کے شریک ہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی۔ آپ مجھ سے بڑے لٹیرے ہیں۔ مجھ سے بڑے ڈاکو ہیں۔

سکندر: بدبخت! میں نے اپنی زندگی مردانگی اور بہادری میں گزاری ہے۔ میری شہرت سورج کی روشنی کی طرح ساری دُنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ میرا وقار، میری عزّت، اور میری سلطنت اس بات کا کھُلا ثبوت ہے۔ بڑے بڑے مغرور شہنشاہ میری عزّت کرتے ہیں۔ اور مجھ سے ڈرتے ہیں۔

ڈاکو: خداوندِ نعمت! میری بہادری میں بھی آپ کو کسی قسم کا شک، و شبہہ نہ ہونا چاہیئے۔ میرے سینے پر زخم کے نشانات آپ سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ یقین نہ ہو تو گن لیجئے لیکن پیٹھ پر ایک بھی خراش نہیں۔ اس لئے کہ میدان سے پیٹھ دکھاکر آج تک نہیں بھاگا۔ ہمّت اور بہادری میں میرا کوئی ہم پلّہ نہیں۔ آپ ہی بتایئے کہ آپ کی نظر میں کبھی کوئی مجھ جیسا بھی گزرا ہے۔ کیا میں بہادری میں آپ سے کم ہوں؟

سکندر: تو کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو۔ مگر ہے تو ایک ظالم ہی۔ جو خلقِ خدا کے لئے وبال بنا ہوا ہے۔

ڈاکو: جہاں پناہ! یہ الزام جو آپ مجھ پر لگا رہے ہیں آپ پر بھی لگتا ہے۔ میں نے دو چار ہی آبادیاں برباد کی ہوں گی۔ لیکن آپ!........ آپ نے ملکوں کے فتح کرنے کی ہوس میں نہ جانے کتنے ملکوں کو برباد کر ڈالا کتنی عورتوں کا سہاگ لوٹا، کتنے ہی بچوں کو یتیم کیا۔ میں ایک آبادی کے لئے فتنہ ہوں تو آپ امنِ عالم کے لئے خطرہ ہیں۔ ذرا اپنے گریبان میں منھ ڈالیے کہ میں نے زیادہ بچوں کو یتیم کیا ہے یا آپ نے۔ آپ نے کتنی عورتوں کا سہاگ چھینا ہے اور میں نے کتنی عورتوں کا۔ میرا مظلوم ممکن ہے کوئی گمنام ہو۔ لیکن آپ کے مقتول شہنشاہ "دارا" کا نام ایران کا بچہ بچہ جانتا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ اس کے غم میں میرا کیا حال ہے۔ میں اگر ایک معمولی لٹیرا ہوں تو آپ بڑے لٹیرے ہیں۔ آپ پہلو کیوں بدل رہے ہیں؟ بے چین کیوں ہو رہے ہیں۔

سکندر: گستاخ! ہم نے ملک فتح کیے ہیں تو حق داروں کو ان کے حق بھی دیئے ہیں۔ میں ملکوں ہی کا مالک نہیں ہوں۔ دلوں کا بھی بادشاہ ہوں۔ راجا پورس کو میں نے........

ڈاکو: (بات کاٹ کر) بندہ پرور! میرا بھی یہی شعار رہا ہے۔ میں نے دولت مندوں سے مال و دولت ضرور چھینا ہے۔ لیکن ناداروں کو بے حساب بانٹا بھی ہے۔ خدا گواہ ہے۔ میں نے بے بسوں اور لاچاروں کی خاطر سینکڑوں مرتبہ اپنی جان جوکھوں میں ڈالی۔ ظالموں کی سرکوبی بھی کی ہے۔ اور اسی لئے غریبوں کی دعائیں بھی لی ہیں۔ آپ نے حکومت سنبھالی ہے۔ میں نے جماعت بنائی ہے۔ آپ نے فوج تیار کی ہے۔ میں نے ایک گروہ ترتیب دیا ہے۔ میری یہ غریب نوازی کچھ نہیں تو آپ کی امراء پروری بھی کچھ نہیں——

سکندر: (غصے میں) کمینے!! چپ بھی رہتا ہے یا نہیں۔

ڈاکو: (جوش میں) اے سکندرِ یونانی!

تو مجھے کہنہ کہہ کر میری خاندانی شرافت پر دھول اُڑا رہا ہے ــــ کیا تو نہیں جانتا کہ جو جان سے ہاتھ اُٹھا چکا ہو اور خاک و خون میں تڑپنے کے لئے تیار ہے۔ اگر وہ تجھ کو بھی ترکی بہ ترکی جواب دے تو اس کو کونسی چیز روک سکتی ہے۔ تو نے میری شرافت پر دھبہ لگانے کی کوشش میں اپنی شرافت کھودی۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں تجھے گالی دے کر اپنی زبان نہیں خراب کرنا چاہتا ــــ ایک مرنے والے سے سبق سیکھ لے کہ کس وقت، کس کو، کیا کہنا چاہیئے ــــ میں اب تک تجھ کو عاقل، فرزانہ، غیور، اور خود دار سمجھتا تھا ــــ لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ باتیں تجھ میں نہیں ہیں۔

سکندر: نادان! تجھ کو قدرت نے زبان عطا کی ہے عقل نہیں ــــ میں جانتا ہوں کہ مرنے والے کہنے اور کرنے سے نہیں ڈرتے۔ تو بھی یاد رکھ بادشاہوں سے اس طرح باتیں نہیں کرتے ــــ تو عاقل نہیں ــــ میں تنگ دل نہیں ــــ

(بقیہ دیکھئے صفحہ ۲۳ پر)

رام نرائن جوہر



ریشم کی کہانی

آپ نے نرم نرم ریشمین کپڑا تو اکثر دیکھا ہوگا، اور یہ ریشمین کپڑا پہننے میں کتنا اچھا لگتا ہے۔ لیکن کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ یہ ریشم سب سے پہلے کہاں تیار ہوا اور کیسے بنتا ہے۔ آیئے ہم آپ کو اس کی کہانی سنائیں۔ یہ کہانی بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز ہے۔ آج سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے کی بات ہے کہ چین کا ایک بادشاہ اپنی لڑکی کو محل کی چہار دیواری سے باہر نہ جانے دیتا تھا۔ اس نے اپنے محل کے اندر ہی ایک خوبصورت باغ لگوا دیا تھا۔ شہزادی اس طرح محل میں پڑے پڑے گھبرانے لگی۔ آخر جب کسی طرح اس کی طبیعت نہ لگی تو پھر اس نے باغبانی سے دلچسپی لینی شروع کر دی۔ اس نے اپنے باغیچے میں طرح طرح کے پھل دار درخت اور ہر قسم کے پھول لگا رکھے تھے۔ اس کے باغ میں بہت سے پیڑ شہتوت کے بھی تھے۔ ایک دن شہزادی اپنے باغ میں ٹہل رہی تھی۔ اس کا جی گھبرا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر شہتوت کے پیڑ پر جا کر جم گئی۔ اس نے شہتوت کے پتوں پر کچھ انوکھے کیڑے دیکھے۔ یہ کیڑے جلدی جلدی شہتوت کے پتے

کھا رہے تھے۔ اِن کے جبڑوں سے ایک ہلکی سی آواز آرہی تھی جو شہزادی کو بہت بھلی لگی۔ اب تو شہزادی کا روزانہ کا معمول تھا کہ وہ شہتوت کے پیڑوں کو بیٹھ کر دیکھتی رہے۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ ان کیڑوں نے اپنے چاروں طرف ایک جالا بنانا شروع کر دیا ہے۔ ایک دن وہ اپنے چھوٹے سے گھونسلے میں بالکل چھپ گئے۔ اب وہ گیند کی شکل بن کر لٹک گئے۔ یہ دیکھ کر شہزادی سے صبر نہ ہو سکا۔ وہ بے چین ہو گئی۔ اس نے سمجھا کہ وہ ننھے مُنے کیڑے اپنے بنائے ہوئے جال میں پھنس کر ہی دَم توڑ چکے ہیں۔ اس کو بے حد افسوس ہوا اور اس نے شاہی طریقے سے اُن کی تجہیز و تکفین کرنے کا ارادہ کیا اور ایک بڑی دعوت کا انتظام کیا۔ وہ اتنی گھبرائی ہوئی اور پریشان تھی کہ ایک مُردہ کیڑا اس کے ہاتھ سے چھُٹ کر کھَولتے ہوئے پانی میں گر گیا۔ شہزادی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے جو وہ کیڑا پانی سے نکالا تو ایک باریک اور چمکدار نرم سا تار اُس کی اُنگلیوں میں لپٹ گیا۔ شہزادی نے ہوشیاری سے وہ تار دھیرے دھیرے نکالنا شروع کیا۔ یہ تاگا کافی لمبا نکلا۔ شہزادی دَوڑی دَوڑی اپنی ماں "سی لنگ چی" کے پاس گئی اور اُسے سارا حال کہہ سُنایا۔

"سی لنگ چی" بڑی سمجھدار تھی اس نے بڑی احتیاط سے اس تاگے کا ایک گچھا سا بنا لیا۔ اس طرح ایک کیڑے سے ریشم کا وہ تاگا ملا جس سے آگے چل کر ریشم کی صنعت وجوُد میں آئی۔ چین کے باشندے آج بھی "سی لنگ چی" کا نام عزّت سے لیتے ہیں اور اسے ریشم کے کیڑے کی دیوی کہتے ہیں۔

ریشم ایجاد تو ہو گیا لیکن عرصے تک اس کا راز باہر کے ملکوں کو نہ معلوم ہو سکا۔ اس لئے کہ وہ بادشاہ جو اپنی لڑکی کو محل کی چہار دیواری کے باہر جانے نہ دیتا ہو وہ اس دریافت کو باہر کے دیسوں میں کیسے جانے دیتا۔

۳۳۰ء قبل مسیح میں جب سکندر اعظم ایشیا کے بہت سے ملکوں کو جیت کر اپنے

ملک واپس ہونے لگا تو ہیرے جواہرات کے علاوہ اپنے ساتھ کچا ریشم بھی لے گیا۔ لیکن اس طرح اسے ریشم بنانے کا طریقہ نہ معلوم ہو سکا۔

جاپان تو چین کا پڑوسی ملک ہے لیکن چینیوں نے اپنی اس نئی دریافت کو اُن سے بھی چھپایا۔ لیکن جاپانی اس راز کو دریافت کرنے کے لئے بے چین تھے۔ آخر وہ چین کے ایک گاؤں سے چند چینی لڑکیوں کو پکڑ کر لے ہی گئے، ان لڑکیوں کی مدد سے انھوں نے ریشم بنانے کا طریقہ معلوم کیا۔

کہا جاتا ہے کہ بہت کافی دنوں کے بعد چین کی ایک شہزادی نے ہندوستان کے ایک بادشاہ سے شادی کرلی اور پھر اپنے بالوں کے جوڑے میں ریشم کے کیڑے چھپا کر ہندوستان لائی۔ اور اُس نے یہاں آکر ریشم کی صنعت شروع کرائی۔ یہیں سے ریشم کا کیڑا ایران اور یورپ وغیرہ بھی گیا۔ روم کے ایک بادشاہ نے ۵۲۷ء میں ایران کے دو مذہبی رہنماؤں کو خفیہ طریقے سے ہندوستان بھیجا۔ ان ہی لوگوں نے بہت سے انڈے چھپا کر قسطنطنیہ بھجوائے۔

چینیوں نے اس طرح اپنی اس دریافت کو کافی دنوں تک دُنیا سے چھپا رکھا۔ لیکن پھر بھی بہت دنوں تک نہ بچا سکے اور یہ صنعت دُنیا کے کونے کونے میں پہنچ گئی۔ اور آج تو ریشم، فرانس، جینوا، وینس، سیلون، اٹلی جاپان، ایران، پاکستان میں کثرت سے پیدا کیا جاتا ہے۔

ریشم کے کیڑے کی خوراک شہتوت کے درخت کے پتے ہیں۔ یہ کیڑے سرد ملکوں کی بہ نسبت گرم ملکوں میں زیادہ اچھی طرح رہ سکتے ہیں۔ ہندستان میں سب سے زیادہ ریشم صوبہ بنگال میں تیار کیا جاتا ہے۔ ریشم کی فصلیں سال میں تین بار ہوتی ہیں۔ مارچ جولائی اور نومبر میں۔

یہ کیڑے باریک کاغذ یا ململ پر بٹھائے جاتے ہیں۔ ململ کی سفید چادر پر ننھی ننھی بوندوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ ریشم کا کیڑا ۵۰۰ سے ۷۰۰ تک انڈے دے کر اُسی وقت مرجاتا ہے۔ یہ کیڑے شروع میں سیاہ رنگ میں ہوتے ہیں۔ چھ ہفتوں کے بعد مٹیالے اور

سپیدی مائل رنگ اختیار کرکے اپنے جسم پر تاگا لپیٹنے کے لائق ہوجاتے ہیں اور اس طرح ریشم کا "کویا" بنتا ہے۔ ریشم کے کیڑے کے جسم کے دونوں طرف گلٹیاں ہوتی ہیں۔ ان میں گاڑھا لعاب دار مادہ بھرا رہتا ہے۔ جب کیڑا ان گلٹیوں کو دباتا ہے تو لعاب دار باریک دھاگوں کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ ہوا لگتے ہی یہ دھاگے خود بخود مضبوط ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد کیڑے پیروں کو آگے اور پیچھے کی طرف جھکاکر اپنے جسم پر باریک باریک سنہری دھاگے لپیٹ لیتے ہیں اس طرح ایک "کوئے" کے مکمل ہونے میں تقریباً چار دن لگتے ہیں۔

اس کے بعد بڑی احتیاط سے دھاگا نکالا جاتا ہے۔ ایک سیر کچے ریشم کا مضبوط دھاگا تیار کرنے کے لئے ایک تکلا ۵۲ کروڑ ۸۰ لاکھ مرتبہ گردش کرتا ہے۔ اور بہت ہی تیز کام کرنے والا آدمی دن بھر میں صرف ایک سیر ریشم ہی لپیٹ سکتا ہے۔ لیکن اب تو اس کام کو جلد کرنے کے لئے بڑی بڑی مشینیں بنائی گئی ہیں جن میں گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہوجاتا ہے۔ انٹیوں پر چڑھاتے وقت "کویوں" کا اندر اور باہر کا حصہ جو فاضل ہوتا ہے اُسے پھینکا نہیں جاتا بلکہ اس کو توم کر کات لیا جاتا ہے۔

اب پانی میں صابن ملاکر کچے ریشم کی انٹیاں اُبالی جاتی ہیں اس سے انٹیوں کا وزن کم ہوجاتا ہے پھر اس کی پورا کرنے کے لئے پہلے ایک ٹین کا ٹکڑا ایک انگریزی دوا کی مدد سے گلایا جاتا ہے پھر اس میں پانی ڈال کر انٹیاں تر کرلی جاتی ہیں۔ اس طرح جن انٹیوں کا وزن ۱۳ چھٹانک رہ گیا تھا وہ اب ۲۰ سے ۶۰ چھٹانک تک وزنی ہوجاتی ہیں اور آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ اس طرح بعض ریشمی کپڑوں میں آدھے سے زیادہ ٹین کا جزو بھی شامل ہوتا ہے۔

چونکہ ریشم بہت قیمتی ہوتا ہے اس لئے اب نقلی ریشم بھی تیار کیا جانے لگا ہے۔ یہ ریشم اصلی ریشم سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ اس میں چمک تو بالکل اصلی ریشم کی سی ہوتی ہے لیکن چھونے سے اصلی اور نقلی کا پتہ چل جاتا ہے۔

(بقیہ دیکھئے صفحہ ۴۵ پر)

عبدالحسیب ملک



مغرور لڑکا

لطیف اور رحیم دونوں شہر کے بڑے اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لیکن دونوں کے گھر مختلف گاؤں میں تھے۔ لطیف کے والدین دولت مند اور باحیثیت تھے۔ لطیف بڑے ناز و نعم سے پلا تھا۔ جو بھی خواہش کرتا، اسے پورا کروا لیتا۔ نہیں تو سارا گھر سر پر اٹھا لیتا۔ اسی وجہ سے اس کی طبیعت میں دھیرے دھیرے غرور پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی حیثیت سے کم لوگوں سے ملنا پسند نہ کرتا۔ اسکول میں بھی الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا۔ اسی لئے ساتھیوں میں بہت کم لڑکے اُسے جانتے۔ برخلاف اس کے رحیم ایک معمولی کسان کا بیٹا تھا۔ بہت ہی نیک اور سیدھا سادا لڑکا تھا۔ سکول میں لڑکوں سے بھی خوب گھل مل کر رہتا۔ لڑکوں کی عزت کرتا۔ دوسرے لڑکے بھی اس کی عزت کرتے۔

چھٹیوں کے دنوں میں کسی کام سے لطیف شہر گیا۔ جب گھر واپس آنے لگا تو شام ہو گئی اور اندھیرا بڑھنے لگا۔ رات کا وقت تھا اور اکیلے سفر سے اُسے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ جس راستے سے گذر رہا تھا اس راستے پر رحیم کا گاؤں تھا۔ رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کو دیکھ کر

وہ سوچنے لگا کہ رحیم کے گھر ٹھیر جائے لیکن گھمنڈی طبیعت روکتی تھی اور نہ جانے دیتی تھی کہ ایک غریب اور مفلس ساتھی کے یہاں رات بسر کرے۔ دل پر بہت زور ڈالا لیکن اندھیری اور ڈراؤنی رات کو دیکھتے ہوئے مجبوراً رحیم کے گھر جا پہنچا۔ رحیم کا باپ بہت ہی شریف اور سمجھدار آدمی تھا وہ یہ بھی جانتا تھا کہ لطیف مالدار ماں باپ کا بیٹا ہے اور پھر اس کے بیٹے کا ساتھی بھی، اس لیے اس کی جتنی بھی آؤ بھگت کی جائے تھوڑی ہے۔ اس نے اپنی حیثیت کے مطابق بہتر سے بہتر کھانا میز پر سجا کر رکھ دیا۔ لیکن بھلا لطیف ایسے کھانے کو کیسے پسند کرتا۔ دو چار لقمے کھا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ چہرے کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے کھانا پسند نہیں آیا۔ رحیم کا باپ سمجھ گیا کہ اسے یہ کھانا پسند نہیں۔ لطیف کے سونے کا انتظام کر دیا گیا۔ صاف اور نرم بستر دیا گیا تاکہ آرام سے سو سکے۔ لطیف کو اس پر سوتے ہوئے بھی شرم آئی لیکن کیا کرتا مجبوری جو تھی۔

گھر کے سب لوگ سو گئے لیکن لطیف کو نیند نہ آئی۔ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ ایک تو وہ پہلے ہی تھکا ماندا تھا۔ اس پر غرور کی وجہ سے بہت کم کھایا تھا۔ بھوک بُری طرح پریشان کر رہی تھی۔ کروٹیں بدلنے لگا لیکن نیند نہ آنا تھا نہ آئی۔ آدھی رات کو بالکل بے چین ہو گیا اور اُٹھ کر آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ سب لوگ بے خبر سو رہے تھے۔ گھر میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ دبے پاؤں باورچی خانے میں پہنچا۔ شاید وہاں کچھ کھانے کو مل جائے۔ لیکن سوائے دو انڈوں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ بھوک کی حالت میں اس نے دو انڈوں کو ہی غنیمت جانا۔ اتنے میں رحیم کے باپ نے سوتے سوتے کروٹ بدلی۔ لطیف ڈر گیا اندھیرے میں دھیرے دھیرے پلنگ کی طرف بڑھا۔ راستے میں کچھ برتن پھیلے ہوئے تھے۔ اتفاق سے لطیف کا پیر اُن سے جا ٹکرایا اور آواز پیدا ہو گئی رحیم کا باپ آواز سنتے ہی جاگ اُٹھا۔ سمجھا کہ گھر میں چور گھس آیا ہے اور چیزیں ٹٹول رہا ہے۔ دیا جلایا۔ گھبراہٹ

میں لطیف کو انڈے چھپانے کی جگہ نہ ملی اس نے جلدی میں دونوں انڈے منہ میں بھر لئے۔ اب تو منہ پھول گیا رحیم کا باپ دیکھتے دیکھتے لطیف کے پلنگ تک جا پہنچا۔ لطیف کو پلنگ پر بیٹھا دیکھ کر بولا "کیا آپنے بھی کوئی آواز سنی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چور گھر میں داخل ہوا ہے۔ لطیف چُپ رہا وہ بول نہیں سکتا تھا۔ رحیم کے باپ نے سمجھا کہ شاید ناراض ہے۔ اس لئے کئی بار پوچھا لیکن کچھ جواب نہ ملا۔ لطیف کے منھ کے پاس دیا لے جاکر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس کا منھ پھولا ہوا تھا۔ سمجھ گیا کہ اس کے منھ میں تکلیف تھی اِس لئے جواب نہ دے سکا۔ رحیم اور اس کی والدہ کو فوراً جگایا۔

اس گاؤں میں ایک ڈاکٹر تھے۔ جو بہت کم بولتے تھے۔ لیکن اپنی چھٹی کے زمانے میں گاؤں آجایا کرتے۔ کیونکہ یہیں ان کا آبائی مکان اور جائداد تھی۔ جب بھی آتے تو ان کے یہاں بھیڑ لگی رہتی۔ اس طرح ان کا وقت بھی اچھی طرح گذر جاتا اور گاؤں کے لوگوں کا بھی بھلا ہو جاتا۔

رحیم دوڑا دوڑا ڈاکٹر کے پاس گیا، اُن کو اٹھایا۔ ڈاکٹر صاحب پوچھنے لگے کہ اِس وقت کیسے آنا ہوا۔ سب خیریت ہے؟ رحیم نے بتایا کہ اس کا ایک ساتھی رات بسر کرنے آیا اور تکلیف میں مبتلا ہو گیا۔ اس لئے ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ جلدی چلئے۔ ڈاکٹر نے جاکر اس کے منھ کو اچھی طرح دیکھا اور کہا کہ منھ کے اندر زخم ہو گیا ہے آپریشن کرنے کی ضرورت ہوگی۔ رحیم کے باپ نے کہا کہ "ڈاکٹر صاحب کیا کہیں یہ رات بسر کرنے ہمارے یہاں آئے اور بے چارے اس مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ یہ بڑے گھر کے لڑکے ہیں۔ اگر ان کو کچھ ہو گیا تو ہماری خیر نہیں۔ کسی طرح بھی انھیں اچھا کر دیجئے۔"

لطیف نے دیکھا کہ معاملہ بڑا بے ڈھب ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر اور آپریشن تک نوبت آچکی ہے۔ آپریشن سے تکلیف بھی ہوگی اور بدنامی بھی۔ اس سے اچھا ہے کہ بڑی تکلیف سے بچنے کے لئے چھوٹی تکلیف اٹھا لینی چاہئے۔ یہ سوچ کر انڈے منھ سے اُگل دیئے۔ یہ دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ رحیم کا باپ سمجھ گیا کہ رات کو

زیادہ بھوک لگنے کی وجہ سے یہ پریشانی اُٹھانی پڑی۔ ڈاکٹر صاحب کو الگ لے جاکر سب کچھ سمجھا دیا۔ ڈاکٹر صاحب بھی مسکراتے ہوئے چلدیئے۔ لطیف شرم سے پانی پانی ہوگیا کسی سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوئی سارا گھمنڈ پاش پاش ہوگیا۔ صبح اُٹھتے ہی بغیر کسی سے ملے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

بقیہ "سکندر کے دربار میں"

جا میں نے تجھے معاف کیا۔ سپاہیو! اس کی بیڑیاں توڑ دو ——— میرا دماغ اس وقت بے قابو ہے۔

داستان گو: اور اس کے بعد سکندر پھر سوچنے لگا۔ کیا واقعی میں ایک بے عقل اور ڈاکو ہوں؟

دُنیا کا سب سے بڑا فاتح ——— سوچ رہا تھا کہ

یہ اُلٹا امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

ریحان احمد

زیبرا



اب سے ہزاروں برس پہلے ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب کہ انسان بھی جانوروں کی طرح زندگی گذارتا تھا۔ جنگلی پھل، پیڑوں کی جڑیں اور کچا گوشت کھانا اور رات کو درندوں کے ڈر کی وجہ سے کسی غار یا پیڑ پر سو جاتا۔ آخر اس کھانے پینے اور رہنے سہنے کی تکلیف سے تنگ آکر، انسان نے جہاں اپنی عقل سے اور بہت سے کام لئے وہاں جانور بھی اس کے بہت کام آئے۔ ان کو اپنی غذا بھی بنایا اور ان سے دوسرے کام بھی لئے۔ سب سے پہلے جانور جو انسان نے اپنے پاس رکھا وہ کتا تھا۔ اس کے بعد گائے بھینس اور گھوڑا۔ بلی سب سے آخیر میں انسان سے مانوس ہوئی۔ گھوڑا بھی پہلے پہل صرف گوشت کھانے کے لئے استعمال ہوا کافی عرصے کے بعد انسان نے اندازہ لگایا کہ گائے بھینس سے گوشت کے علاوہ دودھ بھی مل سکتا ہے جو لذیذ ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین غذا بھی ہے۔

گھوڑا تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ ذرا اس کے کھر بھی دیکھئے گائے بیل کی طرح پھٹے ہوئے

دو دو نہیں بلکہ ایک ہی کھُر ہوتا ہے۔ ٹانگیں پتلی اور مضبوط ہونے کی وجہ سے بہت تیز دوڑتا ہے۔ گدھا اور خچّر بھی گھوڑے سے کتنا ملتا جُلتا ہے۔ اسی طرح 'زیبرا' بھی گھوڑے کے خاندان سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

یوں سمجھیے کہ 'زیبرا' جنگلی گھوڑے کی وہ نسل ہے جو ابھی تک سَدھائی نہیں جا سکی۔ یہ جنوبی افریقہ میں پایا جاتا ہے۔ اس کی کھال کا رنگ ہلکا بھورا ہوتا ہے۔ اور بدن پر کالی کالی بڑی خوبصورت دھاریاں ہوتی ہیں۔ یہ کالی دھاریاں، مُنہ، گردن، کمر اور دُم سب ہی جگہ ہوتی ہیں۔ گھوڑے کی طرح اِس کے بھی ایال ہوتے ہیں مگر چھوٹے چھوٹے ــــ دُم گدھے کی طرح چھوٹی ہوتی ہے مگر سر پر بالوں کا گُچھا سا ہوتا ہے۔

'زیبرے' کی تین قسم کی نسل ہوتی ہیں۔

۱۔ پہاڑی زیبرا: اس کی کھال کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ اس کا قد تقریباً چار فٹ کا ہوتا ہے، پہاڑوں پر رہتا ہے اور بہت تیز دَوڑتا ہے۔

۲۔ ورچل زیبرا: یہ زیبرے سفید، بھورے اور ہلکے پیلے ہوتے ہیں۔ یہ پہاڑی زیبرے سے کچھ بڑے اور موٹے ہوتے ہیں۔

۳۔ گیروی زیبرا: یہ زیبرے گھنے جنگلوں میں رہتے ہیں اور میدان میں نکلنا بہت کم پسند کرتے ہیں۔ ان کے جسم کی بناوٹ پہاڑی زیبرے جیسی ہوتی ہے۔ لیکن اِس کے جسم کی دھاریاں باریک اور گنتی میں زیادہ ہوتی ہیں۔

ہرنوں کا چَوکنّا ہونا تو خیر مشہُور ہی ہے۔ لیکن زیبرا بھی ہرن سے کم چوکنا نہیں ہوتا۔ زرا سی آہٹ ہوئی اور وہ بھاگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسانوں کے قابو میں نہیں آتا اور اس کو پکڑنا بے حد دُشوار ہوتا ہے۔

عام طور پر زیبرا شُترمُرغ کے ساتھ رہتا ہے۔ دُور سے شُترمُرغ کو دیکھتے ہی لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یہیں آس پاس زیبرے کا جُھنڈ بھی ہوگا۔ زیبرے اور شُترمُرغ کی دوستی بڑی پُرانی ہے۔ لیکن اس کے پیچھے زیبرے

کی خود غرضی شامل ہے۔ شتر مرغ کو اپنے قد کی اونچائی کی وجہ سے کافی دور تک نظر آتا ہے۔ اسی لئے جہاں کوئی خطرہ ہوا اور شتر مرغ بھاگا، زیبرے کے جھنڈ کو فوراً معلوم ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی خطرہ ہے، بس وہ بھی اس خطرے سے ہوشیار ہو گیا۔

زیبرا اپنے جسم کی دھاریوں سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔ جب وہ پیڑوں اور پودوں کے درمیان ہوتا ہے اور دھوپ پڑتی ہے تو اس کا رنگ پتّیوں کے سائے سے اتنا گھل مل جاتا ہے کہ شکاریوں کے لئے پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔

زیبرے کا سب سے بڑا دشمن شیر ہے اس لئے کہ وہ شیر کی مرغوب غذا ہے۔ شیر اس کو دیکھ کر دور ہی سے اس پر حملہ کرتا ہے۔ زیبرے کے کان ہمیشہ چوکنے رہتے ہیں۔ اور وہ بھی بہر حال جنگل میں رہتا ہے اس کو ان خطروں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے ان خطروں میں گھرے رہنے کی وجہ سے اس کے سونگھنے دیکھنے اور سننے کی قوت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

زیبرے کا قد ۴ اور ۵ فٹ کے درمیان ہوتا ہے۔

زیبرے کے جھنڈ دن بھر دھوپ میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ لیکن انھیں اس طرح مارے مارے پھرنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ پیڑوں کے سائے میں تو یہ بہت کم بیٹھتے ہیں۔ زیبرے عام طور پر جھنڈوں ہی میں رہتے ہیں اور دشمن کا مل جل کر مقابلہ کرتے ہیں۔ اور اپنے اس اتفاق ہی کی بنا پر وہ کبھی کبھی شیر کو بھی مار بھگاتے ہیں۔

براہِ کرم دفتر سے خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں۔

لطیفے

گاہک :- دیسی اونی کپڑا دکھائیے۔
دوکاندار :- لیجئے، دیکھئے،
گاہک :- اس پر تو ولائتی کی مہر لگی ہوئی ہے۔
دوکاندار :- وہ تو دوسروں کے لئے ہے۔

باپ : تم درجے میں سب سے پیچھے کیوں بیٹھتے ہو۔
بیٹا : ہمارے درجے میں پیچھے بیٹھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب استاد پڑھاتا ہے تو دونوں جگہ برابر آواز آتی ہے۔

عبدالحمید پنچھی

لڑکا :- آج مجھے دو انعام ملے۔
ماں :- (خوش ہو کر) دیکھیں۔
لڑکا :- پیٹھ اور ہتھیلی دیکھئے

(زبانی حساب کا گھنٹہ)

گروجی :- ۲۰ میں سے ۱۰ نکالے کتنے بچے؟
چیلا :- گروجی صفر۔
گروجی :- گدھا۔
چیلا :- ٹھیک۔ گدھا بچا۔

انعام احمد۔ مارہرہ

اڈیٹر :- مضمون نگار کو خط لکھ دو کہانی اخلاقی ہونی چاہیئے۔
کلرک :- لیکن وہ تو بہت بد اخلاق ہیں۔
اڈیٹر :- تم کو کیسے معلوم؟
کلرک :- جی وہ آپ ہی تو ہیں۔

استاد :- چٹکلے کسے کہتے ہیں؟
شاگرد :- چٹکی اور کلے کو۔

ماسٹر :- لندن کہاں واقع ہے؟
لڑکا :- (سوچتے ہوئے) عدن میں۔

ماہ بانو۔ گوا[illegible]

مالک :۔(ڈرائیور سے) گاڑی کیوں رُک گئی۔
ڈرائیور:۔حضور!پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔
مالک :اچھا:۔ تو پھر واپس گھر چلو۔

پہلا دوست:۔ بتاؤ وہ کون ہے جو کام کے وقت بھی سیٹیاں بجاتا ہے۔
دوسرا :۔چوراہے کا سپاہی۔

لڑکا :۔(ٹیلیفون سے) جناب آج میرا بیٹا بیمار ہے۔ اس لئے وہ اسکول نہ آ سکے گا۔
ماسٹر :۔(آواز پہچان کر) اور یہ کون بول رہا ہے۔
لڑکا :۔(گھبراہٹ میں) جی میرا باپ بول رہا ہے۔
محمد علی خاں ۔ فرخ آباد

فقیر :۔دو خدا کی راہ میں۔
شخص :۔تو تم کیوں مانگ رہے ہو؟

جج :۔تم نے احمد کا جوتا مسجد سے کیوں چرایا؟
ملزم :۔میں سمجھا اب احمد ہمیشہ خدا کے گھر رہیگا۔
جج :۔تو تم اب جیل گھر میں رہ سکتے ہو۔

ناظم :۔ تم نے عدالت کی توہین کی ہے۔
افسر :۔ آپ نے توہین کی توہین کی ہے۔
ناظم :۔ (مسکرا کر) تب دونوں معافی کے قابل ہیں۔
اقبال احسن ۔ راولپنڈی

انور :۔ ارے بھائی! تم یہ اینٹ لئے کیوں پھرتے ہو؟
معین :۔ میں اپنا مکان فروخت کرنا چاہتا ہوں، یہ نمونہ ہے۔

استاد :۔ ۵۰ میں سے کتنے نکالیں کہ باقی ۵ بچیں۔
لڑکا :۔ صفر۔

پہلا :۔ بتاؤ میری مٹھی میں کیا ہے؟
دوسرا :۔ ریل کا ڈبہ۔
پہلا :۔ واہ تم نے دیکھ لیا۔

استاد :۔ (شاگرد سے) یہ گلاس میں کاغذ کیوں ڈال رہے ہو؟
شاگرد :۔ سوال حل کر رہا ہوں۔
تقی علی خاں ۔ فرخ آباد

رضیہ سلطانہ رومی

دوستی



فریدہ و سکندر تھے تو دونوں بھائی بہن، لیکن ان میں آپس میں کبھی نہ بنتی۔ ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے۔ ان کی چھوٹی بہن رخسانہ بڑی شریر تھی۔ وہ دونوں کے جھگڑوں کو اپنی چغل خوریوں سے اور بھی ہوا دیتی۔ کوئی دن بھی ایسا نہ جاتا جب کہ گھر میں کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہوتا ہو۔ اماں ان کے جھگڑے چکاتے چکاتے عاجز آ گئی تھیں۔ ہم نے بھی کئی بار ان دونوں میں میل ملاپ کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ مسئلہ کسی طرح حل نہ ہوتا تھا

ایک دن کی بات ہے ہم لوگ شام کے وقت اپنے پڑھنے کے کمرے میں بیٹھے اپنی اپنی کتابیں پڑھ رہے تھے۔ ماسٹر صاحب کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی کہ نہ جانے فریدہ نے کیا شرارت کی کہ سکندر نے کتاب پھینک کر ماری۔ کتاب فریدہ کی آنکھ پر لگی۔ فریدہ کچھ کم تھوڑا ہی تھی۔ اس نے بھی کتاب کا جواب ایک اور موٹی کتاب سے دیا۔ رخسانہ بھلا کب چپ بیٹھنے والی تھی۔ وہ بلی کی طرح کونے میں بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ ہمدردی میں سکندر سے اُلجھ پڑی۔ معاملہ بڑھ گیا۔ پڑھنے کا کمرہ ذرا سی دیر میں میدانِ جنگ بن گیا۔ کسی نے دوات

پھینکی تو کسی نے قلم۔ کسی نے کاپیاں پھینکیں تو کسی نے تکیے۔ غرضیکہ بیچ بچاؤ کرنے کے بعد بھی دونوں کے کچھ نہ کچھ تو چوٹ لگی ہی۔ چغل خور رخسانہ کے بھی اس جھگڑے میں کافی چوٹ آئی۔ اس کے ناک پر کچھ ایسی چوٹ لگی کہ وہ چیختی چلاتی امّی کے پاس چلی گئی۔ اور ماسٹر صاحب اب تک نہ آئے تھے۔ اور اب ان کے آنے کی کوئی امید بھی نہ تھی۔ فریقین میں صلح کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے مٹھائی منگائی۔ پھر میں نے ایک قصہ سنانا شروع کر دیا۔ جیسے ہی میں نے قصے کا نام لیا سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ اور سب دلچسپی سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے قصہ شروع کیا۔ کسی زمانے میں ایک راجا تھا جو نہایت ہی ظالم تھا۔ ذراسی بات ناگوار گذری اور اس آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ رعایا اس کے ظلم سے تنگ آگئی تھی۔ اس راجہ کا ایک وزیر تھا جو بہت ہی عقل مند اور ہوشیار تھا۔ تعریف کی بات یہ تھی کہ وہ جانوروں اور پرندوں کی بولیاں بھی اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔ ایک دن اس وزیر نے دو چڑیوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا۔ چڑا اپنی چڑیا سے کہہ رہا تھا کہ "کل صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی اس ظالم راجا کا خاتمہ ہو جائے گا"۔ چڑیا نے چڑے سے پوچھا "وہ کس طرح" چڑے نے کہا کہ "اس ظالم راجا نے بہت دن پہلے ایک بہت اچھے آدمی کو بغیر کسی قصور کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کا بدلہ اس سے ایک کالا سانپ لے گا۔ کل صبح سورج نکلتے ہی وہ سانپ سامنے کے باغ کی طرف سے آئے گا اور پھر محل میں گھس کر راجہ کو کاٹ لے گا۔

وزیر نے یہ بات فوراً راجا سے کہہ دی یہ سن کر راجا بہت پریشان ہوا۔ اس کے ہوش و حواس جاتے رہے تھے۔ وزیر نے راجا کو تسلی دی اور کہا کہ "آپ کی جان اب بھی بچ سکتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ آج سے ظلم کرنا چھوڑ دیں۔ اور رعایا کے ساتھ ہمیشہ پیار و محبت سے پیش آئیں محبت سے دشمنوں کو بھی دوست بنایا جا سکتا ہے۔ راجا نے کہا "اب میں سچے دل سے عہد کرتا ہوں کہ اب ظلم نہ کروں گا۔ لیکن

سانپ سے کس طرح نجات ملے گی ؟ وزیر
نے کہا " سانپ ہو یا شیر ہر ایک پر محبت سے
فتح پائی جا سکتی ہے ۔ چنانچہ وزیر نے راجا
کو مشورہ دیا کہ وہ شاہی باغ سے لے کر
شاہی محل تک راستہ صاف کرائے ۔ کناٹے
کنا نے طرح طرح کے پھول سجائے جائیں
تاکہ پھولوں کی خوشبو سے اس کا دماغ
معطّر ہو جائے ۔ ایک ناند میں اس کے پینے
کے لئے دودھ بھی رکھ دیا جائے ۔ اس کو
پینے کے بعد اس کا غصّہ بھی جاتا رہے گا ۔
چنانچہ راجا نے یہی کیا ۔ صبح سویرے ٹھیک
وقت پر سانپ نکلا ۔ خوب سیر ہو کر دودھ پیا
پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے جھومتا ہوا
سانپ محل کے اندر داخل ہوا اور تخت شاہی
جس پر راجا صاحب بیٹھے تھے وہاں پہنچ گیا ۔
سانپ راجا کی فیاضی ۔ اخلاق اور
محبت سے بہت متاثر ہوا ۔ اس نے راجا
کو محبت بھری نظروں سے دیکھا ۔ اور پھر
اسی راستے باغ کی طرف واپس چلا آیا ۔ لو
بھئی کھیل ختم پیسہ ہضم ۔
فریدہ و سکندر خاموشی کے ساتھ
بیٹھے سُن رہے تھے ۔ میں نے ان دونوں
کو آپس میں میل جول اور محبت سے رہنے
کے لئے کہا ۔ اور وہ فوراً میری باتوں کو
مان گئے ۔ اور عہد کر لیا کہ اب وہ آپس
میں کبھی نہ لڑیں گے ۔ فریدہ کے پاس ایک
اکنی تھی ۔ وہ دوڑ کر فوراً اس کی مٹھائی لے
آئی ۔ سکندر بھی آخر دل رکھتا تھا ۔ فیاضی
کا جواب فیاضی سے دیتے ہوئے نمک پارے
لے آیا ۔ دونوں نے مٹھائی اور نمک پارے
ادل بدل کر کھائے ۔ اور آج مہینوں گذرنے
کے بعد بھی واقعی یہ دونوں آپس میں پھر
کبھی نہ لڑے ۔

اطہر پرویز



چالاک شہزادہ

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ایک بادشاہ گزرا ہے اس کے تین لڑکے تھے ۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ اس کے تینوں لڑکے پڑھ لکھ جائیں اور علم وفضل کی معراج پر پہنچ جائیں ۔ اس لئے کہ آخر ان کو ہی آگے چل کر سلطنت کے کاموں میں حصّہ لینا ہے۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ جاہل رہے تو دربار کے لوگ اتنی بڑی سلطنت کو ختم کردیں گے اور جب چڑیاں کھیت چُگ جائیں گی تو پھر پچھتانے سے کیا فائدہ ۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ہر علم و فن کے اُستادوں کو شہزادوں کی تعلیم کے لئے مقرر کیا ۔ تاکہ ان کو بہترین تعلیم مل سکے ۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ تینوں بچے ذہین ہونے کے باوجود بیحد بدشوق تھے ، لکھنے پڑھنے سے انھیں زرا بھی دلچسپی نہ تھی ۔ سارے دن کھیل کود میں لگے رہتے ۔ آہستہ آہستہ تمام اُستادوں نے جواب دے دیا اور بادشاہ سے کہہ دیا کہ یہ شہزادے کسی طرح نہیں پڑھ سکتے ۔

یہ سُن کر بادشاہ کو بے حد افسوس ہوا اور وہ سوچ میں پڑ گیا کہ آخر شہزادوں کی

تعلیم کس طرح ہوگی۔ اس کو اتنا افسوس ہوا کہ اس کے لئے کھانا پینا حرام ہوگیا۔ آخر ایک دن بادشاہ کے وزیر نے پوچھا۔

"عالم پناہ! کیا میں آپ کی پریشانی کی وجہ معلوم کرنے کی ہمت کر سکتا ہوں؟"

بادشاہ کو یہ سُن کر ڈھارس سی بندھی اور اس نے سوچا کہ وزیر سے بھی یہ بات کہنی چاہیئے، ممکن ہے کہ یہ کوئی اچھا مشورہ دے سکے۔ یہ سوچ کر بادشاہ نے وزیر سے اپنی پریشانی کا حال سُنایا کہ شہزادے پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں لیتے اور تمام اُستادوں نے پڑھانے سے اِنکار کر دیا ہے۔

وزیر بڑا سمجھ دار تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا کہ حضور اگر اجازت دیں تو میں سلطنت کے ایک کونے سے دوسرے تک اس بات کا اعلان کردوں کہ جو مُعلّم شہزادوں کو پڑھنے لکھنے کی طرف رغبت دلا سکے گا اس کو دولت سے مالا مال کر دیا جائے گا۔

بادشاہ یہ تجویز سُن کر بے حد خوش ہوا۔ اور اس نے اس اعلان کے لئے حکم دے دیا۔

چنانچہ ایک ہفتے کے اندر اندر سلطنت کے کونے کونے میں یہ اعلان کر دیا گیا۔ اعلان کا ہونا تھا کہ بڑے بڑے تجربے کار اور اچھے مُعلّم دربار میں حاضر ہوئے۔ وزیر نے سب کا امتحان لیا اور آخر میں ایک نوجوان اُستاد کو اس کام کے لئے چُنا۔

یہ نوجوان اُستاد عجیب و غریب انسان تھا۔ وہ بچّوں کو کتابوں سے پڑھانے کے خلاف تھا اور اس کی تعلیم کا طریقہ بھی مختلف تھا۔ یہ نوجوان بچّوں کو کھیل کھیل میں تعلیم دیتا تھا۔ بچّے کھیلتے جاتے تھے اور اسی کھیل کھیل میں وہ بہت کچھ سیکھ لیتے تھے۔

اب نئے اُستاد نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا۔ پہلے پہل تو اس نے شہزادوں کے ساتھ کھیلنا شروع کیا۔ وہ اپنی طرف سے کبھی کچھ نہ کہتا صرف اُن کے ساتھ کھیلتا رہتا شہزادوں نے اب تک جتنے اُستاد دیکھے تھے وہ تو اُنھیں اچھا خاصا کھیلتے کھیلتے پڑھنے بٹھا لیتے تھے۔ اُنھوں نے تو پڑھنے کا کمرہ ہی الگ کر رکھا تھا شہزادے اس نئے اُستاد کو دیکھ کر پھولے نہ سمائے۔ اس لئے اب تو ان کے ساتھ ایک

کھلاڑی اور شامل ہوگیا تھا۔ شہزادے اس نئے اُستاد سے بہت جلد مانوس ہو گئے۔

جب اِسی طرح کئی دن گزر گئے، تو ایک دن اُستاد نے ان کو نئی گولیاں لاکر دیں۔ یہ گولیاں بہت خوبصورت تھیں۔ شہزادوں نے بڑے شوق کے ساتھ گولیاں لیں۔ شام کو اُستاد نے یہ گولیاں واپس لے لیں۔

شہزادوں نے اُستاد سے کہا "حضرت یہ گولیاں ہم کو دے دیجئے، ہم اپنے پاس احتیاط سے رکھیں گے، اور اس کے لئے کوئی لڑائی جھگڑا نہ کریں گے۔"

اُستاد نے فوراً بڑے شہزادے کو چھ گولیاں، منجھلے کو تین، اور چھوٹے کو دو گولیاں دیں۔ یہ دیکھ کر چھوٹا تو چُپ ہوگیا لیکن بڑے اور منجھلے میں جھگڑا ہونے لگا۔ منجھلا لڑکا کہتا تھا کہ مجھے کم ملی اور بڑا اپنے بڑے ہونے کی وجہ سے اس کو ڈانٹتا ہے کہ مجھے زیادہ گولیاں رکھنے کا حق ہے کیونکہ میں تم سے بڑا بھی ہوں اور ولی عہد بھی۔

اُستاد یہ جھگڑا پہلے تو چُپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا پھر منجھلے سے بولا کہ "تم کو کتنی گولیاں کم ملیں؟"

منجھلے نے فوراً جواب دیا "چار" —— فوراً بڑے نے غصے سے کہا کہ جھوٹا کہیں کا، تین ملی ہیں یا چار—— بڑا آیا چار کہنے والا۔"

ابھی بڑے کی زبان سے جملہ نکلا ہی تھا کہ چھوٹے نے فوراً کہا "ارے بھیّا یہ کیا غضب کر رہے ہو۔ تین اور چار کے جھگڑے میں پڑ گئے۔ یہ تو اُستاد نے پڑھانا شروع کر دیا ہے تم کو کچھ خبر بھی ہے؟"

یہ سُنتے ہی دونوں نے اپنی اپنی گولیاں اُستاد کے سامنے پھینک دیں اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

حفیظ الدین



مولانا جلال الدین رومی

مولانا جلال الدین ایران کے مشہور و معروف شاعر گذرے ہیں۔ آپ کا اصل نام محمد بن حسین تھا۔ آپ کا وطن یوں تو بلخ ہے مگر آپ بچپن ہی میں روم میں جا بسے۔ اس زمانے میں ایشائے کوچک کو روم کہتے تھے۔

مولانا ۱۲۰۷ھ میں پیدا ہوئے اور بڑی عمر پائی۔ ان کو بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے اتنا پڑھا لکھا کہ اپنے زمانے کے مشہور عالموں میں ان کا شمار ہو گیا۔ دور نزدیک ہر جگہ ان کے علم اور استادی کا چرچا ہونے لگا۔

کہتے ہیں کہ ایک بار ایک قلندر سا شخص ان کے مدرسے میں آیا۔ مولانا حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور پاس کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ آنے والے نے پوچھا۔ یہ کونسی کتابیں ہیں؟ مولانا نے کہا یہ تم نہیں جانتے۔ اسے قیل و قال کہتے ہیں۔ اس نے وہ تمام کتابیں اٹھا کر پانی میں ڈال دیں۔ مولانا کو بہت افسوس ہوا کہا، اے درویش تم نے یہ کیا کیا۔ اس میں تو بعض ایسی کتابیں ہیں جو کہیں نہیں ملتیں۔

درویش نے پانی میں ہاتھ ڈال کر سب کتابیں نکال لیں۔ جوں کی توں سوکھی نکلیں۔ مولانا کو بہت حیرت ہوئی۔ پوچھا کیا بات ہے۔ درویش نے کہا۔ "یہ تم نہیں جانتے یہ ذوق و حال ہے۔ اب تو مولانا درویش کے مرید ہو گئے۔ اور اس کے رنگ میں رنگ گئے۔

یہ درویش حضرت شمس تبریزی تھے یہ بہت بڑے بزرگ اور اللہ والے تھے۔ مولانا پر تبریزی کا ایک رنگ چڑھا کہ انھوں نے پڑھانا لکھانا چھوڑ دیا۔ اپنے پیر کے ساتھ جنگلوں، ویرانوں میں وقت بتانے لگے۔

مولانا کے شاگرد چھوٹے، رشتہ دار ٹوٹے، دوست احباب ختم ہو گئے، اس کا سبب صرف تبریزی تھے۔ اس لئے وہ ان سب کی نظروں میں کھٹکنے لگے۔ اور لوگوں نے سوچا کہ راستے کا یہ روڑا ہٹا دیا جائے۔

ایک دن مولانا اور ان کے پیر ذکر فکر میں لگے ہوئے تھے۔ کسی نے تبریزی کو پکارا وہ باہر نکلے تو ان پر کچھ لوگوں نے حملہ کر دیا۔ اس وقت ایک ایسی دل ہلا دینے والی چیخ نکلی کہ سب بے ہوش ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ہوش آیا تو دیکھا کہ شمس تبریزی غائب ہیں اور لہو کی چند بوندیں وہاں پڑی ہوئی ہیں۔

مولانا رومی کا اس پر زبردست اثر پڑا وہ اپنے پیر کی جدائی میں اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔ نہ کھانے پینے کی سُدھ، نہ پہننے اوڑھنے کا دھیان۔ بس کسی خیال میں ڈوبے ہوئے۔ کچھ دنوں بعد طبیعت میں کچھ سکون ہوا تو اپنے چہیتے دوست اور مرید حسام الدین کے کہنے سے ایک مثنوی لکھی جو فارسی کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب مثنوی مولانا روم کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب میں اچھا انسان بننے کی تلقین ہے۔

مولانا سوکھے دماغ والے مذہبی لوگوں کی طرح نہ تھے۔ وہ بڑے مزے کی باتیں کرتے تھے ہنسی ہنسی میں بڑی کام کی باتیں سمجھا جاتے تھے۔

پرانے زمانے میں ہندستانی مسلمانوں کو اسلامی ملکوں میں ہندو کہا جاتا تھا۔ مولانا نے چار ہندوؤں، یعنی ہندوستانی مسلمانوں کا قصہ بڑے دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ دوسرے کے عیب نکالنے میں انسان خود کیسی حماقت کرتا ہے کہانی سمجھنے کے لئے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ مسلمانوں میں نماز کے درمیان میں باتیں کرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ قصہ یوں لکھتے ہیں۔

ایک مسجد میں چار ہندو آئے۔ ایک دوسرے کا عیب نکالنے کی ان میں عادت تھی چاروں نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اور نماز پڑھنے لگے۔ اتنے میں موذن آیا تو ایک نے اس سے پوچھ لیا۔ دوسرے نے جھٹ سے کہا۔ "اس نے بات کرلی، اس کی نماز جاتی رہی۔ تیسرے نے کہا "بچا! تم اس کو کہتے ہو خود جو بات کرکے نماز توڑ دی۔ چوتھے نے کہا۔" خدا کا شکر ہے کہ سب بولے، میں نہ بولا۔ اس طرح ان چاروں کی نماز ٹوٹ گئی۔ دوسروں کا عیب ڈھونڈنے والوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔

ایک اور موقع پر لکھا کہ کسی بادشاہ نے سُنا تھا کہ ہندوستان میں ایک ایسا پیڑ ہوتا ہے کہ اس کی پتیاں کھانے سے آدمی نہیں مرتا سدا کے لئے امر ہو جاتا ہے۔ اس نے اپنا ایک آدمی ہندوستان بھیجا۔ اور بہت سا روپیہ خرچ کیا۔ مگر ایسا کوئی پیڑ ہوتا تو ملتا۔ آخر میں مولانا نے بتایا ہے کہ لوگ بات کی جڑ تک نہیں پہنچتے۔ کہنے کے طریقے ہوتے ہیں۔ یہاں اس درخت سے مراد علم تھا۔ لوگ سچ مچ اسے پیڑ سمجھنے لگے۔ اسی طرح دنیا میں ایک دوسرے کو نہ سمجھنے سے جھگڑے کھڑے ہوتے ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ بات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ لفظوں اور اصطلاحوں کے پھیر میں نہ پڑ جائے۔

مولانا نے انسانوں کی خدمت اور دل کی پاکی پر بہت زور دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ محبت دنیا کی بہت بڑی دولت ہے۔

مولانا رومؔ کی کہانیاں

توتے کی عقل مندی

عرب کے ایک سوداگر نے ایک توتا پالا تھا۔ بہت خوبصورت اور اچھی آواز والا۔ سوداگر پرندوں کی بولی جانتا تھا۔ اور توتے سے میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتا تھا۔

ایک بار سوداگر ہندستان کے سفر کے لئے تیار ہوا، اپنے ہر نوکر چاکر سے پوچھا کہ بتاؤ اس ملک سے تمھارے لئے کیا تحفہ لاؤں۔ سب نے اپنی اپنی پسند کی چیزیں بتائیں آخر میں توتے کی باری آئی تو اس نے کہا مجھے کچھ منگوانا نہیں ہے۔ البتہ میری قوم کے لوگوں کو میرا سلام پہنچا دیجئے اور میرا حال بتا دیجئے۔ اُن سے کہئے کہ "میں پردیس میں ہوں اور آپ نے مجھے بُھلا دیا، قسمت نے مجھے قید میں ڈال دیا ہے۔ آپ آزاد ہیں اور باغوں کی سیر کرتے پھرتے ہیں۔ میں رات دن وطن اور آپ کی یاد میں تڑپتا رہتا ہوں۔ اس قید سے رہائی کی کوئی صورت ہو تو آپ مجھے بتایئے ورنہ میں یوں ہی گھٹ گھٹ کر مرجاؤں گا۔"

مسافر نے توتے کی بات بھی لکھ لی۔ جب وہ سفر کرتے کرتے ہندستان کی سرحد میں

پہنچا تو اُسے توتوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ اس نے اپنی سواری روکی اور توتے کا سلام د پیام پہنچایا۔ پیام سُنتے ہی ان توتوں میں سے ایک پھڑ پھڑاکر زمین پر گر پڑا۔ اور ٹھنڈا ہوگیا۔

سوداگر کو بہت افسوس ہوا کہ میں نے یہ پیغام کیوں پہنچایا۔ شاید یہ توتا اس توتے کا عزیز تھا، جب ہی صدمے سے گر کر مرگیا۔ اب وہ کیا کرسکتا تھا۔

بات جو ہونی تھی وہ ہوگئی۔ اس نے سواری آگے بڑھائی۔

کچھ دنوں کے بعد سوداگر وطن لوٹا۔ توتے نے اپنے تحفے کے بارے میں پوچھا، سوداگر نے کہا "اس سلسلے میں مجھے بہت رنج اُٹھانا پڑا اور تمھاری بات کہہ کر میں بہت پچھتایا۔"

"آخر ایسی کون سی بات تھی۔ جس سے آپ کو صدمہ اُٹھانا پڑا۔" توتے نے کہا۔

سوداگر نے کہا "پیڑ پر توتوں کا ایک جھنڈ بیٹھا تھا جیسے ہی میں نے تمھارا سلام اور پیام پہنچایا اُن میں سے ایک توتے کا بُرا حال ہوگیا، اُس کا دل پھٹ گیا، وہ پھڑ پھڑاکر زمین پر گر پڑا اور ٹھنڈا ہوگیا۔

سوداگر کے توتے نے جو یہ ماجرا سُنا تو وہ بھی اسی طرح کپکپایا اور پنجرے میں گر پڑا اور ٹھنڈا ہوگیا۔ سوداگر یہ دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوا۔ دانتوں سے اُنگلیاں کاٹ لیں۔ رونے دھونے لگا اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ ہائے یہ میں نے کیسی غلطی کی، اگر میں یہ نہ کہتا تو کیوں اس طرح ہو جاتا۔ انسان کی زبان ہی آگ ہے، یہی خرمن ہے کبھی یہ خرمن جمع کرتی ہے اور کبھی اس میں آگ لگاتی ہے۔ یہ زبان جو چاہے کرے، افسوس ہزار افسوس۔



سوداگر نے رو دھوکر توتے کو اُٹھایا اور پنجرے سے باہر پھینک دیا۔ توتا زمین پر گرتے ہی اُڑا اور ایک پیڑ کی ٹہنی پر

جا بیٹھا۔ سوداگر نے حیران ہو کر پوچھا "یہ کیا ماجرا ہے"؟ توتے نے کہا "میری قوم والے توتے نے مجھے یہ سبق دیا تھا کہ تو اپنے میٹھے میٹھے بول اور پیاری پیاری باتیں چھوڑ دے۔ اپنی مرضی سے زندگی کے چہچہے اور مزے بھلا دے اور اپنے آپ کو مُردے کی طرح بے خواہش بنا دے پھر تو آزاد ہو جائے گا۔"

یہ کہا اور اُڑ کر اپنے وطن ہندستان چلا گیا۔

بہرے کی عیادت

ایک بہرے کو اپنے دوست سے معلوم ہوا کہ اس کا پڑوسی بیمار ہے۔ سوچا کہ پڑوسی کا بڑا حق ہوتا ہے۔ میرا عیادت کے لئے جانا ضروری ہے بیماری سے بچارا کمزور ہو گیا ہوگا میں بہرا ہوں، یوں بھی مشکل سے سُن پاتا ہوں اس کی کمزور آواز کیسے سُن سکوں گا۔



اس نے یہ تدبیر سوچی کہ پہلے جا کر دُعا سلام کے بعد اس سے پوچھوں گا تم اب کیسے ہو۔ وہ کہے گا اب بہتر ہوں۔ اس پر خدا کا شکر ادا کروں گا۔ پھر پوچھوں گا آجکل کیا کھا رہے ہو۔ وہ شوربا یا دال کا پانی بتائے گا۔ میں کہوں گا خدا بچائے۔ پھر پوچھوں گا۔ کس حکیم کا علاج ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی اچھے حکیم کا نام بتائے گا۔ میں کہوں گا اس کا قدم بڑا مُبارک ہے۔ جس گھر میں وہ جاتا ہے کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ مجھے معلوم ہے جہاں وہ گیا ہے وہاں اس نے کام پورا کیا ہے۔

یہ سب باتیں سوچ کر پڑوسی کی طرف

چلا۔ پڑوسی بیمار تو تھا ہی۔ بہرے کو آتا دیکھ کر جھنجھلایا۔ کہ اب یہ میرا دماغ چاٹے گا۔

بہرے نے سلام دُعا کے بعد پُوچھا' اب آپ کیسے ہیں۔ بیمار بولا: "مر رہا ہوں"

بہرے نے اپنی سوچی ہوئی تدبیر کے مُطابق کہا "خدا کا شکر ہے" بیمار یہ سُن کر چڑھ گیا۔

بہرے نے پُوچھا "کیا کھایا ہے، آپ نے ؟" بیمار نے جھلاّ کر کہا "زہر" بہرا بولا "خدا رچائے اور پچائے" اب تو وہ اور بھی غصہ ہوگیا۔

بہرے نے پھر پُوچھا' کون سا حکیم آپ کے ہاں آتا ہے ؟ غصے تو تھا ہی ' کہا "عزرائیل" (موت کا فرشتہ) — بہرا بولا۔ "اس کا بڑا مُبارک قدم ہے۔ خوش ہوجاؤ' اب تمھارا کام بن گیا۔ میں ابھی ابھی اس سے مل کر آرہا ہوں آپ پر خاص توجہ کرنے کے لیے کہہ آیا ہوں۔ بیمار جل بُھن کر کباب ہوگیا۔

یہ کہہ سُن کر بہرا رخصت ہوا' جی میں بہت خوش تھا کہ میں نے اٹکل سے خوب کام نکالا۔

ترجمہ: حفیظ الدّین

سیدہ قریشیہ نور

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر

کسی مُلک میں ایک راجا رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک توتا تھا۔ راجا کو اس توتے سے بہت محبّت تھی۔ ایک دن توتے کا پنجرہ محل کی چھت پر رکھا ہوا تھا۔ شاہی توتے نے چند پرندوں کو ہوا میں اُڑتے ہوئے دیکھا۔ اس کے دل پر بجلی سی گری۔ اتنے میں توتوں کا ایک جھنڈ آندھی کی طرح اُڑتا ہوا امرود کے کسی باغ کی طرف چلا گیا۔ پیچھے سے ایک توتا تھکا ہوا آیا اور محل کی چھت کے پاس والے درخت کی اُونچی ٹہنی پر بیٹھ گیا۔ شاہی توتے نے اسے آواز دی۔ "ارے بھائی! ذرا سُنو تو" آزاد توتے نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا تو کیا دیکھتا ہے کہ سامنے ایک خوبصورت سی چوکی پر ایک نہایت قیمتی سونے کا پنجرہ رکھا ہوا ہے اور پنجرے میں ایک خوبصورت توتا چاروں طرف چکّر کاٹ رہا ہے۔

آزاد توتے نے بڑی ہمدردی سے پُوچھا "تم کون ہو" شاہی توتے کو جنگلی توتے پر بہت غصّہ آیا۔ جنگل کی ٹہنیوں پر زندگی بسر کرنے والا توتا اس طرح بات چیت کرتا ہے۔ آزاد توتے کو اس کی شکل دیکھ کر غصّہ آیا اور بولا "ارے تو بولتا نہیں مگر تو بڑ

سخت جان ہے جو اس قید میں بھی زندہ ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ مجھے بُلا رہا ہے۔" شاہی توتے کے ماتھے پر شرم کے مارے پسینہ آگیا۔ لیکن پھر وہ سنبھل کر بولا "میں تیری نگاہ میں کتنا ہی حقیر سہی لیکن ذرا اِدھر میرے پاس تو آ۔" آزاد توتے نے اکڑ کر جواب دیا "مَیں تیرے پاس کیوں آؤں، تجھے غرض ہو تو خود میرے پاس آجا۔"

آزاد توتے کی یہ بات سُن کر قیدی توتے کو بڑا افسوس ہوا اور زندگی میں پہلی مرتبہ اس کو اپنی مجبوری اور بے بسی محسوس ہوئی اسے اتنی شرم آئی کہ وہ جھوٹ بولنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ اس جنگلی اور غریب توتے کو شان و شوکت دکھائے یہاں اُلٹا اسے خود شرمندہ ہونا پڑا۔ بولا۔ "بھائی میرے پروں میں درد ہے اس لئے مجبور ہوں۔ ذرا تم ہی تکلیف گوارا کرو۔ آزاد توتا ایک اُڑان میں آکر پنجرے کی سلاخوں سے لپٹ گیا اور بولا "کیا کہتا ہے؟ جلدی بتا مجھے تو تیری یہ حالت دیکھ دیکھ کر وحشت سی ہو رہی ہے" شاہی توتے نے کہا "تم اندر کیوں نہیں آجاتے" آزاد توتے نے جواب دیا۔ "یہ تو بہت بھیانک جگہ ہے۔"

یہ سُن کر تو شاہی توتے کو غصہ آہی گیا اس نے بگڑ کر کہا "تنکوں کے گھونسلے میں رہنے والے اور کھیتوں سے کچے پھل چُرا چُرا کھانے والے تُو اس عیش و آرام کی قدر کیا جانے، دیکھ میں قیمتی جواہرات کی کٹوری میں طرح طرح کے حلوے اور مٹھائیاں کھاتا ہوں۔" یہ دیکھ کر جنگلی توتے کے منھ میں پانی بھر آیا اور بولا "دیکھوں تو کیسا ہوتا ہے بادام کا حوا اس کا مزا امرود کی طرح ہوتا ہے یا جامن کی طرح۔" قیدی توتے نے غرور سے کہا "ارے بے وقوف کہاں جامن اور امرود اور کہاں یہ شاہی حلوہ۔ اس کو چکھ کر دیکھ تو تُو کچھ دن یاد کرے گا۔"

اب یہ روز کا دستور بن گیا کہ جنگلی توتے کا لایا ہوا پھل شاہی توتا کھاتا اور شاہی توتے کا حلوہ اور مکھن جنگلی توتا اُڑاتا۔

راجا نے ایک دن توتے سے پُوچھا "تمھیں کسی بات کی تکلیف تو نہیں ہے۔"

توتے نے جواب دیا "سرکار میں بہت خوش ہوں۔ جنت کے مزے لوٹ رہا ہوں۔ صرف ایک بات ہے نہ جانے کیوں میری طبیعت اُداس اُداس رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کڑی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔"

راجا کو یہ گفتگو سن کر بہت افسوس ہوا۔ اس نے حکیموں کی تلاش میں آدمی دوڑائے۔ ہر شخص کی زبان پر توتے اور اس کی بیماری کا ذکر تھا۔ دور دور سے حکیم آئے، مگر کسی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ کسی نے کہا جگر خراب ہوگیا ہے کوئی بولا آنتوں میں بادام پھنس گیا ہے۔ کسی حکیم نے کہا "گھی ایک جگہ جمع ہوگیا ہے۔" ایک اور حکیم کا خیال تھا کہ آنتوں میں سونے کا ورق جمع ہو کر ڈھیلا سا بن گیا ہے۔ راجا نے اعلان کیا کہ جو بھی میرے توتے کو اچھا کردے گا میں بڑا انعام واکرام دوں گا۔ سب نے مل کر علاج شروع کیا لیکن توتا برابر دُبلا اور کمزور ہوتا گیا۔ راجا کی پریشانی بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ حکومت کے کاموں میں بھی اس کا دل نہ لگتا۔

ایک دن راج کمار نے بغاوت کردی بہت سے سپاہی جو راجا سے پہلے ہی سے جلے ہوئے تھے، انھوں نے بھی راج کمار کا ساتھ دیا۔

راج کمار نے ملک پر قبضہ کرلیا اور راجا کو گرفتار کرلیا۔ راجا قلعہ میں نظربند کردیا گیا۔ اس قلعے میں اس نے اپنے توتے کو بھی منگوا کر رکھ لیا تھا اور جب اس کی طبیعت گھبراتی اس سے باتیں کرتا۔ راج کمار قید کرلینے کے بعد بھی راجا کا خیال رکھتا کہ اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے، لیکن راجا پھر بھی خوش نہ تھا۔ ایک دن راجا اپنی مسہری پر لیٹا ہوا تھا اور میز پر عمدہ عمدہ کھانے چُنے ہوئے تھے۔ لیکن راجا کا دل کچھ کھانے کو نہ چاہتا تھا۔ اس کی نظر کھڑکی سے باہر میدان پر گئی۔ بہار کا موسم تھا راجا کو اپنا گزرا ہوا زمانہ یاد آگیا۔ بولا "کاش آج کے دن میں بھی آزاد ہوتا۔" توتے نے پوچھا "حضور آپ کی طبیعت کیسی ہے۔" راجا نے کہا۔ میں اس زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔" توتے نے کہا "کیا حضور کو کوئی تکلیف ہے۔ کھانے

کے لیے اچھے اچھے کھانے، پہننے کے لیے قیمتی پوشاک، خدمت کے لیے ملازم ہیں اور آرام کرنے کے لیے مسہری، پھر آپ زندگی سے کیوں تنگ آ رہے ہیں؟"

راجا نے جواب دیا "میں قید ہوں۔"

توتے نے پوچھا "یہ تو میں بھی جانتا ہوں، مگر آپ کو تکلیف کیا ہے؟"

راجا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "قیدی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ کاش میں زمین پر سوتا اور فاقہ کرتا مگر آزاد ہوتا۔"

توتے نے رنجیدہ ہو کر کہا "مجھے بھی یہی بیماری ہے سرکار۔"

راجا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اس نے فوراً پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ اور کہا "میرے عزیز توتے جا میں نے تجھے آزاد کیا اور ساتھ ہی اب خود اپنی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔"



بقیہ "ریشم کی کہانی"

ریشم کی صنعت برابر ترقی کر رہی ہے۔ اب تو تقریباً ہر ملک میں لاکھوں کیڑے ہمارے لیے ریشم کے تار کاتتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب کپڑے کی بُنائی کے لیے ہمارا ملک ساری دنیا میں مشہور تھا۔ یورپ اور دوسرے ملک کے دولت مند لوگ کشمیری ریشم کے کپڑے بڑے فخر کے ساتھ پہنتے تھے۔ لیکن برسوں کی غلامی نے ہمارے ملک کے اس فن کو بہت نقصان پہنچایا اور ہماری کپڑے کی صنعت کو بہت پچھاڑ دیا۔ اب ہمارا ملک آزاد ہے ہمیں پھر سے اپنے پچھڑے ہوئے فن کو آگے بڑھانا ہے۔ کپڑا بُننے کی صنعت میں ریشم کا کیڑا ہماری بہت مدد کر سکتا ہے۔ ریشم کا کیڑا پالنے میں بہت روپے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ تھوڑی پونجی سے کیڑے پالنے کا کام گھریلو دھندے کی شکل میں کیا جا سکتا ہے اور ہمارے ملک میں اِس وقت گھریلو دھندے کی ضرورت بھی زیادہ ہے۔

توفیق الرحمن قدوائی

نینی تال کی سیر

نوٹ :۔ یہ مضمون توفیق میاں نے پیام تعلیم کے لئے خاص طور پر لکھا ہے
آپ پیام تعلیم سے خاص طور پر بڑی دلچسپی لیتے ہیں ۔اور اسے
بڑی پابندی سے پڑھتے ہیں۔
۔ مضمون دلچسپ بھی ہے اور نینی تال کے بارے میں آپ کی معلومات
بھی بڑھائے گا ، امید ہے کہ توفیق میاں آئندہ اس سے بھی اچھا مضمون
لکھیں گے ، (اڈیٹر)

ہماری گرمیوں کی چھٹیاں ۲۰ مئی سے شروع ہوئیں اس بار ہم نے طے کرلیا کہ اپنی یہ چھٹیاں کسی پہاڑ پر گذاریں ، یوں تو پہاڑی مقام کئی ہیں مسوری ، شملہ ، نینی تال اور کشمیر وغیرہ لیکن اس بار ہم نے سوچا کہ ہم پہاڑی مقام نینی تال چلیں۔ ہم لوگ ۲۸ مئی کو دہلی سے روانہ ہوئے اور ۳ بجے رات کو بریلی پہنچے ، دو گھنٹے ویٹنگ روم میں ٹھہرے وہاں صبح کی چاۓ پی ، پانچ بجے کاٹھ گودام جانے والی گاڑی تیار ہی کھڑی تھی اس میں بیٹھے۔ ساڑھے سات بجے ہماری گاڑی روانہ ہوئی بارہ بجے ہم کاٹھ گودام پہنچے کاٹھ گودام تک ریل آتی ہے اس سے آگے ریل اس لئے نہیں جاتی کیونکہ وہاں سے پہاڑی علاقہ شروع

ہوجاتا ہے ، اس لئے کاٹھ گودام سے بس پر جانا پڑتا ہے ہم لوگ وہاں سے بس پر آئے اور ۲۹ر مئی کو ۲ بجے بس سٹینڈ پر پہنچے ، وہاں سے ہمارا گھر بہت دور تھا لیکن پھر بھی ہم پیدل ہی آئے بڑا مزہ آیا ، ہم لوگ تین بجے گھر پر پہنچے ، اس دن ہم لوگ کہیں گھومنے نہ جاسکے بہت تھک گئے تھے

دوسرے دن ہم لوگ نے سامان وغیرہ ٹھیک کرلیا ، اور شام کو ۵ بجے ہم سب ٹہلنے کے لئے نکلے وہاں پر ایک جگہ ہے جس کو فلیٹ کہتے ہیں وہاں شام کے وقت لوگ آتے ہیں بڑی تفریح رہتی ہے سنیما بھی ہیں، کھیل کا میدان اور بوٹ ہاؤس کلب ہے جہاں سب ممبر جاتے ہیں اور کھیل میں شریک ہوتے ہیں اور بہت سے ہوٹل ہیں۔ ایک جگہ چاٹ کی دوکان بھی ہے جسے دیکھ کر منھ میں پانی بھر آتا تھا ، ایک جھیل بھی ہے جس کی سیر کا لطف ہم لوگوں نے بھی خوب اٹھایا ، ہم لوگ روز شام کو کشتی پر بیٹھ کر ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر جایا کرتے تھے ۔ ایک سکیٹنگ ہال بھی ہے جہاں پر سب لوگ سکیٹنگ سیکھتے تھے فرش پر پھسلنے میں بڑا مزا آتا تھا ، ہم لوگ روزانہ چاٹ کھاتے تھے بڑا لطف آتا تھا ، اس طرح دس بجے گھر واپس آئے۔

ایک دن ہم لوگوں نے پروگرام بنایا کہ ہم نینی تال سب سے اونچی چوٹی پر جائیں گے اسی لئے صبح سویرے سب سامان لے کر روانہ ہوئے راستہ میں ہم لوگوں نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو لیا اور اس طرح سے ہماری پارٹی بن گئی اور ہم لوگ خوب باتیں کرتے، کھیلتے، کودتے گیارہ بجے کے قریب چینا پیک پہونچ گئے ، وہاں کے راستے میں ہم لوگوں نے ہمالیہ کی چوٹیاں دیکھیں جن کے اوپر برف جمی ہوئی تھی بڑا دلکش منظر تھا ، ہم لوگوں نے اوپر پہونچ کر دیکھا کہ ہم اوپر کھڑے ہیں اور بادل ہم سے ہزاروں فیٹ کے نیچے ہیں یہ دیکھ کر ہم کو بہت تعجب ہوا ،

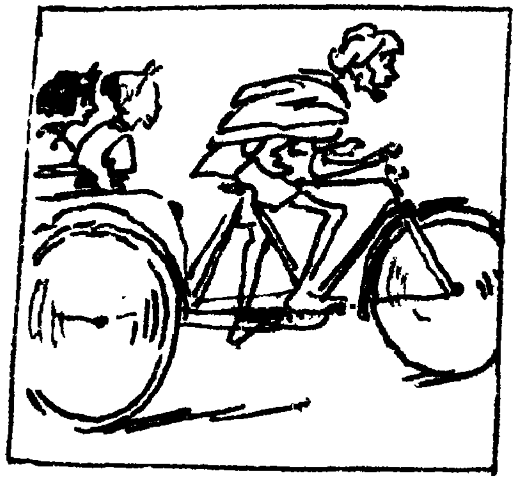
ہم لوگوں نے خوب کھیلنے کودنے کے بعد کھانا کھایا ، اپنے ساتھ پانی لے جانا بھول گئے تھے پیاس لگی تو پانی کی تلاش کی کہ کہیں بک رہا ہو تو لے لیا جائے ، اب اس دفعہ تو غلطی ہو ہی گئی ، خیر بہت تلاش کرنے کے بعد ایک پانی والا ملا اس نے دو دو آنے فی گلاس پانی دیا پانی بہت

مہنگا تھا کیونکہ اتنی اونچائی پر پانی پہنچانا بہت مشکل تھا، کھانے کے بعد ہم لوگ دوسری طرف گئے جہاں ہم کو نیچے کی ہر چیز دکھائی دیتی تھی اور ہر چیز بہت چھوٹی چھوٹی تھی جھیل بڑی بھی معلوم ہو رہی تھی جیسے کہ ایک چھوٹا سا تالاب اور جو کشتیاں اس میں پڑی ہوئی تھیں وہ بالکل چھوٹی چھوٹی سی معلوم ہوتی تھیں اور بادبان جیسے کہ ایک چھوٹا سا تنکا پر پھیلائے ہوئے ہے، ہم لوگ وہ منظر بہت دیر تک دیکھتے رہے اور کوئی دو بجے وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک گھنٹے میں ہم لوگ گھر پہنچ گئے کیونکہ اُترنے میں اتنی دیر نہیں لگتی جتنی کہ چڑھنے میں لگتی ہے وہاں سے آکر ہم لوگ بہت تھک گئے تھے اس لئے اُس دن تو فلیٹ نہیں جا سکے۔

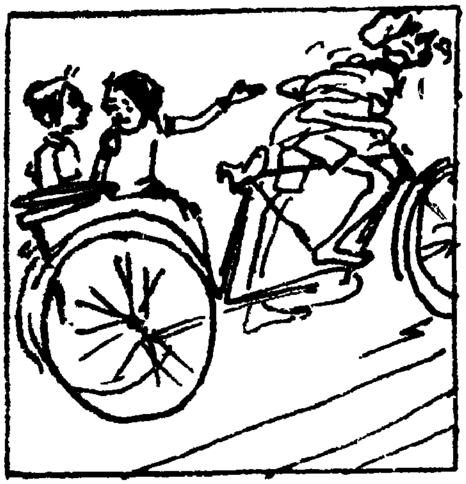
تیسرے دن ہم لوگوں نے سوچا کہ ... آج ہم نینی تال کی سب سے اونچی چوٹی پر چلیں ہم لوگ دوسرے دن صبح سویرے روانہ ہوگئے وہاں پر بھی بہت مزا آیا اور راستے میں کئی پگڈنڈیاں ملیں اب ہم لوگ سوچنے لگے کہ کس طرف جائیں ادھر کوئی آدمی بھی نہیں جس سے راستہ پوچھتے خیر بہت سوچنے کے بعد ہم لوگ دوسری طرف مڑے آگے دیکھا تو جنگل ہی جنگل تھا پھر ہم لوگ واپس آئے اور دوسری طرف گئے اور وہ راستہ ٹھیک تھا ادھر بہت سے لوگ جاتے ہوئے ملے اور ان ہی لوگوں کیساتھ ہم لوگ بھی روانہ ہوئے اور تقریباً دس بجے کے قریب ہم وہاں پہنچے ہم لوگوں نے اپنی اپنی تصویریں کھنچوائیں اور کھیلے کودے پھر کوئی دو بجے کے قریب سب نے کھانا کھایا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھنے چلے گئے اور بڑے اچھے مناظر دیکھے جو بہت پسند آئے ہم لوگ کوئی چار بجے کے قریب واپس گھر آگئے۔

ہم لوگوں نے بہت سے مقامات دیکھے لیکن سب کا ذکر کرنا تو بہت مشکل ہے آئندہ کوشش کروں گا کہ کچھ اور بتلاؤں۔ ۲۶ کی صبح کو نینی تال سے چلے اور پھر کاٹھ گودام پہنچے وہاں پر پہنچکر گرمی بہت لگی لیکن مجبوری تھی پھر گاڑی آئی اور کاٹھ گودام سے روانہ ہوئے اور لکھنؤ گئے وہاں پر اپنے رشتہ داروں سے مل کر دلی آئے کیونکہ ہماری چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں، ہم لوگ بہت اداس تھے کہ چھٹیاں بڑی جلدی ختم ہوگئیں اور خوشی بھی تھی کہ دو مہینے بعد اپنے دوستوں اور استادوں سے ملے تھے۔

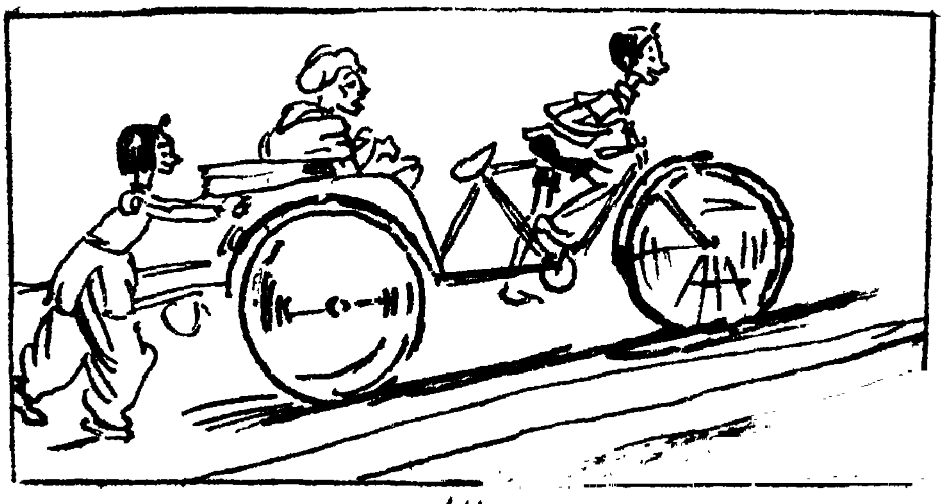
کالو مینا کی کہانی



(۱)



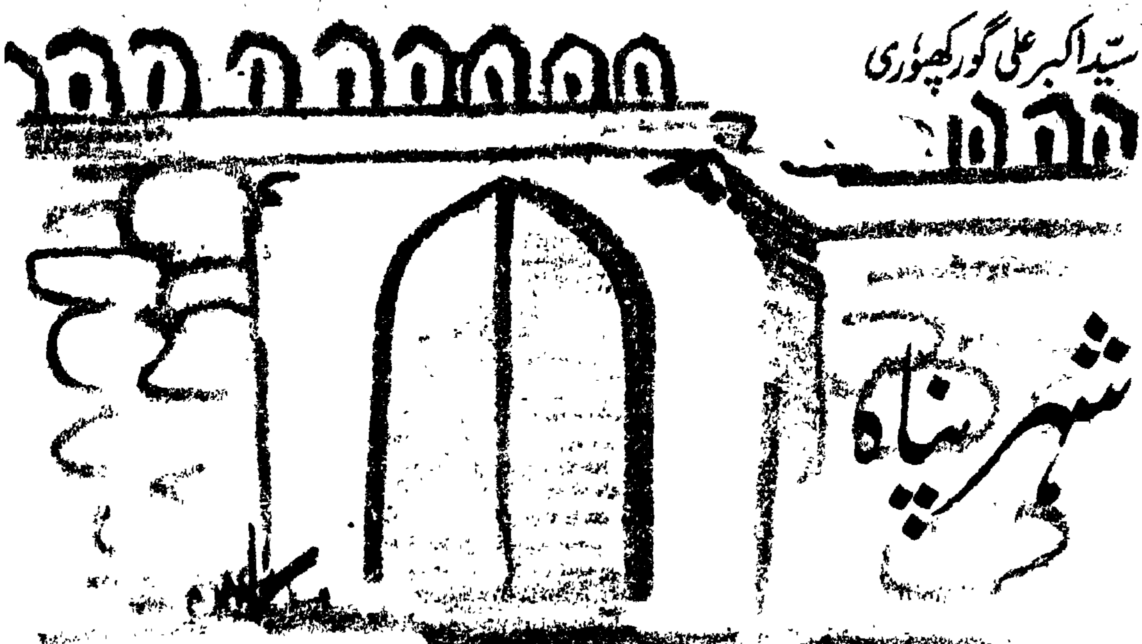
(۲)



(۳)

شہر پناہ

سید اکبر علی گورکھپوری



پُرانے زمانے میں شہروں کے چاروں طرف ایک بہت بڑی پتھر کی دیوار بنا دی جاتی تھی۔ یہ دیوار دشمنوں سے حفاظت کے لئے بنائی گئی۔ اور اسی لئے لوگ اِسے شہر پناہ کہتے تھے۔ اب بھی ہمارے ملک کے پُرانے شہروں میں اس طرح کی شہر پناہیں موجود ہیں۔ یا اُن کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔

شہر کیف کے چاروں طرف ایک ایسی ہی شہر پناہ تھی۔ اس دیوار میں صرف ایک بہت بڑا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ موٹے لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اس پر ہر وقت ایک چوکیدار پہرہ دیتا تھا۔ اس کا کام دروازہ کھولنا اور بند کرنا تھا۔ اِس دروازے کی بڑی سخت نگرانی ہوتی تھی۔ سوائے شہر والوں کے اور کوئی اس میں نہیں داخل ہو سکتا تھا۔ یہ دروازہ کبھی کبھی کُھلتا تھا۔ ورنہ عام طور پر بند رہتا تھا۔ اس لئے چوکیدار کو کافی فرصت رہتی تھی۔

چوکیدار کو شہد بہت پسند تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ دروازے کی چھت پر شہد کی مکھیاں پالوں۔ پھر یہاں ان کو کوئی چھیڑ بھی نہیں سکتا۔ اور مجھے ہمیشہ شہد مفت ملتا رہے گا۔

اس خیال کا آنا تھا کہ چند روز میں چوکیدار نے شہد کی مکھیاں پال لیں۔ اور اب کچھ دنوں کے اندر دیوار کی چھت پر چاروں طرف شہد کے چھتے ہی چھتے دکھائی دینے لگے۔

اس شہر سے کچھ فاصلے پر دوسرا شہر سمرنا آباد تھا۔ سمرنا کے رہنے والے کیف والوں کے پرانے دشمن تھے۔ انھوں نے شہر کیف پر حملہ کرنا چاہا۔ انھوں نے اپنے شہر کے تمام سورماؤں کو بلایا۔ بہت سی تدبیریں سوچی گئیں۔ آخر ایک بڈھا بولا۔

"سمرنا کے لوگو! تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ کیف کے رہنے والے کاہل اور سست ہیں۔ وہ سویرے بہت دیر میں سو کر اٹھتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ تم لوگ بہت تڑکے سورج نکلنے سے پہلے کیف پر دھاوا بول دو۔ جب تک وہ جاگیں گے تم شہر پر قبضہ کر چکے ہو گے۔"

یہ رائے سمرنا والوں کو بہت پسند آئی۔ فوراً ایک فوج تیار کی گئی اور وہ لوگ کیف کی طرف روانہ ہو گئے۔

جب فوج کیف پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ اتفاق سے اندھیری رات بھی تھی۔ اس لئے فوج دیوار کے قریب تک چلی گئی۔

کیف میں صرف نانبائی بہت سویرے اٹھتے تھے۔ کیونکہ ان لوگوں کو صبح صبح تازی اور گرم روٹیاں لوگوں کے ناشتے کے لئے پکانی پڑتی تھیں۔ جب روٹیاں پک کر تیار ہو جاتیں تو یہ نانبائی بھی دوبارہ سو جاتے۔ نانبائیوں کے لڑکوں کو روٹیوں کی دیکھ بھال کے لئے جاگنا پڑتا تھا۔

اس دن جب ایک نانبائی کے دو لڑکے اٹھے تو انھوں نے سوچا کہ چل کر بڑے دروازے کی چھت سے شہد نکالیں۔ بڈھا چوکیدار ابھی تک خرگوش کی طرح مزے میں سو رہا ہوگا۔ اس کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔

وہ دونوں تھوڑی ہی دیر میں چھت پر پہونچ گئے۔

"کیا تم نے کوئی آواز سنی ہے" ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

"ہاں، شاید چوکیدار آ رہا ہے" دوسرے نے آہستہ سے جواب دیا۔

"مگر یہ تو دیوار کے دوسری طرف سے آرہی ہے۔" پہلے نے کہا۔

دونوں لڑکے بہت ہی چالاکی سے زرا جُھک کر چھت کے کنارے پہونچے۔ اور اُنھوں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ نیچے سمرنا کی فوج تیار کھڑی تھی۔ دیوار پر سیڑھی لگادی گئی تھی اور دُشمن کے سپاہی دیوار پر چڑھنے ہی والے تھے۔

"اب کیا کیا جائے؟" دونوں لڑکے ایک ساتھ بولے۔ "اب تو اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ شہر والوں کو جگا دیا جائے۔"

فوراً ہی ایک لڑکے کو شہد کی مکھیوں کے چھتوں کا خیال آیا۔ مانا کہ شہر کے لوگ سو رہے تھے۔ لیکن شہد کی مکھیاں تو جاگ رہی تھیں۔ لڑکوں نے شہد کے چھتوں کو نیچے بہت زور سے سمرنا والوں کی فوج پر گرا دیا۔ اور تیزی سے سیڑھی کے ذریعے نیچے اُتر گئے۔ اُنھوں نے چوکیدار کو جگا دیا۔ سمرنا کی بھاگتی ہوئی فوج کی یہ چیخ و پکار سُن کر کیف والے جاگ اُٹھے۔ کیف کے بہادر سپاہی دروازہ کھول کر باہر کی طرف لپکے۔ لیکن شہد کی مکھیاں اپنا کام کر چکی تھیں۔ دُشمن کی فوج کا ایک بھی سپاہی مقابلے کے لیے نہ آیا۔ سمرنا والوں کی فوج تیزی سے بھاگ رہی تھی اور شہد کی مکھیاں ان کو دَوڑا دوڑا کر کاٹ رہی تھیں۔

اس اُونچے دروازے پر ان دونوں نابالغ لڑکوں کے مجسّمے بنوا دیئے گئے۔ جن کی عقلمندی نے شہر کیف کو بچا لیا تھا اور اس کے بعد کیف والوں نے ایک بڑے میدان میں یہ عہد کیا کہ وہ اب دل و جان سے اپنے ملک کی حفاظت کریں گے۔ اور علی الصبح اُٹھا کریں گے اور پھر اُنھوں نے صبح سویرے اُٹھنے کی عادت ڈال لی۔

سید علیم اللہ حالی

تین بیوقوف



ایک گاؤں سے دو بیوقوف دوست گزر رہے تھے دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی۔ بات ہی بات میں ایک ہرے بھرے میدان سے گزرتے ہوئے، ایک دوست نے کہا،

"اگر مجھے یہ زمین مل جائے، تو میں اس میں گنے کی کھیتی کروں گا۔"

دوسرے نے کہا: "اگر مجھے مل جائے، تو میں اس میں بکریاں پالوں گا یہ ایک اچھی چراگاہ بن سکتی ہے۔"

پہلا :۔ نہیں میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا۔

دوسرا :۔ لیکن میں تو اس میں ضرور بکریاں پالوں گا۔

پہلا :۔ مگر یاد رکھو ابھی سے ہی کہے دیتا ہوں کہ تمہیں اپنی بکریاں باندھ کر رکھنی ہوں گی۔ کھلی رہنے پر وہ میرے گنوں کو کھا جائیں گی۔

دوسرا :۔ میں تو ضرور کھولوں گا۔ اگر بکریاں کھلیں گی نہیں تو پھر اپنا پیٹ کیونکر بھر سکیں گی۔

پہلا:۔ اگر بکریوں کو چھوڑ دوگے تو میں پکڑ کر کھا جاؤں گا۔

دوسرا:۔ تمھاری مجال نہیں جو میری بکریوں کو کھا جاؤ۔

بہت دیر تک دونوں میں بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر نوبت تُو تُو میں میں تک پہونچ گئی۔ عجب نہیں تھا کہ دونوں دوست آپس میں لڑ پڑتے ــــــ اتنے ہی میں ایک طرف سے ایک بڑے میاں آتے دکھائی دیئے۔ خچّر پر سوار تھے اور خچّر کی پیٹھ پر دونوں طرف تیل سے بھری ایک ایک مشک تھی۔ جب بڑے میاں قریب آئے تو دونوں نے اپنا اپنا بیان سُنایا اور کہا:۔

"اگر آپ اس مقدمے کا فیصلہ کردیں گے تو ہم ایک مُناسب رقم آپ کو دیں گے۔"

بڑے میاں کو مقدمہ بہت پیچیدہ معلوم ہوا اور دیر تک سوچتے رہے آخر انھوں نے اپنی دونوں مشکوں کے منہ کھول دیئے اور انھیں اُلٹا کر دیا۔ دونوں بیوقوف حیران تھے کہ بڑے میاں یہ کیا کر رہے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں سارا تیل بہہ گیا اور دونوں مشکیں خالی ہوگئیں اور تب بڑے میاں نے مدبّرانہ انداز میں کہا:۔

"تم دونوں عقل سے ایسے ہی خالی ہو جیسے یہ دونوں مشکیں تیل سے" ــــــ ــــــ اور یہ کہہ کر بڑے میاں بغیر انصاف کئے چلتے بنے۔

پیامی معمّا نمبر ۳۵ کا شاندار نتیجہ

اس بار صحیح حل ۱۲ موصول ہوئے۔ لہٰذا مبلغ تیس روپے کا پہلا انعام ۴/۸ فی کس تقسیم کردیا گیا

(۱) میمونہ بیگم شولاپور (۲) کریم الدین۔ پٹنہ (۳) نرمل سنگھ۔ جمشید پور (۴) اسماعیل محمد علی۔ ضلع رتناگری (۵) شمس بیلاپور (۶) رضی الدین۔ بریلی (۷) اکرام علی۔ بریلی (۸) جمال بھائی فتو بھائی۔ قاضی داؤ خوساری (۹) جمیل احمد کانپور (۱۰) رشید بمبئی (۱۱) رحیم الدین جھبوں (۱۲) محرم علی۔ کرنول۔ (۱۳) منظور احمد۔ رتلام (۱۴) نثار احمد مقبر احمد شولاپور (۱۵) محمد اشرف الدین بمبئی۔ (۱۶) نسیم احمد۔ شولاپور (۱۷) حکمت اللہ۔ کلکتہ۔ (۱۸) محمد عثمان۔ منو ناتھ بھنجن (۱۹) انور احمد۔ دہلی (۲۰) محمد شمیم۔ دہلی (۲۱) محمد نسیم۔ دہلی

صحیح حل پیامی معمّا ۳۵

(۱) پیام (۲) نیک (۳) صفائی (۴) مسافر (۵) راج (۶) مہر (۷) تجلی

ایک غلطی والے ۲۵ حل موصول ہوئے۔ لہٰذا مبلغ بیس روپے کا دوسرا انعام ۱۳/ فی کس تقسیم کردیا گیا

(۱) خورشید جہاں سلطانہ بیگم۔ کلکتہ (۲) عبد المقیم۔ لکھنؤ (۳) عبد الکریم۔ لکھنؤ (۴) بی عائشہ بی۔ داغیاڑی (۵) بہادر حسین پونہ (۶) آفتاب احمد۔ حیدرآباد (۷) جناب احمد۔ حیدرآباد (۸) ایم نظام۔ کلکتہ (۹) نصیر الدین۔ کلکتہ (۱۰) غلام حسین بجہ۔ کشمیر (۱۱) محمد سلیم۔ تیجہ کینٹ (۱۲) حمیدہ بانو۔ کھرگون (۱۳) محمد ابراہیم۔ کھرگون (۱۴) محمد اشفاق حسین تعلقہ روی پیٹھ (۱۵) فاروق احمد قریشی۔ سری نگر کشمیر (۱۶) تنویر احمد۔ لکھنؤ (۱۷) حمیدہ بنت عبد الغنی۔ شولاپور (۱۸) زینت فاطمہ۔ کلکتہ (۱۹) مشتاق احمد۔ ایرنپور (۲۰) شام لال۔ شولاپور (۲۱) سید محمود۔ آگرہ (۲۲) محمد سعید۔ آگرہ (۲۳) سلیم احمد۔ دہلی (۲۴) محمد اکبر۔ دہلی۔

نوٹ:۔ ایک غلطی والا ایک حل اور ہے لیکن [redacted] نام پتہ نہیں لکھا ہے۔ اسلئے انکا نام شائع نہیں کیا جا سکا۔ براہ کرم جن صاحب کا یہ حل ہو۔ معقول ثبوت پہنچا کر اپنا انعام حاصل کریں۔

کمپائلر

جامعہ نگر دہلی

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں	**پچاس ۵۰ روپے کے نقد انعامات**	فیس داخلہ فی حل ایک آنہ جگہ کی صورت میں اور پانچ حلوں فیس ۴ آنے

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۳۰ روپے ‖ دوسرا انعام ایک غلطی پر ۲۰ روپے

حل اور فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۰ ستمبر ۵۴ء

اشارے

۱۔ وزیر صحت شریمتی ۔۔۔۔ کور۔

۲۔ بارش ہو رہی ہو تو ۔۔۔۔ میں بڑا مزہ آتا ہے (سفر ۔ سیر)

۳۔ دنیا بھر میں ہندوستان کے بہت مشہور ہیں (دنگل ۔ جنگل)

۴۔ ۔۔۔۔ کا ناجائز استعمال اچھا نہیں ۔ (طاقت ۔ دولت)

۵۔ بعض لوگ ۔۔۔۔ سے بھی کسی دولت کا اندازہ لگا لیتے ہیں ۔ (نوکر ۔ موٹر)

۶۔ اسے حاصل کرنے کے لیے بعض جان تک کی بازی لگا دیتے ہیں ۔ (راج ۔ تاج)

۷۔ ہمیشہ کم ۔۔۔۔ والا دوکاندار ہی ناکامیاب رہتا ہے ۔ (بولنے ۔ تولنے)

پیامی معمہ نمبر ۳۶

۱	ا	م	ر	ت		
۲	س	ح	ر	■		
۳	د	ن	گ	ل		
۴	د	و	ل	ت	■	■
۵	ن	و	ک	ر	■	■
۶	ر	ا	ج	■	■	■
۷	ت	و	ل	ن	ے	■

ٹوکن پیامی معمہ نمبر ۳۶

نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

پتہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ٹوکن پیامی معمہ نمبر ۳۶

نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

پتہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

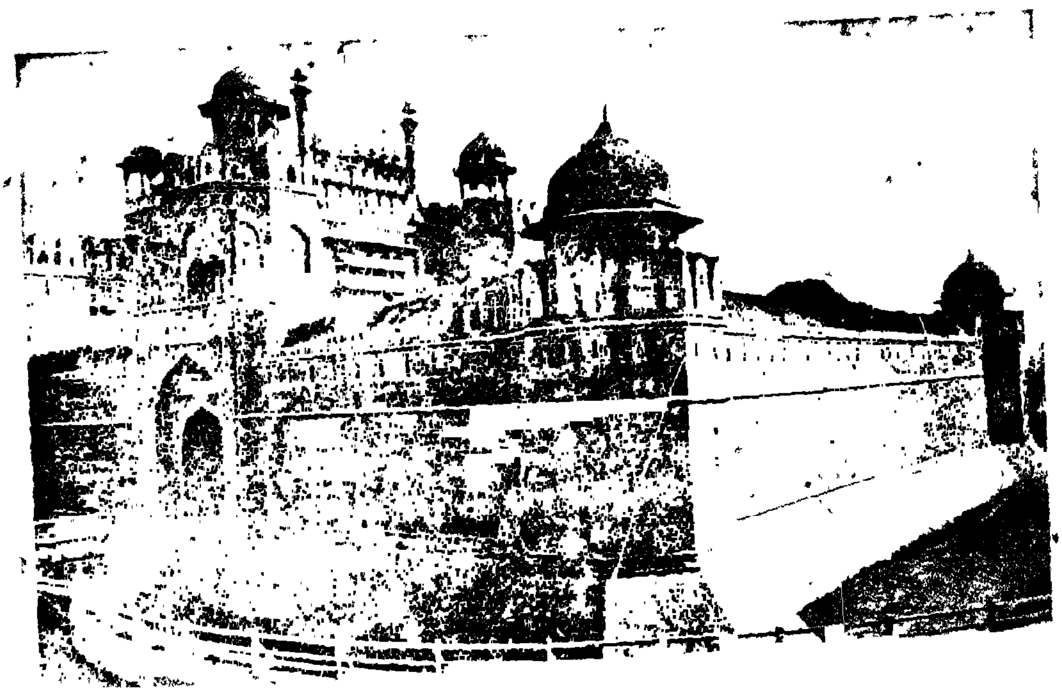
پیامی معما اور فیس بھیجنے کا پتہ

پیامی معمہ ۳۶ معرفت ماہنامہ "پیام تعلیم" جامعہ نگر نئی دہلی

پرنٹر پبلشر:۔ حامد علی خاں
مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ پریس ۔ دہلی



لال قلعہ دہلی کا ایک منظر



\YAM-E-TALEEM

Regd. No. D. 96.
September 54.




پیام تعلیم
ادارہ
حامد علی خاں
اطہر پرویز



آزادی کا مجسمہ - امریکہ -
اندر کے صفحات میں مضمون دیکھئے

NOV 1954

[illegible]

پیامِ تعلیم

فہرست

اور اس کے علاوہ لطیفے، کارٹون، کہانیاں اور معمّے وغیرہ

سالانہ چندہ ۔۔۔ ۴ روپے

فی پرچہ ۔۔۔ ۶ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی

پیامِ تعلیم

کا

اگلا پرچہ سالنامہ ہوگا

سالنامہ نومبر ۵۴ء میں شائع ہوگا

چند لکھنے والوں کے نام

حامد اللہ افسر پروفیسر آل احمد سرور ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی۔
مرزا ادیب ڈاکٹر مسعود حسین خاں پروفیسر مبارز الدین رفعت
الیاس مجیبی حبیب تنویر وامق جونپوری ممتاز حسین
محمد انس بیگم قدسیہ زیدی اخگر مشتاق

سالانہ چندہ مبلغ چار روپیہ بھیجنے والوں کو یہ نمبر مفت ملے گا

قیمت سالنامہ ۔۔۔ ایک روپیہ

منیجر پیامِ تعلیم۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ دہلی

ادارہ

حامد علی خاں بی۔ اے (جامعہ)
اطہر پرویز ایم اے (علیگ)
آرٹسٹ: گلیڈون میسی



بچوں سے باتیں

آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ اِس مہینے ہمارے دیس میں ایک غیر ملکی مہمان آئے تھے ـــــ انڈونیشیا کے وزیر اعظم، جناب علی ساستروامی جویا ـــــ اور ان کی بیگم صاحبہ۔ آپ ۲۳ ستمبر کو ہماری جامعہ بھی تشریف لائے۔ اُن کے آنے کی خبر سُن کر ہم خوشی خوشی اُن کے استقبال کی تیاریوں میں لگ گئے۔ وقت کم تھا اور کام بہت۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے آنے تک کام ختم نہ ہو سکے گا لیکن ایک دفعہ کام شروع کر دیا تو نہ وقت کی کمی محسوس ہوئی اور نہ کام کی زیادتی۔ آخرکار ۲۳ کی صبح کو جامعہ نگر کی چھوٹی سی بستی کو سب نے سجا کر دُلہن بنا دیا۔

مکتبے کے سامنے ایک بڑے پنڈال میں جامعہ کی چھپی ہوئی کتابیں، مسودے، اور چارٹ لگائے گئے تھے۔ جس کو ایک ہی نظر میں دیکھ کر ہمارے کام کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

جب آپ ساری جامعہ کی سیر کر چکے تو پھر اُستادوں کے مدرسے کے ہال میں ایک جلسہ ہوا۔ جہاں جامعہ کے بچّوں کی طرف سے اُن کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اور پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ مُعزّز مہمان ہماری جامعہ اور بچّوں کے جوش و خروش کو دیکھ کر بہت خوش خوش تشریف لے گئے۔

لیجئے اسی کے ساتھ جامعہ کے تعلیمی میلے کی بھی کچھ خبریں سُن لیجئے۔ اب جدھر دیکھئے اُدھر میلے کی باتیں ہونے لگی ہیں۔ ہر طرف یہی چرچے ہیں۔ پروگرام طے ہو رہے ہیں، تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ابھی سے سب لوگوں نے اپنے اپنے ذمّے کام بانٹ لئے ہیں۔ در اصل میلہ ہماری جامعہ کا سالانہ تہوار بن گیا ہے۔ اس موقع پر ہم خود اپنے کاموں کو جانچتے ہیں۔ کہ ہم نے اپنے کام کو کتنا آگے بڑھایا ہے۔ یہ میلہ جہاں ہماری سیر و تفریح کے سامان اکٹھا کرتا ہے، وہاں ہمارا امتحان بھی ہے۔

اس بار ہم میلے کے موقع پر اپنا سالنامہ پیش کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ہم نے ہندستان کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں سے مضامین کہانیاں اور نظمیں لکھوائی ہیں۔ اگلا پرچہ یہی سالنامہ ہوگا۔

ضروری اعلان

اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کا سالنامہ آپ کے پاس محفوظ پہنچ جائے تو ۶ر کے ٹکٹ رجسٹری کے لئے بھیج دیں تاکہ آپ کے نام پرچہ بذریعہ رجسٹری روانہ کر دیا جائے۔ ٹکٹ کے ساتھ ہی اپنا خریداری نمبر اور پتہ صاف خوشخط لکھئے۔

ایک پہیلی

میں کیا ہوں یہ بتلاؤ تم
لکڑی کا اک بڑا ڈبا سا
بجلی سے چلتا رہتا ہوں
شعلہ کی طرح [illegible] رہتا ہوں
میں باتیں [illegible] لیتا
دنیا بھر کی خبریں میرا
صبح و شام بجتا ہوں
پیغام اپنا سناتا ہوں
ہیں سب کھیلوں کا باوا ہوں

پھر گھی اور شکر کھاؤ تم
بیٹھا ہوں میں اک چھوٹا سا
دن رات چلتا رہتا ہوں
دن رات چہکتا رہتا ہوں
بلبل کی طرح چہکتا رہتا ہوں
میں گانے خوب سنا دیتا
پھر گھر وہ پہنچا دیتا
پھر گھر میں نام میرا
بڑا سا اسی میں رہتا ہوں
اس ڈبے میں بہتا رہتا ہوں
بچوں کا دل بہلاتا ہوں
میں کیا ہوں یہ بتلاؤ تم
پھر گھی اور شکر کھاؤ تم

اس کا حل صفحہ ... پر ملاحظہ فرمائیے

محمد شفیع الدین نیر

حامد اللہ افسر

گاندھی جی کی باتیں



۱۹۲۱ء کا ذکر ہے، میں ایل، ایل، بی کا طالب علم تھا، گاندھی جی میرے وطن میرٹھ میں تشریف لائے، مجھے اُن سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ آخر میری آرزو بر آئی اور مجھے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل گیا۔ باتیں کرتے کرتے گاندھی جی نے میری اچکن کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "دیسی کپڑا کیوں نہیں پہنتے؟" میں نے عرض کیا "میں چار چیزیں مستقل طور پر استعمال کرتا ہوں۔ دیسی آم کھاتا ہوں، دیسی پان کھاتا ہوں دیسی آلو کھاتا ہوں اور دیسی شکر استعمال کرتا ہوں، کیا یہ کافی نہیں ہے؟" گاندھی جی نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا اور فرمایا "تب تو آپ کے لئے دیسی کپڑا پہننا اور بھی آسان ہے، ایک ہی دیسی چیز کا تو اور اضافہ ہوگا۔"

اس کے بعد متعدد بار کئی کئی برس کے وقفہ کے بعد مجھے گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا مگر خیریت یہ ہے کہ ہر مرتبہ مجھے دیکھتے ہی انھیں میری چار دیسی چیزوں میں اپنی اسی پانچویں دیسی چیز کے اضافے کا خیال آگیا۔

۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا، گاندھی جی مسوری پہاڑ پر برلا ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں بھی اُس

سال مسوری گیا ہوا تھا اور گاندھی جی کی خدمت میں کبھی کبھی حاضر ہوتا رہتا تھا۔

مسوری میں ان دنوں بہت سے لداخی مزدور آئے ہوئے تھے۔ لداخ کشمیر میں ایک جگہ ہے یہاں کے رہنے والوں کو لداخی کہتے ہیں۔ سنتے ہیں وہ ہر سال گرمی کے موسم میں کام کی تلاش میں مسوری اور دوسرے مقامات پر آجاتے ہیں، یہ سب کے سب یا ان میں سے زیادہ تر مسلمان تھے، بیچارے بہت غریب تھے، ایک پھٹے ہوئے جانگیے اور پیوند لگے ہوئے سلوکے کے سوا ان کے بدن پر کچھ نہ ہوتا تھا۔ رات کے وقت ٹاٹ کے بورے میں لیٹ جاتے تھے، یہی ٹاٹ کا بورا ان کا لحاف تھا اور یہی ان کا گدا۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر گاندھی جی کو بڑا ترس آیا اور انہوں نے ان کی امداد کے لئے مختلف تجاویز پر غور کرنا شروع کیا، اسی سلسلہ میں گاندھی جی نے ایک ایسی عمارت کی تعمیر کی تحریک بھی شروع کی جہاں یہ بیچارے پہاڑی مزدور ٹھہر سکیں۔ اور ان سے اس کا کرایہ نہ لیا جائے۔ شاید اس عمارت کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپے کے وعدے بھی ہو گئے تھے۔

ایک دن میں بیٹھا ہوا تھا کہ یہ ذکر چلا کہ اس عمارت کا نام کیا رکھا جائے۔ کئی نام تجویز ہوئے مگر گاندھی جی کو کوئی نام بھی پسند نہ آیا۔ آخر فیصلہ اس پر ہوا کہ اسے "دھرم شالہ" کہا جائے۔

میں نے عرض کیا " اگر اس کا نام دھرم شالہ رکھا گیا تو ان بیچارے لداخی مزدوروں میں سے زیادہ تر تو اس میں داخل بھی نہ ہو سکیں گے، کیونکہ وہ مسلمان ہیں۔ یہ عمارت بھی اسی طرح کی ہو جائے گی جیسے اور بہت سے دھرم شالے ہیں۔"

مہاتما جی نے کہا " مگر ان کے لئے ہم اس عمارت میں خاص طور پر کچھ کمرے مقرر کر دیں گے۔"

میں نے عرض کیا " پھر بھی شاید وہ اس میں ٹھہر نہ سکیں کیونکہ دھرم شالہ میں مسلمان کہاں ٹھہر سکیں گے!"

مہاتما جی نے فرمایا " پھر اس کا علاج کیا ہے؟"

میں نے عرض کیا " اس عمارت کا نام آپ غریب خانہ کیوں نہیں رکھتے۔"

ایک اور صاحب وہاں بیٹھے ہوئے تھے بولے "غریب خانہ تو شاید اپنے گھر کو کہتے ہیں"۔ میں نے کہا "جی ہاں کہتے تو ہیں لیکن اپنے گھر کو غریب خانہ محض انکساری کی وجہ سے کہتے ہیں، خود کو غریب فرض کر لیتے ہیں اور اپنے گھر کو غریب خانہ قرار دیتے ہیں، ورنہ غریب خانہ کے معنی غریب کا گھر کے سوا اور کچھ نہیں۔

گاندھی جی کو یہ نام پسند آیا اس کے بعد مجھے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ عمارت بنی بھی یا نہیں اور اس کا نام غریب خانہ رکھا گیا یا نہیں۔

(۳)

گاندھی جی جھوٹ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ستیا گرہ آشرم میں نیک چلنی اور سچائی کے قواعد بڑے سخت تھے یہاں تک کہ بچوں کو بھی ان کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔

ایک دفعہ ایک نوجوان آشرم میں رہنے کے لئے آئے، یہ بی۔اے پاس کر چکے تھے۔ حسب دستور گاندھی جی نے ان کے سپرد یہ کام کیا کہ تین مہینے تک وہ آشرم میں روزانہ جھاڑو دیا کریں۔

اس نوجوان کو بچوں سے بڑا انس تھا اور بچے بھی اس سے بہت مانوس تھے۔ ایک دن آشرم کی ایک آٹھ سالہ لڑکی اس سے ایک لیمو چھیننا چاہتی تھی، وہ اس لڑکی کے ساتھ کھیلنے لگا اور اُسے تھپا مارا اور لیمو نہیں دیا، لڑکی تنگ آ کر رو پڑی، اصل میں یہ لیمو وہ آشرم کے ایک مریض کے واسطے لئے جا رہا تھا، اُسے کیسے دے دیتا، جب لڑکی رونے لگی تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کرے، آخر اُسے ایک ترکیب سوجھی، اُس نے لیمو ہاتھ میں لے کر زور سے اپنا ہاتھ ہلایا اور یہ ظاہر کیا کہ جیسے لیمو کو سابرمتی ندی میں پھینک دیا ہو، مگر اصل میں ایسا نہیں کیا تھا بلکہ چالاکی سے لیمو کو اپنی جیب میں رکھ لیا تھا، اب لڑکی کا دھیان ندی کی طرف گیا اور کہنے لگی "میں لیمو کو ندی سے نکال لاؤں، کنارے ہی پر تو ہوگا۔" نوجوان نے جواب دیا "لیمو ندی میں ڈوب بھی گیا، اب تم اُسے نہیں نکال سکتیں۔"

بات آئی گئی ہوئی، دونوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مریض

کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نوجوان نے اپنی جیب سے رومال جو نکالا تو اس کے ساتھ لیمو بھی جیب سے نکل کر زمین پر گر پڑا، لڑکی ہکا بکا رہ گئی، اور نفرت سے نوجوان کی طرف دیکھ کر بولی "اچھا آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا لیمو آپ نے جیب میں رکھ لیا تھا اور مجھ سے کہہ دیا کہ میں نے ندی میں پھینک دیا۔ آشرم میں رہ کر آپ نے اتنی بُری بات کی، میں باپو سے کہوں گی کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ بھاگی اور سیدھی گاندھی جی کی خدمت میں پہنچی اور ان سے کہہ دیا کہ فلاں آدمی نے اس طرح جھوٹ بولا، گاندھی جی نے کہا "ہم معلوم کریں گے کہ کیا بات ہے اور کیوں انھوں نے جھوٹ بولا۔"

شام کو دعا کے بعد گاندھی جی نے اُس نوجوان کو بلایا، اور اس سے پوچھا کہ کیا بات تھی، اس نے سارا قصہ سنا دیا اور کہنے لگا "یہ سب محض مذاق تھا۔"

گاندھی جی نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا "دیکھو آئندہ سے اس بات کا خیال رکھو کہ بچوں سے مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولو۔"



بادشاہ اور مچھیرے کی کہانی

وحیدالحسن

ایراودی ندی کا نام تو آپ نے بھی سنا ہوگا۔ یہ ندی برما میں ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں وہاں ایک مچھیرا رہتا تھا۔ یہ بے چارا بہت بوڑھا تھا اور اسی بڑھاپے کی وجہ سے وہ زیادہ کام کاج بھی نہ کرسکتا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے اور اپنے خاندان کی پرورش کر رہا تھا۔ ایک دن وہ علی الصباح اٹھا اور ایراودی ندی کے کنارے مچھلی پکڑنے چلا گیا۔ اس نے اپنا جال پانی میں ڈالا اس وقت زمین پر بیٹھ کر وہ ایک برمی گانا گانے لگا جس کا مطلب یہ تھا۔

کیا اچھا ہوتا اگر میں بادشاہ ہوتا اور میرے پاس رہنے کے واسطے عالی شان محل ہوتا میرے پاس کام کرنے کے لئے نوکر ہوتے، میں کتنا سکھی ہوتا۔ اگر میں بادشاہ ہوتا تو میرے سر پہ تاج ہوتا، میں خوبصورت شاہانہ کپڑے پہنتا اور راج سنگھاسن پر بیٹھتا۔

جب وہ اپنا گانا گا رہا تھا تو بادشاہ اپنے دوستوں اور نوکروں کے ساتھ اُدھر سے گزر رہا تھا۔ بادشاہ بڑا خوش مزاج اور نیک تھا۔ اُسے مذاق سوجھا اور وہ اس مچھیرے کو اپنے محل میں لے جانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے اپنے سامان سے ایک بوتل نکالی

جس کے اندر ایک سفید پھول تھا اس پھول کے سونگھنے سے آدمی گہری نیند سو جاتا ہے۔ لہٰذا بادشاہ نے ایک نوکر کے ہاتھ یہ پھول بھیجا تاکہ مچھیرے کو بے خبری میں محل میں لے آیا جائے نوکر نے مچھیرے سے باتیں کرکے دوستی پیدا کی اور پھول سنگھایا۔ مچھیرا گہری نیند سو گیا تو اس کو بادشاہ کے محل میں اٹھا لائے۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کے پرانے کپڑے اتار لئے جائیں اور اس کو شاہی لباس پہنایا جائے۔ مچھیرے کی جب آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک بڑے کمرے میں پایا یہ دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن جلد ہی اس نے دوبارہ آنکھ کھولی، ہر چیز کو ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ اپنی آنکھیں ملیں، چاروں طرف خوب غور سے دیکھا واقعی یہ خواب نہیں تھا۔ اب اس کو یقین ہو گیا کہ میں شاہی محل میں ہوں۔ اور ذرا سی دیر میں اُسے معلوم ہوا کہ وہ اس دیس کا راجہ ہے اور یہ محل اُس کا اپنا محل ہے۔ دسیوں نوکر چاکر اس کے حکم کے منتظر ہیں۔ اب تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمایا اس نے ایک نوکر کو حکم دیا کہ اس کے لئے اچھے اچھے کھانے لائے۔ اس کے حکم کی دیر تھی کہ سامنے کے کمرے میں کھانا قرینے سے سجا دیا گیا اور راجا صاحب نے خوب مزے لے لے کر یہ کھانا کھایا۔

جب ان کا پیٹ بھر گیا تو اس نے نوکروں سے پوچھا کہ "میں اس محل میں کیسے آیا؟" نوکروں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور انھیں دوسرے کمرے میں آرام کرسی پر لٹا دیا۔ جہاں گانا گانے والوں نے مسے گانا سنایا۔ پھر ایک نوکر نے لا کر ایک خوبصورت سا گلدستہ دیا۔ لیکن جیسے ہی انھوں نے گلدستے کے پھول کو سونگھا تو انھیں پھر نیند آ گئی۔

اس وقت بادشاہ نے نوکروں کو حکم دیا کہ اس مچھیرے کو اس کے پرانے کپڑے پہنا کر دریا کے کنارے ڈال آؤ لیکن ایسا کرنے سے پہلے اس کے گلے میں ایک سونے کی زنجیر ڈال دو۔

ابھی شام ہوئی تھی، سورج پورے طور

پر ڈوبا بھی نہیں تھا کہ مچھیرے کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو پھر وہیں ایراودی ندی کے کنارے پڑا پایا۔ اب اس کو بڑا تعجب ہوا کہ کس طرح وہ بادشاہ کے محل میں پہنچا اور کس طرح یہاں آیا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس کے گلے میں کوئی زنجیر پڑی ہے۔ اُتار کر دیکھا تو یہ سونے کی تھی اور اس پر بادشاہ سلامت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی زندگی میں کبھی چوری نہ کی تھی اور اب اگر لوگوں نے اس کے پاس یہ ہار دیکھ لیا تو یہی سمجھیں گے کہ اس نے یہ ہار محل سے چرایا ہے۔ اس خیال سے وہ گھبرایا اور اس کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ ہار نہیں ہے بلکہ کوئی سانپ ہے۔

آخر سوچتے سوچتے اس کے سمجھ میں ایک ترکیب آگئی۔ اس نے سوچا کہ خود ہی چل کر بادشاہ کو یہ ہار لوٹا دینا چاہیئے۔ یہ سوچ کر وہ سیدھا راج محل پہنچا اور بادشاہ کو ساری کہانی سنائی۔ بادشاہ بہت ناراض ہوا اور اس نے حکم دیا کہ اس مچھیرے کو چوری کے جرم میں قید خانے میں ڈال دو۔ غریب مچھیرا بید کی طرح کانپنے لگا اور گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ اب تو بادشاہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا اس نے مچھیرے کو سارا واقعہ سنایا۔ مچھیرا بھی حیران رہ گیا۔

بادشاہ مچھیرے کی ایمانداری سے بے حد خوش ہوا اور اس کو ایک ہزار اشرفی کی ایک تھیلی انعام کے طور پر دی اور وہ سونے کی زنجیر بھی اُسے بخش دی۔ مچھیرا خوش خوش دربار سے رخصت ہوا اور اپنی آئندہ زندگی ہنسی خوشی آرام سے گزاری۔

پروفیسر مبارز الدین رفعتؔ



فردوسی

ایک ہزار سال سے بھی زیادہ ہو گئے کہ ایران میں ایک بہت بڑا شاعر گذرا ہے۔ اس کا نام ابو القاسم تھا۔ جو بعد میں فردوسی کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ طوس کے پاس ایک چھوٹے سے گاؤں طابران میں پیدا ہوا۔ اس بچّے کو اپنے دیس سے بڑا پریم تھا۔ وہ بچپن ہی سے اپنے دیس کے سورماؤں کی کہانیاں بڑے شوق سے سُنا کرتا تھا۔ جب وہ لکھ پڑھ کر بڑا ہوا، تو اُسے یہ معلوم ہوکر بڑی خوشی ہوئی کہ اُس کے اپنے ہی دیس کا ایک شاعر دقیقی ایران کے بڑے بڑے بادشاہوں اور سورماؤں کی کہانیوں کو شعروں میں لکھ رہا ہے۔

ابھی دقیقی نے صرف ایک ہی ہزار شعر لکھے تھے کہ اُس کے غلام نے اُسے مار ڈالا۔ فردوسی کو دقیقی کے مرنے کا بہت افسوس ہوا۔ اور اُس نے دقیقی کے کام کو ختم کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ سب سے پہلے تو ایران کی تاریخی کتابوں کو فردوسی نے بڑی محنت سے اکٹھا کیا۔ جب یہ نظم پوری ہوگئی تو اُس کا نام شاہنامہ رکھا۔

اُس زمانے میں ایرآن میں سُلطان محمود غزنوی کی حکومت تھی۔ محمود نے دوسرے ملکوں پر حملے کرکے خوب دولت اکٹھا کر لی تھی۔

اُس زمانے کے شاعر محمود غزنوی کی شان میں قصیدے لکھ لکھ کر خوب روپے کما رہے تھے۔ یوں تو فردوسی کو دولت کی کوئی لالچ نہ تھی۔ اس لئے کہ اُس کے صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ لیکن وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کی شادی خوب دھوم دھام سے کرے۔ اس کے علاوہ اُس کے وطن میں ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ جس کا بند خراب ہوگیا تھا۔ فردوسی اُسے ٹھیک کرانا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کے پاس اتنے پیسے کہاں تھے۔ اس لئے اُس نے سوچا کہ کیوں نہ یہ نظم پوری کرکے بادشاہ کے حضور میں پیش کرے۔ اور جب انعام مل جائے، تو اپنی بیٹی کی شادی بھی دھوم دھام سے کرے، اور تالاب کی مرمت بھی کرائے

یہ سوچ کر فردوسی محمود کے دربار میں پہنچا۔ اُس نے بادشاہ کو اپنے کچھ شعر سُنائے۔ شعر سُن کر بادشاہ بے حد خوش ہوا۔ اور اُس نے وعدہ کیا کہ اس کے پورا ہونے پر ہر شعر پر سونے کی ایک ایک اشرفی انعام میں دی جائے گی۔ یہ وعدہ لے کر فردوسی واپس آیا اور اُس نے دس پندرہ سال تک شاہنامہ پر خوب جی لگا کر محنت کی، اور ساٹھ ہزار شعروں میں شاہنامہ پورا کیا۔ اُس وقت فردوسی کی عمر اسّی سال کی ہوگئی تھی۔ لیکن جب شاہنامہ پورا ہوگیا، تو بادشاہ اپنے وعدے سے پلٹ گیا، اور ساٹھ ہزار اشرفیاں دینے کے بجائے اُسے چاندی کے ساٹھ ہزار درم دینے کا حکم دیا۔

جب سلطان کا یہ انعام فردوسی کے پاس پہنچا تو اُس کو بڑا دُکھ ہوا۔ اُس نے یہ انعام سلطان کو لوٹا دیا اور ناراض ہوکر غزنی سے چلا گیا۔

کہتے ہیں کہ غزنی سے چلتے چلتے فردوسی نے سلطان کی بُرائی میں ایک

نظم لکھ دی۔ یہ نظم پڑھ کر سلطان بہت خفا ہوا۔ فردوسی پہلے تو ادھر اُدھر چھپتا رہا۔ لیکن پھر کسی نہ کسی طرح اپنے وطن میں پہنچ کر گھر بیٹھ رہا اور سلطان کے ہاتھ نہ آیا۔

ادھر اتفاق کی بات ہے کہ سلطان کسی لڑائی پر گیا۔ لڑائی ابھی شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ سلطان کے دشمن صلح کی بات چیت کرنے لگے۔ سلطان نے اپنے وزیر سے کہا:۔

"اگر صلح نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟"

وزیر نے تراق سے یہ جوش دلانے والا شعر پڑھ دیا ؎

اگر جز بکام من آید جواب
من و گرز و میدان و افراسیاب

یعنی اگر میرے مقصد کے مطابق جواب نہ آیا، تو پھر میں ہوں گا، گُرز ہوگا، میدان جنگ ہوگا اور دشمن ہوگا

سلطان یہ شعر سُن کر پھڑک گیا، پوچھا کس کا شعر ہے؟ وزیر نے کہا اسی پھوٹے نصیب والے کا جس کا نام فردوسی تھا، اور جو سلطان کے انعام سے محروم رہ گیا۔ اور آج جانے کس عالم میں زندگی گذار رہا ہے۔ سلطان کو بہت افسوس ہوا اور اُس نے کہا:۔

"جب ہم غزنی پہنچیں تو ہمیں یاد دلانا۔"

واپسی پر جب غزنی میں وزیر نے اُسے وہ بات یاد دلائی تو سلطان نے ساٹھ ہزار سونے سے لدے پھندے اونٹ فردوسی کے پاس بھیجے۔ اتفاقاً اِدھر سے بادشاہ کے انعام سے لدے ہوئے اونٹ شہر کے ایک دروازے سے داخل ہوئے، اور اُدھر دوسرے دروازے سے لوگ فردوسی کا جنازہ لئے ہوئے شہر سے باہر نکلے۔

سلطان کے آدمیوں نے یہ انعام فردوسی کی بیٹی کو دینا چاہا۔ لیکن وہ لڑکی تھی تو فردوسی ہی کی، اُس نے یہ انعام لوٹا دیا۔ اور کہا "جو دولت میرے باپ کے کام نہ آسکی، اسے میں کیا کروں گی۔"

مسعود الحق صدیقی

(پنچ تنتر کی ایک کہانی)





کبوتر راجا

جنوبی ہندوستان میں ایک شہر ہے مہیل پور۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک برگد کا اونچا پیڑ تھا۔ اس پر ہر طرح کے پرندے رہتے تھے۔ اس کے خول میں طرح طرح کے کیڑے بستے تھے۔ اور ادھر سے آنے جانے والے مسافر اس کے سائے میں آرام کرتے تھے۔ اسی پیڑ پر ایک کوّا رہتا تھا۔ ایک دن وہ چارے کی تلاش میں شہر جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک کالا آدمی اپنے ہاتھ میں ایک جال لئے ہوئے کھڑا ہے۔ اس نے سوچا کہ ضرور یہ آدمی اپنے برگد ہی کی طرف جا رہا ہے۔ شاید وہاں کے رہنے والے پرندوں کو پکڑے گا۔ یہ سوچ کر وہ لوٹا اور پرندوں سے بولا "ارے یہ چڑیمار جال اور چاول لے کر آ رہا ہے۔ چاول بکھیر کر وہ جال پھیلائے گا۔ تم سب اس چاول کو زہر سمجھنا۔ ایسا ہی ہوا۔ چڑیمار نے جال پھیلایا۔ لیکن ایک پرندہ بھی چاول چگنے نہیں آیا۔ اتفاقاً ذرا سی دیر کے بعد کبوتروں کا راجا اپنے ایک ہزار ساتھیوں کے ساتھ دانے کی تلاش میں جا رہا تھا۔ اس نے دور سے چاول کے دانے کو دیکھا اور کوّے کے منع کرنے کے باوجود بھی ان چاولوں پر ٹوٹ پڑا۔ پھر تو ان سب ساتھیوں کے ساتھ جال میں پھنس گیا۔ چڑیمار یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

اور لاٹھی اٹھا کر مارنے دوڑا۔ کبوتروں کے راجا نے جو اُسے آتے دیکھا تو اپنے ساتھیوں سے بولا "ارے ڈرو مت، دکھ پڑنے پر جو گھبراتا نہیں اسی کے دکھ دُور ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سب مل کر جال کے ساتھ ہی اڑ چلو۔" یہ سن کر سب نے اس پر عمل کیا۔ چڑیمار نے جو دیکھا تو پیچھے دوڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کبوتر اب تو اکیا کر کے اڑے جا رہے ہیں لیکن جب لڑیں گے تو ضرور گریں گے۔ کوٹے نے دیکھا اب جب یہ کبوتر آنکھ سے اوجھل ہو گئے تو چڑیمار واپس آ گیا۔ اس نے دل میں سوچا کہ پرندوں کا ہاتھ آنا تو دور رہا، جس جال سے گھر والوں کے لئے روٹی کماتا تھا وہ بھی جاتا رہا۔

جب کبوتروں کے راجا نے دیکھا کہ چڑیمار چلا گیا تو اس نے کبوتروں سے کہا "ارے وہ چڑیمار لوٹ گیا۔ اس لئے اب اطمینان سے شمال کی طرف چلو وہاں میرا ایک چوہا رہتا ہے جو میرا دوست ہے وہ یہ پھندے ضرور کاٹ دے گا۔ مصیبت میں سوائے دوست کے کوئی مدد نہیں کرتا۔"

راجا کے کہنے پر سب کبوتر اُتر پڑے۔

وہ چوہا ایک قلعہ بنا کر اپنے بل میں رہتا تھا کبوتروں کے راجا نے بل کے پاس پہنچ کر زور سے آواز دی۔ "ارے دوست جلدی آؤ، میں بڑی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ یہ سُن کر چوہا قلعہ کے اندر سے بولا" ارے تم ہو کون، کس لئے آئے ہو تم کو کیا مصیبت آن پڑی ہے؟" کبوتروں کے راجا نے جواب دیا" میں تمہارا ساتھی کبوتروں کا راجا ہوں۔ اس لئے تم جلدی سے آؤ۔ تم سے بہت کام ہے۔ یہ سُن کر چوہا خوشی خوشی جلدی سے باہر آ گیا۔ دوست کے گھر آنے پر جتنی خوشی ہوتی ہے اس سے زیادہ اور کس چیز سے خوشی ہو سکتی ہے۔ لیکن جب اس نے ان سب کو جال میں پھنسا ہوا دیکھا تو دکھی ہوکر پوچھا "ارے تمھارا کیا حال ہے۔ کس طرح اس جال میں پھنس گئے؟"

کبوتروں کے راجا نے جواب دیا" جانتے ہوئے بھی کیا پوچھتے ہو۔ میں لالچ کی وجہ سے اس میں پھنس گیا ہوں۔ اب تو جلدی سے مجھے چھڑاؤ۔"

یہ کہہ کر جب اس نے دیکھا کہ چوہا اُس کے پھندے کاٹنے کو تیار ہے تو وہ بولا" دوست

ایسا مت کرو۔ پہلے میرے ساتھیوں کے پھندے کاٹو۔ اس کے بعد میرے" یہ سُن کر چوہا غصے ہو کر بولا" تم نے ٹھیک نہیں کہا، پہلے راجا پھر پرجا" کبوتر نے کہا" دوست! یہ سب اپنا گھر بار چھوڑ کر میرے پاس رہتے ہیں اس لئے کیا میں ان کا اتنا خیال بھی نہ کروں جو راجا اپنی رعایا کا خیال رکھتا ہے وہ رعایا اس کا ساتھ مصیبت میں بھی نہیں چھوڑتی۔ اگر کہیں پھندے کاٹتے ہوئے تیرے دانت ٹوٹ گئے یا وہ چڑیمار آ پہنچا تو پھر میں جہنم میں جاؤں گا۔ کیونکہ اگر رعایا تکلیف اٹھائے اور راجا سکھ پائے تو وہ راجا آخرت میں دُکھ اُٹھاتا ہے۔

یہ سُن کر چوہا بڑا خوش ہوا! اور بولا "اجی میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔ میں تو در اصل آپ کا امتحان لے رہا تھا۔ میں خود پہلے دوسرے پرندوں کے پھندے کاٹوں گا پھر آپ کے۔ اس طرح بہت سے کبوتر آپ کی خدمت میں آجائیں گے"۔

یہ کہہ کر اس نے سب کے بندھن کاٹ ڈالے اور کہا" دوست! اب تو اپنے گھر جا۔ پھر مصیبت پڑے تو یہاں آنا"۔

آزادی کا مجسمہ

مجیب احمد خاں



پچھلے سو ڈیڑھ سو سالوں میں انسان نے جو چند حیرت انگیز چیزیں بنائی ہیں اُن میں امریکہ کے آزادی کے مجسمے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ مجسمہ فرانس اور امریکہ کے باشندوں کے اُس اتحاد عمل کی یادگار ہے جس کے بل بوتے پر امریکہ نے آزادی کی جنگ میں فتح حاصل کی تھی۔ اور یہ اصل میں وہ تحفہ ہے جو فرانس نے امریکہ کے باشندوں کو پیش کیا۔ یہ مجسمہ امریکہ کے سب سے مشہور اور دنیا کے سب سے بڑے شہر اور بندرگاہ نیویارک کے مشرق میں "بیڈلو" نامی ایک چھوٹے سے جزیرے پر نصب ہے۔ یورپ سے آنے والے مسافر جب امریکہ کے قریب پہنچتے ہیں تو سب سے پہلے ان کو یہی دیوپیکر مجسمہ ہی نظر آتا ہے۔

کانسے اور تانبے سے بنے ہوئے اس مجسمہ کی اونچائی ۱۵۲ فٹ ہے۔ اس کے اُلٹے ہاتھ میں ایک کتاب ہے جو امریکہ کی آزادی کے "اعلان نامہ" کو ظاہر کرتی ہے۔ داہنا ہاتھ سیدھا اُوپر اٹھا ہوا ہے اور اس کی مضبوط مٹھی میں ہمیشہ روشن رہنے والی ایک مشعل ہے۔ جس چبوترہ پر یہ مجسمہ نصب کیا گیا ہے اُس کی اونچائی تقریباً ۱۵۰ فٹ ہے۔ یہ چبوترہ، چوکے

پتھر اور کنکریٹ سے بنایا گیا ہے۔ بیچ بیچ میں لوہے کے بہت بڑے بڑے اور مضبوط گارڈر لگائے گئے ہیں جن کے اوپری سرے پر مجسمہ کو بڑی مضبوطی کے ساتھ نصب کر دیا گیا ہے چبوترے اور مجسمے دونوں کو ملا کر اُس کی اونچائی ۳۰۵ فٹ ہے یعنی قطب مینار، جو ہندوستان کی سب سے اونچا مینار ہے، اس سے بھی ۶۷ فٹ زیادہ۔

اس یادگار کو قائم کرنے کا خیال سب سے پہلے ایک مشہور مورخ موسیو ایڈورڈ لیبولے کے دل میں پیدا ہوا۔ دو ملکوں کے اتحاد کے سو سالہ جشن کے موقع پر یہ یادگار قائم کی جائے۔ اور جب اس نے اس کا اظہار امریکہ اور فرانس کے لوگوں پر کیا تو ہر طرف سے اس کی تائید کی گئی۔ لیبولے نے یہ بھی کہا کہ اس یادگار کے قائم کرنے میں ہم دونوں ملکوں کی حکومتوں سے کوئی مدد نہ لیں گے بلکہ عام لوگوں سے چندہ لے کر اس کے تمام اخراجات برداشت کریں گے بس پھر کیا تھا۔ چندہ جمع کرنے کا کام تیزی سے شروع ہو گیا مجسمہ کا نمونہ بنانے کے لئے فرانس کے مشہور مجسمہ ساز فریڈرک بارتھولڈی سے بات کی گئی۔ بارتھولڈی پہلے ہی سے اس کام کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن میں مجسمے کی پوری تصویر مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن کام شروع کرنے سے پہلے اُس نے کہا کہ جس جگہ یہ مجسمہ نصب کرنا ہے اس جگہ کا انتخاب پہلے کر لینا ضروری ہے۔ لہٰذا وہ فرانس سے امریکہ آیا جیسے ہی وہ اس بندرگاہ کے قریب پہنچا اس کے ذہن کی تصویر سامنے آ گئی اور پھر تو یہ تصویر ایک جگہ آ کر ٹھہر گئی۔ بارتھولڈی نے اسی جگہ کا انتخاب کر لیا۔ یہ حصہ بیڈلو جزیرے کے نام سے مشہور ہے۔ سب سے پہلے اُس نے اسی مجسمے کا ۹ فٹ کا ایک ماڈل تیار کیا۔

اس مجسمہ کو بغیر کسی تبدیلی کے منظور کر لیا گیا۔ بارتھولڈی نے اسی وقت یہ بھی بتایا کہ اصل مجسمہ نمونہ سے تقریباً ۱۳ گنا اونچا ہوگا۔ اس لئے جس چبوترہ پر یہ لگایا جائے گا۔ اس کو بہت زیادہ مضبوط بنانا بھی تو نہایت ضروری تھا۔ کہتے ہیں اس مجسمہ پر دو لاکھ پچاس ہزار ڈالر اور چبوترہ پر دو لاکھ ۲۵ ہزار ڈالر (ایک ڈالر چار روپیہ چودہ آنے کے برابر ہوتا ہے) صرف ہوئے۔ فرانسیسیوں

نے مجسمہ کی تیاری کی ذمہ داری تو خود لے لی. اور چبوترے کی تیاری امریکہ کے باشندوں نے بارتھولڈی اپنے نمونے کا مجسمہ لے کر فرانس واپس لوٹ آیا۔ بڑے پیمانے پر چندہ جمع کیا جا رہا تھا۔ اب کام شروع کر دیا گیا۔ بارتھولڈی کے سامنے سب سے بڑی فنی دقت یہ تھی کہ اتنے بڑے مجسمہ کے جسم کے حصوں میں تناسب کیسے قائم رکھا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجسمہ بے ڈول ہو جائے۔ لیکن تھوڑا سوچ بچار کرنے کے بعد اس نے اس مشکل کو بھی حل کر لیا۔ اُس نے پہلے اپنے ۹ فٹ والے ماڈل کی مدد لی۔ ۳۶ فٹ اونچا پلاسٹر کا ایک مجسمہ تیار کیا۔ اور پھر اس ۳۶ فٹ والے مجسمہ کی سے پورا ۱۵۲ فٹ والے مجسمہ کا خاکہ بنایا اس کے بعد مجسمے کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر حصہ کے علیحدہ علیحدہ سانچے بنائے گئے۔ ان سانچوں کی مدد سے ہر حصے کو کانسے سے ڈھال کر بنایا گیا۔ ہر حصے کا جوڑ اس طرح کا بنایا گیا کہ جب چاہیں سب حصوں کو جوڑ کر پورا مجسمہ کھڑا کر سکتے ہیں اور جب چاہیں کھول کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔ کانسے کے اوپر تقریباً $\frac{1}{2}$ انچ موٹی تانبے کی پتر چڑھائی مجسمہ کے تمام حصوں کو ایک دوسرے کے کَسا ہوا رکھنے کے لئے اندر لوہے کے گاڈر اس طرح لگائے ہیں جیسے آپ اکثر اسٹیشن کی چھتوں یا ریل کے پُلوں پر دیکھتے ہیں۔ مجسمہ کا کُل وزن تقریباً پانچہزار پانچسو من اور جس قدر کانسہ اس میں استعمال ہوا صرف اس کا وزن تقریباً ڈھائی ہزار من ہے۔ جب مجسمہ کے تمام حصے بن گئے تو ان کو جوڑ کر کھڑا کیا گیا اور عام نمائش کے بعد سمندر پار لے جانے کے لئے کھول کر بکسوں میں بند کرکے رکھ دیا گیا۔ جس وقت فرانس میں اس مجسمہ کو بنایا جا رہا تھا اس وقت امریکہ والے بیڈلو نامی جزیرے پر چبوترہ بنانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ اُن کو یہ معلوم ہی ہو گیا تھا کہ مجسمہ بہت ہی اونچا اور بہت ہی بھاری ہوگا۔ جس کو سمندر پر تیز چلنے والی ہواؤں کا سامنا بھی کرنا ہوگا اس لئے چبوترہ کی ساخت ایسی ہونی چاہیئے جو مجسمہ کے بوجھ اور ہوا کے جھونکوں دونوں کو برداشت کر سکے۔ بڑے بڑے انجنیر اکٹھا ہوئے۔ بہتر سے بہتر چونا، کنکریٹ اور

پتھر منگائے گئے اور چبوترے کی تیاری شروع کردی گئی۔ نیچے گیارہ کونوں والے ایک ستارے کے شکل کا چبوترہ قائم کیا گیا جس پر اصل چبوترہ بنایا گیا۔ چبوترے کے درمیان لوہے کے گارڈر اور قینچیاں اس طرح بٹھائی گئی ہیں کہ لوہا، پتھر اور کنکریٹ سب ایک جان ہو کر رہ گئے۔ جب چبوترہ تیار ہو گیا تو اس کی اطلاع فرانس بھیج دی گئی۔ فرانس سے مجسمے کے حصے بڑے صندوقوں میں رکھ کر امریکہ لائے گئے اور پھر چبوترے کے اوپر تمام حصے ایک ایک کرکے جوڑے گئے۔ ۱۸۸۶ء میں امریکہ کے صدر گروور کلیو لینڈ نے مجسمہ کا افتتاح کیا۔ افتتاح کے وقت اس کا بنانے والا بارتھولڈی بھی موجود تھا۔ آپ اس وقت اس کی خوشی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

جو لوگ امریکہ جاتے ہیں وہ اس مجسمے کو ضرور دیکھتے ہیں۔ مجسمہ کے اندر قطب مینار کی طرح گول سیڑھیاں بھی ہیں جن کے ذریعے آدمی مشعل تک جا سکتے ہیں۔ سیڑھیوں کے علاوہ بجلی سے چلنے والی لفٹ کا بھی انتظام ہے۔ مشعل کے نیچے جو دائرہ ہے وہ اتنا بڑا ہے کہ اس پر دس بارہ آدمی بیک وقت کھڑے ہو کر چاروں طرف کے دلفریب منظر کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ مجسمہ کو روشن رکھنے کے لئے جو انتظام کیا گیا ہے وہ بھی قابل تعریف ہے۔ نیچے چبوترے کے چاروں طرف ایک اک ہزار واٹس کے ۹۶ بلب لگائے گئے ہیں جو رات کے وقت چاروں طرف سے مجسمہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مشعل میں ایک اک ہزار واٹس کے تیرہ بلب لگے ہوئے ہیں جو رات دن جلتے رہتے ہیں۔ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مجسمہ کتنا بڑا ہے تو اس کا اندازہ آپ صرف اس سے لگا لیجئے کہ اس کا چہرہ دس فٹ چوڑا ہے اور اس کے اندر بیک وقت چالیس آدمی کھڑے ہو سکتے ہیں مجسمے کے جس ہاتھ میں مشعل ہے اس کی لمبائی چالیس فٹ اور قطر کا اوسط ۱۲ فٹ کے قریب ہے۔ جب اس مجسمہ کو چبوترہ پر جوڑا جا رہا تھا تو کام کرنے والے مجسمہ کے اوپر ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی آدمی کے جسم پر چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔

/// /// ///



ایک دلچسپ واقعہ

ا،ع، انصاری

یہ اُن دنوں کی بات ہے، جب ہم لوگ الہ آباد میں رہتے تھے۔ مارچ کا پہلا ہفتہ تھا۔ کڑاکے کا جاڑا تو قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ ہلکی ہلکی سردی پڑ رہی تھی۔ صبح ہم لوگ ناشتہ کرکے اُٹھے ہی تھے کہ باہر سے کسی کے پکارنے کی آواز آئی۔ میرا چھوٹا بھائی باہر نکلا۔ دروازے پر کوئی اجنبی آدمی کھڑا تھا۔ اُس نے اُس آدمی سے پوچھا "آپ کسے تلاش کر رہے ہیں؟" آنے والے نے کہا "مدن بابو کیا آپ ہی کا نام ہے؟" اتنے میں میں باہر آگیا۔ میں نے جواب دیا "جی ہاں"۔

"میں آپ ہی سے ملنے آیا ہوں" اس آدمی نے کہا۔

"تو آئیے، بیٹھیے!" میں نے کمرے میں آکر کرسی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"نہیں، نہیں کوئی بات نہیں" کہتا ہوا وہ آدمی کرسی پر بیٹھ گیا، اور پھر کہنے لگا۔ "مجھے آپ نہیں جانتے ہوں گے۔ میں ریلوے کالونی میں رہتا ہوں۔ ریلوے میں ٹکٹ کلکٹر ہوں۔ میرا تبادلہ آسنسول ہوگیا ہے۔ اسی مہینے مجھے جانا ہے۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ میں اس مہینے کا راشن لے چکا ہوں۔ پہلے کا بھی راشن کافی بچا ہوا ہے۔ اسے آسنسول لے جانا بہت ہی مشکل ہے، اور میں ایسا کرنا اچھا بھی نہیں سمجھتا اس لئے میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ کو راشن خریدنا ہی ہوتا ہے، تو کیوں نہ مجھ ہی سے خرید لیں؟ بازار کے بھاؤ سے کچھ سستا ہی دے دوں گا۔ کہئے کیا خیال ہے آپ کا؟"

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ بہن مالتی دیدی، جو دروازے کے پاس آکر

کھڑی ہوگئی تھیں، بول اٹھیں :-

"ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ آخر اس مہینے کا راشن تو ابھی لینا ہی ہے اور پھر رعایت کے ساتھ مل رہا ہے تو لے ہی لینا چاہیئے۔"

میں نے بھی سوچا ٹھیک ہی تو ہے۔ دس بارہ روپے کی بچت ہو جائے گی۔ اس مہینے میں ہولی بھی پڑ رہی ہے۔ اس موقع پر روپے کی ضرورت بھی ہوگی یہ سوچ کر میں نے کہا :-

"اچھی بات ہے، آپ کے پاس جتنا سامان ہو، سب مجھے دیجئے۔ میں لے لوں گا۔"

اُس آدمی نے دو تین منٹ تک حساب لگانے کے بعد بتایا "یہی کوئی پچاس روپے کا راشن ہوگا۔ اس کے علاوہ کچھ فرنیچر اور کتابیں ہونگی۔ وہ سب قریب پانچ سو کی ہوں گی۔ لیکن میں آپ کو صرف دو سو میں دے دوں گا۔"

ہم لوگ کمرے میں بیٹھے اس آدمی سے باتیں کر ہی رہے تھے کہ بہن مالتی گھر کے اندر چلی گئیں، تھوڑی دیر میں واپس آکر میرے کان میں دھیرے سے بولیں :-

"میں دیکھ آئی ہوں۔ اس وقت ڈیڑھ سو روپے گھر میں ہیں۔ باقی پچاس کا کوئی بندوبست کرنا ہوگا ــــ کہو تو امبیکا بابو کے یہاں سے روپے منگوالوں۔ پھر چار پانچ دن کے بعد تو پٹنہ سے روپے آ ہی جائیں گے۔ اُن کو دے دیا جائے گا۔"

میں نے بہن مالتی کو امبیکا بابو کے یہاں روپے لینے کی اجازت دے دی، وہ چلی گئیں۔

اب میں نے اُس آدمی سے فرنیچر کے بارے میں پوچھا، تو اُس نے جیب سے ایک فہرست نکالی اور اُسے پڑھ کر بتایا کہ اُس نے حال ہی میں سول لائین سے نیا فرنیچر خریدا ہے۔

میں بے چین تھا کہ کسی طرح راشن اور فرنیچر جلدی سے میرے ہاتھ لگ جائے۔ میں نے فرنیچر خریدنے کے لئے

بھی اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ اور
اُس سے پوچھا — "ہاں تو یہ سب
چیزیں مجھے آپ کب دے رہے ہیں"
"آپ جب چاہیں، لیکن میں تو
اچھا سمجھتا ہوں کہ ابھی وقت میرے
ساتھ کسی کو بھیج دیں، میں سامان ان
کے ساتھ کر دوں گا۔ میں اسی کی وجہ
سے ابھی تک رُکا ہوا ہوں، یہ کام
ہو جائے تو میں آج ہی شام کی ٹرین
سے چلا جاؤں" اُس نے نہایت ہی
اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

"اچھی بات ہے۔ کچھ دیر رُکئے
میں روپے کا انتظام کر لوں۔" میں بولا۔

"ارے روپے کی کیا بات ہے؟
روپے تو پھر کسی وقت آکر لے لوں گا۔
سامان پہنچانے تو آؤں گا ہی۔ اُسی
وقت آپ دے دیجئے گا۔ اس کے
لئے اتنی جلدی کیا پڑی ہے؟" اُس
نے کہا۔

"نہیں، نہیں، آپ خواہ مخواہ
کیوں تکلیف کریں گے؟ ابھی روپے
کا بندوبست ہوا جاتا ہے۔ میرا
بھائی سعدن آپ کے ساتھ چلا جا
اور سامان دیکھ بھال کر لیتا آ
آپ اتنا کریں کہ ٹھیلے والے کو ا
طرح ہدایت کر دیں کہ راستے
کوئی چیز ٹوٹنے یا گرنے نہ پائے

"ہاں، ہاں آپ اس کی بالکل
نہ کریں۔ میں سب کچھ ٹھیک کر دوں
وہ درمیان ہی میں بول اُٹھا۔

اتنے میں تالنی بہن آگئیں۔ اُن
سے روپے لے کر میں نے سعدن کے
حوالے کئے۔ اور اُس آدمی کے سا
بھیج دیا۔

کچھ دیر بعد نہا دھوکر اور
کھانا کھاکر میں کالج روانہ ہوگیا۔
جاتے وقت ہدایت کرتا گیا کہ سب
سامان ٹھیک سے اتروا کر رکھ لینا۔

کالج گیا تو ضرور، لیکن آج
وہاں طبیعت نہیں لگ رہی تھی —
دل میں طرح طرح کے خیال پیدا
ہو رہے تھے۔ میں بے چین سا ہوا

جا رہا تھا، کہ کب گھر پہنچوں۔ میں رہ رہ کر سوچنے لگتا تھا کہ" فلاں میز، فلاں جگہ پر، فلاں کرسی، فلاں جگہ پر رکھوں گا۔ کرسیاں تو اس وقت بھی میرے پاس کافی ہیں۔ لیکن وہ سب کی سب پُرانی ہو چکی ہیں۔ ان میں جو زیادہ پُرانی اور خراب ہوں گی اُنہیں بیچ دوں گا۔ اس بار ہولی میں میرے کمرے کی شان ہی کچھ اور ہوگی۔ راشن بھی کافی مل گیا ہے ــــ گیہوں، گھی، چینی، تیل، مصالحہ ساری چیزیں...... ٹھیک ہے۔ کئی دوستوں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ہولی کے موقعہ پر ضرور دعوت دوں گا۔ قسمت کی بات ہے کہ وہ ٹکٹ کلکٹر سیدھے میرے ہی یہاں آگیا، ورنہ کہیں میرے پڑوسیوں کو بھنک لگ جاتی تو وہ کچھ زیادہ روپے دے کر راشن وغیرہ لے لیتے۔ اسی لئے تو میں فوراً رضامند ہوگیا، اور سچ پوچھو، تو سب سے زیادہ بہن مالتی نے جلد بازی سے

کام لیا، کہ جھٹ امبیکا بابو سے روپے لے آئیں۔"

یہی سب سوچتا ہوا، میں شام کو گھر پہنچا۔ لیکن سدن کو مُنہ لٹکائے دروازے پر بیٹھے دیکھ کر مجھے کچھ شک ہوا۔ میں نے قریب جاکر اُس سے پوچھا:۔

"کیوں، کیا ہوا، سامان لے آئے؟"

سدن بولا۔" نہیں، وہ تو روپے لے کر فرار ہوگیا۔ راستے میں اُس نے مجھ سے کہا کہ "روپے مجھے دے دیجئے، میں سامان آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔ ابھی تو بہت دُور جانا پڑے گا، تھک جائیے گا۔"

میں نے کہا کہ "نہیں کوئی بات نہیں، میں چلا چلوں گا۔" اس کے بعد ہم دونوں ساتھ ساتھ قریب ایک میل نکل گئے۔ جب خسرو باغ سے ہوکر ہم گذر رہے تھے، تو یکایک وہ پستول نکال کر کھڑا ہوگیا میں بالکل گھبرا گیا۔ ایک تو چلتے چلتے

پہلے ہی بُرا حال ہوگیا تھا، دوسرے یہ پستول۔ ایسا محسوس ہوا کہ پاؤں تلے کی زمین کھسکی جا رہی ہے۔ اتنے میں وہ بول اُٹھا — "روپے ابھی دے دو، نہیں تو........" میں آخر کرتا کیا؟ اُسے روپے نکال کر دے دیئے۔ روپے لے کر وہ آہستہ آہستہ باغ سے نکل گیا —"

یہ سُن کر میری ساری خوشی ہوا ہوگئی۔ میرے سارے خیالی محل ڈھ گئے۔ اپنے ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ امبیکا بابو کے پچاس روپے کی فکر مجھے پریشان کرنے لگی۔ سدن پر مجھے بہت ہی غصہ آیا اور میں نے اُس پوچھا "تم نے شور کیوں نہیں کیا؟"

سدن جھنجھلا اُٹھا اور بولا — "شور کرنے کا مطلب دو سو روپے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈالنا تھا اور اگر ایسا کرتا بھی تو کیا آپ نے خسرو باغ نہیں دیکھا ہے، اُس کی اونچی اونچی دیواریں اور اُس پر اتنا گھنا باغ۔ بھلا میرے شور کی باہر کیوں پہنچ جاتی؟ البتہ مجھے جان سے ہاتھ دھو لینا پڑتا!"

بات ٹھیک ہی تھی۔ مجھے چُپ ہو جانا ہی پڑا۔ گھر کے تو شرم، افسوس اور غصہ سے ہوا میرا چہرہ دیکھ کر بہن مالتی کو آگئی اور وہ بولیں۔ "اُس بدم نے دھوکا تو ضرور دیا، لیکن ست کی تھکاوٹ پر اُسے ضرور رحم آ جانتے ہو، اُس نے جاتے جاتے ر کی طرف ایک روپیہ پھینکتے ہوئے "یکہ کرکے چپ چاپ آرام سے گھر چلے جاؤ —"

میں اس وقت کافی غصہ اور رنج میں تھا، لیکن اس کی یہ بات سُن کر مجھے بھی ہنسی آگئی۔ اور پھر اپنی بے وقوفی پر پچھتانے لگا کہ میں نے ایک اجنبی شخص پر اتنی جلدی اور اتنا زیادہ بھروسہ کیوں کرلیا۔؟

(ہندی سے)

شاہنامے کی کہانی

شاہنامے کی کہانی بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ جس میں سیکڑوں واقعات اور ان گنت کارنامے ہیں جن کو ایران کے شیکسپیر فردوسی نے ساٹھ ہزار اشعار میں نظم کیا ہے فردوسی کا کہانی سنانے کا طریقہ کچھ ایسا ہے کہ کہانیوں میں سے کہانیاں نکلتی ہیں اور ہر کہانی اپنی جگہ بڑی دل لبھانے والی اور دلچسپ ہے۔ جیسا کہ پرانے فارسی ادبیات کی روایت رہی ہے۔ شاہنامہ بھی خدا کی حمد و ثنا سے شروع ہوتا ہے۔

پھر ایران کے سب سے پہلے بادشاہ کیومرث کی کہانی سے شروع ہوتی ہے۔ کل کتاب میں پچاس بادشاہوں کی بادشاہت کے قصّے بیان کئے گئے ہیں۔ اور آخر میں عربوں کے ہاتھوں ایرانیوں کے آخری بادشاہ کی شکست پر شاہنامہ ختم ہو جاتا ہے۔

شروع کے حصے میں بتایا گیا ہے کہ انسان نے کس طرح پہلے پہل مل جُل کر رہنا سیکھا۔ کیسے کھیتی باڑی شروع کی۔ اور کیسے کھانے کا انتظام کیا اور رہنے کے لئے کس طرح مکان تیار کرائے۔ اسی حصے میں ضحّاک، کاوہ اور فریدوں کی کہانی آئی ہے جو آریا قوم کی

سب سے پرانی کہانی مانی جاتی ہے۔ پھر ایک بادشاہ منوچہر گزرا ہے جس کے زمانے میں سام پیدا ہوا۔ سام کے بیٹے کا نام زال ہے۔ اور زال ہی رستم کا باپ تھا۔ رستم کا نام تو آپ نے بھی سنا ہوگا۔

ہاں تو شاہ منوچہر کے بعد اس کا بیٹا نوذر سات سال تک بادشاہت کرنے کے بعد مارا گیا۔ اس پر ایرانیوں اور تورانیوں کے درمیان بڑے زور کی لڑائی ہوئی ہے جو برسوں چلتی رہی ہے۔ ان ہی لڑائیوں میں ایران کا زبردست پہلوان رستم اپنی بہادری کے کمال دنیا کو دکھاتا ہے۔ افراسیاب سے پہلی ہی جنگ میں رستم، افراسیاب کا کمر بند پکڑ کر اسے گھوڑے کی زین سے اٹھا کر زمین پر دے مارنا چاہتا تھا۔ لیکن افراسیاب کا بند کھل گیا اور وہ موت کے منہ سے نکل گیا۔ اس کے بعد تو یہ جنگ کافی دنوں تک چلتی رہتی ہے۔

شاہنامے کی سب سے اہم اور مفصل کہانی کیکاؤس کی کہانی ہے۔ اسی زمانے میں رستم اور سہراب کی لڑائی ہوتی ہے۔ رستم اور سہراب کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ رستم نے اپنے لڑکے سہراب کو کبھی نہ دیکھا تھا اپنے باپ سے ملنے کے لئے گھر سے نکا آخر وہ افراسیاب کی فوج میں ملازم ہ اور افراسیاب کے دشمن سے لڑنے کے لئے میدان میں آگیا۔ سہراب کو کیا معلوم کہ اس کا باپ ہی اس سے لڑ رہا ہے۔ خوب زور کی لڑائی ہوئی اور یہ لڑائی مسلسل کئی د تک چلتی رہی۔ اور دونوں میں سے کوئی نہ ہارتا تھا۔ رستم حیران تھا کہ یہ کون بہادر ہے کہ جو اس کے سامنے اتنی بہادری سے لڑ رہا ہے۔ سہراب نے بار بار اس کا نام پوچھا لیکن رستم نے اسے ٹال دیا۔ آخری مرتبہ اس نے لڑتے لڑتے اپنا نام بتا دیا۔ اپنے باپ کا نام سنتے ہی سہراب نے اس کو چھوڑ دیا اور رستم نے ایک ہی وار میں اُسے مار دیا۔ لیکن جب اس کے گلے میں رستم نے اپنی نشانی دیکھی تو سمجھ گیا کہ یہ تو اس کا اپنا بیٹا ہے لیکن اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ سہراب کا آخری وقت تھا اور وہ ذرا سی دیر میں ختم ہوگیا۔

یہ کہانی شاہنامے کی جان ہے اور فردوسی نے اپنے قلم کا سارا زور اسی پر صرف کر دیا۔

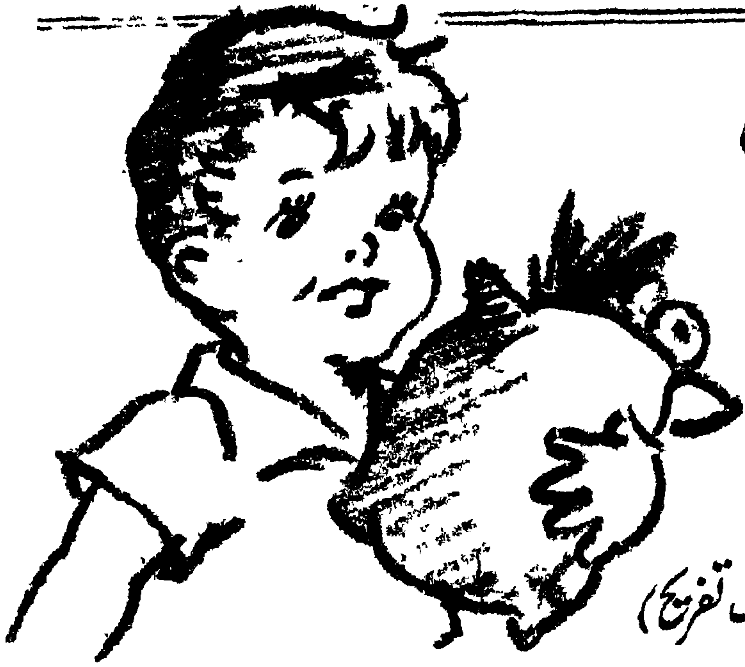
سہراب اور رستم کی اس کہانی کے بعد ایران میں سکندر کے حملے کا ذکر ہے۔ ساسانیوں کے آخری بادشاہ یزدگرد سوم کی عربوں کے ہاتھوں شکست ہو جاتی ہے اور اس کے بعد شاہنامہ ختم ہو جاتا ہے۔

شاہنامے میں فردوسی نے ایران کے رہن سہن، اس زمانے کی پڑھائی، اس زمانے کے اخلاق اور عادتیں اور اس زمانے کے جنگ کے طریقے، بادشاہوں کے دربار کے آداب پیش کئے ہیں اور یہ سب کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ اس زمانے کے ایران کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرانے زمانے کے ایران کی فلم دیکھ رہے ہیں۔

فردوسی نے تقریباً ۳۰ سال کی لگاتار محنت سے یہ کتاب لکھی۔ جن نظموں میں لڑائیوں کا ذکر ہوتا ہے یا سورماؤں کی کہانیاں ہوتی ہیں اُسے ہندی میں مہا کاویہ، انگریزی میں ایپک اور فارسی میں رزمیہ کہتے ہیں۔ دنیا میں چار رزمیہ نظمیں بہت مشہور ہیں۔ اُن میں ایک ویاس جی کی لکھی ہوئی مہابھارت ایک ہومر کی اوڈیسی، ورجل کی ایلیڈ اور فردوسی کا شاہنامہ۔

چند سال پہلے ایرانیوں نے "ہزار سالہ جشن فردوسی" بڑے دھوم دھام سے منایا۔

(سید مبارزالدین رفعت)



حبیب السیدین

پکنک کے مزے

(بچوں کی برادری کی ایک تفریح)

کھیل کود سیر و تفریح بھی تو زندگی کا حصہ ہے۔ اگر یہ سب نہ ہو تو زندگی کتنی بے مزہ ہو جائے۔ آدمی مسلسل کام کاج سے گھبرا جاتا ہے اور اس کی طبیعت کسی کام میں نہیں لگتی۔ ہم آپ بھی تو پڑھتے پڑھتے تھک جاتے ہیں اور جب تھک جاتے ہیں تو اس تھکن کو دور کرتے ہیں۔ یہ علاج کسی دوا سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح کہ ہم پکنک کے لئے اپنے گھروں سے باہر چلے جاتے ہیں۔ اور سارا دن کھیل کود میں گذارتے ہیں۔

اب تو ہم نے اپنی بچوں کی برادری میں پکنک کو مستقل پروگرام میں شامل کر لیا ہے اور کبھی کبھی سیر و تفریح کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ملتے جلتے ہیں کھیلتے کودتے ہیں اور ایک ساتھ ہر تفریح میں اور کھیل تماشے، کھانے پینے میں شریک ہوتے ہیں۔ اکثر نئے نئے بچوں سے ملتے ہیں۔ اس طرح پکنک کے بے شمار فائدے ہیں۔ دن بھر کی تفریح کے بعد ہفتوں کی تھکن دور ہو جاتی ہے۔ البتہ پکنک کی یاد اس کے بعد کئی کئی دن رہتی ہے۔ آیئے آپ کو بھی ہم اس ایک تفریح کا حال سنائیں۔

ابھی کچھ دن ہوئے ہماری برادری کے بچے دہلی کے مشہور مقاموں پر تفریح کے لئے گئے۔ اس پکنک میں بچوں کی برادری دہلی کے مختلف کلبوں کے ہر مذہب ملت کے بچے شامل تھے۔ ہماری جامعہ کی لاری صبح ۷½ بجے جامعہ نگر، اوکھلا جمولا، جھولینا اور مسیح گڑھ کے تمام کلبوں کے بچوں کو لے کر جامع مسجد پہنچی۔ یہاں سے آس پاس کے مختلف کلبوں کے بچے اکٹھا ہو گئے اور ۹ بجے آنند پربت پہنچے۔ قرول باغ کے بچے تو جیسے ہمارا انتظار ہی کر رہے تھے۔ اب ہم سب ایک ساتھ ۱۰ بجے حوض خاص پہنچ گئے۔ راستہ میں برلا مندر، اور راشٹر پتی بھون بھی نظر آئے اور ان کو دیکھ کر ہم حوض خاص گئے۔ کیا پُر فضا مقام ہے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ جدھر دیکھئے ہریالی ہے۔ بس لطف ہی تو آ گیا یہاں آکر۔ ایک سائے دار پیڑ نے ہمارا استقبال کیا۔ اور ہم سائے میں ہری ہری گھاس پر بیٹھے۔ سب بچے خوش تھے۔ اور اتنے مزے میں آئے کہ گانا شروع ہو گیا۔ کیمروں کے رُخ ایک دوسرے کی طرف ہو گئے۔ تصویریں کھینچیں گئیں۔ اب تو ہم کافی دیر سستا چکے تھے۔ یہاں سے قطب مینار صاف نظر آ رہا تھا اور ایک بار جو سب بچوں نے قطب کی طرف نظر بھر کر دیکھا تو جیسے یہ مینار سچ مچ ہم کو آواز دے رہا ہو۔ "آؤ بچو آؤ۔ میرے پاس آؤ۔ میری بلندی سے مت ڈرو۔ میں بھی آہستہ آہستہ بڑا ہوا ہوں۔ اور اب تو اتنا بڑا ہو چکا ہوں کہ تم میلوں سے مجھ کو دیکھ سکتے ہو۔ اور بلندی کی تعریف بھی یہی ہے۔ آؤ میرے قریب آجاؤ۔ میں سینکڑوں سال سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔ تمھاری راہ تک رہا ہوں۔ جلدی آؤ میرے کھنڈر تمھارے لئے سایہ دیں گے۔ اور میرے پاس پڑوس میں بھی خوب سبزہ ہے۔"

اس آواز پر ایک ایک بچے نے لبیک کہا اور فوراً قطب مینار چلنے کا پروگرام بنایا۔ اور ذرا سی دیر میں قطب کے راستے میں "بچوں کی برادری زندہ باد" کے نعرے گونج رہے تھے۔ ہم سب نے علیحدہ علیحدہ قطب مینار کی سیر کا پروگرام بنایا اسی طرح ساری ٹولیاں سیر کے لئے نکل کھڑی ہوئیں۔

ہوئیں۔ قطب مینار کو تو جیسے ہمارے آنے کی بڑی خوشی ہوئی ہو وہ سینہ تان کر اور اونچا ہو گیا۔ وہیں پر مسجد قوۃ الاسلام دیکھی۔ علائی دروازہ اور لوہے کی لاٹ دیکھی۔ قطب کے آس پاس کتنی بہت سی پرانی عمارتیں ہیں اور کھنڈروں کی تو گنتی ہی نہیں ہر طرف کھنڈر ہی کھنڈر تھے۔ ہم لوگ کودتے پھاندتے چلے جا رہے تھے۔ جیسے تاریخ کے اوپر سے قدم بڑھا چل رہے ہوں۔ ہندوستان کی کئی سو سال پرانی تاریخ ہمیں اپنی وادی کی سیر کرا رہی تھی۔

جب ہم ہر جگہ ہو آئے تو پھر قطب مینار پر چڑھنے کے لئے تیار ہوئے۔ لیکن ابھی قطب کی پہلی منزل ہی ختم نہ ہوئی تھی کہ ہم سب ہانپنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے ہیں اور سیڑھیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں ہم نے اس تھکن کو دور کرنے کے لئے نعرے لگائے۔ نعرے لگانے سے نہ جانے ہماری تھکن دور ہوئی یا نہیں، البتہ ہم اس کو بھول ضرور گئے۔ ہمارا جوش و خروش خوب بڑھ گیا۔ اور جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ آخر اوپر کی منزل بھی ہمارے قدموں تلے آ ہی گئی۔ اور ہم نے چارو نظر ڈالی تو گویا ساری دلی ہماری آنکھو سامنے تھی یہیں سے جامع مسجد بھی نـ رہی تھی اور پارلیمنٹ کی عمارت بھی۔ کا مقبرہ بھی دکھائی دے رہا تھا اور قلعہ بھی۔ قطب نے ہمیں ساری دلی کی کرادی۔ اب ہم ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھا نیچے اترے۔

نیچے اترے تو کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ اور کھانے کا خیال بھی ا لئے آیا کیوں کہ بھوک کے مارے ہمار برا حال تھا۔ سب نے اپنے اپنے ناشتہ دان نکالے اور ایک ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ اس وقت کے کھانے میں جو مزا آیا ہے اس کا کیا کہنا۔ یوں تو کھانا ویسا ہی تھا جو ہم روز کھاتے ہیں لیکن اس وقت تو مزا ہی اور تھا۔ جیسے کوئی بڑی نعمت کھا رہے ہوں۔ سب کے چہرے خوشی کے مارے دمک رہے تھے۔

قطب کی سیر تو ہو چکی تھی۔ اور ابھی ہمیں اوکھلے بھی جانا تھا۔ اوکھلے کا خیال

تتے ہی سب لوگوں نے ایک آواز ہو کر کہا "مچھلی کا شکار کھیلیں گے" تیسرے نے کہا "ہم نہر میں تیریں گے، مزا آجائے گا" ہر طرف پانی ہی پانی ہوگا"

اب ہم یہاں سے اوکھلے کے لئے روانہ ہو گئے۔ چھٹی کا دن اوکھلے کی رونق کو کتنا بڑھا دیتا ہے۔ شہر سے آنے والوں دھوم تھی۔ سڑک پر آگے پیچھے گاڑیاں چلی جا رہی تھیں۔ لاری میں شور مچا ہوا تھا۔ اچانک لاری رُک گئی۔ ہم سب چونک پڑے معلوم ہوا کہ اوکھلا آگیا ہے۔ جامعہ ملیہ کی عمارتیں نظر آرہی تھیں۔ ہم لوگ جمنا کی سیر کے لئے روانہ ہو گئے۔ دریا کے کنارے ہر طرف بھیڑ تھی۔ کچھ لوگ تیر رہے تھے تو کوئی گانا گا رہا تھا۔ کوئی مچھلی کا شکار کر رہا تھا۔ ہم نے خوب سیر و تفریح کی۔

ذرا سی دیر میں چائے بنی۔ ہم نے ڈٹ کر چائے پی۔ لاری کے پاس آکر تصویریں کھنچوائیں اور ۵ ½ بجے اپنے اپنے گھر آگئے اور اس طرح یہ پکنک بڑے مزے میں ہوئی۔

تین ہزار جزیروں کا دیس
انڈونیشیا

کیا آپ نے کبھی کسی ایسے ملک کا نام سنا ہے جو سیکڑوں جزیروں سے مل کر بنا ہو۔ اگر نہ سنا تو آیئے ہم آپ کو ایک ایسے دیس کا حال سنائیں۔

دُنیا کے نقشے میں زرا اپنے دیس کے جنوب مشرق کی طرف دیکھیے۔ آپ کو چھوٹے چھوٹے جزیروں کی ایک لمبی سی زنجیر نظر آئے گی۔ یہ زنجیر دُور تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہی انڈونیشیا ہے۔ ان جزیروں کی مجموعی تعداد تین ہزار کے قریب ہے۔ جو عام طور پر بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ ان میں سے بڑے دو چار ہی ہیں جیسے جاوا، سماترا، نیوگنی، بورنیو وغیرہ۔ نیوگنی سب سے بڑا ہے اور جاوا سب سے خوبصورت۔ اسی لیے لوگ اِسے ایشیا کی جنّت کہتے ہیں۔

انڈونیشیا بھی پہلے ہمارے دیس کی طرح غلام تھا۔ یہاں ہالینڈ کی حکومت تھی۔ لیکن انڈونیشیائی اپنی آزادی سے بہت محبت کرتے تھے اور اِسی لیے انھوں نے آزادی کی لڑائی میں بڑے جوش و خروش سے حصّہ لیا۔ اس جدوجہد میں بے شمار جانیں ضائع ہوئیں۔ اور جب اِس کا پھل ملنے والا تھا تو دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ ۱۹۴۲ء میں ہالینڈ کی

ڈچ حکومت جاپان سے ہار گئی اور انڈونیشیا کو جاپان کے سپرد کرکے چلی گئی۔ آقا بدل گئے تھے، لیکن غلام وہی تھے، غلامی کی مصیبتیں البتہ کچھ اور زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ جاپانیوں نے ساڑھے تین سال تک وہاں من مانا راج کیا۔ انڈونیشیا کے عوام ڈٹ کر اس ظلم و ستم کا مقابلہ کرتے رہے۔ آخر جب بڑی لڑائی میں جاپانی ہار گئے تو ۱۷ر اگست ۱۹۴۵ء کو انڈونیشیا کے باشندوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا لیکن ہالینڈ کی حکومت نے دوبارہ انڈونیشیا پر قبضہ کرنا چاہا اور اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن اب تو دیس کے باشندے آزادی کی برکتوں سے واقف ہو چکے تھے۔ انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ پھر اپنی جانوں کی قربانیاں دیں۔ اور دشمن کو ہرا دیا۔

آج انڈونیشیا کو آزاد ہوئے نو سال ہو چکے ہیں اور انڈونیشیا کے عوام، آزادی، امن، اور ترقی کی شاہراہ پر بڑی تیزی کے ساتھ گامزن ہیں۔

انڈونیشیا کی حیثیت ایک آزاد جمہوریت کی ہے۔ جہاں عوام کے منتخب نمائندے حکومت کا کام کاج چلاتے ہیں۔ حکومت کی بنیاد پانچ اصولوں پر ہے، خدا پر ایمان، جمہوریت، قومیت، انصاف اور انسانیت۔

انڈونیشیا ہمارے دیس کا بہت اچھا پڑوسی ہے۔ انڈونیشیا سے ہمارے تعلقات آج کے نہیں بلکہ سیکڑوں برس پرانے ہیں۔ انڈونیشیا کا ذکر ہمیں سب سے پہلے رامائن میں ملتا ہے۔ رامائن میں اس کا نام جاوا دِیپا لکھا ہے جس کے معنی ہیں سات حکومتوں کا ملک، جس میں سونے چاندی کی کثرت ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انڈونیشیا کی دولت کی کہانیاں سارے ہندستان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس ملک سے ہندستانیوں کی دلچسپی اتنی بڑھ گئی کہ وہاں کے اکثر لوگ انڈونیشیا جانے لگے، کچھ لوگ تجارت کی غرض سے گئے تو کچھ پڑھے لکھے لوگ علم پھیلانے اور علم حاصل کرنے کی غرض سے۔ اور یہی نہیں بعد میں تو کچھ ہندستانی وہاں جا کر بس بھی گئے۔

انڈونیشیا کی تہذیب میں آج بھی



مشتاق اشرف

بندر اور گھڑیال کی کہانی

ندی کے کنارے آم کا ایک بہت بڑا درخت تھا اُس کی شاخیں پانی کی سطح سے چھوتی رہتیں۔ اُس کی ہری ہری پتیاں اور آم کے چھوٹے چھوٹے پھل ندی کے پانی پہ سائے ڈالے رہتے اور جب آم کے پکنے کا وقت آتا تو بندروں کا غول کا غول اس پہ حملہ کر دیتا۔ اور بڑے مزے لے لے کر آم کھاتا۔

ایک دن ایک گھڑیال تیرتا ہوا اُسی درخت کے کنارے آرام کرنے کے لئے ٹھہر گیا۔ یکایک گھڑیال کی نظر پکے ہوئے آموں پہ پڑی۔ اُس نے للچائی ہوئی نظروں سے انھیں دیکھا۔ بندر نے گھڑیال کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ بے چارے کا آم کھانے کو جی چاہتا ہے۔ اسی لئے اس نے کچھ آم گھڑیال کی طرف پھینک دئے۔ گھڑیال نے بڑے مزے لے لے کر آم کھائے۔ اور بہت خوش ہوا۔

دوسرے روز گھڑیال پھر وہیں آیا۔ بندر نے پھر کچھ آم اس کی طرف پھینک دئے۔ گھڑیال اُس روز بہت خوش ہوا۔ پھر تو بندر اور گھڑیال میں بڑی گہری دوستی ہو گئی۔

ایک دن گھڑیال کو خیال آیا کہ یہ آم اپنی بیوی کو بھی کھلانے چاہئیں۔ اس بے چارے نے

اتنے مزے کی چیز کہاں کھائی ہو گی جب گھڑیال کی بیوی نے آم کھایا تو اُسے بہت اچھا لگا۔ وہ بولی یہ تو بہت مزے دار چیز ہے تم کہاں سے لائے ہو؟ گھڑیال نے اسے سارا قصہ سنایا کہ کس طرح وہ بندر اس کو روز آم کھلاتا ہے۔ اور خود تو وہ بہت کھاتا رہتا ہے۔

یہ سُن کر اس کی بی بی خوشی سے اچھل پڑی۔ اور پھر کچھ دیر کے بعد کہنے لگی۔

اگر بندر روز یہ پھل کھایا کرتا ہے تو یقینی اس بندر کا کلیجہ بہت میٹھا ہوگا۔ اس لئے آپ کو میرے واسطے بندر کا کلیجا لانا ہوگا۔ میں اُسے کھاؤں گی۔ اور میں اُس وقت تک خوش نہ ہونگی جب تک آپ مجھے بندر کا کلیجا نہ لا دیجئے گا۔"

یہ سُن کر گھڑیال بہت گھبرایا اور بولا "مگر میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔ بندر تو میرا گہرا دوست ہے۔ میں اُسے کس طرح مار سکتا ہوں۔"

"تمھیں ضرور بندر کا کلیجا لانا ہوگا۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

گھڑیال سوچ میں پڑ گیا۔ اب اگر بندر کو مارتا ہے تو دوستی جاتی ہے اور نہیں مارتا تو بیوی ناراض ہوتی ہے۔ بڑی دیر تک سوچتا رہا لیکن اس کے سمجھ میں کوئی صورت نہ آئی آخر وہ غمگین صورت لئے بندر کے پاس گیا۔

"آج اتنے اُداس کیوں ہو؟ کون سی مصیبت آن پڑی؟" بندر نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں دوست! میری بی بی مجھ سے ناراض ہو گئی ہے وہ کہتی ہے کہ تم نے اب تک اپنے دوست کی کوئی دعوت نہ کی حالانکہ وہ روزانہ تمھیں میٹھے میٹھے پھل دیا کرتا ہے۔ اور اس نے کہہ دیا ہے کہ جب تک میں آپ کو اپنے گھر کھانا نہ کھلا لوں وہ ہرگز مجھے کھانا نہیں دے گی۔" گھڑیال نے اور زیادہ رونی صورت بنا کر کہا۔

بندر نے کہا "واقعی تم سچ کہتے ہو مجھے تو خود تمھارے گھر آنا چاہیئے۔"

"لیکن میں کس طرح تمھارے یہاں جا سکتا ہوں تم تو پانی میں رہتے ہو اور مجھے تیرنا نہیں آتا۔" بندر نے کہا۔

"میں دریا کے کنارے ریتلی زمین پر رہتا

ہوں۔ تم میری پیٹھ پر سوار ہو جاؤ اور میں تمھیں سوار کر کے گھر تک لے جاؤں گا۔ اس طرح تم میرے گھر تک بغیر بھیگے پہنچ سکتے ہو۔

بندر درخت سے نیچے اتر کر گھڑیال کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ گھڑیال جب تیرتے ہوئے ندی کے بیچوں بیچ میں پہنچا تو اس نے سوچا۔ اب بندر یہاں سے کیا بھاگ سکے گا اس لئے اب اسے بتا دینا چاہیئے کہ میں اسکو کیوں گھر لے جا رہا ہوں۔

گھڑیال نے کہا۔ ارے بھائی میری بیوی تمھارا کلیجا کھانا چاہتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ "جو جانور اتنے اچھے اچھے پھل کھاتا ہے اس کا کلیجا بہت میٹھا ہوگا۔ اسی لئے میں تم کو لئے جا رہا ہوں"

تم نے مجھ سے پہلے کیوں نہیں کہا تھا؟ بندر نے کہا "میرا کلیجا تو اسی درخت میں لٹکا ہوا ہے۔ تم مجھے واپس لے چلو۔ میں کلیجا تم کو دیدوں گا"

"ٹھیک ہے چلو ہم واپس چل کر کلیجا اُتار لائیں"۔ گھڑیال نے کہا۔

اس لئے گھڑیال واپس ہو گیا۔ اور جب وہ درخت کے قریب گیا تو بندر اُچھل کر درخت پر چڑھ گیا۔ اور سب سے اونچے سرے پر بیٹھ گیا۔

"جلدی کرو۔ گھڑیال نے نیچے سے دی۔ "اپنا کلیجا واپس لاؤ"

بندر کو بڑے زور سے ہنسی آئی کہا "افسوس ہے کہ تم نے ایک سچے دوست کو ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔

صفحہ ۳۵ کا بقیہ مضمون

ہندستانی تہذیب کا اثر نمایاں ہے۔ یہاں آج بھی مہابھارت کی کہانیاں کتھا کلی کے ناچ کی شکل میں پیش کی جاتی ہیں۔

یہاں سب مذہبوں کے ماننے والے پائے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ مسلمان پھر ہندو، پھر بدھ اور عیسائی۔ الگ الگ مذہبوں کے ماننے کے باوجود سب مل جل کر رہتے ہیں۔ اور جب لوگ مل جل کر رہیں تو اُن کی ترقی یقینی ہوتی ہے۔



ریحان احمد عباسی

شتر مرغ

دنیا میں سب سے بڑا پرندہ شتر مرغ ہے۔ یہ افریقہ اور عرب کے ریگستانوں میں پایا جاتا ہے۔ شتر مرغ سات آٹھ فیٹ اونچا ہوتا ہے اس کا وزن ۵۰ سیر سے لے کر ۱۵۰ سیر تک یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ نر کا قد مادہ سے نسبتاً بڑا ہوتا ہے۔ بازو کمزور اور چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اس لئے وہ بالکل اڑ نہیں سکتا۔ لیکن یہ اپنی لمبی اور مضبوط ٹانگوں سے عربی گھوڑے سے بھی زیادہ تیز دوڑ لیتا ہے۔ بھاگتے وقت اس کا قدم ۲۵ فیٹ کے قریب پڑتا ہے۔

بزرگوں نے اس کا نام "شتر مرغ" ٹھیک ہی رکھا تھا۔ اس کی مڑنے والی لمبی گردن، چھوٹا سر، کمر پر چھوٹا سا کوبڑ پیروں میں گدیاں، بھدی چال، شتر یعنی اونٹ سے کبھی کبھی بہت ملتی جلتی ہیں۔ اس کے پیروں میں عموماً دو یا تین انگلیاں ہوتی ہیں۔ ایسے بھی شتر مرغ ہوتے ہیں جن کے پیروں میں مرغیوں کی طرح پچھلی انگلی بھی ہوتی ہے۔ ٹانگوں پر روواں یا پر کچھ بھی نہیں ہوتے، اس وجہ سے ٹانگیں ننگی ننگی معلوم ہوتی ہیں۔ پنجے سخت ہوتے ہیں اور یہی اس کے ہتھیار ہوتے ہیں۔ یہ اپنے پیروں سے دائیں بائیں آگے پیچھے اتنی طاقت سے دو لتیاں چلاتا ہے کہ ایک ہی وار میں دشمن کی ہڈیوں تک کا چورا کر دیتا

ہے۔

اونٹ کی طرح یہ بھی گھٹیا قسم کے پودے کھاتا ہے ویسے یہ بڑا پیٹو ہوتا ہے جو چیز مل جائے کھانے سے مطلب۔ حتیٰ کہ پتھر اور اس کی طرح دوسری سخت چیزیں تک کھا جاتا ہے شتر مرغ ۱۸۶۰ئہ سے افریقہ، امریکہ اور آسٹریلیہ میں پالے جا رہے ہیں۔

شتر مرغ دیکھنے میں بہت بھدا معلوم ہوتا ہے اگر کچھ خوبصورتی ہے تو دم اور بازوؤں کے پروں سے ہے۔ نر کے بازو اور دُم کے پَر سفید ہوتے ہیں۔ باقی جسم پر گہرے کالے رنگ کے پر ہوتے ہیں۔ سفید پر کافی قیمتی ہوتے ہیں۔ دُم اور بازوؤں کے سفید پروں میں دُم کے بال قیمت کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہوتے ہیں۔ مادہ کے پَر بھورے رنگ کے ہوتے ہیں اور ان کی مانگ بھی کم ہوتی ہے نر کے سفید پروں کو لوگ طرح طرح سے فیشن میں استعمال کرتے ہیں۔ عموماً نر کے ایک بازو سے ۳۰ پر اور دُم میں سے ۶۰ پر نکلتے ہیں یہ پر ہر چھٹے مہینے نوچے جاتے ہیں۔ تقریباً ۸۵ فی صدی پر جنوبی افریقہ سے ملتے ہیں۔ باقی پندرہ فی صدی شمالی افریقہ آسٹریلیہ اور امریکہ سے حاصل ہو

عام طور پر پرندوں کی کھال اتنی بار ہے کہ وہ کسی کام میں نہیں لائی جا سکتی لیکن شتر مرغ کی کھال دوسرے پرندو طرح بے کار نہیں ہوتی۔ جوتے، سوٹ کیس اور دوسری ایسی چیزیں جو چمڑوں سے بنتی، اس کی کھال سے بھی بنائی جاتی ہیں۔ ایسی چیزیں دوسروں کے مقابلے میں کافی قیمتی ہیں۔

شتر مرغ پرندوں کی طرح اپنا گھو نہیں بناتا۔ مادہ کسی گڑھے میں انڈے دے د ہے۔ وہ ایک وقت میں چالیس پچاس انڈے دیتی ہے۔ انڈے دن میں دھوپ کی گرمی سے سکتے رہتے ہیں یا کبھی کبھی مادہ اُن پر آ کر بیٹھ جاتی ہے لیکن رات میں انڈوں پر نر ہی بیٹھا کرتا ہے۔ ان انڈوں سے ۴۲ دن میں بچے نکل آتے ہیں۔ لیکن ان چالیس پچاس میں سے صرف ۲۰ کے لگ بھگ بچے نکلتے ہیں۔ اول تو بہت سے انڈے اس کے بیٹھنے ہی سے پھوٹ جاتے ہیں اس کے علاوہ یہ بچے انڈوں سے نکلنے کے بعد جو پاس پڑے ہوئے انڈے ہوتے ہیں توڑ توڑ

کر کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کا انڈا بھی کوئی معمولی نہ سمجھئے اُس کا وزن ڈیڑھ سیر کے قریب ہوتا ہے اور غذا میں مُرغی کے دو تین درجن انڈوں کے برابر۔ اس کے انڈوں کی کھانے کی بہت سی چیزیں بنائی جاتی ہیں جو مُرغی کے انڈے کی طرح کافی لذیز ہوتی ہیں۔

اب ایک نیا طریقہ انڈوں کو ایک مشین سے حرارت پہنچا کر بچے نکالنے کا ایجاد ہوا ہے۔ اس طرح انڈے بہت ہی کم خراب ہوتے ہیں یہ نکلا ہوا بچہ بھی ایک بڑی مرغی کے برابر ہوتا ہے اور وہ صرف چھ مہینے میں ہی بڑا ہو کر اپنے ماں باپ کے برابر ہوتا ہے۔

شُتر مُرغ جب اپنی گردن سکوڑ کر زمین پر بیٹھتا ہے تو قریب سے بھی ایک جھاڑی سا معلوم ہوتا ہے۔ جنگلی شُتر مُرغ کا شکار کئی طریقہ سے کیا جاتا ہے عام طور پر اس کا شکار گھوڑے پر بیٹھ کر کیا کرتے ہیں۔ کئی کئی دن تک گھوڑے پر بیٹھ کر پیچھا کیا جاتا ہے جب تھک جاتا ہے تو شکار کر لیتے ہیں۔ دوسرے یہ سیدھا نہیں بھاگتا چکر لگاتا ہوا بھاگتا ہے۔ شتر مرغ کی عمر پچیس سال کی ہوتی ہے۔

لطیفہ

ڈاکٹر:۔ دیکھو یہ دوا ہر روز دو چمچے پینا۔
مریض:۔ مگر ڈاکٹر صاحب میرے پاس تو صرف ایک ہی چمچہ ہے۔

سپاہی۔ (موٹر روکتے ہوئے) تم پچاس میل فی گھنٹے کی رفتار سے موٹر کیوں چلا رہے ہو۔
ڈرائیور:۔ گاڑی کے بریک خراب ہو گئے ہیں اس لئے میں جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتا ہوں تاکہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔

ماسٹر:۔ لڑکو! یہ بتاؤ کہ ریلوے لائن پر پھاٹک کیوں لگا ہوا ہے۔
ایک لڑکا:۔ اس لئے کہ ریل کہیں شہر میں نہ گھس جائے۔

غیر تعلیم یافتہ باپ (ناراض ہو کر) آج تم اتنی دیر کے بعد اسکول سے آئے۔
بیٹا:۔ ماسٹر صاحب نے روک رکھا تھا کیونکہ میں بھول گیا تھا کہ دریائے نیل کہاں ہے۔
باپ:۔ تو آئندہ سے خیال رکھا کرو کہ تمہاری چیزیں کہاں ہیں۔

انور محمود:۔ لکھنؤ

ماسٹر:۔ جامے سے باہر ہونے کے کیا معنی ہیں۔
شاگرد:۔ ننگا ہونا۔

ماسٹر:۔ بندرگاہ کسے کہتے ہیں۔
ایک لڑکا:۔ جناب! بندروں کے رہنے کی جگہ کو

بندرگاہ کہتے ہیں۔

ڈاکٹر:۔ آج صبح تو آپ خوب اچھی طرح کھانس رہے تھے۔
مریض:۔ جی ہاں رات بھر مشق جو کرتا رہا ہوں۔

بیٹا: ماں آپ کی نظروں میں میرکی کتنی قیمت ہے۔
ماں:۔ ہزاروں لاکھوں روپے۔
بیٹا:۔ اچھا تو اس میں سے ایک پیسہ مجھے دیجئے۔

منیرالدین۔ لکھنؤ

حاکم:۔ (ملزم سے) قسم کھاؤ کہ تم نے چوری نہیں کی۔
ملزم:۔ جناب اس وقت میرا پیٹ بھرا ہوا ہے اس وقت کچھ نہیں کھا سکتا۔

پہلا مسافر:۔ اس وقت کیا بجا ہے۔
دوسرا:۔ جی اس وقت تو کچھ نہیں بجا البتہ تھوڑی دیر پہلے ریل کی سیٹی بج رہی تھی اب ذرا سی دیر بعد پھر بجے گی۔

فردوس جہاں۔ آگرہ

(ایک شاعر دوسرے شاعر سے) کیوں جی! میں اتنے دنوں بیمار پڑا تم مجھے دیکھنے تک نہ آئے۔
دوسرا شاعر:۔ دوست معاف کرنا میں تمھارا مرثیہ لکھنے میں مشغول تھا۔

(ایک افیمی دوسرے سے) بھائی بتاؤ میرے رومال میں کیا ہے اگر بتا دو گے تو دو امرود دوں گا اور اگر یہ بھی بتا دو کہ کتنے ہیں تو چاروں کے چاروں دے دوں گا
دوسرا:۔ ارے یار کچھ اتا پتہ تو بتاؤ۔

لڑکا:۔ ابّا میں ایک غریب آدمی کو ایک آنہ دیدوں
باپ:۔ ضرور۔ میرے بیٹے کہاں ہے وہ؟
لڑکا:۔ ابّا وہ گلی کے کونے میں کھڑا آئس کریم بیچ رہا ہے

انیس مرزا۔ فرخ آباد

فقیر شہزادہ

اسرار ندوی



اپنی دکان پر جاتے ہوئے روزانہ میں اس کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑا دیکھا کرتا تھا "دے خدا کی راہ پر" یہی اس کی صدا تھی۔ اس کی عمر اسّی سال سے کم نہ ہوگی۔ وہ نابینا تھا۔ ایک پرانی ترکی ٹوپی کو پیالے کی طرح ہاتھ میں لئے دن بھر اسی جگہ کھڑا رہتا اور ذرا ذرا سی دیر کے بعد "دے خدا کی راہ پر" کہتا رہتا۔

آنے جانے والے پیسہ دو پیسہ اس کی ٹوپی میں ڈال کر آگے بڑھ جاتے۔ میں نے کبھی اس کو ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ کنجوسی کی وجہ سے نہیں۔ معلوم نہیں کیوں پیسہ دو پیسہ دیتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگتا تھا اور چونی اٹھنی کی صلاحیت نہیں۔ روز کا جو کاروبار ٹھہرا۔

ایک شام پانی برس کر کھل گیا تھا۔ لیکن کالے کالے بادل مست ہاتھی کی طرح اب بھی آسمان پر اوپر تلے تھے۔ سب سے پہلے میں نے سویرے ہی دکان بڑھا دی۔ جامع مسجد کے پاس پہنچا تو میری آنکھوں نے اس بوڑھے فقیر کو تلاش کیا۔ مگر مجھے نہیں ملا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ کچھ ہی دور آیا ہوں گا کہ وہی بوڑھا سامنے آگے جاتا ہوا دکھائی دیا۔ پانی سے تر بتر اپنی لٹھیا کی آنکھوں سے راستہ ٹٹولتا ہوا چلا جا رہا تھا

مجھے اس کی حالت پر بڑا ترس آیا اور کچھ ایسا جی میں آیا کہ اس کے گھر کا پتہ لگا کر اس کی کچھ مدد کی جائے۔

میں چپکے چپکے اس کے پیچھے چلتا رہا، چلتا رہا، چلتا ہی چلا گیا۔ آبادی سے دور بہت دور بالکل اس کنارے پر جہاں آبادی ختم ہوتی ہے۔ بوڑھا ایک ٹوٹے پھوٹے گھر کے پاس رُکا اور کنڈی ہلائی۔ کواڑ فوراً کھل گیا اور ایک خوبصورت سی لڑکی اس بوڑھے کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اندر لے گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ میں وہیں کھڑا طرح طرح کے خیالات میں کھو گیا۔ کچھ دیر میں دروازہ پھر کھلا۔ اور وہ لڑکی مجھے اندر بلا لے گئی۔

گھر کا حال بڑا بُرا تھا۔ ہر طرف مٹی کا ڈھیر بس ایک کوٹھری بچ رہی تھی اس میں بھی پانی کے ٹپکنے کی وجہ سے ہر جگہ کیچڑ ہو گئی تھی۔ ایک کونے میں کچھ اینٹیں بچھا کر چبوترہ سا بنا لیا گیا تھا۔ اس پر چٹائی کے دو ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ ایک پر بوڑھا فقیر دو زانو بیٹھا تھا اور دوسرا شاید مہمان کے لئے رکھا گیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے بوڑھے فقیر کو آداب کیا۔ بوڑھے نے ہاتھ بڑھا کر بڑی محبت سے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور کہا "مہربان آپ نے اس فقیر کے گھر آنے کی تکلیف کیسے گوارہ کی؟" میرا دل دھک دھک کر رہا تھا! میں کچھ دیر چپ رہا پھر یوں چوری چوری پیچھا کرنے کے لئے معافی چاہنے کے بعد جو کچھ میرے دل میں تھا میں نے کہہ سنایا اور جیب سے دو روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بوڑھا مسکرایا اور کہنے لگا "میرے مہربان۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ آپ میرے مہمان ہیں۔ مجھے آپ کی خاطر کرنی چاہیئے۔ میں یہاں آپ سے ایک پیسہ بھی نہ لوں گا۔" اور اس نے نوٹ میری طرف سرکا دیا۔ اس نے اس لڑکی کو پکارا "رضیہ! رضیہ!!" وہ سر جھکائے ہوئے سامنے آکر کھڑی ہو گئی: "بیٹی مہمان کی کچھ خاطر نہ کرو گی؟" یہ کہہ کر اس نے جیب سے اکنی نکالی شاید یہی اس کی دن بھر کی کمائی تھی۔ پھر کہنے لگا "یہ شاید ہندو ہیں ان کے لئے کیا لاؤ گی؟ تو ایک آنے کے پاس سے بھنے ہوئے چنے لے لو!" وہ چلی گئی۔ میں نے ہمت کر کے بوڑھے سے پوچھا "رضیہ آپ کی لڑکی ہے؟" وہ تھوڑی دیر چپ رہا جیسے وہ کسی بڑے طوفان کو دبا رہا ہو۔ پھر کہنے لگا "مہربان، یہ میری پوتی ہے اس کا باپ اور اس کی ماں اس کو بچپن ہی میں چھوڑ کر چل

بسے تھے میں نے اسے انہیں ہاتھوں سے پالا ہے۔" اس کی آنکھوں کی کٹوری میں آنسو بھر آئے پھر میری ہمت کچھ پوچھنے کی نہ ہوئی۔

رضیہ آگئی۔ ایک صاف کپڑے پر اس نے ہم دونوں کے درمیان چنے پھیلا دئے۔ بوڑھے نے مجھ سے کہا "میرے مہربان، اگر آپ اس میں سے ایک مٹھی بھی لے لیں تو میں سمجھوں گا کہ میں اب بھی مہمان کی خاطر کرنے کے لائق ہوں۔" میں نے اس میں سے ایک مٹھی لیتے ہوئے کہا "میرے بزرگ میں انہیں نعمت سمجھتا ہوں۔" چنے ختم کرنے کے بعد میں نے اجازت چاہی۔ بوڑھے نے کھڑے ہو کر مجھے رخصت کیا اور دعائیں دیں

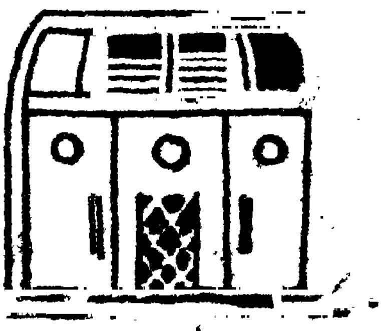
اس روز کے بعد سے ہفتہ دو ہفتہ کے بعد میں بوڑھے کے ہاں تھوڑی دیر کے لئے ضرور چلا جاتا تھا۔ میں نے اس بوڑھے کی اصلی حالت معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن بس اتنا معلوم ہوا کہ یہ بوڑھا کسی بڑے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اب میرے اس سے کافی تعلقات ہوگئے تھے۔ میں اس کی کوئی خدمت کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہا تھا۔

یکایک میں نے ایک روز دیکھا کہ وہ بوڑھا اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ دو روز ہوئے، تین ہوئے، کئی روز ہو گئے۔ میں نے ایک روز نہیں کھولی۔ ناشتہ کر کے سیدھا بوڑھے گھر چلا گیا۔ اُف کیا دیکھتا ہوں کہ بوڑھا موت بستر پر پڑا ہوا ہے اور رضیہ اس کی خدمت لگی ہے۔ مجھے اپنی غفلت پر بڑا غصہ آیا۔ ا مجھے بڑے بھائی، کہتی تھی۔ اس نے مجھے د ہی کہا "بڑے بھائی دیکھئے بابا کی کیا حالت ہے یہ کئی دن سے آپ کو پوچھ رہے ہیں۔" میں کے مارے کچھ نہ بولا۔ پھر اُس نے بوڑھے سے جھک کر کہا "بابا بڑے بھائی آئے ہیں۔" بوڑھے نے میری طرف منہ کیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ا بوڑھے کا آخری وقت ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "مجھے افسوس ہے کہ اور پہلے نہ آ سکا۔ میرے بزرگ۔ اب تو مجھے کوئی خدمت کرنے کا موقع دیا جائے۔" بوڑھے نے کانپتی ہوئی آواز میں مجھ سے رضیہ کا ایک کام کرنے کا وعدہ لے کر اس نے ہلکی آواز میں رضیہ سے کچھ کہا۔ وہ کپڑے میں لپٹا ہوا ایک پلندہ لے آئی۔ بوڑھے نے اسے سینے سے لگایا پھر میری طرف بڑھا کر کہنے لگا "ان کاغذوں کو خوب اچھی طرح

سنبھال کر رکھنا۔ جب رضیہ انیسویں سال میں قدم رکھے تو اسے کھولنا اور جیسا لکھا ہو ویسا کرنا۔ بولو کروگے؟" میں نے وعدہ کیا پھر کہنا شروع کیا۔ "میرے بعد رضیہ کی یہ حالت نہ رہے گی۔ یہ یہاں نہ رہ سکے گی۔ تم اسے جہاں مناسب سمجھنا رکھنا۔" پھر اس نے مجھے ایک جڑاؤ کنگن دیتے ہوئے کہنا شروع کیا "اسے بیچ کر اس کے رہنے کا سامان کر دینا۔" پھر کچھ دیر چپ رہ کر اس نے رضیہ کو بلایا اور ہم دونوں کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہنے لگا "میرے مہربان تم ہندو ہو اور رضیہ مسلمان لیکن خدا کی نظروں میں دونوں انسان ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم رضیہ کی طرف سے کبھی غافل نہ ہوگے۔" وہ زور زور سے ہانپنے لگا۔ ہم دونوں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا "میرے بچے! خدا حافظ تم اپنا نفع نقصان سوچ لینا۔" اتنا کہتے کہتے بوڑھے کی سانس اکھڑ گئی۔

رضیہ میرے گھر رہنے لگی۔ بستی والوں کے چاؤں چاؤں کے خیال سے رضیہ کا نام میں نے کملا رکھ دیا۔ دن بیتتے گئے۔ رضیہ کا اٹھارواں سال ختم ہوا۔ اس دن میں نے رضیہ کو ایک نئی ساری لا کر دی۔ پھولوں کے ہار لا دئے۔ وہ جڑاؤ کنگن اس کو پہنایا اس کے بعد پلندا کھولا۔ اس میں کچھ کاغذات تھے۔ ایک شاہی مہر تھی۔ کچھ فرمان تھے۔ ایک نسب نامہ تھا۔ نسب نامہ کے پڑھنے سے پتہ چلا کہ بوڑھا فقیر ایک شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا بیٹا۔ یعنی رضیہ کا باپ ــــ جنگ میں مارا گیا تھا۔ ایک کاغذ سے پتہ چلا کہ اس کا سرکار سے معاہدہ تھا کہ رضیہ جب اٹھارہ برس کی ہو جائے گی تو اس کو ایک علاقہ جو اس کے باپ کا ضبط کر لیا گیا ہے واپس ملے گا۔

"ایک پہیلی" کا جواب



ریڈیو

کارٹون



بچوں کی کوشش

نیکی کا بدلہ

ایک لکڑہارا تھا ۔ بے چارا بہت غریب تھا ۔ روزانہ جنگل جاتا ۔ لکڑیاں کاٹتا اور شہر میں بیچ دیتا ۔ اس طرح وہ اپنی گزر بسر کرتا ۔ ایک دن وہ لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ دُور سے اسے ایک آدمی نظر آیا ۔ اس کے پاس جادو کی کھڑاؤں تھی ۔ جسے پہن کر وہ ایک قدم میں دو میل چلتا تھا ۔ وہ جب لکڑہارے کے پاس آیا تو بولا کہ "بابا میں بہت بھوکا ہوں اگر تم مجھے اس وقت روٹی کھلا دو تو میں تم کو اپنی کھڑاؤں دے دوں گا ۔ یہ کھڑاؤں مجھے ایک امیر آدمی نے دی تھی ۔ اس نے مجھ سے ایک کام کے لیے کہا تھا ۔ یہ کام بہت مشکل تھا اس سے پہلے بہت سے آدمیوں نے یہ کام



کرنے کی کوشش کی مگر کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن میں کامیاب ہوگیا۔ اس امیر آدمی نے خوش ہوکر مجھے یہ کھڑاؤں دے دی۔ لکڑہارے نے دل میں سوچا کہ میں روزانہ گھر پیدل جاتا ہوں۔ راستے میں پیروں میں کانٹے لگتے ہیں۔ اگر اس آدمی نے مجھے یہ کھڑاؤں دے دی تو پھر میں بڑے آرام سے گھر آجا سکوں گا۔

اب لکڑہارے نے جلدی جلدی لکڑیاں کاٹیں اور اس آدمی کو وہیں بٹھاکر بولا کہ "سائیں بابا! تم یہاں بیٹھو میں ابھی شہر جاکر تمھارے لئے روٹی لے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر لکڑ لکڑی لے کر شہر چلا گیا اور وہاں اس نے لکڑیاں بیچیں اور اس سے جو پیسے ملے اس سے کھانا خرید کر اس آدمی کے پاس واپس آگیا۔ کھا کھاکر وہ بہت خوش ہوا اور کھڑاؤں دے کر چلا گیا۔

اب لکڑہارے کو کوئی دقت نہ ہوتی تھی اس کے پیر میں کانٹے بھی نہ چبھتے تھے۔

الفت النساء درجہ پنجم



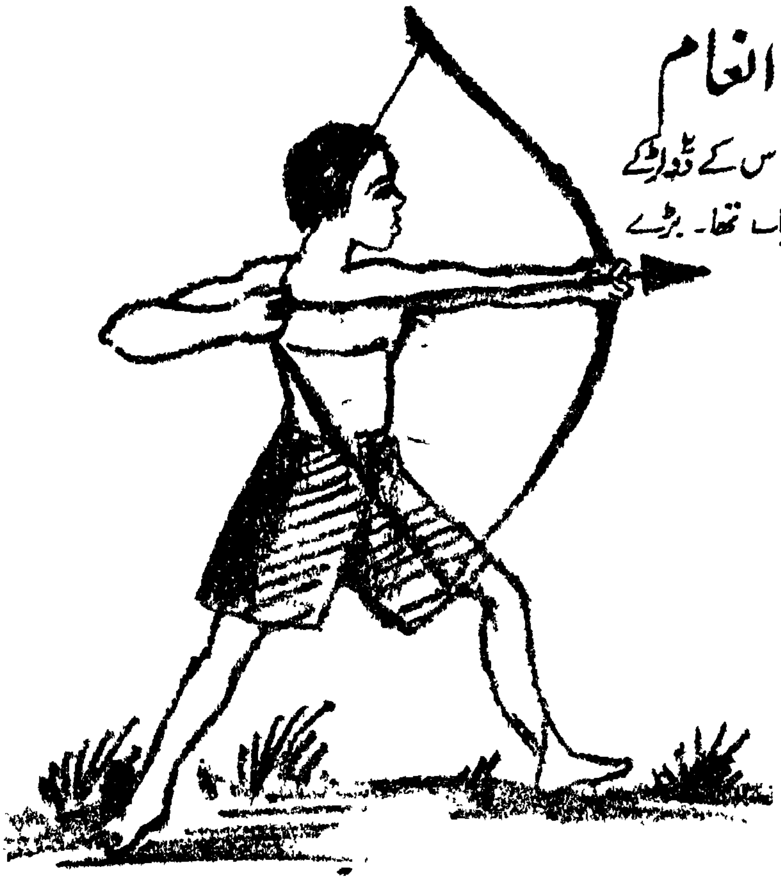
گڑیا کی شادی

ایک لڑکی تھی اس کا نام رفعت تھا اس کا ایک بھائی تھا۔ بھائی کا نام ریحان تھا۔ دونوں ایک ساتھ رہا کرتے تھے کیونکہ نہ ان کی کوئی ماں تھی نہ کوئی باپ۔ ایک دن رفعت بیمار ہوگئی۔ ریحان بے چارا کرے

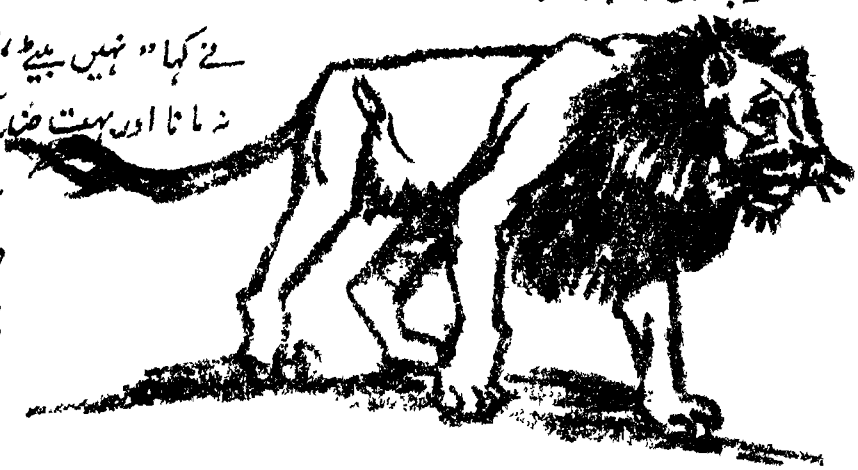
تو کیا کرے نہ پاس پیسہ تھا جو دوا لا سکے۔ ریحان دو تین دن تک ایک جنگل سے لکڑیاں لاتا اور انھیں بازار میں جاکر ایک بڑھئی کے پاس بیچ آتا۔ اس طرح اس کے پاس ۵ یا ۶ روپیے ہوگئے۔ وہ روز دوا لاتا اور رفعت کو روز پلاتا۔ کچھ روز بعد رفعت بالکل اچھی ہوگئی۔ اور اسے اپنی گڑیا کی شادی کی فکر ہوئی۔ کیونکہ اس نے اپنی بیماری سے پہلے اپنی ایک دوست ذکیہ سے گڑیا کی شادی طے کرلی تھی۔ وہ صبح اٹھ کے جلدی جلدی ناشتہ کرکے اپنی دوست ذکیہ کے پاس گئی۔ ذکیہ رفعت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور بولی "دوست رفعت تم ٹھیک ہوگئیں۔ رفعت بولی" ہاں میں بالکل ٹھیک ہوگئی ہوں۔ پہلے تم بتاؤ کہ اپنی گڑیا کی شادی کب کر رہی ہو۔ دیکھو پرسوں اتوار ہے۔ پرسوں کرلو۔" ذکیہ بولی" ہاں گھر جاکر تم تیاری کرلو۔" رفعت بھاگی بھاگی اپنے گھر گئی اور سوچنے لگی کہ نہ میرے پاس پیسے ہیں نہ کوئی کپڑا جو اپنی گڑیا کو جہیز میں دوں۔ آخر رات کو سوتے وقت ریحان سے بولی" بھیا ریحان میں اپنی گڑیا کی شادی کر رہی ہوں۔ میرے پاس پیسے بھی نہیں جو اپنی گڑیا کی شادی کروں۔" ریحان بولا" میں کل صبح کو اپنے دوست عمران سے ۱۰ روپئے لاؤں گا۔ اس لئے کہ جب ممانی جان اپنے گھر جارہی تھیں تو مجھ کو ۱۰ روپے دے کر گئی تھیں۔ وہ روپے میں اسکول لے گیا۔ وہاں میرے دوست عمران نے کسی کام کی وجہ سے مجھ سے دس روپے لے لئے۔ وہ میں کل لے آؤں گا۔" یہ کہہ کر دونوں سوگئے۔ صبح اُٹھ کے ریحان بھاگا بھاگا عمران کے گھر گیا اور عمران سے بولا "دوست عمران تم نے اسکول میں کسی کام کی وجہ سے دس روپے لئے تھے وہ دے دو۔ عمران جانتا تھا کہ ریحان بہت غریب ہے۔ اس نے فوراً دس روپے دے دیئے۔ ریحان دس روپے لے کر بازار گیا۔ اور گڑیا کے کپڑے خریدے۔ گھر آیا۔ رفعت کپڑے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور پھر ذکیہ کے گڈے سے اپنی گڑیا کی شادی کردی۔

سعدیہ درجہ پنجم ابتدائی

بہادری کا انعام



ایک بادشاہ تھا اس کے دو لڑکے تھے۔ وہ بادشاہ بہت نیک تھا۔ بڑے لڑکے کا نام الیاس اور چھوٹے شہزادے کا مجیب۔ الیاس کو شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک دن شہزادہ الیاس شکار کو جا رہا تھا کہ مجیب نے بھی اسے دیکھ لیا اور اپنے ابا سے بولا "ابا جان میں بھی بھائی جان کے ساتھ جاؤں گا۔" بادشاہ نے کہا "نہیں بیٹے، تم مت جاؤ" لیکن مجیب نہ مانا اور بہت ضد کرنے لگا۔ آخر بادشاہ نے اسے بھی اجازت دے دی۔ اب دونوں بھائی جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ کوئی شکار ہاتھ نہ آیا پھر شام بھی ہو گئی۔



وہ دونوں گھر لوٹنے ہی والے تھے کہ انھیں ایک شیر نظر آیا۔ بڑے بھائی نے ایک تیر شیر کے مارا وہ تیر خطا ہو گیا تو دوسرا تیر مارا۔ دوسرا تیر شیر کے سینے پر لگا۔ اور شیر مر گیا۔ پھر تو دونوں بھائی بہت خوش ہوئے اور شیر کو لے کر گھر آئے۔ جب باپ نے دیکھا کہ میرے بچے شیر مار کر لائے ہیں تو بہت خوش ہوا اور بہت شاباشی دی۔ اسی خوشی میں چھوٹے بھائی کو جادو کا پھول دیا جو کبھی مُرجھاتا نہ تھا۔ اور بڑے بھائی کو اپنی جگہ بادشاہ بنا دیا۔ اور خود اللہ کی عبادت کرنے لگا۔ اب تو رعایا اور بھی زیادہ خوش رہنے لگی۔

شوکت بانو درجہ پنجم

بچوں کی کہانیاں

سردار گائیڈ	۳/	سفید ہاتھی	۴/	خاموش شہزادی	۴/
چھومنتر	۳/	شاہی لباس	۴/	انوکھی شہزادی	۴/
کبڑا فرشتہ	۳/	شاہی موچی	۴/	شہزادی کا ہار	۴/
آفت کا پرکالا	۴/	شہزادی گوہر بار	۵/	ضدی شہزادہ	۵/
مسٹر بھوٹ	۳/	مٹی کی شہزادی	۴/	پھولوں کی شہزادی	۴/
ماں کا ظلم	۳/	گرم چائے	۳/	مسٹر گڑبڑ خاں	۴/
جن پکڑا گیا	۳/	خرگوش	۳/	سونے کا راجہ	۳/
شاہ صاحب کی بد دعا	۳/	سنہری کھال	۳/	رستم چور	۳/
ظالم بادشاہ	۳/	راموموچی	۳/	کہانی میں کہانی	۳/
ہیبت خاں	۳/	سنہری پرندہ	۳/	جادو کی کہانی	۳/
اکبر بیربل کے لطیفے	۶/	آنکھ مچولی	۳/	کایا پلٹ	۳/
دو بھائی	۵/	علم کی قیمت	۳/	بوڑھا جادوگر	۳/
ہوائی گھوڑا	۵/	بچوں کی بیت بازی	۳/	گوہر پری	۳/
وفاداری کا امتحان	۵/	شیخ چلی نے شادی کی	۳/	لنگڑا دیو	۳/
تین ٹھگ	۵/	شہزادی نیلوفر	۳/	فقیر کی دعا	۳/
لاڈلی بیٹی	۵/	جادو کی چھڑی	۳/	خدا کی لاٹھی	۳/
ایمانداری کا پھل	۵/	اندھیر نگری	۳/	جادوگر کی کہانی	۳/
دو بہنیں	۵/	نیلم پری	۳/	چھم چھم پری	۳/
دلچسپ چٹکلے	۵/	شہزادی نیلم	۴/	مزیدار لطیفے	۴/
شام نگر میں سینما آیا	۴/	جادو کا باپ	۴/	چٹ پٹی پہیلیاں	۴/
جادو کی انگوٹھی	۵/	مداری کا ڈنڈا	۴/	نوشیرواں کا انصاف	۴/
شیخ چلی کا مشاعرہ	۵/	بدھو سیٹھ	۴/	مکار بھائی	۴/
نیلم	۶/	قاضی اور ٹھگ	۴/		۴/
کاغذ ساز کی بیٹی	۴/	ناگ شہزادہ	۴/	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ دہلی	۴/

پیامی معمہ نمبر ۳۶ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل پیامی معمہ نمبر ۳۷:۔ (۱) امرت (۲) سیر (۳) دنگل (۴) طاقت (۵) نوکر (۶) راج (۷) توے

اس بار صحیح حل ۲۴ موصول ہوئے۔ لہذا پہلا انعام ۸ ؍ فی کس تقسیم کر دیا گیا

(۱) احمد حسین۔ دہلی (۲) جمیلہ بی۔ دہلی (۳) نعمت اللہ۔ کانپور (۴) کلدیپ لعل چوپڑہ۔ جموں توی (۵) کلیم اللہ صاحب میرٹھ (۶) اکرام علی۔ غازی آباد (۷) شریف الحسن۔ نئی دہلی (۸) محمد اکرم۔ میرٹھ (۹) شفیع الدین خاں بمبئی (۱۰) محمد اشرف دہلی (۱۱) بی فاطمہ بی۔ دہلی (۱۲) روشن آرا بمبئی (۱۳) حسن آرا۔ بمبئی (۱۴) محمد ادریس احمد۔ پونہ (۱۵) افروز عالم حیدرآباد (۱۶) محمود وقار۔ حیدرآباد (۱۷) شفیق احمد۔ گلبرگہ (۱۸) ریاض الدین احمد۔ لکھنؤ (۱۹) عبدالقدیر۔ کانپور (۲۰) حسن توحید۔ گیریڈی (۲۱) شبیر حسین۔ حیدرآباد (۲۲) توقیر احمد۔ جمشید پور (۲۳) عبدالستار۔ کانپور (۲۴) معین الدین۔ اناؤ

ایک غلطی والے چھبیس حل موصول ہوئے لہذا دوسرا انعام بحساب ۳ ؍ فی کس تقسیم کیا گیا

(۱) محمد وانس۔ چندرسن (۲) سروپ سنگھ۔ لدھیانہ (۳) شفیع احمد۔ گھرگون (۴) جنید الرحمٰن۔ دیوبند (۵) محمدی بیگم۔ بینا تمبڑی (۶) ار ہر پرکاش کلائی۔ دہلی (۷) نسیم احمد۔ ضلع پورنیہ (۸) حبیب النسا۔ ٹونک (۹) عبدالرزاق۔ بگہا۔ (۱۰) عزیز اللہ۔ الہ آباد (۱۱) سرجیت سنگھ۔ جموں توی (۱۲) عزیز احمد۔ قادرآباد (۱۳) صغرا بیگم۔ نظام آباد (۱۴) صبیحہ لطیف بھیونڈی (۱۵) محمد اسرائیل۔ کلکتہ (۱۶) عبدالرحیم۔ ضلع چاندہ (۱۷) نثار احمد۔ شولاپور (۱۸) ضیا اللہ۔ رائپور۔ (۱۹) حمیدہ بانو (۲۰) عبدالقیوم۔ شولاپور (۲۱) جمیل احمد۔ گریڈیہہ (۲۲) محمد افضل الدین۔ حیدرآباد (۲۳) سید صبیح الدین علوی۔ علی گڑھ (۲۴) شگفتہ پروین سمیع۔ مرادآباد (۲۵) حمید الدین۔ کانپور۔

نوٹ:۔ جن حضرات کو پیامی معمہ ۳۵ کا انعام ابھی تک نہ ملا ہو۔ براہ کرم وہ اپنا پتہ صاف خوشخط لکھ کر دوبارہ روانہ کر دیں۔ تاکہ تعمیل ۱۰ ؍ اکتوبر ۵۴ء تک کی جا سکے

:۔ کمپائلر ۔:

اشارے

۱۔ پیام تعلیم کا سالنامہ ۔ ۔ ۔ میں شائع ہوگا (نومبر)

۲۔ کبھی کبھی ۔ ۔ ۔ کی درستی بھی مستقل صورت اختیار کرلیتی ہے۔ (ریل ۔ جیل)

۳۔ خدا کی راہ میں ۔ ۔ ۔ تک قربان کرنے والے بہت کم ملتے ہیں۔ (جان ۔ مال)

۴۔ بعض بچے ۔ ۔ ۔ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ (نانی ۔ دادی)

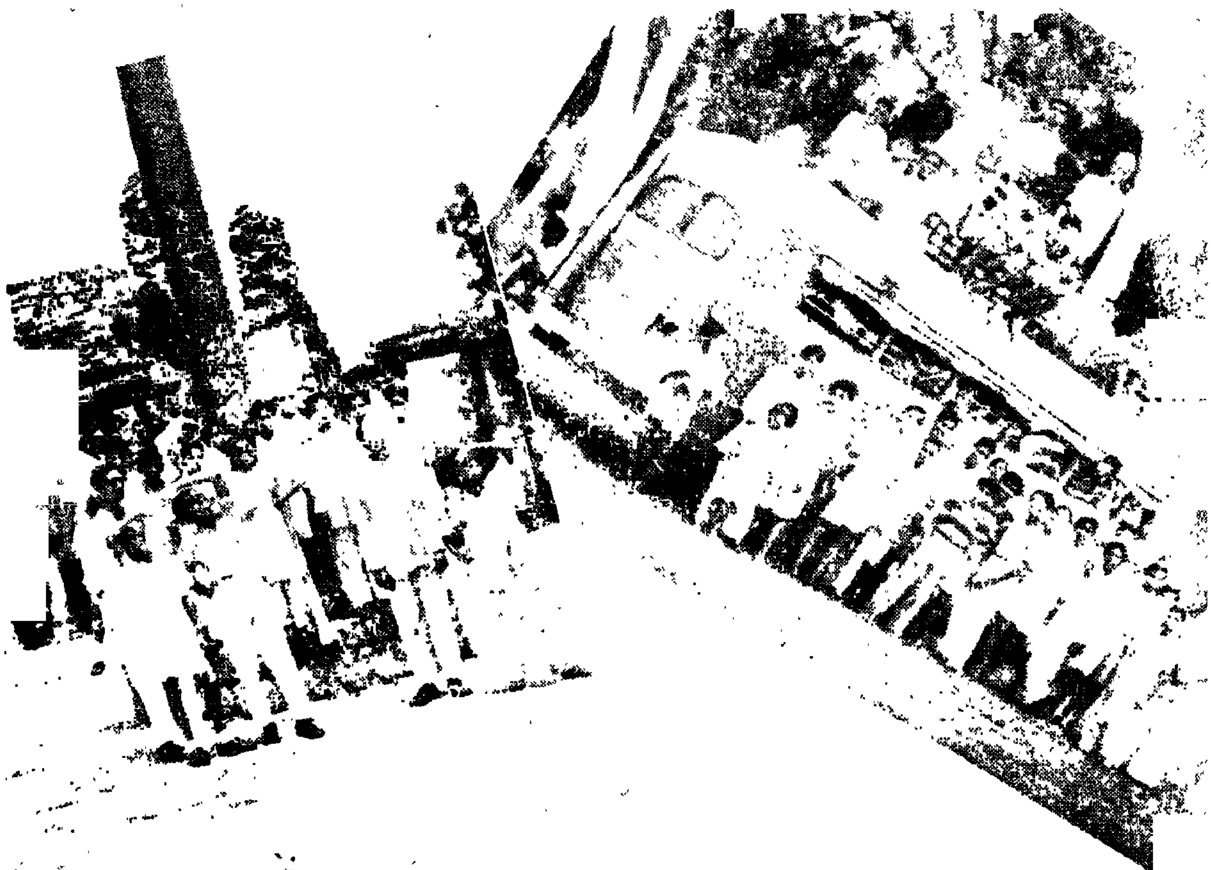
۵۔ آج کل کے زمانے میں ۔ ۔ ۔ کی بڑی قدر ہے۔ (نوٹ ۔ ووٹ)

۶۔ ہندوستان میں ۔ ۔ ۔ لوگوں کی تعداد بڑھتی ہی جارہی ہے (بیمار ۔ بے کار)

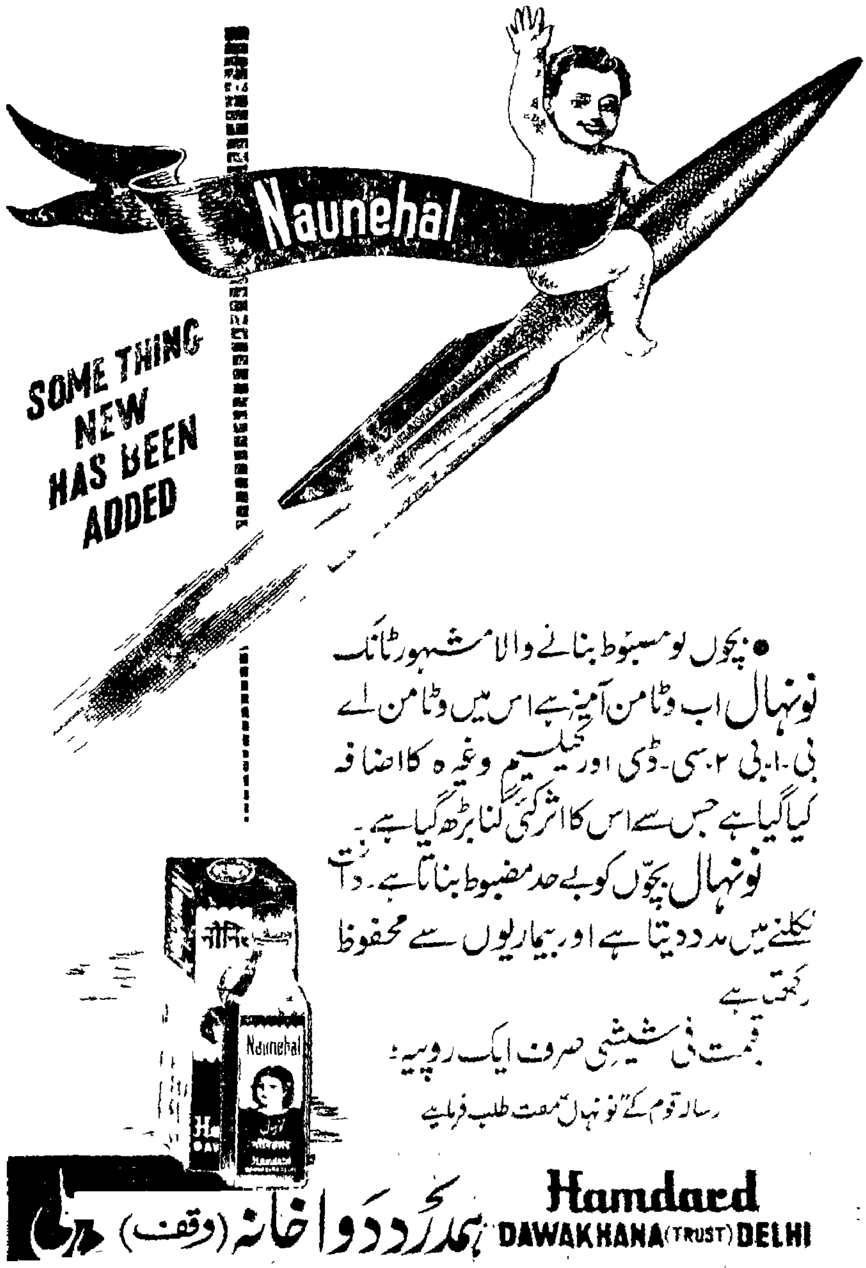
پیامی معمّا نمبر ۳

۱ ن	و		پ	ر	■
۲	ے	ل	■	■	■
۳	ا		■	■	■
۴	ا		ی	■	■
۵	و	ٹ	■	■	■
۶	ی		ا	ر	■

پرنٹر پبلشر حامد علی خاں　　　　　　　　مطبوعہ:۔ کوہ نور پریس ۔ دہلی






Naunehal
SOME THING NEW HAS BEEN ADDED
• بچوں کو مضبوط بنانے والا مشہور ٹانک
نونہال اب وٹامن آمیز ہے اس میں وٹامن اے
بی۔ای بی ۲۔سی۔ڈی اور کیلسیم وغیرہ کا اضافہ
کیا گیا ہے جس سے اس کا اثر کئی گنا بڑھ گیا ہے۔
نونہال بچوں کو بے حد مضبوط بناتا ہے۔ دانت
نکلنے میں مدد دیتا ہے اور بیماریوں سے محفوظ
رکھتا ہے
قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ
رسالہ قوم کے "نونہال" مفت طلب فرمایئے
Naunehal
Hamdard
DAWAKHANA (TRUST) DELHI
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی



پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی


नौबहार
CHILDREN
NAUBAHAR
بچوں کی قوت و صحت کا محافظ
نہایت آزمودہ اور پسندیدہ ٹانک
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ



سالنامہ

پیامِ تعلیم



ادارہ

حامد علی خاں بی، اے (جامعہ)

اطہر پرویز ایم، اے (علیگ)

آرٹسٹ: گلیڈون میسی

سالانہ چندہ

چار رُوپے

قیمت سالنامہ ایک رُوپیہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

فہرست



بچّوں سے باتیں

لیجیے، سالنامہ بھی آگیا۔ اس سالنامے کی سب سے بڑی خصوصیت تو یہ ہے کہ ہم نے تقریباً تمام مضمون اپنے لکھنے والوں سے فرمائش کرکے لکھوائے، ہیں۔

محترمہ سُلطانہ آصف فیضی، محترمہ مُشیر فاطمہ، اور مُمتاز حسین صاحب کے مضامین اس لحاظ سے اہم ہیں کہ انھوں نے مصر، انگلستان اور چین کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر نورالحسن صاحب ہاشمی اور مسعودالحق صاحب نے لکھنؤ اور دلّی جیسے تاریخی شہروں کی کہانی لکھی ہے، جو معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد دلچسپ ہے۔

وامق جونپوری کی زمین کی کہانی اس کی زبانی، م الیاس صاحب کا مضمون ہماری زمین ہمارا گھر، محسن حامد صاحب کا مضمون گلیشیر، ہماری زمین کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اور ہماری معلومات میں بڑا اچھا اضافہ کرتی ہیں۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم نے اس بار دو شاعروں سے مضمون لکھوائے ہیں۔ جناب وامق جونپوری، اور جناب غلام ربّانی تاباں۔ آپ ان مضمونوں کو پڑھ کر ان کی نثر کے بھی

قائل ہو جائیں گے۔ ہمارے مشغلے یوُں تو بہت کچھ ہو سکتے ہیں لیکن اِس بار ہم نے فوٹوگرافی اور باغبانی کو سالنامے کی زینت دی ہے اُمید ہے کہ اِن مضامین سے پوُرا فائدہ اُٹھائیں گے سراج انور صاحب خود بھی ایک بڑے فوٹوگرافر ہیں اور اس لحاظ سے اُن کا یہ مضموُن اور بھی اہمیت رکھتا ہے۔

سالنامے میں کہانیاں تو خیر ہیں ہی۔ اس بار ہم نے دو ڈرامے بھی شامل کیے ہیں۔ "بادل کے نیچے" ہاجرہ بیگم صاحبہ کا ڈرامہ ہے جسے مدرسہ ابتدائی کے بچے میلے کے موقع پر پیش کر رہے ہیں۔ دوُسرا ڈراما "کارتوس" تاریخی ہے، جسے حبیب تنویر صاحب نے ہمارے سالنامے کے لیے خاص طور پر لکھا ہے۔ قومی منصوُبوں کے سلسلے میں بھاکڑہ ننگل پراجکٹ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قیصر نقوی صاحب کا مضموُن اس پراجکٹ پر خوب روشنی ڈالتا ہے۔

مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپُوری نے ہمیں ایک بڑی خوبصوُرت نظم عنایت کی ہے اور یہ سالنامے کی برکت ہے کہ ہم جناب روشن صدیقی، جناب یکتا امروہوی، جناب حامد اللہ افسر، مرزا ادیب صاحب، جناب شتاق، جناب ا ع، الفاروی، جناب الیاس محترمہ درشہنم شمع، محمد شمیم صاحب جیراجپوری، جناب عبداللہ ولی بخش قادری، سید منیر الحسن، پروفیسر مبارز الدین رفعت، قدسیہ زیدی، جناب مجتبٰی محمود۔تہران مجیب احمد خاں صاحب، نوح فاروقی، ا دوُسرے ادیبوں اور شاعروں کے مضا. کہانیاں اور نظمیں شائع کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آئندہ بھی یہ حضرات پیا. بچّوں کے لیے اچھی اچھی چیزیں عنایت فرماتے رہیں گے۔

پرچے کے بارے میں پیامی ہمیں اپنی رائے لکھیں۔ ہم اسے پیامِ تعلیم کے اگلے پرچے میں شائع کریں گے۔

۳۰ر اکتوبر سے جامعہ میں تعلیمی میلہ ہو رہا ہے۔ جس کا حال ہم اگلے پرچے میں لکھیں گے۔

(بقیہ دیکھئے صفحہ ۵۰ پر)

مولینا حافظ محمد اسلم جیراج پوری



خودداری

ایک کُتّے نے کہا یہ شیر سے ۔ ہے بات کیا؟ ۔ سارے جنگل پر مسلّم ہے جو سرداری تری
جانور جتنے ہیں تجھ کو مانتے ہیں بادشاہ جانتے ہیں گرچہ وہ فطرت ہے خونخواری تری
آدمی بھی کرتے ہیں عزّت تری ہر اک طرح گو کہ ہے مشہورِ عالم مَردُم آزاری تری
ہے نشاں پر تیری صورت تیغ پر تیرا ہے نقش اسلحہ داری تری ہے اور علمداری تری
تیرے ناخن ہیں وہ سمّیت سے بچ سکتا نہیں گر کسی پر چوٹ لگ جائے ذرا کاری تری
جانور جتنے ہیں تجھ کو دیکھ کر جاتے ہیں بھاگ کس قدر دہشت ہر اک کے دل پہ ہے طاری تری
تُو کسی کے بھی نہیں دُنیا میں کام آتا کبھی قوم ہے بے منفعت اور ذات ناکاری تری
رحم کی نرمی کی تجھ میں خو نہیں ہے نام کو بلکہ ہے مشہور دُنیا میں ستمگاری تری

دیکھتے ہیں جب ترے اس ظالمانہ کام کو
لوگ پھر عزّت سے کیوں لیتے ہیں تیرے نام کو؟

برخلاف اس کے مجھے دیکھو نہ ہوں خدمت گزار
ساری دنیا میں مسلم ہے وفاداری مری

[illegible]ک کی حفاظت رات بھر کرتا ہوں میں
پاسبانی کو ہے اس کی وقف بیداری مری

[illegible] میں اس کے ہراک شے کا کرتا ہوں شکار
کام آتی ہے نہایت تیز رفتاری مری

جب کہیں جاتا ہے تو رکھتا ہے مجکو ساتھ ساتھ
کٹتی ہے خدمت میں اسکی عمر بھی ساری مری

جب کبھی جھڑکا تو بھاگا۔ جب بلایا آگیا
دیکھئے فرماں پذیری، حکم برداری مری

پھر بھی ہے بدنام دنیا میں ہراک سو میرا نام
ہر گلی کوچہ میں ہوتی ہے سدا خواری مری

مارتا ہے کوئی پتھر۔ کوئی ڈنڈے سے مجھے
ایک بھی سنتا نہیں ہے گریہ وزاری مری

شیر نے سن کر۔ دیا یہ مختصر اس کو جواب
میری عزت کا سبب ہے خاص خودداری مری

غیر کے ٹکڑوں پہ رہتی ہے تری ہر دم نظر
اس لئے دنیا میں ہے تو خوار و رسوا در بدر





... پوری

زمین کی کہانی اُسی کی زبانی

میرے پیارے بچو! میں آج تم کو اپنی وہ کہانی سناتی ہوں جس کو سن کر تم کو معلوم ہوگا کہ تمہاری ماں بننے سے پہلے اور اس کے بعد میں کیا تھی اور اب کیا ہوں۔ میری کہانی تو بہت بڑی ہے مگر چونکہ میں جلدی میں ہوں اور مجھے بہت لمبا سفر کرنا ہے اس لئے میں تم کو اپنی کہانی بس یہی چار پانچ منٹ میں چلتے چلاتے سنائے دیتی ہوں۔ میں بہت تیز چلتی ہوں اور یہ کہانی کہتے کہتے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر لوں گی۔

اچھا تو اب سنو۔ میں نارنگی جیسی چپٹی گول ہوں اور ہر وقت ناچتی رہتی ہوں۔ میرے ناچنے کا ہر چکر چوبیس گھنٹے میں پورا ہوتا ہے اور اس طرح ناچتے ناچتے میں اپنی جگہ سے برابر آگے بڑھتی رہتی ہوں اور ایک سال یعنی تین سو پینسٹھ دن میں سورج کے گرد پورا چکر لگا لیتی ہوں۔

میں اب سے کئی ہزار سال پہلے سورج جیسی گرم تھی۔ اُس وقت میرے کوئی اولاد نہ تھی۔ میں خود اُس وقت بچہ تھی۔ بڑی کھلنڈری آگ بگولا۔ آندھی۔ طوفان۔ میرے جسم سے شعلے

نکلتے رہتے تھے۔ پیٹ میں آگ باہر آگ۔ ہر وقت بے چین۔ پریشان۔ ہر وقت زلزلہ۔ ہر وقت دھماکہ۔ جیوں جیوں میری عمر بڑھتی گئی میں ٹھنڈی ہوتی گئی۔ جب اوپر کی آگ بالکل بجھ گئی تو میرے جسم پر جھریاں پڑنے لگیں۔ نیچی جگہوں میں پانی بھر گیا اور سمندر بن گئے۔ اونچی جھریاں پہاڑ بن گئیں اور برابر جگہیں میدان۔ سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بھاپ بننے لگا۔ جس سے بادل بنتے میدانوں اور پہاڑوں پر برسے اور ندیاں بہہ نکلیں جو سمندر سے جا کر پھر مل گئیں۔

اب بھی کبھی کبھی اور کہیں کہیں زلزلہ آتا ہے۔ یہ اُسی آگ کا اُبال ہے جو میرے پیٹ میں بھری ہوئی ہے۔ جب وہ باہر نکلنے کے لئے زور لگاتی ہے تو میرے جسم کو دھکا لگتا ہے اور میں کانپ اُٹھتی ہوں۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ سمندر بنے پہاڑ بنے اور دریا بنے۔ مگر سب بالکل بے جان سنسان۔ کوئی زندگی نہیں کوئی چہل پہل نہیں۔ تب میں نے آگ پانی مٹی اور ہوا کے مختلف حصوں کو ملا کر جانوروں اور درختوں کو جنم دیا۔ ایک مدت میں میرے جسم پر تم جنگل ہی جنگل اور عجیب و غریب قسم کے جا دکھائی دینے لگے۔ اژدہے۔ ہاتھی۔ مچھلیا سانپ شیر۔ گھڑیال۔ بارہ سنگھے اور بندر و مگر اس میں کوئی جانور نہ تھا جو تمہاری طر عقل مند، ہونہار، محنتی، اور محبت کرنے وا ہوتا۔ اور مجھ میں چھپی ہوئی دولت اور قوت کو معلوم کر کے کام میں لاتا اور مجھ کو اپنی ما کہہ کر پکارتا۔ اُن دنوں کوئی نہ جانتا تھا کہ یہ زلزلے کیوں آتے ہیں۔ پانی کیوں برستا ہے بادل کیوں گرجتا ہے۔ بجلی کیوں چمکتی ہے۔ دن کیا ہے۔ رات کیا ہے۔ پھر بھی میں نا اُمید نہ ہوئی اور تمہارے جیسی اولاد کو جنم دینے کی برابر کوشش کرتی رہی۔ چونکہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی قوت مجھ میں ہمیشہ سے تھی اس لئے میری ہر اولاد میں بھی یہ صفتیں موجود تھیں۔ فطرت کی مدد سے میں نے بندر کو جو اُس وقت تک میری اولادوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا دماغی اور جسمانی طور پر اور زیادہ ترقی کرنے اور ہاتھ پیر مارنے کے موقعے دئے۔ تب وہ بندر سے بن مانس بنا۔ درختوں سے

اُتر کر گپھاؤں اور جھاڑیوں میں رہنے لگا ۔ جب اُس نے اور ترقی کی تو جسم کے بال بھی کم ہونے لگے۔اب اُس کو سردیوں میں بدن ڈھانکنے کو گرمی کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ضرورت ایجاد اور علم کی ماں ہے۔چنانچہ اُس نے پتوں سے بدن چھپایا اور چقماق سے آگ بنائی۔ اب وہ انسان کہے جانے کا حق دار ہوگیا تھا کیونکہ اُس نے فطرت پر اپنا قبضہ جماتا شروع کر دیا تھا۔ اُس نے تیر کمان اور بھالے بنائے جس سے وہ جانوروں کا شکار کرنے لگا۔ وہ تمھاری طرح مہذب اور شائستہ نہ تھا۔ اور جنگل کے قانون کے مطابق آپس میں خوب لڑتا بھی تھا۔ آج بھی جو لوگ لڑتے ہیں اُن کو میں جنگلی ہی سمجھتی ہوں۔ اُن لوگوں نے ابھی تک اپنا کوئی گھر نہ بنایا تھا اور نہ اُن کا کوئی وطن تھا۔ وہ روزی کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرتے رہتے تھے بالکل جیسے آج کل کے بنجارے اس دوڑ دھوپ میں گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کی سواری کے علاوہ انھوں نے اپنا اسباب اٹھانے پھرنے اور بھاری چیزوں کو ڈھکیلنے کے لئے "پہیا" ایجاد کیا۔ انسان نے سب سے پہلا پہیاّ درخت کے تنے کو تھوڑا چھیل چھال کر بنایا تھا جو بیلن کی طرح لڑھکتا تھا۔اس کے بعد ایک تنے سے کئی کئی پہیئے کمھار کے چاک کی شکل کے کاٹ کر نکالے۔ کچھ دن بعد اس کو بھی ہلکا کیا اور پھر اور ہلکا کیا۔ دیکھو آج میرے اوپر کتنے قسم کے پہیئے چل رہے ہیں۔ اب ذرا سوچو کہ اگر انسان پہیاّ نہ ایجاد کر پاتا تو تم کیا تہذیب کی اس منزل پر ہوتے جہاں آج ہو۔ پہیئے کی ایجاد پر تم جس قدر غور کروگے اتنا ہی تم کو یقین ہوتا جائے گا کہ انسان کی عقل کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

انسان کی پیدائش سے پہلے میں قریب قریب بڈھی ہو چلی تھی۔ مگر میری اس اولاد نے میری کوکھ بھر دی۔ مجھ کو دلہن کی طرح سنوار کر جوان کر دیا۔ اپنے دماغ اور ہاتھ پیر سے ایسے ایسے کام کئے کہ اب میں اُس کی زندگی اور خوشحالی کے لئے اُس پر آئے دن طرح طرح کی نعمتیں نچھاور کرتی رہتی ہوں۔ اُس کے کارناموں کی فہرست تو بہت بڑی ہے مگر تمھاری دلچسپی کے لئے میں تھوڑے سے نام گنائے دیتی ہوں۔ پانی پر چلنے کے لئے کشتی اور جہاز بنائے۔ خشکی

کے لئے موٹر کار اور ریل گاڑیاں۔ ہوا میں اُڑنے کے لئے ہوائی جہاز۔ رہنے کے لئے عالیشان عمارتیں۔ پھول پھل کے لئے چمن اور باغ لگائے۔ ایک سے ایک حسین شہر بسائے۔ مختلف زبانیں ایجاد کیں۔ لکھنا پڑھنا سیکھا۔ اور ہر زمانے میں اپنی تہذیب کا کوئی نہ کوئی ایسا نمونہ چھوڑا کہ جس پر آج سب فخر کرتے ہیں۔ مثلاً تاج محل۔ اجنتا کے غار میں پتھر پر تصویریں۔ مصر کے اہرام اور ابوالہول۔ چین کی دیوار۔ روم اور یونان کے بُت اور نقش و نگار۔ وغیرہ ایسے ایسے گانے اور ناچ ایجاد کئے کہ جن کو سن کر اور دیکھ کر طبیعت کو وجد آتا ہے۔ کھیتی کر کے غلہ اُگایا۔ مشین سے کپڑے تیار کئے۔ ریڈیو۔ ٹیلی وژن اور دوسری آرام کی چیزیں ایجاد کیں۔ میرے سینے میں جو جواہرات اور دھاتیں دفن تھیں اُنکو نکالا۔

اور اب تو انسان بہت ترقی کر گیا ہے اُس نے ذرّاتی قوت دریافت کر لی ہے۔ اور اب یہاں سے میری کہانی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ تم سے میں ذرّاتی قوت کی کیا تعریف کروں۔ اگر اُس کا ٹھیک ٹھیک استعمال کیا جائے تو یہ تمہاری زندگی کو اب سے سو گنا زیادہ خوشگوار بنا سکتی ہے۔ مگر اس قوت میں جس قدر کی صلاحیت ہے اتنی ہی بگاڑنے کی بھی۔ ایٹم بم، جو دیکھنے میں تو بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ پھٹنے پر سیکڑوں میل کی ۔ ر لیتا ہے۔ جنگ حالت میں بڑی چیز ہے، مگر اُس میں ایٹم کا استعمال تو اس لئے اور زیادہ خراب ہے کہ وہ لڑنے والوں کے علاوہ بے گناہ شہر کو بھی نہیں چھوڑتا۔ مجھ کو جنگ سے بڑی نفر ہے۔ جنگ میں میری گود کی پالی ہوئی لاکھو جانیں جاتی ہیں۔ ہزاروں بچے یتیم ہو جا ہیں اور لا تعداد عورتیں بیوہ۔ پُرانے تہذیبی کارنامے تباہ ہوتے ہیں۔ اور میری چھاتی پھٹ ہے۔ ابھی تک مجھ کو ایٹم بم ہی کا غم تھا مگر اب تو ہائیڈروجن بم بھی تیار ہو گیا ہے۔ سننے میں آ رہا ہے کہ یہ بم ایٹم بم سے دس گنا زیادہ تباہ کن ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ چار ہائیڈروجن بم ہندستان کو ختم کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پچاس ساٹھ بم تو مجھ ہی کو جھلس کر رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے پیارے بچو اگر دنیا میں ہمیشہ کے لئے امن نہ ہوا تو یہ بم ضرور پھٹینگے اور

(بقیہ پچھلے صفحہ ۴۲۵ پر)

(ایک قدیم روسی کہانی)

مظفر شاہ



برف بالا

بہت دنوں کا ذکر ہے، روس کے برفانی دیش میں اوان نامی بوڑھا کسان اور اُس کی بیوی میر لیا رہا کرتے تھے، ان کی زندگی بڑے مزے سے بیت رہی تھی، اگر انھیں غم تھا تو بس یہی کہ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔

سردی کے موسم میں ایک دن یہ دونوں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے برف میں بچوں کے کھیل دیکھ رہے تھے، بچے شوروغل مچاتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے، یہ دیکھ کر اوان اپنی بیوی سے بولا "ہماری قسمت ہی خراب ہے، مگر ہمیں افسوس نہیں کرنا چاہیئے، چلو باہر برف میں چلیں اور بچوں کے کھیل میں شریک ہو جائیں"۔

بس بڈھے بڑھیا، دونوں آستینیں چڑھا کر برف میں پہنچ گئے اور سفید سفید برف کا ڈھیر کرنے لگے۔ بچوں نے جو ان کو برف جمع کرتے ہوئے دیکھا تو چلاتے ہوئے ان کی طرف دوڑے۔

"ہم بھی دیکھیں آپ کیا بنا رہے ہیں۔؟"

جب بچے قریب پہنچے تو انھیں یہ دیکھ کر بڑا اچنبھا ہوا۔ اوان نے برف کی ایک ننھی منی گڑیا بنا ڈالی تھی، برف کی گڑیا سر سے پیر تک مکمل سچ مچ کی لڑکی دکھائی پڑتی تھی،

بوڑھا اوان اپنی اس کاریگری کو دیکھ کر پھولا نہیں سماتا تھا، اتنے میں کچھ آہٹ ہوئی اور لڑکی کی آنکھیں

چپکے سے آیا اور چلا گیا۔ اوان اس کو نہیں دیکھ پایا۔ اس کے جاتے ہی برف بالا کے جسم میں زندگی کے آثار اُبھرنے لگے، اس کا سفید برفیلا منھ سرخ ہو گیا۔ اور اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے کھُلتی گئیں۔ اس برف کی گڑیا میں جان پڑ گئی، اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پھیلا کر بوڑھی میریا کی طرف دوڑی۔ یہ دیکھ کر میریا کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں ایوان سے پوچھا "کیا یہ سچ ہے، واقعی یہ زندہ ہے۔ میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟"

ننھّی برف بالا نے ماں کہہ کر پکارا، اور اپنا خوبصورت چہرہ میریا کی طرف بڑھا دیا پھر بھی بوڑھے میاں بیوی کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔

دونوں برف بالا کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنی جھونپڑی میں واپس آ گئے، میریا نے اوان سے کہا۔ "اب ہم ہمیشہ خوش رہیں گے۔ آج میں بہت خوش ہوں" اوان نے اس پر آہستہ سے سر ہلا کر جواب دیا! "اس دنیا میں خوشی زیادہ دیر نہیں رہتی"

میریا نے اوان کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا، اور وہ خوشی خوشی برف بالا کے لئے گھر ٹھیک ٹھاک کرنے میں لگ گئی۔

سردیوں بھر اس چھوٹی سی جھونپڑی میں خوشی چھائی رہی، جب بہار کا موسم آیا تو ایک دن سویرے ہی گاؤں کے بچّے اوان کے گھر پہنچے، دروازہ کھٹکھٹانے لگے، وہ برف بالا کو باہر کھیلنے کے لئے بُلانے آئے تھے،

ماں نے دروازہ کھولا، بچّوں کو دیکھ کر برف اپنی ماں کے پیچھے چھُپ گئی، ماں نے اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا "جا بیٹا جاؤ"، باہر بچّوں کے ساتھ کھیلو، پھر بھی برف بالا آگے نہیں آئی، اتنے میں ایک بڑی لڑکی نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا، اور بولی "گھبراؤ نہیں! دیکھو! ہم تمہیں پھولوں کا خوبصورت تاج پہنائیں گے" بچّے برف بالا کو ساتھ لے کر چل پڑے، بوڑھی میریا برف بالا کو بچّوں کے ساتھ جاتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

بچّوں نے جنگل میں پہنچ کر کھیل شروع کر دیا۔ برف بالا بھی سب کے ساتھ بھاگنے دوڑنے لگی۔ کھیلتے کھیلتے ایک بچّی بولی! "آؤ! آگ جلائیں" آگ کا نام سُنتے ہی برف بالا سہم گئی، اور چلّانے لگی

"ہائے آگ! مجھے آگ بالکل پسند نہیں"، مگر بچوں نے
اس کی ایک نہ سنی، اور وہ سب ادھر ادھر سے لکڑیاں
لاکر جمع کرنے لگے، جب لکڑیوں کا ڈھیر ہو گیا تو اس
میں آگ لگا دی گئی۔ آگ کے شعلے بھڑک اٹھے،
بچوں نے خوشی سے تالیاں بجانا شروع کر دیں، اور
ناچنے گانے لگے، ایک بچہ بولا "آؤ گھیرا بنا کر دوڑیں"
برف بالا نے پوچھا! "یہ کیا کھیل ہے؟"
دوسرے نے جواب دیا، "تم ہمارے ساتھ
آؤ، اور جیسا ہم کریں ویسے ہی تم کرتی جاؤ"،
برف بالا سب کے پیچھے چل پڑی، اور
دوسروں کی دیکھا دیکھی اچھل کود مچانے لگی سب نے
آگ کے چاروں طرف دوڑنا شروع کر دیا بچوں
کے شور وغل سے سارا جنگل گونج اٹھا۔ وہ لوگ
آگ کے چاروں طرف ناچ رہے تھے اور مل جل کر
گیت گا رہے تھے۔ آخر میں انھوں نے باری باری
آگ کے اوپر سے پھاندنا شروع کیا؟ ایک، دو
۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سب سے آخر میں
برف بالا نے چھلانگ لگائی۔ اسی وقت ایک تیز
چیخ سنائی دی، اور جنگل میں گم ہو گئی۔ بچوں
نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ برف بالا کا کہیں
پتہ نشان نہیں تھا۔ سب سے بڑی لڑکی نے کہا

"شاید وہ چپکے سے جنگل میں بھاگ گئی ہے، چلو
ڈھونڈھ لائیں۔" یہ کہہ کر وہ جھٹ جنگل کی طرف
دوڑی، اس نے زور زور سے پکارا "برف بالا!
برف بالا!!" مگر برف بالا ہو تو بولے۔ غرضیکہ
اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔

اتنے میں بوڑھی میریا نے اپنی جھونپڑی کے
دروازے سے منھ نکال کر پکارا "برف بالا!
آؤ اب گھر آجاؤ، تمہارا کھانا تیار ہے"
جونہی اس کی نگاہ بچوں کے سہمے ہوئے
چہروں پر پڑی، اس کا ماتھا ٹھنکا، اس نے
گھبرا کر پوچھا: "کیا ہوا! برف بالا کہاں ہے؟
تم نے کیا کر ڈالا؟"

بچوں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا! "ہم آگ
کے اوپر سے پھاند رہے تھے"

یہ سنتے ہی میریا کی جان نکل گئی، اس کا بدن
کانپنے لگا! چیخ کر بولی "ہائے تم نے کیا کیا!
آگ کا کھیل کھیل رہے تھے!!"

بوڑھی میریا نے اپنا منھ دوپٹے سے چھپالیا اور پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگی، دھیرے دھیرے وہ جھونپڑی کی
طرف چل پڑی، دروازے پر ادوان نے اس کو روکا۔ وہ
بولا "میں نہ کہتا تھا اس دنیا میں خوشی زیادہ دنوں نہیں ٹکتی"

قدسیہ زیدی



راشٹرپتی

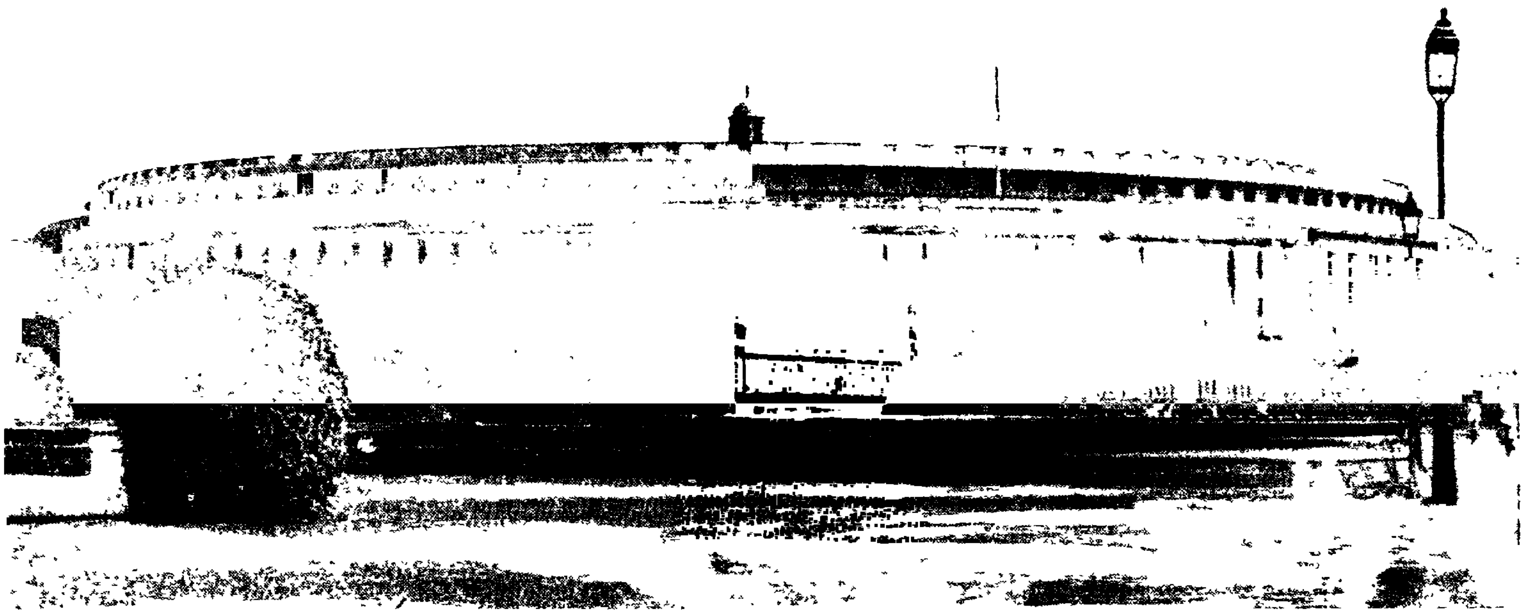
دنیا میں ہر دیش کی اپنی ریت ہوتی ہے۔ رسم و رواج ہوتے ہیں، حکومت کرنے اور رہنے سہنے کے کچھ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ یہ سب ڈھنگ اور طریقے اتفاقیہ نہیں بنتے ہیں بلکہ ملک کے بسنے والوں کے مزاج اور طبیعت کو اس میں بڑا دخل ہوتا ہے اگر کوئی جنگجو اور لڑاکا ملک ہے تو وہ ایک شانتی چاہنے والے ملک سے بالکل مختلف ہوگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہاں حکومت چلانے کے رنگ ڈھنگ بھی بالکل الگ ہوں گے مگر کچھ بنیادی چیزیں ایسی ہیں جو سب ملکوں میں ایک سی ہوتی ہیں۔ مثلاً ہر ایک ملک میں وہاں کی حکومت کا ایک سردار ہوتا ہے جس کے نام سے گورنمنٹ کا کاروبار چلتا ہے۔ بہت سے ملکوں میں سلطنت کے سردار بادشاہ کہلاتے ہیں۔

پرانے زمانے میں بادشاہوں کو پورا پورا اختیار اور ادھیکار ہوتا تھا کہ وہ جس ڈھب سے چاہیں حکومت کریں۔ ان کا ہر حکم قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے حکم چونکہ وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے تھے اس لئے قانون بھی بدلتے رہتے تھے وہ جس کو چاہتے تھے اپنا وزیر یا منتری مقرر کرسکتے تھے اور جب چاہتے انھیں الگ کردیتے ان تمام باتوں میں جنتا کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا



میری ننھی گڑیا کی تصویر کھینچئے

فوٹو سراج انور



دارالپارلیمنٹ ، نئی دہلی
جہاں قوانین بنتے ہیں

ہے۔ مگر آج کل عام طور پر یہ حالت بدل گئی ہے ۔ اکثر دیشوں میں وہاں کے لوگ اپنے نمائندے چنتے ہیں ۔ جو اس دیش کی پارلیمنٹ میں بیٹھ کر قانون بناتے ہیں ۔ اور جب قانون بن جاتے ہیں تو ان کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔ کوئی قانون کسی ایک آدمی کی مرضی سے نہیں بدل سکتا۔

جو لوگ چناؤ کے بعد پارلیمنٹ کے ممبر بنتے ہیں ان کی رائے سے انھیں میں سے کچھ کو وزیر مقرر کر کے کابینہ بنتی ہے اور وہ اس ملک کی حکومت چلاتی ہے۔ بادشاہ یا پریذیڈنٹ اپنی رائے سے کوئی کام نہیں کرتا۔ لیکن پھر بھی وہ ملک کا سب سے بڑا سردار ہوتا ہے اور حکومت اسی کے نام سے چلتی ہے۔

بہت سے ملکوں میں اب بادشاہی کا دستور نہیں رہا۔ بلکہ چند سال کے لئے سلطنت کا ایک سردار چن لیا جاتا ہے جسے عام طور پر پریذیڈنٹ کہتے ہیں۔ بھارت میں بھی اب پریذیڈنٹ چنا جاتا ہے جسے ہم راشٹرپتی کہتے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں یہ طے ہوا کہ بھارت کو ایک ری پبلک بنایا جائے۔ جس کا سردار لوگوں کا اپنا چنا ہوا آدمی ہو۔ ہمارے دیش کے پہلے راشٹرپتی بابو راجندر پرشاد جی بنائے گئے اب پانچ برس تک یہ راشٹرپتی رہیں گے۔ ہر پانچ برس کے بعد راشٹرپتی کا چناؤ ہوگا۔

پارلیمنٹ کے چنے ہوئے ممبروں اور تمام ریاستوں کی اسمبلیوں کے چنے ہوئے ممبروں کی رائے سے راشٹرپتی کا چناؤ ہوتا ہے۔

ہمارا راشٹرپتی ہمارے دیش کا سردار ہے۔ اس کو قانون کے ماتحت بڑے اختیارات ہیں اگر دیش میں کوئی بڑی بدنظمی یا ہل چل ہو تو وہ اپنے اختیارات کا بہت کچھ استعمال کر سکتا ہے لیکن عام طور پر حکومت کے کاروبار کو کابینہ چلاتی ہے اور راشٹرپتی اپنے منتریوں کی رائے کے خلاف نہیں جا سکتے وہ جو کچھ بھی کریں گے تو اپنے وزیروں کے صلاح مشورے سے کریں گے۔

راشٹرپتی وزیروں کو اپنی مرضی سے الگ نہیں کر سکتے۔ وزیروں کی علیحدگی تبھی ہو سکتی ہے جب پارلیمنٹ کے زیادہ ممبر منتریوں کے خلاف رائے دیں۔ بھارت کا سیاسی دستور پارلیمنٹری ہے۔ ہمارے نئی منتری منڈل بنانے اور بگاڑنے کا اختیار صرف پارلیمنٹ کو ہے

اگرچہ راشٹرپتی بھارت کے چھتیس کروڑ

لوگوں کے نمائندے ہیں اور پورے راشٹر کی ایکتا کا نشان ہیں لیکن وہ اس مہر کی طرح ہیں جو قوم کے فیصلوں پر لگ کر ان کی تصدیق کر دیتی ہے۔ مہر خود تو کوئی فیصلہ نہیں کرتی نہ کوئی حکم دیتی ہے۔ لیکن اس مہر کے بغیر فیصلے اور حکم پکے نہیں ہوتے۔ ملک میں جتنے قانون بنتے ہیں وہ راشٹرپتی کی منظوری کے محتاج ہوتے ہیں۔

سارے وزیروں کو راشٹرپتی مقرر کرتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے چناؤ کے بعد لوک سبھا میں جس پارٹی کے ممبر سب سے زیادہ ہوں اس پارٹی کے لیڈر کے مشورے سے راشٹرپتی پرائم منسٹر مقرر کرتے ہیں۔ باقی منتریوں کا تقرر بھی راشٹرپتی ہی کرتے ہیں، لیکن وزیر اعظم کے مشورے سے ہی کرتے۔

اس سے پہلے کہ کوئی وزیر اپنے عہدے کا کام شروع کرے۔ راشٹرپتی اسے عہدے اور رازداری کی سوگند دیتے ہیں۔ پردھان منتری کا فرض ہے کہ بھارت کے انتظام کی بابت کابینہ کے تمام فیصلوں کی راشٹرپتی کو برابر اطلاع دیتے رہیں۔

پارلیمنٹ کی ہر بیٹھک راشٹرپتی کے حکم سے شروع اور ختم ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ۔ سیشن کے شروع میں راشٹرپتی خود تشر لا کر تقریر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی را کو ادھیکار ہے کہ وہ پارلیمنٹ کی بیٹھک وقت چاہیں بلالیں اور انھیں مخاطب کر یا اپنا سندیس بھیجیں۔

راشٹرپتی کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ ک مجرم کو جسے موت کی سزا دی گئی ہو، رحم درخواست پر معاف کر دیں یا اس کی سزا کم کر دیں۔

بھارت کی فوج، سمندری اور ہوائی بیڑے کے سب سے بڑے سردار بھی راشٹرپتی ہوتے ہیں۔

بدیشی ملکوں کے ساتھ بھارت کا سمبندھ اور تعلقات راشٹرپتی کے نام سے ہوتے ہیں۔ جب کوئی ایلچی باہر سے یہاں آتا ہے تو وہ اپنے ملک کے بادشاہ یا پریذیڈنٹ کا خط ہمارے راشٹرپتی کے نام لاتا ہے اور جب تک وہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے کاغذات پیش نہ کر دے اپنا کام شروع نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ہمارا کوئی ایلچی یا راج دوت کسی بدیشی

ملک کو جاتا ہے تو وہ اپنے ساتھ راشٹرپتی کا حط اس ملک کے بادشاہ یا صدر کے نام لے جاتا ہے۔

امریکہ کی ری پبلک میں بھی پریذیڈنٹ کا چناؤ ہوتا ہے لیکن اس کی حیثیت ہمارے راشٹرپتی سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ امریکہ کا پریذیڈنٹ وہاں کی سلطنت کا سردار ہی نہیں ہوتا بلکہ وہاں کی حکومت کا بڑا افسر بھی ہوتا ہے حکومت کے انتظام کا سارا اختیار اس کو ہے۔ امریکہ کا پریذیڈنٹ مختلف محکموں کو چلانے کے لئے اپنے سیکریٹری یا وزیر مقرر کرتا ہے لیکن وہ ان وزیروں کی رائے ماننے پر مجبور نہیں۔ وہ ان کی رائے اور مشورے کے خلاف خود فیصلہ کر سکتا ہے۔ اور جب چاہے وزیروں کو اپنی مرضی سے علیحدہ بھی کر سکتا ہے۔ بھارت کے آئین میں راشٹرپتی کی حیثیت انگلینڈ کے بادشاہ کی سی ہے، جس کے نام سے سارا راج کاج ہوتا ہے۔ لیکن اصل میں تمام اختیارات عوام کے چنے ہوئے نمائندوں یعنی پارلیمنٹ کے ممبروں کو حاصل ہیں۔

راشٹرپتی کے عہدے کے لئے اسی آدمی کا چناؤ ہو سکتا ہے جو بھارت کا رہنے والا ہو اور اپنی عمر کے ۳۵ سال پورے کر چکا ہو اور وہ تمام شرطیں پوری کرتا ہو جو لوک سبھا کے ممبروں کے چناؤ کے لئے لازمی ہیں۔

راشٹرپتی کا تقرر پانچ برس کے لئے ہوتا ہے لیکن ایک ہی آدمی کئی بار بھی اس عہدے کے لئے چنا جا سکتا ہے۔ اپنے چناؤ کے بعد عہدے کا کام سنبھالنے سے پہلے راشٹرپتی کو ہندوستان کے چیف جسٹس کے سامنے یہ عہد کرنا پڑتا ہے کہ میں پریذیڈنٹ کے عہدے کا کام ایمانداری کے ساتھ انجام دوں گا۔ اور جہاں تک بھی بن پڑے گا میں آئین اور قانون کی حفاظت کروں گا۔ اور بھارت کی جنتا کی خدمت اور بہتری کے لئے اپنے کو وقف کر دوں گا۔

ہندوستان میں پناہ گزینوں کی تعداد براعظم آسٹریلیا کی کُل آبادی سے زیادہ ہے۔

میرز

ایک لڑکی کا خط

اپنی ناراض سہیلی کے نام

اے مری پیاری سہیلی! کس لئے تو ہے خفا　　روٹھ جانے کی وجہ کیا ہے مجھے بھی

میں نے کھائی تھی مٹھائی اور تجھ کو دی نہ تھی　　میں سمجھتی ہوں خفا ہونے کا باعث ہے

اور جب میں نے کیا تھا اپنے گڈے کا بیاہ　　تیری گڑیا کو نہ پوچھا تھا یہی ہے کیا

بات یہ ہے کہہ رہی ہوں آج تجھ سے صاف صاف　　تیرے دل کو ٹھیس پہنچی گی مجھے کر دے معاف

تیری "نسرین" ہے وہ کالی بھی ہے موٹی بھی ہے　　اور اس کے ساتھ ہائے کس قدر چھوٹی بھی

میرا گڈا خوبصورت بھی ہے اور پیارا بھی ہے　　مجھ سے گر پوچھو تو میری آنکھ کا تارا بھی

یہ ذرا سی بات تھی جس پر خفا تو ہو گئی　　ہائے کتنی جلد رضیہ کیا سے کیا تو ہو گئی

کر لو بھول جاؤ سب کے سب شکوے گلے　　چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہر گز نہیں اچھے گلے

میں نے رکھی ہے مٹھائی اور پھل تیرے لیے
کیا نہ آئے گی مرے گھر آج تو میرے لیے

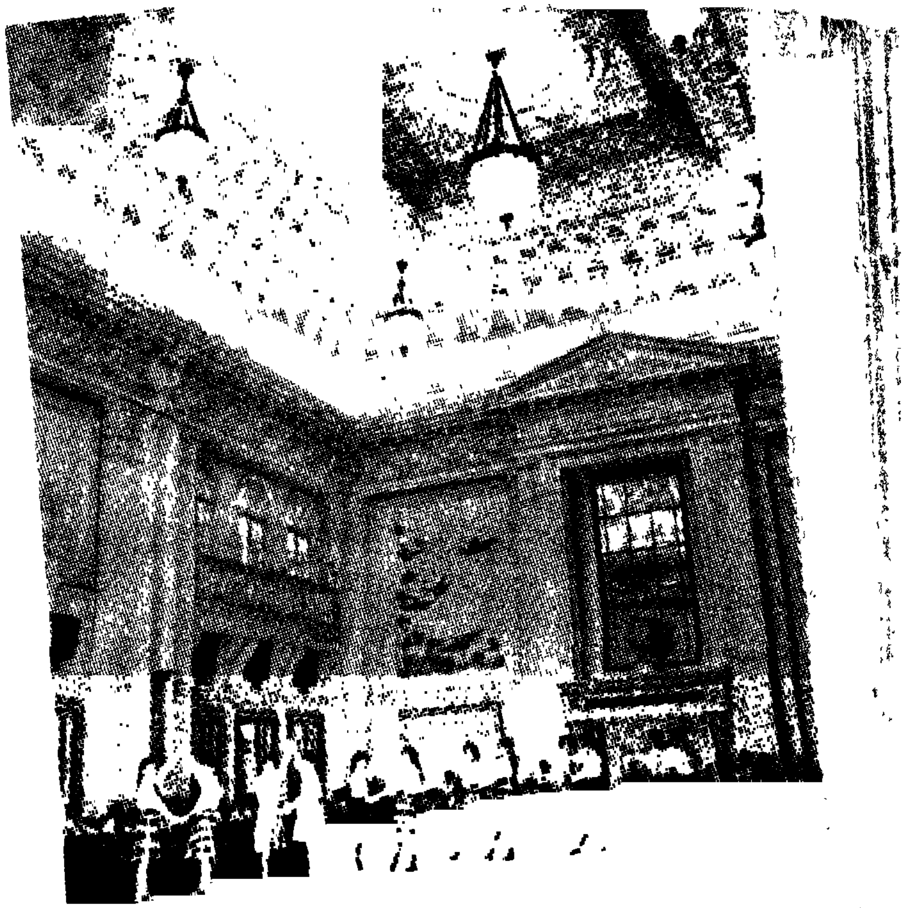
میم ز جبیں

نسرین۔ گڑیا کا نام



چل ممے ڈوڑے تک تک تک

فوٹو سراج از



پیکنگ میں
بچوں کی تفریح کا
ایک منظر



منے ماجے ادنے اسکول میں

بشکریہ چینی سفارت خانہ



چین کا آنکھوں دیکھا حال

ممتاز حسین

چین جانے سے پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ چینی وہی ہے جس کی ناک چپٹی آنکھیں چھوٹی اور گال کی ہڈیاں اُبھری ہوئی ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس طرح کے وہاں اکثر آدمی پائے جاتے ہیں۔ لیکن سب ویسے نہیں ہیں۔ جس طرح ہندوستان میں مختلف شکل و صورت کے لوگ ملتے ہیں ویسے ہی وہاں کے لوگ بھی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں کالے رنگ کے آدمی نہیں پائے جاتے۔ زیادہ تر لوگوں کا رنگ پیلا ہوتا ہے۔ چین کوئی دولت مند دیس نہیں۔ زیادہ تر آدمی کھیتی باڑی کر کے اپنی گزر بسر کرتے ہیں۔ پہلے ان کی دولت پر امریکہ فرانس اور انگلستان کے بیوپاریوں کا قبضہ تھا۔ لیکن اب وہ اپنے مال و دولت پر خود ہی قابض ہیں۔ مگر ہاں باہر کے لوگوں سے بڑے ہوشیار رہتے ہیں۔ البتہ جب ان کو کسی کے بارے میں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ان کے ملک کی دولت لوٹنا نہیں چاہتا تو اس سے وہ بہت ہی پریم اور محبت سے ملتے ہیں۔ ان کے دیس میں ایک مثل مشہور ہے کہ ساری دنیا کے لوگ ایک دل ہیں۔ چنانچہ ان کے قومی ترانے میں اس طرح کا ایک گیت بھی ہے۔ چینیوں کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ وہ افیون یا افیم کھاتے ہیں اور

دُنیا بھر میں جتنی بھی افیون کھائی جاتی ہے وہ سب کی سب چین ہی سے آتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ چینی لوگ بڑے محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں انھوں نے جس محنت سے بارہ سو میل لمبی اور پچاس فٹ چوڑی دیوارِ چین اپنے ملک کی حفاظت کے لئے اُٹھائی تھی۔ اس کے بارے میں تو آپ نے پڑھا ہی ہوگا۔ آپ نے چینی قلیوں کو بوجھ ڈھوتے ہوئے اور کام کرتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا، آپ نے ان کے ہاتھ کے بنے ہوئے کاغذی پھول گلدستے قندیلیں اور کھلونے بھی دیکھے ہوں گے۔ جو لوگ اتنا باریک کام کرسکیں، وہ بھلا افیونی کیونکر ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ افیون کھا کر تو آدمی پینک میں آجاتا ہے۔ اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے بارے میں ہماری یہ اطلاع غلط ہے۔ اور قصہ کسی اور طرح سے ہے۔ آج سے چار اوپر سو سال کا واقعہ ہے کہ انگریز تاجر تجارت کی غرض سے ان کے ملک میں افیون لے گئے۔ کینٹن شہر کے باہر جہاں انھیں ٹھہرنے کی اجازت تھی انھوں نے افیون گھول گھول کر چینیوں کو مفت پلانا شروع کیا۔ اور جب ان لوگوں میں اس کی عادت پڑ گئی تو انھوں نے پھر اس کی باقاعدہ تجارت شروع کردی۔ چین کے بادشاہ کو یہ بات بہت بُری لگی اور پھر انگریزوں اور چینیوں میں بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ چونکہ چینیوں کے پاس توپ نہ تھی وہ ہار گئے۔ ان کا ہارنا تھا کہ انگریزوں کو خوب کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ اور انھوں نے پہلے سے بھی زیادہ افیون بیچنا شروع کردی۔ چین کے لوگ اسی زمانے میں افیون کھانے لگے تھے۔ لیکن سب نہ کھاتے بھلا غریب آدمی کیونکر کھا سکتا ہے۔ اسے تو محنت مزدوری کرنی پڑتی ہے۔ افیون بھی وہی لوگ کھاتے جو بڑے بڑے زمیندار تھے، جن کو سارا دن اونگھنے اور سونے کے سوا اور کوئی دوسرا کام نہ کرنا پڑتا۔ جب سے چین نے آزادی حاصل کی ہے تو انھیں اس چیز سے بھی چھٹکارا مل گیا ہے۔

میں نے چین کے اتنے بہت سے شہر اور وہاں کی اتنی بہت سی چیزیں دیکھی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا کیا بتاؤں۔ لیجئے ایک بات سمجھ میں آئی۔ چین کے سارے بچے چھوٹے بڑے سب اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ ننھے منے بچوں کے لئے نرسری اور

کنڈرگارٹن ہوتا ہے۔ میرا گزر ایک دن پیکنگ کی ایک نرسری میں ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ربڑ کے ولائتی بوؤں اور چینی بچوں میں کچھ بھی فرق نہیں ہے۔ ویسے ہی سُرخ سفید اور گول مٹول۔ یہ بچے بڑے ہو کر کتنا بدل جاتے ہیں اس پر سخت حیرت ہوئی۔

وہیں پیکنگ ہی میں میں نے بچوں کا تھیئٹر بھی دیکھا۔ جس میں ریچھ اور بندر کے کھیل دکھائے جاتے ہیں۔ اس تھیئٹر کا سارا انتظام بچے ہی کرتے ہیں۔ تعلیم بھی پاتے ہیں اور ڈرامے میں اداکاری بھی کرتے ہیں۔ بچوں کے تھیئٹر کا یہ شو، ہر سنیچر اور اتوار کے دن ہوتا ہے اس دن بچوں کا جمگھٹ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ گھنٹوں پہلے سے آتے ہیں تاکہ انھیں تھیئٹر میں اچھی جگہ مل سکے۔

ایک اور مزے کی بات سُنئے۔ چین کے لوگوں نے مچھر مکھی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سب انسان کے دشمن ہیں۔ بیماری اور موت کی وبا پھیلاتے ہیں۔ ایک چینی صاحب سے میں نے پوچھا کہ "بھائی آپ نے یہ مکھیاں اور مچھر کیسے ختم کر دیے۔ ہمارے یہاں تو ایک مارنے پر دس پیدا ہوتے ہیں"۔ انھوں نے جواب دیا کہ جناب یہ اسکول کے بچے جس کے پیچھے پڑ جائیں اس کا صفایا ہی کر دیتے ہیں۔ ماسٹر صاحبان نے سارے چین میں یہ حکم لگا دیا تھا کہ جب تک کہ کوئی طالب علم پانچ مکھیاں نہ مار کر لائے گا اس کی حاضری نہ بنے گی۔ اور جو پانچ مکھیاں مار کر لائے گا اس کو ایک حاضری اور دی جائے گی۔ بس پھر کیا تھا لوگوں نے دس دس مکھیاں مارنا شروع کر دیں کچھ دنوں تک پورے ملک میں یہ ایک عجیب مشغلہ تھا۔ سارا ملک مکھیوں اور مچھروں کے مارنے میں لگا ہوا ہے۔ اس سے متعلق وہاں کے لوگوں نے ایک بڑا دلچسپ واقعہ سُنایا۔

انگلستان کی ایک خاتون نے جب یہ سُنا تو انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ پیکنگ شہر کی ساری مکھیاں مار ڈالی گئیں۔ چنانچہ انھوں نے اسے غلط ثابت کرنے کے لئے پورے شہر کا دورہ کیا۔ بالآخر ترکاریوں کی دوکانوں پر انھیں ایک مکھی مل ہی گئی۔ انھوں نے جھٹ اسے اپنے بٹوے میں چھپا لیا اور بہت ہی فخر کے ساتھ چینی دوستوں کے سامنے اس عجوبے کو

پیش کیا، اس پر وہاں بڑا قہقہہ لگا۔ کیونکہ اس ایک مکھی کا ہونا ہی تو اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ وہاں مکھیاں تھیں جن کو مارا گیا ہے۔ ورنہ یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کبھی مکھیاں تھیں ہی نہیں۔

اسی طرح مجھے ایک شہر میں مچھروں نے بھی بہت ستایا۔ وہاں سب لوگ مچھر دانی استعمال کرتے ہیں۔ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بھائی ایک دو تو پائی ہی جاتیں گی۔ اگر وہ ختم بھی ہو جائیں گی تو ہندوستان سے سفر کر کے چلی جائیں گی۔

اب آپ کو میں چینی مداریوں کا کچھ حال سناؤں گا۔ جس طرح ہمارے یہاں نٹ اور جادوگر پائے جاتے ہیں ویسے ہی چین میں بھی ہیں لیکن ان کے کرتب ہمارے یہاں کے کرتبوں سے زیادہ مشہور ہیں۔ بعض کرتب تو ایسے ہیں کہ اگر روتا ہوا بچہ بھی دیکھے تو ہنس پڑے۔ ان میں سے خاص طور سے میں ایک کرتب کا ذکر کروں گا۔ شنگھائی کے ہوٹل میں ایک دن ہماری ضیافت کے لئے بہت سے مداری بلائے گئے، ایک نے پچاس کبوتر اپنے لبادے سے نکالے تو دوسرے نے اپنی ناک پر چھڑی رکھ کر ایک طشتری کو گھمانا شروع کیا۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت کی چیز تو یہ تھی کہ ایک شخص نے ایک کشتی میں گلاس سلیقے سے رکھے۔ پھر ان گلاسوں کے سر پر ایک دوسری کشتی رکھی۔ اس دوسری کشتی پر چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں چھ انڈے اس طرح رکھے کہ اگر دوسری کشتی ہٹالی جائے تو وہ سیدھے گلاسوں میں آجائیں۔ اب اس پورے دسترخوان کو اس نے ایک چھڑی سے ایک ہاتھ پر بلند کیا اور دوسرے ہاتھ میں ایک دوسری چھڑی لئے رہا۔ جب وہ کشتیاں کافی بلند ہو چکیں تو اس نے دوسری چھڑی سے اس پر ایسا وار کیا کہ دوسری کشتی تیر کی طرح نکل گئی۔ اور وہ سارے انڈے گلاس میں کود پڑے۔

چینی اپنی زندگی کو بنانے سنوارنے میں بھی اسی قسم کے کرتب سے کام لیتے ہیں۔ چین کا ایک مشہور دریا ہے ' یانگسی ۔ اس کی انوکھی ادا یہ رہی ہے کہ یہ اکثر اپنا راستہ بدل دیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس سے بے شمار بستیاں اور کھیت برباد ہو جایا کرتے۔ بتلایا جاتا ہے کہ آج سے چھ سو سال پہلے اس نے ایسا راستہ بدلا کہ ۸۰ ا سو مربع میل کی زمین جھیل میں بدل گئی اور یہ زمین دھان کی کاشت

(بقیہ دیکھئے صفحہ ۹۶ پر)



جب تک یہ دُنیا قائم ہے

سیّد مُنیر الحسن

بات بہت پُرانی ہے اس وقت نہ تو اب جیسی زمین تھی اور نہ آج کل جیسا آسمان۔ اس زمانے میں دُنیا نئی نئی بن رہی تھی اور دھرتی ماتا کی گود میں اس کی نئی اولاد چین کی بنسی بجا رہی تھی۔ ہر طرف سُکھ ہی سُکھ تھا۔ پانی جو ہماری بڑی ضرورت کی چیز ہے اور جسے روزانہ ہم طرح طرح سے استعمال کرتے ہیں، ہمارے بڑے کام کی چیز ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے بنا زندگی نہیں۔ ہاں تو صاحب یہ پانی بھی تو دھرتی ماتا کے پیٹ سے ہی پیدا ہوا تھا۔ اسی لئے تو دھرتی ماتا اپنے اس بیٹے کو کلیجے کا ٹکڑا بنا کے رکھتیں اور اسے ذرا بھی نظر سے اوجھل نہ ہونے دیتیں۔ دھرتی ماتا کی گود میں پانی بھی بے فکر ہو کر اپنا بچپن گذار رہا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ دھرتی ماتا نے اپنی گود کے سب سے زیادہ یعنی تین چوتھائی حصّے میں پانی ہی کو پال رکھا تھا۔ دھرتی ماتا اس کا دھیان بھی خوب رکھتی تھیں اس طرح ان کے اس بیٹے کے دن مہینے اور سال ہنسی خوشی سے گذرتے چلے جا رہے تھے۔

اچانک ایک دن کیا ہوا کہ آسمان پر سورج چمک اُٹھا۔ اس کی چمک دمک اور رنگ روپ کو دیکھ کر سب کی آنکھیں چُندھیا گئیں۔ کسی ایک کی بھی نگاہ اس پر نہ ٹھیر سکی۔ اور جب کسی نے

بھی شبنم اور پنگھڑی میں آ کر اس سے آنکھ ملانے کی کوشش کی وہی اندھا ہو گیا۔ سورج کو جب اپنی اس طاقت اور خوبی کا احساس ہوا تو وہ غرور کے ساتھ دھرتی ماتا کی طرف دیکھ کر کچھ گنگنانے لگا۔ پھر اس نے دھرتی ماتا سے کہا کہ مجھے دیکھو میں تم سے کتنی اونچائی پر ہوں۔ دھرتی ماتا نے اس کی اس بات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ تو باؤلا ہوا ہے ادھر میری گود میں کھیلنے والے پانی کی طرف دیکھ تجھ جیسے ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں سورج اس کے قدموں میں لوٹتے ہیں۔ دھرتی ماتا کی یہ سچی بات سن کر سورج کو بڑا دکھ ہوا۔ اس نے پانی کو بہلانے، پھسلانے اور اپنے پاس آسمان پر بلانے کے لئے اپنی سنہری کرنوں کو بھیجا۔ پانی سورج کی کرنوں کے بہلاوے میں آ کر اور ان کو ایک خوبصورت کھلونا سمجھ کر ان کرنوں کے جال میں پھنس گیا۔ اور اپنی دھرتی ماتا کو اکیلا چھوڑ کر اوپر آسمان پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ سورج نے پانی کو بادل کا رنگ روپ دے کر اپنے پاس اوپر آسمان کی سیر کرنے کے لئے بلا لیا وہاں اس کا ایسا من لگا کہ وہ خوب ادھر ادھر اٹکھیلیاں کرنے لگا اور اس میں اتنا مست ہوا اتنا مست ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔

ادھر جب دھرتی ماتا کو خبر لگی کہ اس کے بیٹے پانی کو سورج نے شرارت سے اپنے جال میں پھانس لیا ہے اور بادل بنا کر اپنے پاس بلا لیا ہے تو وہ بہت بے چین ہوئی۔ اور اس کو سورج کے چنگل سے چھڑانے کے لئے طرح طرح کے جتن کرنے لگی۔ سب سے پہلے اس نے لاتعداد پیڑوں کو جنم دیا اور چاہا کہ اس کا پیارا اور لاڈلا بیٹا ان سبز ہرے بھرے درختوں اور پھولوں سے لدے ہوئے پودوں کو دیکھ کر ان کی ہواؤں کی سنسناہٹ کو سن کر دھرتی ماتا کے پاس دوڑا دوڑا آئے گا۔ لیکن اس کا دل کہاں پسیجنے والا تھا وہ تو بادل بنا ادھر سے ادھر گھومتا پھرتا رہا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر دھرتی ماتا کی بے چینی بہت بڑھ گئی۔ اور پریشان رہنے لگی۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر گھاس پھونس اور پیڑ پودوں کے بھی آنسو (اوس کے قطرے بن کر) نکل آئے لیکن اس پر بھی دھرتی ماتا نے اپنی ہمت نہیں ہاری۔

اس نے سردی کے موسم کو دعوت دی
بی سردی کے آتے ہی دھرتی ماتا کا رواں رواں کانپنے لگا۔ لیکن اس وقت بھی بادل کو اپنی ماتا کا خیال نہیں آیا۔ اب تو دھرتی ماتا کی اداسی بہت ہی بڑھ گئی۔ اس بات کا سب کو ہی بڑا خیال تھا۔ بسنت کے موسم سے بھی چپ چاپ نہ رہا گیا۔ وہ بھی ماتا کو تسلی دینے کے لئے آ پہنچا۔ اور آتے ہی اس نے دھرتی ماتا سے کہا کہ بچّوں کی طبیعت چلبلی ہوتی ہے۔ خوبصورت چیزوں کی طرف وہ خوشی سے لپکتے ہیں۔ اسی خیال کو لے کر بسنت نے ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر پھول کھلائے۔ پھر بھی بادل نہیں لوٹا۔

اس مرتبہ دھرتی ماتا نے گرمی کے موسم کو دعوت دی اور عہد کیا کہ جب تک اس کا شہزادہ پانی جو کہ اب بادل بن گیا ہے لوٹ کر نہیں آ جائے گا اس وقت تک وہ چین سے نہیں بیٹھے گی۔ ادھر دھرتی ماتا کے اٹل ارادے کو دیکھ کر سورج بھی گھبرا اٹھا اور دھرتی ماتا کو ڈرانے اور دھمکانے والا راستہ اختیار کرتے ہوئے اس نے دھرتی ماتا کی گود کے تمام پودوں اور پیڑوں کو جھلسا دیا اور جہاں کہیں ذرا سا پانی بھی نظر آیا اسے بھی بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اور دھرتی ماتا کو اتنا جلایا اتنا جلایا کہ اس کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

مزے کی بات یہ کہ سورج نے دھرتی ماتا کی اس بے چینی کی خبر بادل کو بالکل نہ ہونے دی۔ ہمیشہ اس سے جھوٹ موٹ کی باتیں کر کے اس کے من کو بہلاتا رہا۔ لیکن جب بادل نے دھرتی ماتا کی چھاتی کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا تو اس سے نہ رہا گیا اس وقت کہیں جا کر اسے سورج کی شرارت کا پتہ چلا اور آخر دھرتی ماتا سے ملنے کے لئے پانی بن کر رم جھم برستا ہوا نیچے اتر کر دھرتی ماتا کی گود میں پہنچ گیا۔ جس وقت دنیا بن رہی تھی اس وقت سے اب تک یہی ہوتا چلا آ رہا ہے کہ پانی دھرتی ماتا سے جدا ہو کر سورج کے جال میں پھنس جاتا ہے اور بادل بن جاتا ہے پھر پانی بن کر رم جھم برستا ہوا دھرتی ماتا کی گود میں پہنچ جاتا ہے اس طرح دھرتی ماتا اور بادل کی جدائی اور ملاپ کا یہ چکر چل رہا ہے اور اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک یہ دنیا قائم ہے۔

سید مبارز الدین رفعت



اجنتا اور الورا کے غار

آپ نے پہاڑ تو دیکھے ہوں گے لیکن کسی ایسے پہاڑ کا تصور کیجئے جس کے پیٹ کے اندر اسی پہاڑ سے تراشی ہوئی مورتیاں ہوں اور اس کی شکل غار کی سی ہو، حیدرآباد میں اجنتا اور ایلورا کے غار ایسے ہی ہیں، یہ غار قدرتی نہیں ہیں بلکہ ہمارے اور آپ جیسے انسانوں نے ہی انھیں کاٹ کر بنایا ہے، یہ غار اب سے تقریباً دو ڈیڑھ ہزار برس پرانے ہیں۔ لیکن اتنے پرانے ہونے کے باوجود آج بھی ویسے ہی ہیں جیسے کہ بنے تھے۔

قدرتی مناظر کے لحاظ سے اجنتا کے غار بڑی حسین جگہ پر ہیں۔ ایک طرف قدرتی آبشار ہیں، دوسری طرف داگھرا کا سُریلا نغمہ ہے، یہیں ایک پُرفضا وادی میں یہ غار کاٹ کاٹ کر بنائے گئے ہیں، پہلے پہل تو خود بھکشوؤں نے پہاڑی کو کاٹ کاٹ کر بنائے پھر ان علاقوں کے امیروں، راجاؤں اور مہاراجوں نے اس طرف توجہ کی۔ اس کام کے لئے بہترین فنکار اکٹھا کئے۔ اجنتا کے تمام غار بدھ مت والوں نے ہی بنائے تھے، ان کے بنانے والے مزدور ہی تھے، انہیں اپنے مذہب سے سچی لگن تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دل و جان سے یہ کام کیا۔

اجنتا میں سب سے پرانے غار تو وہ ہیں جو آج سے تقریباً بائیس سو سال پہلے بنائے گئے تھے۔ پھر آخری غار وہ ہیں جو چھٹی صدی علیسوی میں بنے تھے

اس طرح یہ غار تقریباً آٹھ سو سال کے عرصے میں
بنے ہیں۔ معمولی اور چھوٹے غاروں کو تو فن کاروں کی
ایک نسل نے ہی بنایا ہوگا۔ لیکن جو غار بڑے ہیں انہیں
تو کئی نسلوں نے مسلسل کام کرکے بنایا ہوگا۔ یہ غار دو
طرح کے ہیں، ایک تو بھکشوؤں کے رہنے کی جگہیں ہیں
جنہیں "وہار" کہتے ہیں۔ دوسرے ان کی عبادت گاہیں
جنہیں "چیتیا" کہتے ہیں۔

ایک بڑے ہال میں مہاتما بدھ کی ایک بڑی
مورتی رکھی ہے۔ دیواروں پر مہاتما بدھ کے پچھلے
جنموں کی کہانیاں تصویروں کی زبانی بیان کی گئی
ہیں، چھتوں پر نازک بیل بوٹوں کے نقش و
نگار ہیں۔ یہاں ایک استوپا ہے جس میں مہاتما بدھ
کا بال اور ان کی چتا کی راکھ محفوظ ہے، یہیں پر بھکشو
عبادت کیا کرتے تھے، یہ لوگ عبادت کرنے کے ساتھ
ساتھ اپنا یہ کام بھی کرتے جاتے، غاروں میں اندھیرا
تو تھا ہی اس لئے کام میں مشکل پیش آتی، چنانچہ انہوں
نے غاروں کے منہ پر فولاد پر صیقل کئے ہوئے بڑے
بڑے آئینے رکھ دیئے تھے، ان پر سورج کی روشنی
پڑتی اور اس روشنی کا عکس غاروں کے اندر پڑتا۔
صرف یہیں نہیں غار کے اندر اس طرح کے اور آئینے
رکھے جاتے، باہر کے آئینوں کا عکس ان پر پڑتا اور

اس طرح ان کی روشنی میں کام ہوتا، یوں تو مشعل جلاکر
بھی روشنی کی جاسکتی تھی، لیکن مشعل کا دھواں نئی
نئی بنی ہوئی تصویروں پر بیٹھ جاتا، اس لئے انہوں
نے مشعلیں استعمال نہیں کیں۔

اجنتا کی وادی میں تقریباً ایک ہزار برس
تک بڑی پُرسکون زندگی کا راج رہا، بھکشوؤں
کی کئی نسلیں آئیں اور گزر گئیں، اجنتا میں غار بنتے
گئے۔ بعد میں غیر ملکوں سے سیّاح اسے دیکھنے
آتے، مشہور چینی سیّاح ہوئین سانگ ساتویں
صدی میں یہاں بھی آیا تھا اور اس نے اس کی
بڑی تعریف کی۔

زمانہ سدا ایک حال پر نہیں رہتا دھیرے
دھیرے بدھ مت کا اثر کم ہونے لگا اور اس کے
نام لیوا ختم ہوگئے، یہاں تک کہ اجنتا میں بھی کوئی
باقی نہ رہا۔ لوگوں کے دلوں سے بھی آہستہ آہستہ
اس کی یاد مٹ گئی اور سینکڑوں برس تک لوگوں کو
اس کا علم بھی نہ رہا، جب انگریز ہندوستان میں
آئے اور ۱۸۱۹ء میں انگریزوں اور مرہٹوں
کے درمیان اسی اجنتا کے علاقے میں لڑائی چھڑی
تو انگریزی فوج کے سپاہی غاروں والی وادی کو
ایک اچھا قدرتی مورچہ جان کر اس کے اندر اتر گئے

یہاں پہنچے تو انھیں غار کے باہر کا حصّہ نظر آیا۔ یہ غار اب مٹی سے اَٹے پڑے تھے، کچھ سپاہی ان غاروں کے اندر گھس پڑے اندر دیواروں پر تصویریں دیکھ کر اور حیران ہوئے، پھر تو اس کی اطلاع ساری دنیا میں پہنچ گئی اور بڑے بڑے مصوروں نے اس کی تصویریں تیار کیں، ان تصویروں کی لندن اور پیرس میں نمائش ہوئی، اب تو غاروں کو صاف کیا گیا۔ دنیا کے کونے کونے کے لوگ ان کو دیکھنے آتے ہیں۔

ایلورا کے غار بنانے والوں کو اجنتا کے غاروں جیسا دل کش منظر نہ مل سکا۔ تاہم قدرتی مناظر کے لحاظ سے یہ مقام بھی بُرا نہیں ہے، اجنتا میں صرف بُدھ مت کے ماننے والوں ہی کے غار ہیں اور ایلورا میں بُدھ مت کے ساتھ ساتھ شیو اور جین مت کے غار بھی ملتے ہیں، ایلورا میں کل مِلا کر ۳۴ غار ہیں۔

اجنتا میں بُت تراشی، تعمیر اور مصوّری کا کمال دکھایا گیا ہے، ایلورا میں نقشے کی نزاکت، مورتیوں کی بناوٹ کا حُسن ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایلورا کے غار بنانے والوں کے ہاتھ میں پتھر بھی موم بن کر رہ گیا ہے، انھوں نے پتھر کو جیسا چاہا کاٹا، تراشا، بنایا، سنوارا اور اپنے خیالات کی بلندی اس میں شامل کر دی۔ کیلاش کا مندر ایلورا کے غاروں کی جان ہے، یہ مندر راشٹر کے ایک راجا راجا کرشنا کی سرپرستی میں بنا۔ اس کے کسی پُرکھے نے ایک مندر بنایا تھا، راجہ کرشنا کو یہ مندر بہت پسند تھا، اس نے حکم دیا کہ ایسا ہی مندر چٹان کاٹ کر بنایا جائے، اس طرح ایک سالم چٹان کو کاٹ کر اس میں کیلاش کے مندر بنانے میں کوئی دو لاکھ ٹن پتھر کاٹ کر باہر نکالنا پڑا۔

ایلورا کے تمام مندر تین سو (۳۰۰) سال میں بنے ہیں، ایلورا کے غار اجنتا کی طرح لوگوں کی نظروں سے اوجھل تو نہیں ہوئے لیکن ان کی اہمیت ختم ہو گئی تھی، جگہ جگہ مورتیاں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ لیکن اب محکمۂ آثارِ قدیمہ نے ان کی طرف توجّہ دی ہے اور اب اس کی رونق پھر بڑھ گئی ہے۔

اجنتا اور ایلورا کے غاروں کے بارے میں کسی نے سچ کہا ہے کہ "علاء الدین کا چراغ بھی ایسا حیرت انگیز کام نہیں کر سکتا تھا"۔

روشؔ صدیقی

حمدِ خُدا

(سورۃ الفاتحہ کی روشنی میں)

★

آغاز تیرے نام سے
اے کارسازِ دو جہاں
رحمت تری سب سے سوا
تو سب سے بڑھ کر مہرباں

★

سب حمد ہے تیرے لئے اے سب جہانوں کے خُدا
لاریب ہے تو مہرباں سب مہربانوں سے سوا
اے مالکِ رُوزِ جزا
اے مالکِ رُوزِ جزا

کرتے ہیں تیری بندگی، کوئی نہیں تیرے سوا
لیتے ہیں تجھ سے ہی مدد، تیرے سوا کیا آسرا
ہم کو دکھا راہِ ہدیٰ
ہم کو دکھا راہِ ہدیٰ
اُن اہلِ حق کا راستہ، جن پر ترا انعام تھا
وہ باوفا، وہ باصفا، مردانِ تسلیم و رضا
اُن بندگانِ خاص کا
یارب ہمیں رستہ دکھا

★

جن منکروں پر اے خُدا تیرا غضب نازل ہوا
بھٹکے جو تیری راہ سے، رکھنا ہمیں اُن سے جُدا
ہم کو دکھا راہِ ہُدیٰ
اے سب جہانوں کے خدا!
دائم رحیم و مہرباں
سب مہربانوں سے سوا

الیاس مجیبی



شاہ چور

دو ہزار سال سے بھی زیادہ بیت چکے، بھارت میں ایک راجا تھے، بہت ہی بڑے بڑے بھاگوان، بڑے دیالو۔ آج تک ان کا نام ہے۔ وہ پرجا کی دیکھ ریکھ اور چھوٹے بڑے کے سکھ چین کے پیچھے اپنی تکلیف کی پرواہ نہ کرتے، دن رات پرجا کی سیوا میں لگے رہتے۔ اور بھئی دل تو اُن کا اتنا بڑا تھا اتنا بڑا کہ دوست دشمن کی خوشی کے لئے دھن دولت پانی کی طرح بہاتے رہتے اور انمول سے انمول چیز دوسرے کی خاطر خوشی کے لئے دے ڈالتے۔ ایک تو اُن کے ایسے دیا مان راجا کے راج میں دُکھی تھا ہی کون اور جو کہیں یوں ہی کسی کے لکھے کی بات اس کے آگے آ ہی جاتی راجا جی تڑپ جاتے، ہزار جتن کرتے، اُسے وہ سُکھ پہنچاتے رہتے کہ پھر وہ جب تک جیتا راجا ہی کے گیت گایا کرتا۔ اور صاحب ایک نرالی بات اُن میں یہ تھی کہ ایسی ویسی کوئی بات ہوا چاہتی یا کسی کے دل میں بدی سماتی، اُنھیں آپ سے آپ پتہ چل جاتا۔ کسی کروٹ اُنھیں چین نہ آتا۔ روک تھام کے لئے اُسی دم کھڑے ہو جاتے۔ تو بھئی ہمارے دیس میں ایسے ایسے راجا ہوئے ہیں، تبھی تو آج

تک اُن کے گُن گائے جا رہے ہیں۔ سچ ہے اِس آنی جانی دُنیا میں کیا رہا ہے، کیا رہ جائے گا۔ بس ایک ہی دولت، ایک ہی مایا ہے جسے کوئی مٹا نہیں پایا ہے۔ اور وہ ہے نیکی اور شرافت۔ جیسے دو اور دو چار، ٹھیک اسی طرح سانچ کو آنچ نہیں۔ اُنہوں نے جو کیا اس کا اُنہیں بھرپور پھل ملا کہ پورے دیس میں گویا سونا برستا، دودھ گھی بہا بہا پھرتا۔ اور دُکھی تو کوئی رہتا ہی نہ تھا۔

آپ جانتے ہیں بھلا، ان کا نام کیا تھا؟ بھئی، اُن کا نام تھا مہاراجا بِکرماجیت (بِکرم اجیت)۔ تو صاحب خدا آپ کا بھلا کرے راجا جی ایک رات آرام سے بچھونوں کی سیج پہ لیٹے بے سُدھ سو رہے تھے کہ خبر نہیں کیا بات ہوئی کہ ایکا ایکی ہڑبڑا کے جاگ اٹھے، پھر نہ جانے کیا سوچا کیا نہیں کہ لنگوٹ کس، ڈھال تلوار لگا، راج محل سے باہر نکل شہر کی گلی گلی گھومتے پھرے، پھرتے پھرتے ایک جگہ ایسا کچھ لگا جیسے کوئی چپکے چپکے باتیں کرتا ہے، آگے جو بڑھے تو پتہ چلا چار چور کہیں چوری کرنے کی گھات میں ہیں۔ انہیں جو اُن چوروں نے دیکھا تو چوکنے ہو کر پوچھا، کون؟

"جو تم وہ ہم" راجا جی نے کہا۔

"واہ رے میرے یار" ایک چور آگے بڑھ کر بولا، "لاؤ ہاتھ"! پھر سب نے کہا" تو آؤ پھر، چلیں۔ چلتے چلتے ایک جگہ آ کر رکے۔ ایک نے کہا" بھئی پہلے ہر ایک اپنا اپنا گُن اور ہنر بتائے کہ بپتا پڑے پر کام آئے"! ایک چور بولا" میں اچھی بری گھڑی پہچانتا ہوں، ایسی گھڑی بتاؤں کہ جو کوئی گھر سے نکلے تو خالی ہاتھ نہیں مالا مال ہو کر پلٹے"! دوسرا کہنے لگا "میں جانوروں کی بولی جانتا ہوں" تیسرے نے بتایا" میں جس گھر میں چاہوں بے دھڑک گھس جاؤں، سب کچھ دیکھوں پہ مجھے کوئی نہ دیکھ پائے اور جو چاہوں لے کر چلتا بنوں"! چوتھا کیا کہتا ہے کہ مجھے وہ بدیا یاد ہے کہ چاہے جیسا کوئی مارے پیٹے پر میرا کچھ نہ بگڑے! اِس پہ سبھی تو ہنس پڑے، بولے، واہ بے چکنے گھڑے!

چاروں اپنی اپنی کہہ چکے تو راجا جی سے پوچھا" کہو استاد! تم بھی کچھ ڈالو، بھلا

تم کون سی ودّیا جانتے ہو؟" راجا جی ہم نے بتایا کہ "جہاں دھن مال گڑا ہو، میں وہ جگہ بتا سکتا ہوں"

واہ بھئی واہ، چاروں چور خوش ہو گئے، کہنے لگے استاد تمھیں سب سے بڑھ کر ہے اچھا تو اب دیر کیا ہے، چلو، ایسی کوئی جگہ چل کر بتاؤ۔ بس تو راجا جی آگے آگے اور چاروں چور پیچھے پیچھے۔ چلا چل، چلا چل، خاص راج محل کے بائیں باغ میں آکر رُکے بعد میں ایک جگہ بتائی کہ یہاں بے گنتی مایا دبی پڑی ہے۔ اب جو کھدائی ہونے لگی تو سچ مچ ایک موٹی سی لیکن ستھری سی چٹان، اُسے ترکیب سے ہٹایا تو ایک زینہ دکھائی دیا! اُس میں جو اُترے تو مت پوچھئے، سونے، چاندی اور جواہرات کے ڈھیر کے ڈھیر لگے تھے! چوروں کی آنکھیں پھٹ گئیں، اس سے پہلے اتنا مال اُنھوں نے کہاں دیکھا تھا۔ جتنا لاد پائے گٹھڑیاں باندھ باندھ اور سروں پر لاد کر چلے۔ چلے ہی تھے کہ گیدڑ کے بولنے کی آواز آئی۔ دوسرا چور جو تھا کہنے لگا، "دیکھنا یارو، تھم جاؤ۔ راجہ جی تو چپ ہی رہے باقی تینوں چور ایک ساتھ بولے "کیوں بے کیا بات ہے جو تھم جائیں، سویرا تو ہوا چاہتا ہے، کیا پکڑوائے گا کہیں؟" ٹوکنے والے چور نے کہا "بھیا! گیدڑ یوں پکار پکار کہہ رہا ہے کہ یہ مال نہیں کورا جنجال ہے۔ تو بھئی ایسا نہ ہو جو ہم پکڑے جائیں اور مال بھی گنوائیں" چوروں کے سروں پر تو بپتا منڈلا ہی رہی تھی اُن کی سمجھ میں کیا آتی، ایک اُن میں سے جل کر بولا "بس رہنے دے اپنی ودّیا، ایسے جوتے تو ہم میں آکر نہ ملتے۔ بھلا بتلاؤ ہاتھ لگی لچھمی جی کو چھوڑ دینا کس نے بتایا ہے۔

خیر بھئی، لدے پھندے آگے بڑھے، راجا کے دھوبی کا گھر پڑا۔ ایک چور کہنے لگا بھئی اچھی جگہ آکر نکلے، راجا کے دھوبی کے گھر سے کچھ نہ اُڑایا تو مزا ہی کیا۔ بس تو چاروں کے چاروں، گھر میں گھس گئے، بڑھیا بڑھیا کپڑے سمیٹنے لگے اور اس میں ایسے کھوئے کہ اپنے پانچویں ساتھی کی سدھ ہی نہ رہی۔ راجا جی نے سوچا ایسے ہی میں یہاں سے ٹل جانا ٹھیک ہے؛ نہیں تو کیا ہوا جو اُن کے ساتھ ہم بھی پکڑے جائیں۔ بس تو راجا جی چوروں کی چوری میں کھویا ہوا دیکھ چپکے

سے چل دئے اور چور جو تھے وہ گٹھریاں سنبھال کر چلتے بنے۔

سویرا ہوا، دن چڑھتے چڑھتے سارے میں ہلڑ مچا کہ راج محل میں بھاری چوری ہوگئی جو سنتا دانتوں تلے انگلی دبا کے رہ جاتا کہ بھئی کمال ہوگیا کہ اس سے پہلے کبھی سنا بھی نہ تھا۔ سارے میں کھلبلی پڑی شہر کوتوال نے ہر ناکے پہ چوکی پہرا بٹھا دیا۔ اب کس کی مجال تھی کہ بے جانچ پڑتال کے باہر نکل جائے۔ پھر بڑے بڑے جاسوس اِدھر اُدھر کھوج لگاتے پھرے جب اتنے جوڑ جتن ہو ہوا لئے تو بھلا چور کیوں نہ پکڑے جاتے۔

اب جو راجا جی کے سامنے وہ چور لائے گئے تو چاروں کے چاروں گھور گھور کے راجا جی کو دیکھ دیکھ رہ جاتے، کہہ کچھ نہ پاتے، دل ہی دل میں سوچتے کہ ہمارا پانچواں ساتھی ٹھیک راجا ہی جیسا تھا، جو دھوبی کے گھر سے چلتا بنا اور اُس نے اپنا حصہ تک نہ لیا۔ راجا جی پہچان ہی گئے کہ چور کیا سوچ رہے ہیں راجا جی نے ڈانٹا کہ دیکھتے کیا ہو اور کیا سوچتے ہو؟ اپنا بھلا چاہو تو ٹھیک ٹھیک بتاؤ کیا ماجرا ہے اور مال کہاں چھپایا ہے

چوروں نے پوری کہانی کہہ سنائی اور بتایا کہ مہاراج! ہمارے ساتھ ایک چور اور بھی تھا، جو دھوبی کے گھر سے کہیں چل دیا اور اس نے اپنا حصہ تک نہ بٹوایا۔

تو اُسے بھی بتاؤ وہ کہاں ہے؟ راجا جی نے کہا۔

یہ جو سُنا تو بھئی تین چور تو چُپ رہے اُنھیں بولنے کی ہمت نہ پڑی، مگر چوتھا جو تھا، وہ بہت نڈر نکلا، کیا کہتا ہے کہ مہاراج! آپ جو چاہے سو کیجئے، مار دیجئے کاٹیئے یا پھانسی پہ چڑھا دیجئے پر سچی بات یہ ہے کہ ابھی تو آپ ہمارے راجا ہیں، پر کل رات ہمارے ساتھی پانچویں چور آپ ہی تھے!

راجا جی ہنس پڑے، پھر کہا اچھا بھئی ہم نے تمھیں چھوڑا، اور وہ مال بھی تم کو دیا، بلکہ اُس سے دونا اور ملے گا تمھیں۔ سچ مچ اُس مال کے سوا بہت کچھ راجا جی نے اُنھیں دیا اور اُنے بھی اپنی بات نباہ دی کہ پھر جیتے جی چوری چکاری کے پاس نہ پھٹکے۔

/// /// /// /// /// /// ///

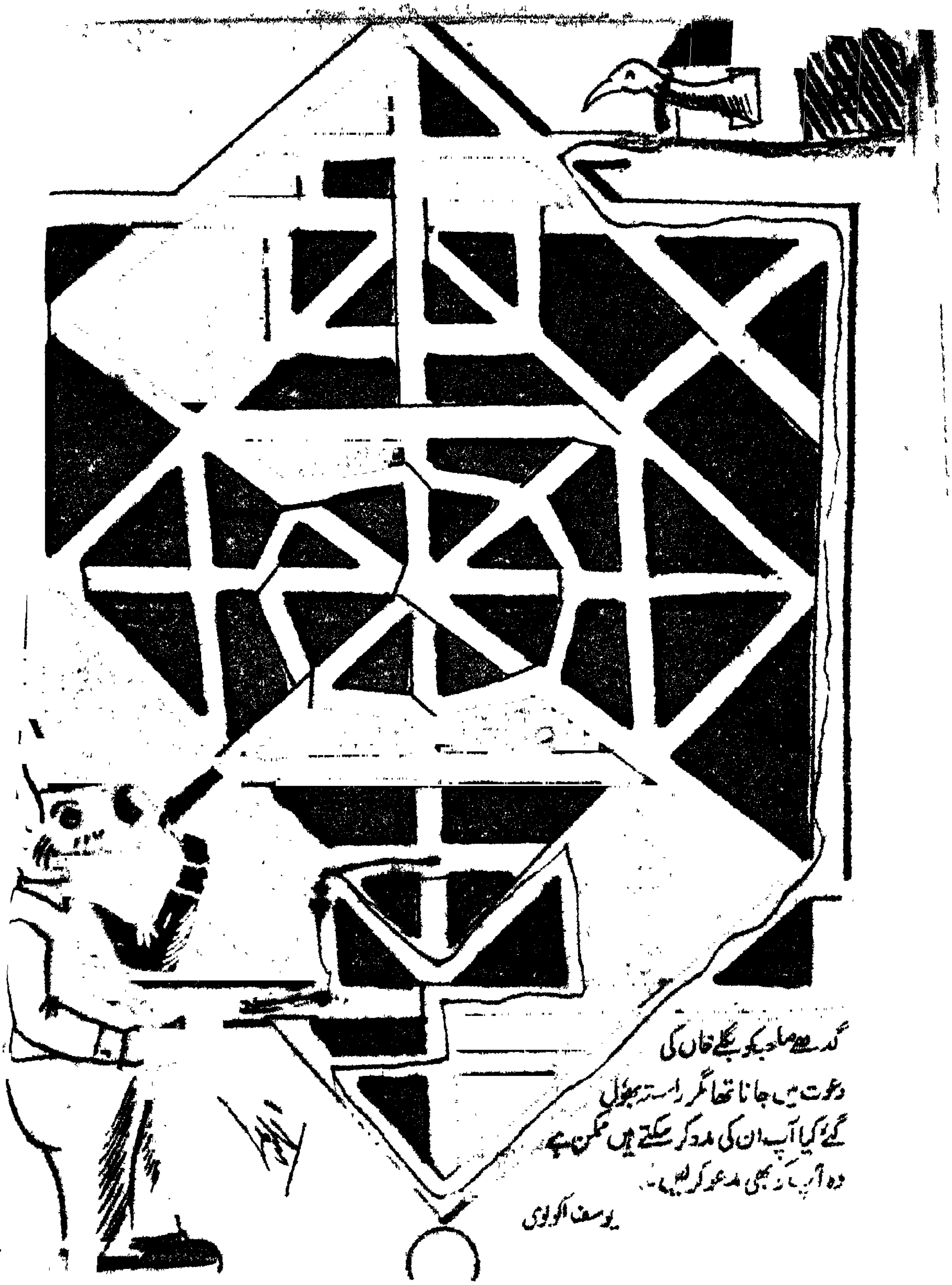
چاند

از

حامد اللہ افسر



دیکھو چاند اُبھرتا آیا   چھم چھم چھم چھم کرتا آیا
بادل میں سے گزرتا آیا
مُنہ دھو دھو کے نکھرتا آیا
پھر کچھ اور سنورتا آیا
دیکھو چاند اُبھرتا آیا   چھم چھم چھم چھم کرتا آیا
رات کا مُنہ تھا کالا کالا
چاند نے نور کا آنچل ڈالا
کردیا چاروں سمت اُجالا
دیکھو چاند اُبھرتا آیا   چھم چھم چھم چھم کرتا آیا
ہر شے کو چمکانے والا
کلیوں پر منڈلانے والا
پھولوں کو شرمانے والا
دیکھو چاند اُبھرتا آیا   چھم چھم چھم چھم کرتا آیا
تاگے سے لٹکانے والا
دل کو سب کے لُبھانے والا
راحت سی برسانے والا
دیکھو چاند اُبھرتا آیا   چھم چھم چھم چھم کرتا آیا


گدھے صاحب کو بگلے خاں کی
دعوت میں جانا تھا مگر راستہ بھول
گئے کیا آپ ان کی مدد کر سکتے ہیں ممکن ہے
وہ آپ کو بھی مدعو کر لیں۔
یوسف اکوی

محمد انس ایم اے علیگ



ہماری زمین ہمارا گھر

یقین تو نہیں ہوتا پھر بھی یہ بات ہے بالکل سچ ——

کہ اگر ہماری دُنیا میں بسنے والے ہر انسان کا قد نہ صرف چھ فٹ ہو بلکہ ہر آدمی کافی موٹا تازہ بھی ہو تب بھی دُنیا کی تمام آبادی — یعنی ۵ ارب انسان — ایک ایسے صندوق میں بند کئے جا سکتے ہیں جو آدھ میل لمبا آدھ میل چوڑا اور آدھ میل اونچا ہو دُنیا کی ساری کی ساری آبادی ایک صندوق میں! میں نے عرض تو کیا کہ بات یقین کرنے کی نہیں ہے، لیکن اگر آپ حساب لگائیں تو آپ کو خود ہی یقین آ جائے گا۔

اگر ہم کسی طرح اس صندوق کو اُٹھا کر کسی پہاڑ کی چوٹی پہ لے جائیں اور اسے وہاں سے کسی کھڈ میں لڑھکا دیں تو کیا ہوگا؟

اڑاڑا — ڑا دھڑام — پھر خاموشی اور سناٹا —

اس صندوق میں ٹھنسے ہوئے سب کے سب

انسان موت کے گھاٹ اتر جائیں گے ۔ مگر ہوا اور آندھی اور دھوپ اور بارش کا دنیا میں اسی طرح راج رہے گا اور زمین اپنے راستے پر چکر کھاتی رہے گی ۔ کوئی سو سال گذرنے پر اس جگہ جہاں تمام انسانوں کی قبر ہوگی ۔ گھنے جنگل اگ آئیں گے اور آدمی کا نام و نشان بھی مٹ جائے گا ۔

آپ کو یہ کہانی اچھی نہیں لگ رہی ہوگی بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ دنیا سے انسان کا نام و نشان بھی مٹ جائے ۔

مگر اسی بات کو دوسرے ڈھنگ سے سوچئے ۔ بھئی یہ تو بہت فخر کی بات ہے ۔ ہم انسانوں کی تعداد کتنی ہی کم سہی اور ہمارے جسم کتنے ہی کمزور سہی پھر بھی ہم دنیا میں کتنے بڑے بڑے کام کرتے ہیں ۔

جس روز سے ہم نے دنیا میں قدم رکھا اسی دن سے ہم اپنے اردگرد ایسے جانوروں کے جھنڈ اور ٹولیاں پاتے ہیں جو زندگی کی بھاگ دوڑ اور چھینا جھپٹی میں ہم سے کہیں تیز ہیں ۔ شروع شروع میں انسان کو ایسے جانوروں سے بھی سابقہ پڑا جو سو سو فیٹ لمبے اور وزن میں چھوٹے موٹے انجن کے برابر تھے ۔ بعض جانوروں کے دانت اتنے تیز تھے جیسے آرا ۔ اس زمانے میں ایک طرف تو زبردست اور خونخوار جانور بڑی شان و شوکت سے گھومتے پھرتے تھے اور دوسری طرف وہ ننھے منے کیڑے تھے جو خوردبین کے بغیر نظر بھی نہیں آسکتے مگر ان کی تعداد اتنی تیزی سے بڑھ رہی تھی کہ اگر انھیں اپنے دشمنوں کا مقابلہ نہ کرنا پڑتا تو ایک ہی سال کے عرصے میں وہ تمام روئے زمین پر چھا جاتے ۔ لیکن وہ جتنی تیزی سے پیدا ہوتے رہے اتنی ہی تیزی سے ان کے دشمن انھیں فنا بھی کرتے رہے ۔

آدمی صرف انہی جگہوں پر زندہ رہ سکتا ہے جہاں حالات موافق تھے ۔ وہ مجبور تھا کہ اونچے اونچے پہاڑوں اور گہرے سمندروں کو چھوڑ کر چھوٹے موٹے خشک میدانوں میں گھر بنائے لیکن اس کی ہمت بلند تھی اور اس ہمت کے آگے پہاڑوں کی اونچائی اور سمندروں کی گہرائی کوئی چیز نہیں تھی اس نے ناموافق حالات میں بھی زندہ رہنے کا گُر سیکھ لیا ۔

کیا آپ صرف پٹرول پی پی کر زندہ رہ سکتے ہیں ؟ کیا فرمایا آپ نے ؟ "لاحول ولا قوۃ ؟" ہاں صاحب لاحول ولا قوۃ ۔۔۔ لیکن آپ کو معلوم

ہونا چاہیئے کہ بہت سے ایسے کیڑے ہیں جو چڑ دل میں زندہ رہ سکتے ہیں۔ موسم تبدیل ہوتا ہے تو ہم آپ گرمی یا سردی سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ لیکن بہت سے کیڑے اس درجۂ حرارت میں بھی زندہ رہتے ہیں جسے ہم آپ چند منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ نے وہ کیڑا دیکھا ہوگا۔ جو کتابوں کا بہت شوقین ہوتا ہے۔ کتابیں پڑھنے کا نہیں بلکہ کتابیں چاٹنے کا شوقین ——— جی، میرا مطلب ہے دیمک۔ آپ کسی دیمک کی ٹانگیں توڑ دیجئے پھر بھی وہ اپنے کام میں برابر لگی رہے گی۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود انسان نے تمام جانوروں کیڑوں، مکوڑوں اور درندوں کا مقابلہ کیا اور آخر کار ان سب سے بازی لے گیا۔

جب شروع شروع میں انسان نے اپنے دو پچھلے پیروں پر چلنے کی کوشش کی ہوگی تو جنگل کے دوسرے جانور اس کی اس حرکت پر بہت ہنسے ہوں گے۔

[illegible] زبردست اور قوی ہیکل جانور جن کی کسی زمانے میں دنیا میں حکومت تھی کیا ہوئے؟ ان میں سے بہت سے تو ختم ہو گئے اور صرف چند ایسے ہیں جن کی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کو ہم نے اپنے عجائب خانوں میں جگہ دے دی ہے۔

بہت سے ایسے ہیں جن کو ہم دانہ پانی دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں وہ ہمیں چمڑا انڈا دودھ کھی اون یا گوشت دیتے ہیں یا پھر ہمارے لئے بوجھ ڈھوتے ہیں اور سواری کے کام آتے ہیں۔

غرض یہ کہ دو ہزار صدیوں کے مختصر سے عرصے میں انسان زمین کے ہر ہر چپے کا مالک بن بیٹھا ہے اور صرف زمین ہی نہیں بلکہ ہوا اور سمندر پر بھی اس کا قبضہ ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ سب کچھ اس کمزور انسان کا کارنامہ ہے جس کے پاس اپنے زبردست دشمنوں کے مقابلے میں "عقل" کے علاوہ اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

اس کی عقل نے اسے فتح یاب کیا، اسے کام کرنا سکھایا۔ ترقی کی نئی نئی راہیں نکالیں۔ یہاں تک کہ پچھلے چار ہزار سال میں جو ترقی ہوئی ہے اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ ترقی کے میدان کا کوئی اور چھور نہیں ہے۔

زمین اور زمین کی دولتیں انسان کے قبضے میں دے دی گئی ہیں۔ جہاں کہیں وہ اس دولت کو اپنے قبضے میں نہیں پاتا وہاں وہ اپنے دماغ اور بازو سے کام لے کر اس دولت کو حاصل کر لیتا ہے۔

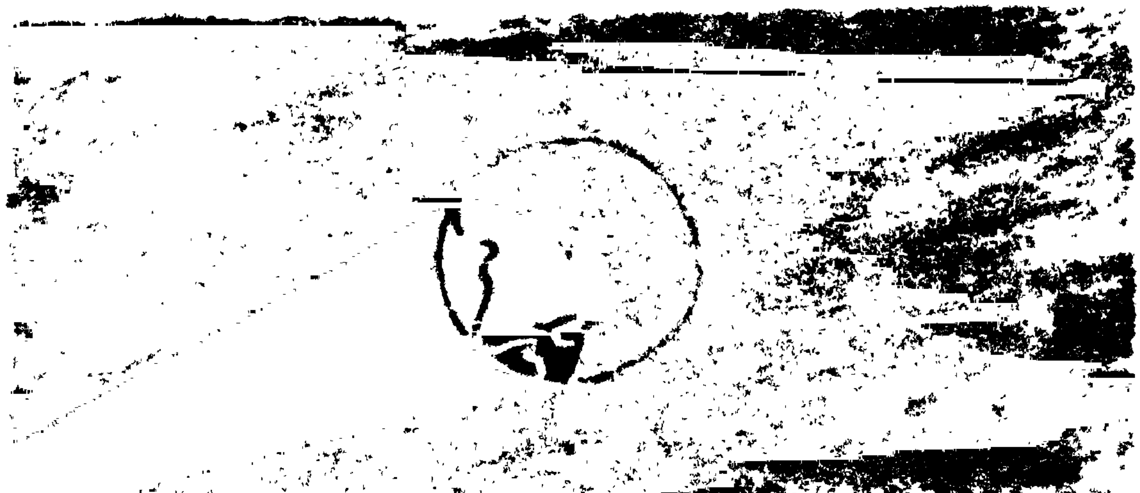
ہماری زمین ہمارا گھر ہے۔ بہت ہی عمدہ گھر۔ یہ ہمارے لئے غلہ پیدا کرتی ہے اس کے سینے میں طرح

طرح کی دھاتیں کوئلہ اور تیل چھپا ہوا ہے۔ اس کی سطح پر جا بجا جنگل ہیں جن سے ہم لکڑی حاصل کرتے ہیں۔ کپاس اور پٹ سن کے کھیت اور بھیڑوں کے گلّے اور شہتوت کے درختوں پر پلنے والے ننھے ننھے ریشم کے کیڑے ہمارے لئے لباس مہیّا کرتے ہیں تاکہ ہم اپنے جسم گرمی اور سردی سے محفوظ رکھ سکیں۔ ہماری زمین بہت پیاری ہے وہ ہمارے لئے اتنی چیزیں پیدا کرتی ہے۔

قدرت ہمیں کچھ خزانے دیتی ہے لیکن قدرت کو ہم کبھی کبھی ناراض بھی کر لیتے ہیں۔ تمام حیوانوں میں انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو ٹولیاں اور گروہ بنا کر آپس ہی میں لڑتا ہے۔ کتا کتے کو نہیں کھاتا، چیتا چیتے کو نہیں کھاتا۔ بن مانس جیسا کمینہ جانور بھی اپنے بھائی بندوں کے ساتھ امن، صلح سے رہتا ہے تو پھر آدمی کیوں نہ آدمیوں سے محبت کرے۔

دُنیا کے ملکوں کی آپس کی دشمنی کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آج کل دُنیا میں بہت سے لوگ تیسری جنگِ عظیم کی تیاری کر رہے ہیں اور ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور طرح طرح کے خوفناک ہتھیار تیار کر رہے ہیں۔ اگر کہیں جنگ چھڑ گئی اور یہ ہتھیار استعمال ہو گئے تو دُنیا کے پردے سے انسان کا صفایا ہو جائے گا نہ دوست رہیں گے اور نہ دشمن۔

ہم دُنیا پر بسنے والے انسان آج ایک اندھیری گلی میں پھنسے ہوئے ہیں اور سامنے ایک بھیانک جنگ کا خطرہ ہے ——— مگر اس اندھیری گلی سے نکلنے کا ایک راستہ موجود ہے۔



(بقیہ دیکھئے صفحہ ۱۱۰ پر)

مجیب احمد خاں



باغ لگائیں
پھول کھلائیں

ایک آدمی نے کسی تجربہ کار اور عقلمند آدمی سے دریافت کیا کہ دنیا میں وہ کون سی چیز ہے جسے سب ہی لوگ پسند کرتے ہیں اور جسے دیکھ کر ہر شخص خواہ غریب ہو یا امیر، عورت ہو یا مرد، بوڑھا ہو یا بچہ خوش ہو جاتا ہے۔ عقلمند آدمی نے جواب دیا۔ وہ چیز پھول ہے، جواب بالکل صحیح اور معقول ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں شاید ایک آدمی بھی ایسا نہ ملے گا جس کو پھول، پھل اور پودے اچھے نہ لگتے ہوں۔ وہ لوگ جن کے پاس پیسہ اور زمین ہے پھولوں اور پھلوں کے بڑے بڑے باغ اور باغیچے لگواتے ہیں، ایسے لوگ جن کے پاس جگہ یا پیسے کی کمی ہے اپنے گھروں کے اندر چھوٹی چھوٹی کیاریوں اور گملوں میں پھولوں کے پودے لگا کر باغبانی کے شوق کو پورا کرتے ہیں۔ پودوں کو زمین سے ابھرتا ہوا، بڑھتا ہوا اور پھر ان میں پھول اور پھل لگتے ہوئے دیکھ کر انسان کو زندگی بڑھا وا دینے کی سچی خوشی حاصل ہوتی ہے اور بڑی بات تو یہ ہے کہ دنیا کو خوشنما بنانے میں اس کو اپنا حصہ بھی نظر آتا ہے۔

پھولوں اور پھلوں کی ان کیاریوں کی تیاری اور دیکھ بھال پر زیادہ وقت بھی صرف نہیں ہوتا، زیادہ پیسے بھی خرچ نہیں ہوتے، اگر آپ چاہیں تو ذرا سی محنت اور پیسوں سے اپنے گھر میں ایک ننھا منا باغیچہ لگا سکتے ہیں۔

پودوں کے لئے سب سے ضروری چیز ہے زمین یا مٹی۔ دوسری چیز پانی اور تیسری چیز دھوپ اور روشنی ہے، کیاریوں کا انتخاب کرتے وقت یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ وہ ایسی جگہ پر ہوں جہاں دن کے بیشتر حصے میں دھوپ رہتی ہو، اس کے علاوہ اس جگہ پر کسی بڑے پیڑ یا عمارت کا سایہ بھی نہ پڑتا ہو۔

مٹی عام طور پر تین قسم کی ہوتی ہے۔ بھربھری چکنی اور ریتیلی۔ پودوں کے لئے بھربھری مٹی سب سے اچھی رہتی ہے، اگر آپ کے گھر کی مٹی بھربھری نہیں ہے تو جس جگہ پر آپ کیاریاں بنانا چاہتے ہیں وہاں کی کم از کم ایک فٹ گہری مٹی اٹھا کر پھنکوا دیجئے اور اس جگہ بھربھری مٹی بھروا دیجئے، اگر پہلے ہی سے بھربھری زمین موجود ہے تو اسے ایک فٹ کی گہرائی تک خوب اچھی طرح کھود ڈالئے اور ڈھیلے توڑ کر تمام مٹی کو خوب باریک کر دیجئے۔

چھوٹے بچوں کی طرح پودوں کو بھی اچھی اور طاقتور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، ان کی خوراک ہے کھاد، کھاد دو طرح کی ہوتی ہے، ایک تو وہ جو کوڑا کرکٹ اور گھاس پھوس کے سڑنے سے بنتی ہے اور دوسری مشینی کھاد بازار میں ملتی ہے، ان میں سے جس قسم کی کھاد بھی آپ کو آسانی سے مل جائے وہ آپ اپنی کیاریوں کی مٹی میں خوب اچھی طرح ملا دیجئے اور پھر اس کیاری میں خوب اچھی طرح پانی دیجئے۔ اس طرح آپ کی دی ہوئی کھاد پانی میں حل ہو کر مٹی میں خوب اچھی طرح مل جائے گی، چار پانچ دن کے بعد جب کیاری خشک ہو جائے تو ایک مرتبہ پھر اس کو پھاوڑے سے خوب گہرا کھود لینا چاہئے اور مٹی کو توڑ کر باریک کر لینا چاہئے۔ اب آپ کی کیاری بالکل تیار ہے۔ اس کیاری کو اب آپ اتنے حصوں میں بانٹ دیجئے جتنے قسم کے پھول آپ لگانا چاہتے ہیں۔

پھولوں کے پودے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ پودے جو تمام سال رہتے ہیں اور ہمیشہ پھول دیتے رہتے ہیں، دوسرے موسمی پھولوں کے پودے، اس لئے بیج بونے سے پہلے اس میں یہ بھی دیکھ لینا چاہئے کہ ہمارے پاس ایسی کتنی زمین ہے جس میں تمام سال رہنے والے پودے لگائیں اور ایسی کتنی ہے جس میں صرف موسمی پھولوں کے پودے لگائیں۔ اس بات کا اندازہ لگانے کے بعد آپ کو اپنی پسند کے پھولوں کے بیج مہیا کر لینا چاہئے اچھے بیج بازار میں بیج بیچنے والی دوکانوں سے بہت کم پیسوں میں مل سکتے ہیں۔ جب آپ بیج لے آئیں تو کسی ایک کیاری کو اتنے حصوں میں

تقسیم کیجئے جتنی قسم کے پھول اُگانا چاہتے ہیں کیاری کے ہر حصّے میں ایک قسم کے پھول کا بیج بو دیجئے اور ہلکا ہلکا پانی دیدیجئے۔ دس بارہ دن میں ان بیجوں کے پودے تین چار انچ بڑے ہو جائیں گے، لیجئے آپ کی پود تیار ہو گئی۔ اب اس پود کو خاص کیاریوں میں منتقل کرنے کا کام باقی رہتا ہے، پود منتقل کرنے سے ایک دن پہلے سب کیاریوں میں ہلکا ہلکا پانی دیدیجئے اور دوسرے دن شام کے وقت ایک ایک قسم کی پود کو آہستہ آہستہ سے اُکھاڑ کر دوسری کیاریوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگا دیجئے اور سب کیاریوں میں اچھی طرح پانی دیدیجئے۔

اس وقت تک آپ کے کام کا بڑا حصّہ ختم ہو گیا۔ اب صرف ان کی دیکھ بھال باقی رہ جاتی ہے۔ دیکھ بھال کے کاموں میں سب سے زیادہ ضروری چیز نکائی یا نُرائی ہے، آپ دیکھیں گے کہ پود منتقل کرنے کے چھ سات دن کے اندر پودوں کے پاس غیر ضروری گھاس اُگ آئی ہے، یہ گھاس آپ کے پودوں کی خوراک میں حصّہ دار بننا چاہتی ہے، اس لئے آپ کو چاہیئے کہ اس قسم کی گھاس کو احتیاط کے ساتھ کسی چھوٹی کھُرپی کی مدد سے نکال کر باہر پھینک دیں، اس کو نکائی یا نرائی کہتے ہیں، نکائی سے دو فائدے ہوتے ہیں ایک تو گھاس نکل جائے گی۔ اور جو کھاد آپ نے کیاری میں ڈالی ہے وہ آپ کے پودوں کے کام آئے گی اور دوسرے زمین نرم ہو جائے گی، جس سے پودوں کی جڑوں کو پھیلنے میں آسانی ہو گی اور مٹّی میں پانی کو جذب کرنے اور نمی قائم رکھنے کی طاقت آجائے گی ہر آٹھویں، دسویں دن کیاریوں کی نکائی کرنا پودوں کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے، اگر آپ اپنی کیاریوں میں وقت پر پانی دیتے رہے اور نکائی کرتے رہے تو تھوڑے ہی دن میں آپ کی کیاریاں لہلہانے لگیں گی اور آپ کے گھر میں رنگ برنگے پھولوں سے بہار آجائے گی۔

اگر آپ کے پاس زمین کچھ زیادہ ہے تو پھولوں کے علاوہ آپ مختلف قسم کی ترکاریاں بھی بو سکتے ہیں ٹماٹر، بھنڈی، گوبھی، بینگن، ہری مرچ، دھنیہ پودینہ، پالک، میتھی، مولی، شلجم، سیم اور اس قسم کی دوسری چیزیں مناسب موسم میں بو کر آپ گھر بیٹھے تازہ اور صاف ستھری ترکاریاں اور سبزیاں گھر ہی میں پیدا کر سکتے ہیں۔



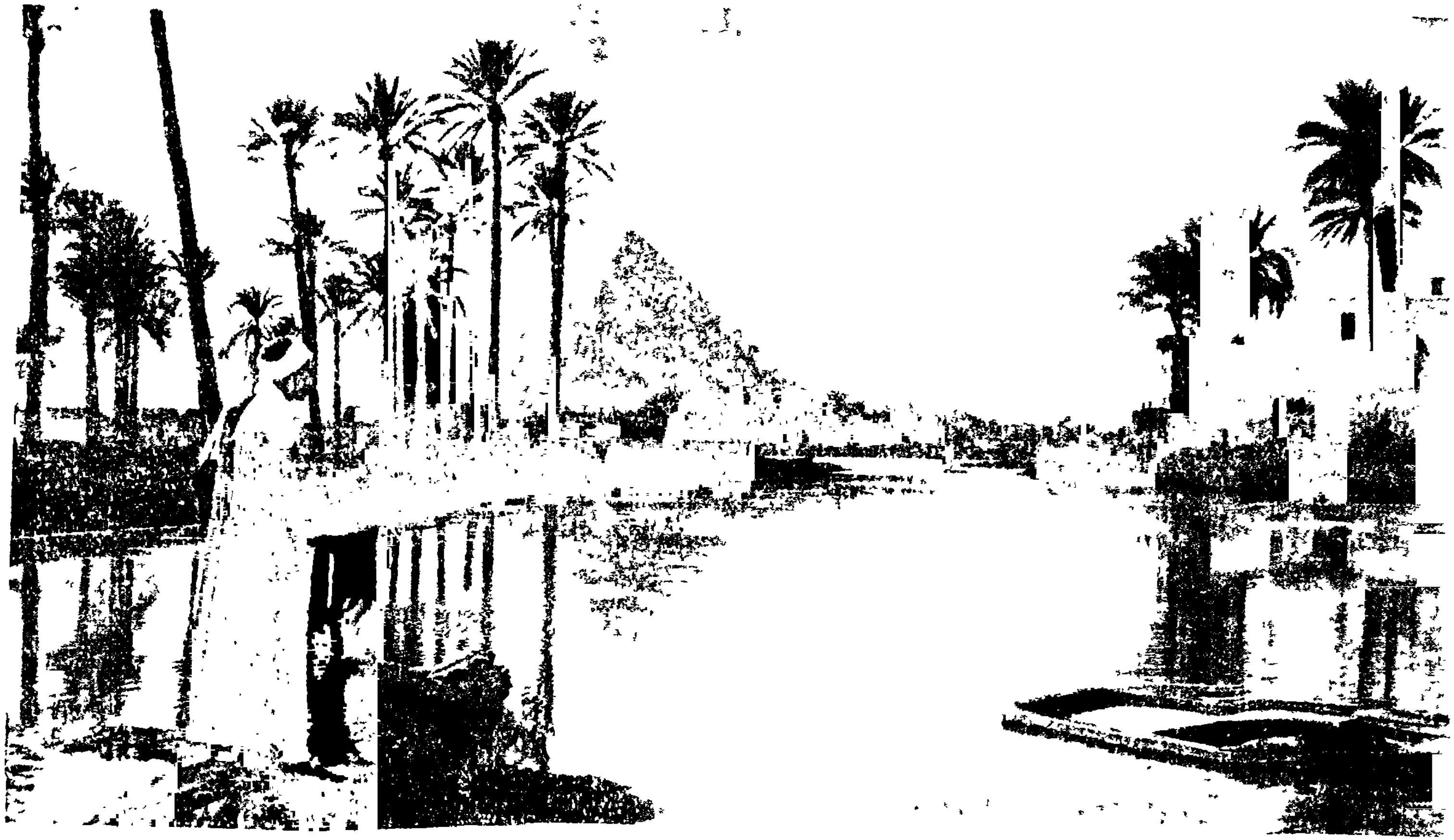
سلطانہ آصف فیضی

مصریوں کی شادی



جناب آصف علی اصغر فیضی ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۱ء تک مصر میں ہندستان کے سفیر کی حیثیت سے رہے۔ اس درمیان میں ان کی بیگم صاحبہ محترمہ سلطانہ آصف فیضی نے مصریوں کے رہن سہن۔ اُن کی سماجی زندگی اور عادت و خصائل کا بڑا گہرا مطالعہ کیا۔ اس مضمون میں آپ نے مصر کی ایک شادی کا حال لکھا ہے جسے پڑھ کر آپ یہ محسوس کریں گے کہ گویا آپ خود یہ شادی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ۔ ادارہ

اپنی مصروفیت کے باوجود مجھے ایک مصری لڑکی کی شادی میں شریک ہونے کا موقع ملا یہ ایک معزز عہدے دار کی لڑکی کی رخصتی کی تقریب تھی۔ اس دعوت کے لئے ہمیں اہرام والی سڑک پہ جانا تھا۔ قاہرہ کے گنجان بازاروں، عالیشان عمارتوں اور دلکش باغوں سے مصر کے شہرۂ آفاق اور پرشکوہ اہرام ۱۲ میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ اس عجیب و غریب شاہی قبر کی زیارت کے لئے دنیا کے ہر کونے سے سیاح یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ اس سڑک پہ جو شہر سے اہرام



دریائے نیل کے داس سے اھرام مصر دا ایک منظر



[illegible]

تک جاتی ہے گرمیوں میں بے شمار قہوہ خانے کھل جاتے ہیں۔

جب ہم سفارت خانے سے چلے تو رات کے نو بجے تھے۔ ہماری مصری رہبر رشاد اپنے جوشیلے انداز میں دولہا دلھن اور اس کے خاندان کے بارے میں ہمیں بہت کچھ بتا رہی تھیں۔ "دلھن بہت خوبصورت ہے اور دولھا کا باپ بہت دولت مند ہے۔ ان کا نکاح تین مہینے پہلے ہوچکا ہے آج تو صرف رخصتی کی رسم ہے۔ ابھی تحفہ نہیں دینا چاہیئے۔ مصریوں میں تحفہ یا تو ایک روز پہلے بھیج دیتے ہیں یا پھر شادی کے بعد دولھن کے گھر دیا جاتا ہے۔" اس کے بعد رشاد نے بڑی آہستہ سے میرے کان میں کہا "لڑکی اس شادی سے خوش نہیں ہے مگر باپ کے حکم کے سامنے مجبور ہے۔ لیکن لڑکا اس شادی سے خوش ہو اور شادی کے بعد تعلیم کی خاطر انگلستان جانے والا ہے۔"

اس بات چیت میں ہماری گاڑی اس پہنچ گئی جہاں ہم مدعو تھے۔ دروازے پر "رمنے" سنے قمقمے تار سے بندھے قطار اندر قطار لٹک رہے تھے۔ یہیں دو نوجوان مصری خوش شکل، سیاہ انگریزی سوٹ اور ترکی ٹوپی پہنے دروازے پر موجود تھے۔ یہ آنے والے مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے انھوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ یہ دونوں دلہن کے بھائی تھے۔ یہاں سے ہم باغ میں پہنچے درختوں کی ڈالیوں پر پتیوں کی آڑ سے رنگین بلب جھانک رہے تھے۔ قسم قسم کی رنگ برنگی شراب اور شربت سے مہمانوں کی خاطر کی جا رہی تھی۔ یکایک سامنے سے ایک موٹے تازے قوی جثہ مصری آئے یہ دلہن کے باپ تھے اور رشاد کے بیان کے مطابق اپنی بیٹی کو دولت کے لالچ میں اس کی مرضی کے خلاف بیاہ رہے تھے۔ مصر میں عام طور پر شادیاں والدین کی رضا مندی ہی سے انجام پاتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہاں طلاق کا عام رواج ہے۔ لڑکیاں پہلی شادی اپنے والدین کی مرضی پر کرلیتی ہیں اور دوسری شادی خود کرتی ہیں۔

رشاد نے پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ سامنے دلہن زرد رنگ کے

گون میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھڑی ہے۔"
رشاد نے بتایا کہ کھانے کے بعد وہ دلہن کا جوڑا پہنے گی۔ میں نے آہستہ سے پوچھا کہ "دولھا کہاں ہے؟" رشاد نے اشارے سے بتایا کہ وہ ایک نوجوان ساتھی کے ساتھ درخت کے سائے میں سگرٹ پی رہا تھا۔ اس کی سج دھج دیکھ کر یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ اس محفل کا نوشاہ ہے۔ ادھر دلہن بار بار ہر طرف گھوم رہی تھی۔ اس کے بال مصری لڑکیوں کی وضع کے ترشے ہوئے گردن اور شانوں پر لوٹ رہے تھے۔ لیکن اس کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ذرا سی دیر میں ایک رقاصہ کا ناچ شروع ہو گیا۔

اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ناچنے والی تھک چکی تھی۔ یکایک سب مہمان اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دالان میں گئے جہاں طرح طرح کے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ رشاد نے ایک صاحب سے جُھک کر کہا جس کے بعد وہ میز کے پاس سے سرک گئے اور میری بھی سموسوں تک رسائی ہو گئی۔ یہ ورقی سموسہ میدے کا تھا جس میں پنیر بھرا ہوا تھا جس کو تلنے کے بجائے دم دے کر پکایا جاتا ہے۔ پلاؤ میں چلغوزے، کشمش، بادام، اخروٹ اور مختلف سوکھے میووں کو بھی ملا دیا تھا۔ اس قسم کے پلاؤ کو "چہ کسیہ" کہتے ہیں۔ چاولوں میں ذرا سی مٹھاس آ جاتی ہے مگر کسی قسم کا مسالہ نہ ہونے کی وجہ سے مجھے مزا نہ آیا۔ البتہ پلاؤ کی قابوں میں مرغ کے پارچے جمائے تھے یہ ٹکڑے اچھے پکے تھے۔ کئی قسم کے میٹھے رکھے ہوئے تھے سویوں کا حلوہ بالائی پڑا ہوا۔ میدے کی لوزیں، دودھ اور شکر میں پکی ہوئی چاندی کے ورق لگا کر رکھی گئی تھیں۔ کھوئے کی مٹھائی برفی کے ٹکڑے وغیرہ بھی بنے۔

کھانے کے بعد دلہن، نیا جوڑا زیب تن کرنے گئی۔ اب حاضرین بڑی بے چینی سے "زفاف" کی رسم کا انتظار کر رہے تھے اس میں باقاعدہ عزیزوں، دوستوں اور حاضرین کے سامنے دلہن، دولھا کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ اس پر نکاح سے زیادہ خرچ کیا جاتا ہے۔

اچانک ہر طرف سے کیمرا کی آواز بلند ہوئی اور تالیاں بجنے لگیں۔ زینے پر دلہن

نمودار ہوئی، معلوم ہوتا تھا کہ کہیں سے پری آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔ اس کا سر سے پاؤں تک یورپی لباس تھا۔ ناچنے والیوں کی گانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس جلوس کو ہر شخص ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ آٹھ نوجوان کنواری لڑکیاں روشن موم بتیاں تھامے نظر جھکائے دلہن کو اپنے ساتھ لئے ہوئے اُتر رہی تھیں۔ موم بتی پر سفید پنی جھلک رہی تھی۔ دلہن کے سر پر سفید باریک کپڑا پڑا ہوا تھا۔ جس پر نازک نازک سفید پھولوں کا تاج رکھا ہوا تھا۔ دلہن کا ہاتھ دولھا کے ہاتھ میں تھا اور دونوں بہت سج سج نیچے اتر رہے تھے۔

جب برات چلتی ہوئی آئی تو دولھا دلھن کے سروں پر سے سونے چاندی کے پھول نچھاور کئے گئے۔ بہت سی بوڑھی عورتوں اور کنواری لڑکیوں نے ان پھولوں کو بڑھ کر اٹھا لیا۔ جب برات نیچے اتری تو ایک پھولوں کے سجے ہوئے منڈپ میں ایک سجے سجائے صوفے پر دولھا اور دولہن کو بٹھا دیا۔ اب چار رقاصاؤں نے دولھا اور دلہن کے سامنے رقص کرنا شروع کر دیا۔ ان کے گانے میں دولہن کی خوبصورتی کا ذکر تھا اور آئندہ زندگی کے لئے دعائیں تھیں۔ دلہن ہاتھ پر ہاتھ رکھے شرمیلی نظریں نیچی کئے فرش پر بکھرے ہوئے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ عموماً ایسے موقع پر دستور ہے کہ دولھا دلہن کو کوئی قیمتی زیور منھ دکھائی کے طور پر دیتا ہے۔ مگر اس شور و ہنگامے اور مجمع کی وجہ سے ہمیں کچھ دکھائی نہ دیا صرف دروازے پر ایک عالیشان سجی سجائی موٹر پھولوں کی چادر اوڑھے دلہن کے انتظار میں کھڑی نظر آئی۔

(بقیہ زمین کی کہانی اسی کی زبانی صفحہ)

میری کہانی جو ابھی بہت آگے جانے والی ہو یہیں ختم ہو کر رہ جائے گی۔ جب سننے والے ہی نہ رہیں گے تو کہانی کس کو سناؤں گی اور کہانی کون پوری کرے گا۔ اس ادھوری کہانی کو پورا کرنے والے تو تم ہو —

حبیب تنویر



کارلوس



(وزیر علی معزول شاہ اودھ پر بچوں کا ایک ڈراما)

کردار :۔ ۱۔ کرنل ۲۔ لفٹیننٹ ۳۔ سپاہی ۴۔ سوار
کھیل کی مدت :۔ پانچ منٹ۔
زمانہ :۔ <u>سنہ ۱۷۹۹ء</u>
وقت :۔ رات
جگہ :۔ گورکھپور کے جنگل میں کرنل کالنز کے خیمے کا اندرونی حصہ۔

کرنل :۔ جنگل کی زندگی بڑی خطرناک ہوتی ہے۔
(دو انگریز بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، کرنل کالنز اور ایک لفٹیننٹ خیمے کے باہر چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ اندر لیمپ جل رہا ہے)

لفٹیننٹ :۔ ہفتوں ہو گئے یہاں خیمہ ڈالے ہوئے سپاہی بھی تنگ آ گئے ہیں۔ یہ وزیر علی

آدمی ہے یا بھوت ؟ ہاتھ ہی نہیں لگتا۔

کرنل :۔ اس کے افسانے سُن کر رابن ہُڈ کے کارنامے یاد آ جاتے ہیں۔ انگریزوں کے خلاف اس کے دل میں کس قدر نفرت ہو کوئی پانچ مہینے حکومت کی ہوگی۔ مگر اس پانچ مہینے میں وہ اودھ کے دربار کو انگریزی اثر سے بالکل پاک کر دینے میں تقریباً کامیاب ہو گیا تھا۔

لفٹیننٹ :۔ کرنل کالنز، یہ سعادت علی کون ہے ؟

کرنل :۔ آصف الدولہ کا بھائی ہے۔ وزیر علی کا اور اس کا دشمن! اصل میں نواب آصف الدولہ کے ہاں لڑکے کی کوئی امید نہ تھی۔ وزیر علی کی پیدائش کو سعادت علی نے اپنی موت خیال کیا۔

لفٹیننٹ :۔ مگر سعادت علی کو اودھ کے تخت پر بٹھانے میں کیا مصلحت تھی ؟

کرنل :۔ سعادت علی ہمارا دوست ہے اور بہت عیش پسند آدمی ہے۔ اس نے ہمیں اپنی آدھی مملکت دے دی اور دس لاکھ روپیہ نقد۔ اب وہ بھی مزے کرتا ہے، اور ہم بھی۔

لفٹیننٹ :۔ سُنا ہے یہ وزیر علی افغانستان کے بادشاہ شاہ زماں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دے رہا ہے ؟

کرنل :۔ افغانستان کو حملے کی دعوت سب سے پہلے اصل میں ٹیپو سلطان نے دی۔ پھر وزیر علی نے بھی اسے دلّی بلایا اور پھر شمس الدولہ نے بھی

لفٹیننٹ :۔ کون شمس الدولہ

کرنل :۔ نواب بنگال کا نسبتی بھائی، بہت ہی خطرناک آدمی ہے۔

لفٹیننٹ :۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ کمپنی کے خلاف سارے ہندوستان میں ایک لہر دوڑ گئی ہے۔

کرنل :۔ جی ہاں۔ اور اگر یہ کامیاب ہو گئی تو بکسر اور پلاسی کے کارنامے دھرے رہ جائیں گے۔ اور کمپنی جو کچھ لارڈ کلائیو کے ہاتھوں حاصل کر چکی ہے۔ لارڈ ویلزلی کے ہاتھوں وہ سب کھو بیٹھے گی۔

لفٹیننٹ :۔ وزیر علی کی آزادی بہت خطرناک ہے ہمیں کسی نہ کسی طرح اس شخص کو گرفتار کر ہی لینا چاہیئے۔

کرنل :۔ پوری ایک فوج لئے اس کا پیچھا کر رہا ہوں اور برسوں سے وہ ہماری آنکھوں میں دھول ڈالے انہیں جنگلوں میں پھر رہا ہے اور ہاتھ نہیں آتا۔ اس کے ساتھ چند جانباز ہیں۔ مٹھی بھر آدمی، مگر یہ دم خم۔

لفٹیننٹ :۔ سُنا ہے وزیر علی ذاتی طور سے بھی بہت بہادر آدمی ہے۔

کرنل :۔ بہادر نہ ہوتا تو یوں کمپنی کے وکیل کو قتل کر دیتا؟

لفٹیننٹ :۔ یہ قتل کا کیا قصہ ہوا تھا کرنل؟

کرنل :۔ قصہ کیا ہوا تھا اس کو معزول کرنے کے بعد ہم نے وزیر علی کو بنارس پہنچا دیا اور تین لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا کچھ مہینے بعد گورنر جنرل نے اسے کلکتہ طلب کیا۔ وزیر علی کمپنی کے وکیل کے پاس گیا۔ جو بنارس میں رہتا تھا اور اس سے شکایت کی کہ گورنر جنرل اسے کلکتہ میں کیوں طلب کرتا ہے؟ وکیل نے شکایت کی پروا نہ کی اُلٹا اسے بُرا بھلا سنا دیا۔ وزیر علی کے دل میں یوں بھی انگریزوں کے خلاف نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس نے خنجر سے وکیل کا کام تمام کر دیا۔

لفٹیننٹ :۔ اور بھاگ گیا؟

کرنل :۔ اپنے جاں نثاروں سمیت اعظم گڈھ کی طرف بھاگ گیا۔ اعظم گڈھ کے حکمران نے ان لوگوں کو اپنی حفاظت میں گھاگھرا تک پہنچا دیا۔ اب یہ کارواں ان جنگلوں میں کئی سال سے بھٹک رہا ہے۔

لفٹیننٹ :۔ مگر وزیر علی کی اسکیم کیا ہے؟

کرنل :۔ اسکیم یہ ہے کہ کسی طرح نیپال پہنچ جائے انغانی حملے کا انتظار کرے، اپنی طاقت بڑھائے۔ سعادت علی کو معزول کر کے خود اودھ پر قبضہ کرے اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دے۔

لفٹیننٹ :۔ نیپال پہنچنا تو کوئی ایسا مشکل نہیں، ممکن ہے پہنچ گیا ہو۔

کرنل :۔ ہماری فوجیں اور نواب سعادت علی خاں کے سپاہی بڑی سختی سے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ انہیں جنگلوں میں ہے (ایک سپاہی تیزی سے داخل ہوتا ہے)

کرنل:۔ (اٹھ کر) کیا بات ہے؟
گورا:۔ دور سے گرد اٹھتی دکھائی دے رہی ہے۔
کرنل:۔ سپاہیوں سے کہدو کہ تیار رہیں (سپاہی سلام کر کے چلا جاتا ہے)
لفٹیننٹ:۔ (جو کھڑکی سے باہر دیکھنے میں مصروف تھا) گرد تو ایسی اڑ رہی ہے جیسے کہ پورا ایک قافلہ چلا آ رہا ہو۔ مگر مجھے تو ایک ہی سوار نظر آتا ہے۔
کرنل:۔ (کھڑکی کے پاس جا کر) ہاں ایک ہی سوار ہے۔ سرپٹ گھوڑا دوڑائے چلا آ رہا ہے
لفٹیننٹ:۔ اور سیدھا ہماری طرف آتا معلوم ہوتا ہے (کرنل تالی بجا کر سپاہی کو بلاتا ہے)
کرنل:۔ (سپاہی سے) سپاہیوں سے کہو کہ اس سوار پر نظر رکھیں کہ یہ کس طرف جا رہا ہے۔ (سپاہی سلام کر کے چلا جاتا ہے)
لفٹیننٹ:۔ شبہ کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔ تیزی سے اسی طرف آ رہا ہے (ٹاپوں کی آواز بہت قریب آ کر رک جاتی ہے)
سوار:۔ (باہر سے) مجھے کرنل سے ملنا ہے۔
گورا:۔ (چلا کر) بہت خوب۔
سوار:۔ (باہر سے) سی
گورا:۔ (اندر آ کر) حضور سوار آپ سے ملنا چاہتا ہے۔
کرنل:۔ بھیج دو۔
لفٹیننٹ:۔ وزیر علی کا کوئی آدمی ہوگا۔ ہم سے مل کر اسے گرفتار کروانا چاہتا ہوگا۔
کرنل:۔ خاموش رہو۔ (سوار سپاہی کے ساتھ اندر آتا ہے)
سوار:۔ (آتے ہی پکار اٹھتا ہے) تنہائی! تنہائی!
کرنل:۔ صاحب۔ یہاں کوئی غیر آدمی نہیں ہے آپ رازِ دل کہدیں۔
سوار:۔ دیوار ہم گوش دارد! تنہائی!
(کرنل لفٹیننٹ اور سپاہی کو اشارہ کرتا ہے دونوں باہر چلے جاتے ہیں
جب کرنل اور سوار خیمے میں تنہا رہ جاتے ہیں تو ذرا وقفے کے بعد چاروں طرف دیکھ کر سوار کہتا ہے۔
سوار:۔ آپ نے اس مقام پر کیوں خیمہ ڈالا ہے؟
کرنل:۔ کمپنی کا حکم ہے کہ وزیر علی کو گرفتار کیا جائے۔
سوار:۔ لیکن اتنا لاؤ لشکر کیا معنی؟

کرنل :۔ گرفتاری میں مدد دینے کے لئے۔

سوار :۔ وزیر علی کی گرفتاری بہت مشکل ہے صاحب۔

کرنل :۔ کیوں؟

سوار :۔ وہ ایک جانباز سپاہی ہے۔

کرنل :۔ میں نے بھی یہی سُن رکھا ہے۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟

سوار :۔ چند کارتوس۔

کرنل :۔ کس لئے؟

سوار :۔ وزیر علی کو گرفتار کرنے کے لئے۔

کرنل :۔ یہ لو دس کارتوس۔

سوار :۔ (مسکراتے ہوئے) شکریہ۔

کرنل :۔ آپ کا نام؟

سوار :۔ وزیر علی! — آپ نے مجھے کارتوس دئے اس لئے آپ کی جان بخشی کرتا ہوں۔

(یہ کہہ کر باہر چلا جاتا ہے۔ ٹاپوں کا شور سُنائی دیتا ہے۔ کرنل ایک سنّاٹے میں ہے ہکا بکا کھڑا ہے کہ لفٹیننٹ اندر آتا ہے)

لفٹیننٹ :۔ کون تھا؟

کرنل :۔ (دبی زبان سے اپنے آپ سے کہتا ہے) ایک جاں باز سپاہی۔

(پردہ)

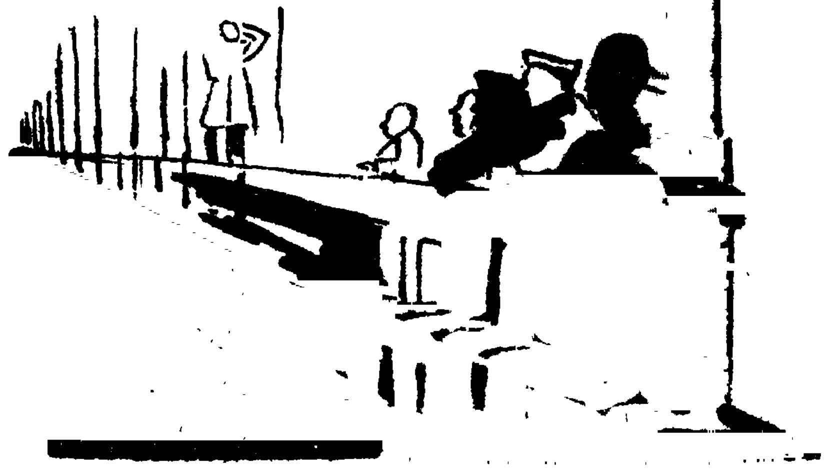
(بچوں سے باتیں کا بقیہ مضمون)

آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ ہمارے وزیر آعظم پنڈت جواہر لال نہرو ان دنوں چینی حکومت کی دعوت پر چین تشریف لے گئے ہیں۔ آپ کے ساتھ آپ کی صاحبزادی شریمتی اندرا گاندھی بھی گئی ہیں۔ اندرا جی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہندوستان واپس آکر پیام تعلیم کے لئے پنڈت جی کے اس دورے کا حال لکھیں گی۔ ادارہ اُن کا بے حد ممنون ہے۔ اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ اندرا جی کا لکھا ہوا چین کا آنکھوں دیکھا حال اور وہاں کی تصویریں بچے اور بڑے سب ہی دیکھنے کے مشتاق رہیں گے۔

سالنامہ نومبر اور دسمبر کا مِلا جُلا پرچہ ہے۔ اب اگلا پرچہ جنوری کا ہوگا۔ پیامی دسمبر کے پرچے کا انتظار نہ کریں۔

بھاکڑہ ننگل پراجکٹ

قیصر نقوی



ہمارا ملک زراعتی ملک ہے۔ جس کی ۷۵ فی صدی آبادی کسانوں کی ہے جن کا کام کھیتی کرنا اور زمین سے اناج اگانا ہے لیکن کتنے تعجب کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں پھر بھی اناج کی کمی ہے اور ہم دوسرے ملکوں کے محتاج ہیں۔ ایک آزاد ملک کے لئے کتنی بری بات ہے کہ وہ کسی چیز کے لئے دوسروں کا محتاج ہو اور جب کسی معاملے میں کسی کی محتاجی ہو تو پھر لازمی ہوتا ہے کہ ان کی ہر جا اور بے جا بات مانی جائے اور انہیں ناراض نہ ہونے دیا جائے۔

ہمارا دیس جب سے آزاد ہوا ہے دیس کی بھلائی اور ترقی کے لئے طرح طرح کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ پیداوار بڑھانے کے لئے بھی نئے نئے طریقے بنائے جا رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں دنیا کی طرح آبادی تو بڑھتی رہی اور پیداوار وہی رہی جو پہلے تھی۔ پیداوار اس لئے نہ بڑھ سکی کہ ہمارے یہاں کاشتکاری کے وہی پرانے دقیانوسی طریقے چلتے رہے۔ نہ تو جوتنے، بونے کے لئے نئے طریقے اختیار کئے گئے اور نہ آبپاشی کے لئے ذریعے۔ اب اس طرف توجہ

کی جا رہی ہے۔ ایسی زمینیں جو اِدھر اُدھر بے کار پڑی ہیں کاشت کے قابل بنائی جا رہی ہیں بڑے بڑے جنگلوں کو کاٹ کر فارم بنائے جا رہے ہیں جن میں نئے طریقوں سے کاشت ہوتی ہے۔ ہل کی جگہ ٹریکٹر وغیرہ کا استعمال سکھایا جا رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے زمینداروں کو امداد باہمی سے کام کو بڑھانے اور پھیلانے کے طریقے بتائے جا رہے ہیں۔ بند باندھ کر نہروں کے ذریعے آبپاشی کی ترکیبیں نکالی جا رہی ہیں۔

بھاکڑہ ننگل کا منصوبہ ان ہی کوششوں سے ایک بڑی کوشش ہے۔ اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ہمالہ سے بہہ کر آنے والے پانی کو روک کر اُسے آب پاشی اور بجلی تیار کرنے کے لئے کام میں لایا جائے۔

دریائے ستلج کا پانی یا تو بہہ کر سمندر میں چلا جاتا تھا یا سیلاب کی صورت بن کر نقصان پہنچاتا تھا۔ وہ پانی اب نہروں کی شکل میں تبدیل ہو کر پنجاب، پیپسو اور راجستھان میں نہ صرف آب پاشی کے لئے کام آئے گا بلکہ اس سے بجلی بھی پیدا کی جائے گی تاکہ ان علاقوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہو جائے اور ایک پنتھ دو کاج، والی بات ٹھیک ہو۔

بھاکڑہ ننگل پراجکٹ کے دو حصے ہیں ایک بھاکڑہ ننگل، دوسرا نہری سسٹم اور پن بجلی گھر۔

بھاکڑہ اور ننگل دو بہت معمولی گاؤں ہیں۔ جہاں ستلج کے پانی کو بند باندھ کر روکا گیا ہے اور ان ہی دونوں گاؤں کے نام پر یہ بند مشہور ہو گیا ہے۔

بھاکڑہ ڈیم

دریائے ستلج کو روپڑ سے ۴۸ میل اوپر بھاکڑہ کے قریب ۶۸ فٹ اونچا ایک ڈیم بنا کر روکا گیا ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر نہروں میں پانی پہنچایا جا سکے۔ اس ڈیم کی بلندی تین قطب میناروں کے برابر ہوگی اور پانچ میل لمبی تین میل چوڑی ایک پختہ اور خوبصورت سی جھیل بن جائے گی۔ اس ڈیم کے بنانے میں ۸ لاکھ ٹن سمنٹ ۸ لاکھ ٹن عمارتی مسالہ اور ایک لاکھ ٹن لوہا استعمال ہوگا اور ہزاروں مزدور روزانہ کام کر کے کہیں

سات سال میں اسے پورا کر پائیں گے۔

ننگل ڈیم

بھاکڑہ ڈیم سے صرف ۸½ میل نیچے ایک اور ڈیم بنایا گیا ہے جسے ننگل ڈیم کہتے ہیں۔ یہ ڈیم ایک ہزار فٹ لمبا اور ۹۱ فٹ چوڑا ہے۔

نہری سسٹم

اس کے بھی کئی حصے ہیں۔

بھاکڑہ نہری سسٹم، ننگل نہر، دوآبہ برانچ، نرولہ برانچ اور ان سب کی شاخیں اور رجبہے ان میں بھاکڑہ نہر اور ننگل نہر دو بڑے حصے ہیں

بھاکڑہ نہری سسٹم

پروجیکٹ کا سب سے اہم حصہ ہے اس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے ۸ جولائی کو کیا۔ بھاکڑہ نہری سسٹم کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے۔ بڑی بڑی نہروں اور ان کی شاخوں کی لمبائی ۔۔ے میل ہے۔ جس میں سے ۱۴۳ میل لمبی نہروں اور برانچوں پر "پلستر" کیا گیا ہے ان نہروں پر ۴۸ کراس ڈرینج بنائے گئے ہیں (یعنی نہروں کو ندی نالوں کے اوپر یا نیچے سے نکالا گیا ہے) ۲۵۰ پل تیار ہوئے ہیں۔ بست دوآب اور نرولہ برانچ بھی اس کے حصے ہیں اور بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

ننگل ہائیڈل نہر

یہ ننگل ڈیم سے کچھ اوپر دریا ستلج سے نکلتی ہے ننگل سے یہ روپڑ تک آتی ہے اور یہاں یہ بھاکڑہ مین لائن سے مل جاتی ہے۔ اس کی لمبائی ۴۰ میل ہے یہ نہر ایسے علاقوں سے گزرتی ہے۔ جہاں پانی کا بہاؤ بہت تیز ہے اس لئے ننگل سے ۱۲ میل پر گنگوال کے مقام پر پانی کو ۹۳ فٹ کی اونچائی سے گرا کر بجلی حاصل کی گئی ہے اور پھر ۴ میل اور آگے آکر اسی طرح کوٹلہ کے مقام پر ایک بجلی گھر بنایا گیا ہے ان دونوں بجلی گھروں سے جو بجلی حاصل ہوگی۔ وہ نہ صرف روشنی ہی کے لئے کافی ہوگی بلکہ قرب وجوار کے قصبوں میں مختلف کارخانے بھی کھولے جائیں گے جس سے ہزاروں لوگوں کو روزگار مل سکے گا۔

چونکہ یہ نہر نہایت دشوار گزار علاقوں

سے گذرتی ہے اور درمیان میں بہت سے ندی نالے پڑتے ہیں اس لئے اس میں بھی ۵۸ کراس ڈرینج ورکس بنائے گئے ہیں۔

نہر ننگل اور بھاکڑہ دنیا کی سب سے بڑی پلستر کی ہوئی نہر ہے جس کے ٹائیلوں کو اگر ایک لائن میں رکھا جائے تو خط استوا کے دونوں طرف دنیا کے دو چکر پورے ہو سکتے ہیں۔

بھاکڑہ پروجکٹ کے کچھ حصے مکمل ہو گئے ہیں۔ اور باقی بھی پورے ہونے والے ہیں۔ یہ سب جب مکمل ہو جائیں گے تو پنجاب پیپسو اور راجستان کا علاقہ نہ صرف آب پاشی کے ذریعے زرخیز ہوگا بلکہ بجلی کے کاروبار سے بھی لاکھوں آدمی فائدہ اٹھائیں گے۔

ہمارے دیس میں ایسے بہت سے پروگرام چل رہے ہیں۔ جنہیں پانچ سالہ پروگرام کہا جاتا ہے۔ ملک کے ہر فرد کو چاہیئے کہ ملک کی ترقی کے ایسے کاموں میں وہ اپنے لئے بھی کوئی کام تلاش کرے۔ تاکہ وہ بھی کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ ملک کی ترقی کے لئے ابھی کام کی بہت ضرورت ہے۔ اور ملک کے ہر فرد کو اس کے لئے کوشش کرنی چاہیئے۔ بچے بھی اس میں اپنا حصہ تلاش کریں تاکہ وہ بھی اپنے ملک کو بنانے میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔

بھاکڑہ بند کی تعمیری سرگرمیوں سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ کام ۱۹۵۷ء میں پورا ہو جائے گا۔ بہرکیف بھاکڑہ ننگل پروجکٹ جتنا ڈیولپ ہوا اتنے ہی کثیر اس سے فائدے بھی حاصل ہوں گے۔

(بقیہ: کیا خوب آدمی ہیں۔

کر ڈالی۔ اپنے وکیل کی تقریر سن کر میاں بدحواس اپنے جرم سے صاف مکر گئے۔ جج نے ڈانٹ کر پوچھا "تھوڑی دیر پہلے تم نے اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا لیکن اب تم کیسے مکر گئے ہو"

میاں بدحواس نے بڑے اطمینان سے فرمایا "اپنے وکیل کا بیان سننے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں مجرم نہیں ہوں"

اچھا بھئی۔ اب مجھے بھاگنے کی اجازت دیجئے تاکہ میں اپنے بچنے اور کہیں چھپنے کا انتظام کر سکوں ورنہ اگر کہیں یہ مضمون میاں بدحواس کے ہاتھ لگ گیا تو پھر میری خیر نہیں۔

بونگالی بابو

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

ہم ہے اِک بونگالی بابو
ٹوٹی پھوٹی زانتا[1] اُردو

پھر بھی ہم تم سے بولے گا — بنگلہ بولی ہم کھولے گا
کیا ہے گولِب[2] کیا ہے اِکبُل[3] — دیکھو ٹھاکر[4]، دیکھو نجرُل[5]
بنگلہ دیس کی بات ہی آرے[6] — شُندر[7] لوک ہے سُنار گھار[8] ہے
بنگلہ میں ہے تین "ٹھو" گھورا[11] — اِک گھورا ہے گھانشی[9] کھاتا
اِک گھورے میں ہم جل رکھتا — اِک گھورا ہے ہم سے لرتا[10]

اُردو کیا اِک بولی ٹھولی
بنگلہ اِک رشس گلّا بولی

---

[1] جانتا [2] غالب [3] اقبال [4] رابندرناتھ ٹھاکر (ٹیگور) [5] نذرالاسلام [6] اور [7] سُندر [8] گھر [9] گھانس
[10] لڑتا [11] تین ٹھو گھورا ۱۔ گھوڑا ۲۔ گھڑا ۳۔ گورا جن کا تلفظ تقریباً ایک طرح کیا جاتا ہے۔

نوح فاروقی

یونان جو ایک ملک تھا

آپ نے کبھی سقراط، ارسطو یا افلاطون کا نام سُنا ہے؟ اگر نہیں سُنا ہے تو آئیے ہم آپ کو بتلاتے ہیں کہ یہ لوگ جن کے نام اور کام ہزار ہا سال سے دنیا میں مشہور رہیں کون تھے اور کہاں کے رہنے والے تھے۔ ....

آج سے ہزاروں سال پہلے جب کہ آپ کے دادا کے دادا کے پڑدادا بلکہ ان کے بھی پڑدادا بہت بڑے تھے تو یورپ میں ایک ملک آباد تھا جس کا نام یونان تھا۔ اگر آپ یورپ کا نقشہ اُٹھا کر دیکھیں تو آپ کو ایک ملک اٹلی نظر آئے گا۔ بہت دنوں پہلے سے اسی مقام پر ایک ملک آباد ہے جو کہ یونان کہلاتا ہے۔ پرانے زمانے میں کچھ قبیلے جو کہ دانہ پانی کی تلاش میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے تھے، یہاں آنکلے۔ اس خطے میں ہر طرف پہاڑیاں ہی پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں، جس پر سر سبز بھرے خوبصورت درخت تھے اور چاروں طرف گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں کی آب و ہوا بہت خوشگوار تھی، جا بجا پھل اور پھول پڑے رہتے تھے، ان قبیلوں کو یہ دیس بہت بھایا، ان لوگوں کے ساتھ بکریوں کے جھنڈ کے جھنڈ تھے

ان بکریوں کو بھی ہری بھری گھانس بہت بھلی لگی چنانچہ انہی پہاڑیوں کی خوبصورت وادی میں یہ قبیلے رہنے سہنے لگے اور رفتہ رفتہ انھوں نے اتنی ترقی کی کہ ہزارہا سال بعد آج بھی ان لوگوں کا اوران کی بنائی ہوئی تہذیب کا نام روشن ہے۔

اس خوبصورت ملک کی آب وہوا ان لوگوں کو اتنی موافق آئی کہ رفتہ رفتہ ان کا رنگ خوب گورا چٹا ہوگیا، اوران کے بالوں کی رنگت سنہری ہوگئی۔یونانی اپنی جسمانی خوبصورتی کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اور مختلف ورزشوں کے ذریعے اپنے جسم کو خوب طاقتور اور خوبصورت بنائے رکھتے تھے، انھوں نے دنیا میں سب سے پہلے کھیل کے مقابلوں کا آغاز کیا، آج کل آپ کھیل کے میدانوں میں بھاگ دوڑ اور اچھل کود کے جو مقابلے دیکھتے ہیں ان میں سے اکثر کھیلوں کی شروعات یونانیوں نے ہی کی تھی، کھیل کے مقابلے اس زمانے میں یونان کے ایک مقام اولمپیاس میں ہوتے تھے، چنانچہ آج بھی اسی کے نام پر یہ کھیلوں کے مقابلے ،،اولمپک مقابلے کہلاتے ہیں، یونانی کھیل کے یہ مقابلے ہار جیت کے پیش نظر نہیں کیا کرتے تھے بلکہ ان کا مقصد صرف انسانی جسم کو توانا، چست اور صحت مند رکھنا تھا۔

یونان میں دو بڑے شہر تھے ایک کا نام ایتھنس تھا اور دوسرے کا نام اسپارٹا۔یہ دونوں شہر تہذیب اور تمدن کا مرکز تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ان شہروں کی زندگی میں زمین آسمان کا فرق بھی تھا۔ ایتھنس کے رہنے والے زیادہ تر علمی معاملات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہاں بچوں اور بڑوں کے لئے اسکول تھے۔ لوگ اپنا وقت علمی قسم کے مباحثوں میں گذارا کرتے تھے، تاریخ، فلسفہ، حکمت، علم نجوم، مذہب اور سیاسیات وغیرہ کے متعلق زیادہ سے زیادہ جانکاری حاصل کرنے کی کوششوں میں مشغول رہتے تھے، ایتھنس میں ہی سقراط ارسطو اور افلاطون جیسے بڑے بڑے قابل فلسفی پیدا ہوئے، آج کل بھی ان کی کہی ہوئی باتیں سچ اور صحیح مانی جاتی ہیں اور لوگ ان کے قول دہراتے ہیں، ایتھنس والوں نے لکھنے کا فن بھی ایجاد کیا تھا اور قلم اور روشنائی کے ذریعے لکھا کرتے تھے ایتھنس کے شہر میں

دیوی دیوتاؤں کے بڑے بڑے خوبصورت مجسمے تھے عالیشان مندر اور عمارتیں تھیں، یہاں کے رہنے والے خود تو معمولی گھروں میں رہتے تھے، لیکن ان کی سرکاری عمارتیں جہاں حکومت کے کاروبار طے پاتے تھے بہت بڑی اور عالیشان ہوا کرتی تھیں ایتھنس کے رہنے والوں کو شعر و شاعری اور ڈرامے کھیلنے کا بھی بہت شوق تھا۔ یہاں کے تھیٹر گول گول اور بہت بڑے ہوتے تھے اور ان میں بہت سے لوگوں کے ایک وقت بیٹھنے کی گنجائش ہوتی تھی، ان تھیٹروں کے اوپر چھت نہ ہوتی تھی اسلئے یہ کھلی ہوا کے تھیٹر کہلاتے تھے، ایتھنس کے رہنے والوں نے سب سے پہلے جمہوریت کا اصول قائم کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ملک کے ہر شہری کو آزادی کے ساتھ حکومت کے معاملات میں کہنے سننے کا حق ہونا چاہیئے اور حکومت کا کاروبار تمام عوام کو مل جل کر چلانا چاہیئے، اس غرض سے کہ عوام کو حکومت میں زیادہ سے زیادہ نمائندگی ملنی چاہیئے یونان میں چھوٹی چھوٹی بہت سی ریاستیں قائم کر دی گئی تھیں۔ جہاں کے عوام نہایت آزادی کے ساتھ الگ الگ اپنی حکومتیں چلایا کرتے تھے لیکن جب کوئی غیر ملک یونان پر حملہ کرتا تو یہ ساری ریاستیں مل جل کر دشمن کا مقابلہ کرتی تھیں!

لیکن اسپارٹا کے رہنے والے یونانیوں کے اصول مختلف تھے، اسپارٹا میں پڑھنے لکھنے کے بجائے کھیل کود اور جسمانی ورزشوں پر زور دیا جاتا تھا، اسپارٹا والوں کا کہنا تھا کہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ طاقتور ہونے کی ضرورت ہے، یہاں تک کہ اگر کسی کے یہاں کمزور بچہ پیدا ہو تو یہ لوگ اس کو جنگلوں میں ڈال دیتے تھے حتیٰ کہ وہ وہاں سردی اور برسات سے مرجاتا کتنی بری بات تھی یہ؟ اسپارٹا والوں کی ان دیوانگی کا خود ایتھنس والے بڑا مذاق اڑاتے تھے اور ان حرکتوں کو بری نظروں سے دیکھتے تھے اسپارٹا والوں کی اس جاہلیت کی وجہ سے اسپارٹا کے شہر میں نہ تو علم کا چرچا ہوا اور نہ وہاں اتنی حسین اور خوبصورت عمارتیں بن سکیں جیسی کہ ایتھنس میں تھیں۔

یونان والے بہت سے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور شہر میں جگہ جگہ ان کے مجسمے تھے۔ یہ دیوی دیوتا بہت کچھ قدیم ہندوستان کے دیوی دیوتاؤں سے ملتے جلتے ہیں۔

یونان کی تہذیب آسمان کے ان ستاروں

کی طرح تھی جو رات میں تو جھل مل چمکتے رہتے ہیں لیکن صبح تک آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

تھوڑے ہی عرصہ میں یونان نے بہت زیادہ ترقی کر لی تھی۔ اتنی کہ آج کل کی مہذب اور ترقی یافتہ دنیا میں بھی یونانیوں کا ذکر بہت عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ لیکن یونان والوں کی تہذیب صرف چند روزہ تھی اور خود انہی کی حرکتوں کی بدولت تھوڑے سے ہی عرصہ میں ملیا میٹ ہو گئی۔ ایتھنس جیسا انمول رتن دیکھتے ہی دیکھتے تباہ و برباد ہو گیا۔ اور یونان کی تہذیب سسک سسک کر خاموش ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یونان کے لوگ خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو گئے، زیادہ پڑھ لکھنے کے بعد ان میں آپس میں حسد اور جلن پیدا ہوا اور ایک دوسرے کی ترقی سے چڑھنے لگے۔ دوسری طرف ایتھنس اور اسپارٹا میں جو نظریات کی دیوار حائل تھی وہ آخر کار خانہ جنگی کا سبب بنی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یونانی آپس ہی میں لڑ بھڑ کر تباہ و برباد ہو گئے، یونان کے ایک ہمسایہ ملک روم کے بادشاہ فلپ نے اس کا فائدہ اٹھایا اور یونان کو فتح کر لیا۔

ایتھنس کے تباہ ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عام انسانوں کی عزت اور اہمیت میں یقین رکھنے کے باوجود وہاں غلام رکھنے کا طریقہ رائج تھا۔ گو کہ یونان کے غلاموں کی حالت بہت اچھی تھی۔ ان میں سے بہت سے ماسٹر تھے، فن کار تھے اور فوج میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ لیکن انھیں شہری حقوق حاصل نہ تھے اور ان سے جانوروں کی طرح کام لیا جاتا تھا۔

یونان میں عورتوں کو بھی کوئی خاص درجہ حاصل نہ تھا۔ اور وہ زیادہ تر گھر کے کام کاج میں مصروف رکھی جاتی تھیں، انھیں حکومت کے معاملات میں بھی کوئی دخل نہ تھا۔

انہی وجوہات کی بنا پر یونان کی تہذیب زیادہ دنوں تک پنپ نہ سکی اور ایک بھولا بسرا خواب بن کر رہ گئی۔ لیکن اپنی چند روزہ زندگی کے دوران میں یونان کے لوگوں نے جس تہذیب کی بنا ڈالی وہ تاریخ میں ایک سنہری باب بن کر چمک رہی ہے۔ دنیا میں ایک دائمی تہذیب کی بقا اس میں ہے کہ ایک ایسی تہذیب ہو جس میں ہر انسان کو برابر کا کام برابر کی عزت برابر کے ترقی کرنے کے ذرائع حاصل ہوں یونان کی تہذیب سے ہمیں سبق لینا چاہیئے۔

دُرِ شبنم شمع

مَیں بلّی بن گئی



"ہشت!" میں نے پلنگ پر سے اپنی چھوٹی بہن کی چہیتی بلی کو ڈھکیلتے ہوئے کہا "کیسی بُری نیت کی ہے یہ بلی!!"

روحی نے میری بات پر کچھ توجہ نہیں دی اور چھوٹے قد والی چتکبری بلی کو جھک کر اٹھا لیا

بدتمیز بلی! کیوں آئی تھی میری چائے خراب کرنے! میں واقعی بھنا گئی۔

روحی نے خاموشی سے چائے رکابی میں انڈیل کر بلی کے آگے کر دی۔

"گندی ـــ میں اور زیادہ بھنا گئی۔

بلّی نے جلدی سے چائے پی۔ اور روحی نے غالباً مجھے چڑانے کے لئے لیٹ کر بلّی کو بھی ساتھ لحاف میں داب لیا۔ چائے کی پیالی میز پر پٹک کر ہارے ہوئے انداز سے ناک پونچھتی ہوئی لحاف میں گھس گئی۔ ہم دونوں کے شوق الگ الگ تھے۔ مجھے کتّے پسند تھے اور بلّی سے نفرت! اور روحی کو بلیوں سے محبت! میرے کتے کو مرے ہوئے چار مہینے ہی

ہوئے تھے۔ جب وہ زندہ تھا تب تو دن رات لڑائی جھگڑے ہوتے تھے۔ میرا کتا السیشن تھا۔ اور اُسی زمانے میں روحی نے تقریباً بلّی کا بچّہ لیا تھا۔ اور ہم دونوں نے اُن کو ایک ساتھ رکھ کر دوستی کرا دی تھی۔ میں نے اپنے کتے کا نام "رینو" رکھا تھا اور روحی نے بلّی کے لئے "کِٹّی" نام پسند کیا تھا۔ میرا رینو تو کبھی اُسے کچھ نہیں کہتا مگر کِٹّی کمبخت اکثر دم پھلا کر فش فش کر کے اس کے منہ پر پنجے مار دیتی اور بیچارہ زخمی ہو جاتا۔ اسی پر اکثر ہم دونوں کی لڑائی ہو پڑتی لیکن روحی بڑی معصوم بن جاتی۔

باجی میرا کیا قصور ہے؟ کیا میں نے کہا تھا کہ وہ رینو کو نوچ لے!

خیر اب اُس بے چارے کا کیا ذکر وہ تو مرگیا مگر یہ کمبخت سخت جان نہیں مرتی دو تین بار تو میں نے چھت پر سے بھی پھینک پھینک دیا۔ پر ویسی کی ویسی رہی ذرا چوٹ بھی تو نہیں آئی۔

آج مجھے بڑا غصہ آ رہا تھا۔ میں بیٹھی ہوئی کہانی لکھ رہی تھی۔ کہ کِٹّی آئی اور مجھے بالکل ایسے کہ بس گردن پکڑ کر اٹھا لیا جیسے بلیاں اپنے بچوں کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگا اور میں نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ چیخنا چاہا مگر میری آواز جیسے بند ہوگئی۔ میں چیخ بھی نہ سکی۔ وہ مجھے ایک پہاڑ پر لے گئی۔ سامنے بڑا سا دروازہ تھا۔ جیسے قلعہ کے دروازے ہوتے ہیں۔ وہاں پر میں نے دیکھا — اُف! میرا پیارا رینو!

وہ دروازے پر پہرہ دے رہا تھا۔ وہ کِٹّی کو دیکھ دم ہلانے لگا۔ میں نے دل میں سوچا۔ ذرا پاس پہنچوں گی تو "شُو" کر دوں گی۔ بس کِٹّی صاحبہ چڑھتے آسمان پر نظر آئیں گی لیکن دروازے کے پاس پہنچ کر کِٹّی نے بڑی سریلی آواز میں کہا "رینو۔ دروازہ کھول دو"!

اور رینو نے بڑے ادب سے سلام کیا۔ اور میری حیرت کے مارے زبان بند ہوگئی۔ یہ بلّی تو بالکل انسان کی طرح بول رہی ہے! — ابھی میری حیرانی دور نہیں ہوئی تھی کہ بلّی کے دروازہ میں داخل ہوتے

ہی ایک آواز آئی۔

"بند کردوں؟" یہ رینو کی آواز تھی۔ میری حیرت اور بڑھ گئی۔

کچھ عجیب سا عالم تھا۔ آدمیوں کی طرح بلیاں وردیاں پہنے کام کرتی پھر رہی تھیں۔ پہرہ دے رہی تھیں۔ خوبصورت اور چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ باغ تھے۔ اُن میں رہنے والی سب بلیاں تھیں کہیں بلی کے بچے کھیل رہے تھے۔ مجھے یہ سب اچھا لگا اور میں رک کر دیکھنے لگی۔ اتنے میں ایک چھوٹی سی موٹر میرے پاؤں کے پاس آ کر رُک گئی۔ موٹر کو ایک بلی چلا رہی تھی۔ "کٹی" کو دیکھ کر وہ فوراً اتر پڑی۔ اور بہت ادب سے سلام کیا۔ پھر کہا

مجھ سے غلطی ہوئی شہزادی صاحبہ موٹر خراب ہو گئی تھی ورنہ میں آپ کو وہیں ملتا۔

خیر کوئی بات نہیں! "کٹی" نے کہا۔

"شکریہ رحم دل شہزادی!" دوسری بلی نے کہا۔

اور "کٹی" موٹر میں بیٹھ گئی۔ موٹر بہت چھوٹی تھی۔ میں نہیں بیٹھ سکی۔ "کٹی" نے کہا کہ میں پیدل اس بلی کے ساتھ آؤں اور "کٹی" نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔

ہم ایک خوبصورت محل کے سامنے رُک گئے۔ کٹی کو سب پہرہ داروں نے سلام کیا۔ وہ سب بڑے بڑے بلے تھے۔ وہ مجھے اُن کے حوالے کر کے اندر چلی گئی

پھر ایک بڑا سا وردی پوش بلا آیا اور مجھے قید کر کے لے چلا۔ مگر جیل چھوٹی ہونے کی وجہ سے باہر ہی ایک سپاہی کے سپرد کر دی گئی یہ بڑا خوفناک بلا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ایک بڑے کمرے میں لے گئے۔ شہ نشیں پر بڑا سا سونے کا تخت تھا۔ اس پر ایک سفید بڑے بالوں والا خوبصورت سا بلا بیٹھا تھا اور پاس ہی ایک بلی بیٹھی تھی۔ درمیان میں کٹی تھی۔ تینوں کے سروں پر تاج تھے۔ میں خوف سے کانپنے لگی۔

بادشاہ نے کہا "کہو بیٹی کیا کہنا ہے"

کٹی بولی "ابا حضور اس لڑکی کی حرکتیں آپ کو معلوم ہی ہیں کہ یہ مجھ سے کس طرح پیش آتی ہے۔ یہ ندیدہ۔ نیت خوار اور منحوس کمبخت تو بات بات پر کہتی ہے۔ اور مارنے سے تو کبھی چوکتی ہی نہیں اکثر ایسا مارتی ہے

کہ میرے تیل پڑ جاتے ہیں۔ دوسری لڑکی بہت نیک اور شریف ہے۔ میں اس کی محبت کی وجہ سے خاموشی سے رہتی ہوں ورنہ کبھی اس گھر میں جاتی بھی نہیں ایک دن ایک بیٹ پر بیٹھ گئی تو خوب مارا۔

اچھا!" تم کہو ـــ کیا صفائی پیش کرنا چاہتی ہو! کیوں مارتی ہو۔ تمھارا کیا بگاڑا ہے اس لئے؟"

میں کہنا چاہتی تھی۔ مگر میرے منہ سے بجائے بات کے بلّی کی سی آوازیں نکلنا شروع ہو گئیں۔ اس پر بلّی ملکہ بولی۔

دیکھو لڑکی اگر تم نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو ہمیشہ کے لئے "میاؤں" بولنے لگو گی ـــ سچ بولو۔

میں رونے لگی۔ اور بے بسی سے کہا۔

"اب نہیں کروں گی"

اچھا! لیکن سزا تو ملے گی۔ بادشاہ نے کہا۔ دلّو چیتے کے لئے بلی کی دم لگا کر بلّی بنا دو اور بیٹی تم اس کی ہم شکل بن جاؤ ـــ اور گھر چلی جاؤ۔

تھوڑی دیر بعد میں بلّی بن گئی اور کٹّی بالکل میرے جیسی لڑکی! پھر ہم دونوں کو گھر پہنچا دیا گیا۔

کٹّی مجھ سے خوب بدلے لیتی مارتی کبھی گالیاں دیتی اور میرا مذاق بناتی، کبھی دُم میں پٹاخے باندھ دیتی۔ ایک دن اس نے مجھے زور سے مارا تو میں نے اُسے خوب زور سے کاٹ لیا مگر اُس کے "اوئی" کی آواز کے بجائے "میاؤں کی آواز آئی۔

لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ! باجی آپ بھی ایسی دشمنی کر رہی ہیں کہ توبہ بھلی۔ اگر بال منہ میں چلے جائیں تو ــ یہ روحی کہہ رہی تھی۔ اور کٹّی کو منہ میں دبا رکھا تھا وہ چیخ رہی تھی۔ م۔ی ا۔و۔ن۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دھوپ نکل آئی تھی ابر چھٹا ہوا تھا۔

بمبئی۔ علی پور (کلکتہ) اور حیدر آباد کی ٹکسالوں میں ہر گھنٹہ ۱۹ سو سکّے ڈھلتے ہیں۔ ان میں روپیہ سے لے کر پیسہ تک شامل ہیں۔



حرکت

حامد اللہ افسر

ہر چیز حرکت سے ظہور میں آئی ، حرکت نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ تھا ، حرکت اصل میں زندگی کا دوسرا نام ہے ۔ حرکت ہی کی بدولت زمین وجود میں آئی ، اگر سمندر کے پانی میں حرکت نہ ہوتی تو ہماری زمین پر صحت برقرار رکھنا مشکل ہوجاتا ۔ اگر بیج حرکت میں نہ آتے تو نباتات کی صورت نظر نہ آتی ۔ اگر انسان دل و دماغ کو حرکت نہ ہوتی تو تاریخ وجود میں نہ آتی ۔

حرکت ہماری زبان کا بہت ہی عام لفظ ہے ۔ ہم نہ جانے کتنی بار ہر روز اس کو استعمال کرتے ہیں لیکن ہم میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اس پر غور کیا ہو کہ یہ لفظ کس قدر اہم ہے ۔ اور دنیا کے معنے کو سمجھنے کے لئے اس لفظ سے ہمیں کتنی مدد مل سکتی ہے ۔

ایک بڑے سائنسدان کا قول ہے کہ اس زمین پر انسان کا واحد مشغلہ یہ ہے کہ وہ چیزوں کو حرکت میں لاتا رہتا ہے ، ایک جگہ سے ہٹاکر دوسری جگہ پہنچاتا رہتا ہے ، مادّے کو اُلٹتا پلٹتا رہتا ہے ۔

حرکت کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ ارادی حرکت اور غیرارادی حرکت ، ایک درخت حرکت کرتا ہے لیکن صرف اس وقت جب ہوا

چلتی ہے، ایک جہاز حرکت کرتا ہے اس لئے کہ جہاز راں اس کو حرکت میں لاتا ہے، ایک تو یہ حرکت ہے اور ایک وہ حرکت ہے جو یہ مضمون لکھتے وقت میرے قلم کو ہو رہی ہے، یا تصویر بناتے وقت ایک مصوّر اپنے برش کو دیتا ہے۔

سائنس نے ہمیں بتایا ہے کہ دنیا کی ہر چیز حرکت میں ہے۔ اپنے کمرے کے کواڑوں کو دیکھو معلوم ہوتا ہے بالکل بے حس و حرکت ہیں جب جنگل میں کسی درخت کا حصہ تھے تو حرکت میں تھے۔ درخت کاٹا گیا، اس کے تختے بنائے گئے، وہ بے جان ہوگئے اور پھر حرکت باقی نہ رہی، کم سے کم ہمارے بزرگ یہی سمجھتے تھے۔ اب سائنس نے ہم پر واضح کر دیا ہے کہ ہر چیز کا وجود ذرّوں یا ایسے مادّے میں ہے جو تقسیم نہیں کیا جاسکتا اور ہر ذرّہ ایک چھوٹی سی ستاروں کی دنیا ہے جو بجلی سے روشن ہے اور مسلسل حرکت میں ہے۔

زمین یوں تو بے حس و حرکت معلوم ہوتی ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ سورج کے گرد گردش کر رہی ہے اور اس کے ساتھ خود بھی گھوم رہی ہے اور اپنے ساتھ سارے پہاڑوں اور دریاؤں اور درختوں اور انسانوں اور جانوروں کو گردش میں لا رہی ہے، کوئی چیز بے حس و حرکت نہیں ہے آپ جب صبح کو سو کر اُٹھتے ہیں اور دریچے سے جھانک کر دیکھتے ہیں تو آپ کو ہر چیز اسی طرح نظر آتی ہے جیسے پچھلی رات کو تھی۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی پتّہ زمین پر گر پڑا ہو، یا کوئی دروازہ جو شام کھلا ہوا تھا اب بند ہوگیا ہو۔ ورنہ ہر چیز بالکل اسی طرح اپنی جگہ پر موجود ہے جیسے کل تھی۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ ہر چیز نے اس عرصے میں اتنا طویل سفر طے کر لیا ہے جو کسی تیز سے تیز ہوائی جہاز یا ریل گاڑی کے ذریعے اتنے عرصے میں کسی طرح طے نہیں ہوسکتا۔

آخر یہ سب کیا راز ہے؟

ایک چیز میں ابھی زندگی تھی اور ذرا سی دیر میں بے جان ہوگئی۔ ایک چیز کچھ عرصہ پہلے اتنی چھوٹی سی تھی کہ ایک بچّہ اسے دو انگلیوں سے پکڑ کر اُٹھا لیتا تھا اور اس سے کھیلتا تھا اب وہی چیز ایک تناور بڑ کا درخت بن گئی ابھی ایک چیز ہری بھری اور خوش نما تھی۔ اب وہ مرجھا گئی اور بدصورت ہوگئی۔ اس گھونسلے میں دیکھو، چھوٹے سے بیر کے برابر ایک سفید سفید انڈا رکھا ہوا ہے، کیسا بے حس و حرکت ہے۔

مگر کچھ عرصے بعد وہ کیا بن گیا، ایک ہوا میں اُڑنے والی چیز، ایک چہچہانے والی اور گھونسلا بنانے والی چیز۔

آخر یہ سب کیا راز ہے؟

سُنئے آپ ایک کتاب پڑھنا چاہتے ہیں آپ اس کتاب کو الماری سے نکال لیتے ہیں گویا آپ نے اس کو حرکت دی، مگر آخر کیوں؟ صرف اس لئے کہ آپ اس کو پڑھنا چاہتے تھے۔ گویا پہلے تو خواہش پیدا ہوئی، اس خواہش نے آپ کے ہاتھوں کو حرکت دی۔ اب یہ معلوم ہوا کہ حرکت تو خواہش کا عمل ہے، ہمارے ہاتھ حرکت کرتے ہیں اس لئے کہ ہم انھیں حرکت دینا چاہتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حرکت کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ پہلے زمین پر سوائے ایک رقیق بے رنگ سے ایتھر کے اور کچھ نہ تھا، نہ سورج تھا، نہ چاند تھا، نہ ستارے تھے، نہ حرکت تھی۔ تمام سکوت، خاموشی، سناٹا اور تاریکی، اس کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے بعد حرکت پیدا ہوئی ایتھر مشتعل ہوگیا، کائنات میں زندگی لہریں لینے لگی، سورج، چاند اور ستارے پیدا ہو گئے۔ تاریکی میں روشنی پیدا ہوئی۔ بے ترتیبی اور ابتری سے ایک ترتیب اور نظام پیدا ہوا۔

اب غور کیجئے کہ یہ پہلی حرکت جس سے یہ سب چیزیں سامنے آئیں کسی ارادے، کسی عزم اور کسی خواہش کے ماتحت تھیں یا خود بخود پیدا ہوئیں، دنیا کے بڑے سے بڑے سائنس داں اس بات پر متفق ہیں کہ ایک زبردست قوت تھی جس کی خواہش پر یہ حرکت پیدا ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک چھوٹا سا بیج ایک بڑ کے درخت میں اسی وقت بدل سکتا ہے جبکہ ایک بڑی قوت نے اس میں یہ اہلیت پیدا کی ہو کہ وہ اپنی صورت سے اس قدر مختلف صورت اختیار کر سکے۔ وہ زبردست قوت جس کی مرضی سے اور جس کی خواہش سے یہ حرکت ظہور میں آئی خدا ہے۔ کن فیکون۔

ملک میں بسنے والے ہر ہندستانیوں میں ایک غیر ممالک میں رہتا ہے اس طرح اس وقت تقریباً ۳۸ لاکھ ہندستانی دُنیا کے دوسرے ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں


دیکھیے، آپ کا کُتّا مجھے
چڑا رہا ہے۔
یوسف



مزاحیہ غزل

(ایک کھلنڈرے لڑکے کی زبان سے)

ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کبھی ویسا نہیں ہوتا
میں جو چاہوں وہ ہو جائے کبھی ایسا نہیں ہوتا

کتابیں دُور سے دیکھا کروں، اور پاس ہو جاؤں
ہاں ایسا ہو تو سکتا ہے مگر ایسا نہیں ہوتا

اگر چھٹی نہیں ملتی تو پھر کچھ بھی نہیں ملتا
تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا اگر ایسا نہیں ہوتا

اِک ایسا وقت ہوتا ہے اک ایسا دن بھی ہوتا ہے
مٹھائی سامنے ہوتی ہے اور پیسہ نہیں ہوتا

مٹھائی خوب کھا لیتا ہوں جب تو شعر کہتا ہوں
مری ہو شاعری کڑوی کبھی ایسا نہیں ہوتا

میرزا ادیب

ہندستان کے جانور

گلیڈون میسی

نیل گائے

اس کی شکل گائے، اور گھوڑے سے ملتی جلتی ہے یہ صرف ہندستان میں پائی جاتی ہے۔ نر کے سینگ ہوتے ہیں۔ رنگ بھورا اور ہلکا نیلا ہوتا ہے اور مادہ ہلکا کالا جنگل میں غول کے غول رہتے ہیں۔ ان کی خوراک گھاس، جڑ اور چھوٹے موٹے پودے ہوتے ہیں۔

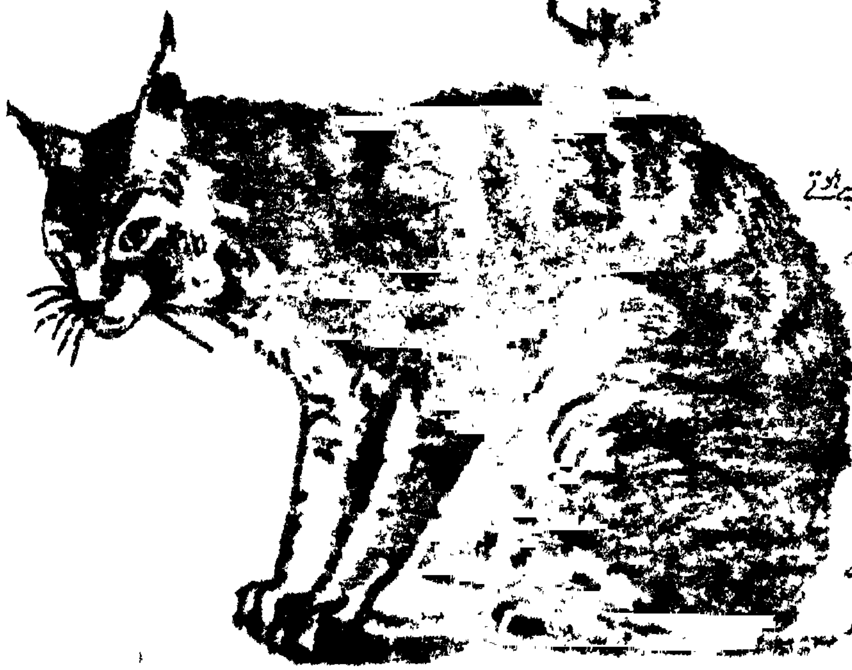


شیر

اسے جنگل کا راجا بھی کہتے ہیں لمبائی
آٹھ فٹ سے دس فیٹ تک ہوتی ہے
خوراک جنگل کے جانور۔ اور جب کبھی
آدمی کا خون مُنہ لگ جاتا ہے تو
آدم خور ہو جاتا ہے۔ اور پھر بستیوں
میں جا کر انسان کا شکار کرتا ہے۔



جنگلی بلّی



اس کے پیر لمبے ہوتے
ہیں۔ پالتو بلّیوں سے
بڑی ہوتی ہے
نیچے کا حصّہ سفید
اور اوپر کا بھورا
ہوتا ہے۔ خوراک
پرندے اور چھوٹے
چھوٹے جانور اور
مچھلی ہے۔

مجتبیٰ محمود۔ تہران



کیا خوب آدمی ہیں

میاں بدحواس بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ آپ کو ان سے مل کر بڑا لطف آئے گا۔ میں تو روز ہی ان کی مزیدار باتوں اور حرکتوں سے لطف اٹھاتا ہوں۔ لیکن آج آپ کو بھی ان کے بعض دلچسپ واقعات سنا کر ہنسانا چاہتا ہوں۔

میاں بدحواس سے میری ملاقات بالکل بدحواسی میں ہوئی۔ یعنی میں نے ایک بدحواسی کی اور میاں بدحواس سے میرا تعارف ہوگیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن میں خیابانِ فردوسی پہ بس کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ میرا ایک موٹا سا دوست جس کے سر اور ہاتھوں پہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں میری طرف چلا آ رہا تھا۔ میں بڑا پریشان ہوا کہ میرا عزیز دوست کس طرح زخمی ہو گیا؟ جب وہ میرے قریب آگیا تو میں نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے لیکن ساتھ ہی بہت ہمدردی سے پوچھا "کیوں یار موٹو! یہ کیا ہوگیا؟ اب جو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ موٹا آدمی میرا دوست پرویز نہیں ہے بلکہ کوئی اور شخص ہے۔ مجھے اپنی بدحواسی پہ بڑی شرمندگی محسوس ہوئی لیکن وہ موٹے حضرت مجھ سے

زیادہ بد حواس نکلے یعنی وہ بے چارے اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ میں ان کا کوئی گہرا دوست ہوں اسی لئے اتنی بے تکلفی سے پیش آرہا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے میرے سوال کے جواب میں لڑکیوں کی طرح شرماتے ہوئے اپنے موٹے موٹے گال ہلاتے یعنی فرمایا کہ "کیا بتاؤں یار! کل رات ذرا غایب دماغ اور بد حواس تھا اور چاہتا تھا کہ بس میں سوار ہو جاؤں"

ان کا یہ جواب سن کر میں نے بھی اپنی بات نبھانے کے لئے کہہ دیا۔ "غالباً بس چل رہی تھی اور تم نے سوار ہونے کی کوشش کی"

"نہیں بھئی بس نہیں چل رہی تھی" انھوں نے کہا۔

"اچھا! سمجھا تم اتنے بدحواس تھے کہ خود ہی بس سے ٹکرا گئے" میں بولا۔

"نہیں بھئی بات دراصل یہ ہے کہ وہاں بس تھی ہی نہیں" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ تھا ہمارا تعارف۔ اس دن کے بعد سے وہ تہران کے نئے دوستوں میں مجھے سب سے گہرے دوست ہیں اور اسی دن سے میں نے ان کا نام میاں بد حواس رکھا ہے لیکن ایک بات کا شبہ مجھے اب بھی ہے اور وہ یہ کہ ممکن ہے انھیں اب تک اس بات کا علم نہ ہو کہ میری ان کی پہلی ملاقات اسی دن خیابان فردوسی پر ہوئی تھی بلکہ وہ مجھے اب تک اپنا کوئی پرانا دوست ہی سمجھ رہے ہوں کیونکہ میاں بدحواس سے ہر قسم کی بدحواسی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ سوچتا ہوں کسی دن میاں بد حواس کو یہ لطیفہ سناؤں لیکن پھر خیال آتا ہے کہ شاید انھیں یقین نہ آئے۔

میں نہیں چاہتا کہ میاں بدحواس کی صورت شکل کو تفصیلی طور پر بیان کرکے اس مضمون میں ان کا مذاق اڑاؤں اس لئے ان کے چہرے کے متعلق صرف ایک بات بتا دیتا ہوں اور وہ یہ کہ میں جب کبھی ان کی صورت دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں بار بار یہ مصرع گردش کرنے لگتا ہے

"ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ"

میاں بدحواس صرف غائب دماغ ہی نہیں ہیں بلکہ بہت خوش مزاج ہیں اور ہنس مکھ آدمی ہیں اور بڑی مزے دار باتیں کرتے ہیں۔ ان خوبیوں کے علاوہ میاں بدحواس تھوڑے بہت شریر بھی ہیں اور کبھی کبھی ہنسنے ہنسانے کے لئے جان بوجھ کر بھی بدحواس بن جاتے ہیں۔

ایک دن وہ مجھے خیابان لالہ زار کی ایک دوکان میں نظر آئے۔ دیکھا کہ حضرت کی داڑھی مولویوں کی طرح بڑھی ہوئی ہے مجھے خیال ہوا کہ یہ بھی میاں بدحواس کی کوئی بدحواسی ہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ دو تین ہفتے تک داڑھی مونڈنا بھول گئے ہوں جس کی وجہ سے یہ شکل نکل آئی ہو۔

میں نے ان سے پوچھا "تمھاری داڑھی اتنی لمبی کیسی ہو گئی؟"

انھوں نے ہنستے ہوئے کہا "یہ میری اپنی داڑھی نہیں ہے۔ مصنوعی ہے۔"

میں نے پوچھا "کیوں؟ یہ مصنوعی داڑھی کیوں لگائی؟"

کہنے لگے "اس لئے کہ لوگ سمجھ نہ سکیں کہ میں نے آج صبح داڑھی نہیں بنائی۔"

وہاں سے وہ سیدھے اپنے گھر لے گئے۔ چائے پلائی، پیسٹری کھلائی اور اپنے بیوی بچوں سے ملایا اور پھر ہم سب مل کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ باتوں ہی باتوں میں میاں بدحواس ہوائی قلعے بنانے لگے اور اپنی بیوی سے بولے "اگر اس مرتبہ لاٹری کا انعام مجھے ملا تو میں ایک خوبصورت لال موٹر خریدوں گا اور پھر ہر روز ہم سب مل کر سیر کو جایا کریں گے۔"

بچوں میں سے ایک نے کہا "ابا مجھے بھی بٹھائیں گے نا؟ میں سامنے بیٹھنا چاہتا ہوں۔"

"بہت اچھا تم سامنے آ جاؤ۔ امی اندر بیٹھ جائیں گی۔" میاں بدحواس بولے۔

دوسرے بچے نے کہا "ابا۔ میں بھی سامنے بیٹھوں گا۔"

پہلے نے کہا "نہیں۔ سامنے میری جگہ ہے اور میں تمھیں بیٹھنے نہیں دوں گا۔"

دوسرا بچہ رونے لگا اور پھر دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ میاں بدحواس کو غصہ آ گیا اور

وہ بولے "بچو! شور نہ کرو ورنہ ابھی موٹر روک کر دونوں کو اتار دوں گا"

یہ سن کر بچے یکایک خاموش ہوگئے اور میاں بدحواس اپنے بچپن کے واقعات سنانے لگے۔ اسی دوران میں انھوں نے اپنے بچے سے کوئی بات پوچھی جس کے جواب میں اس نے کوئی جھوٹ بات کہہ دی اور بس میاں بدحواس نے شروع کر دیا نصیحت کرنا۔ تم ضرور نصیحتیں سننے سے بیزار ہوگے۔ خود میرا یہی حال ہے۔ جب بچہ ذرا بڑا ہوجاتا ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ میں سب کچھ سمجھتا ہوں پھر مجھے نصیحتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے اسی وجہ سے عقل مند لوگ بچوں کو نصیحت کرنے کے بجائے انھیں ایسی مزیدار کہانیاں سناتے ہیں جو سبق آموز بھی ہوتی ہیں۔

مگر بھئی ـــ جس طرح کی نصیحت ہمارے دوست میاں بدحواس نے کی ویسی نصیحت اگر تمھیں تمام دن بھی کی جائے تو تم ہرگز بیزار نہ ہوگے۔ جانتے ہو انھوں نے کیا کہا؟ انھوں نے کہا "بیٹا! تم کبھی جھوٹ نہیں بولتے لیکن آج تم نے پہلی مرتبہ جھوٹ کہا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں کیونکہ میں تمھیں ایک بالکل سچا واقعہ سناتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس واقعہ کو سن کر تم میں سے کوئی بھی پھر کبھی جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔

یہ قصہ آج سے کئی برس پہلے کا ہے۔

پرانے زمانے میں یہ قاعدہ تھا کہ اگر جہاز میں کوئی آدمی مرجاتا تو اسے تھیلے میں بند کرکے سمندر میں پھینک دیا جاتا۔ ایک مرتبہ ایک جہاز میں ایک آدمی مرگیا جو شہر مارسی کا باشندہ تھا جہاں کے لوگ جھوٹ بولنے میں ضرب المثل تھے۔ جہاز کے کپتان نے حکم دیا کہ مرے ہوئے آدمی کو تھیلے میں بند کرکے سمندر میں پھینک دیا جائے۔ دوسرے دن کپتان نے نوکر سے پوچھا "مردے کو سمندر میں پھینک دیا؟" نوکر نے جواب دیا "جی ہاں لیکن تھیلا سیتے وقت مجھے بڑی مشکل ہوئی" کپتان نے پوچھا "کیوں؟" نوکر نے جواب دیا "مردہ کہتا تھا کہ زندہ ہوں مگر میں چونکہ شہر مارسی کے لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں اس لئے میں نے اس کی بات نہ مانی اور اسے سمندر میں پھینک

دیا" تو سمجھا بچو! جھوٹ بولنے کی ایسی سزا ملتی ہے"
کیوں بھئی ــــ پسند آئی تمھیں میاں
بدحواس کی نصیحت؟

ایک مرتبہ میاں بدحواس نے مجھے ڈراما دیکھنے کی دعوت دی۔ انھوں نے اپنے اور میرے لئے ڈرامے کے دو ٹکٹ پہلے سے خرید لئے تھے۔ جب ہم دونوں ڈراما ہال پہنچ گئے تو میاں بدحواس نے کہا " لاحول ولاقوت ــــ بڑا برا ہوا کہ میں میز لانا بھول گیا"

میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے تعجب سے پوچھا " میز لاکر کیا کرتے ؟"

انھوں نے اطمینان سے جواب دیا" اس لئے کہ میں نے ڈرامے کے ٹکٹ میز کے خانے میں رکھے ہیں "

ــــ اور ہنستے ہنستے میرے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ آج دانشگاہ تہران (تہران یونیورسٹی) میں ایک جلسہ ہے۔ میں نے میاں بدحواس سے کہا " چلو جلسے میں چلو"

انھوں نے کہا" اچھا چلو" اور ہم دونوں دانشگاہ کی طرف روانہ ہو گئے

جب دانش گاہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ جلسہ شروع ہو چکا ہے۔ ہمیں بہت پیچھے جگہ ملی۔ خیر صاحب جوں توں کر کے بیٹھ گئے۔

ایک صاحب بادل کی طرح گرج رہے تھے کہ یکایک شور ہوا اور پھر ہال میں خاموشی طاری ہو گئی۔ پتہ چلا کہ ایک صاحب کی پاکٹ مار دی گئی ہے۔ وہ صدر صاحب سے اجازت لے کر مائیکروفون کے پاس پہنچے اور اعلان کیا ــ" حضرات! میری ایک پاکٹ یہاں گم ہے جس میں ایک ہزار روپے تھے۔ جن صاحب کو ملے براہ کرم مجھے واپس دیدیں۔ میں پاکٹ لانے والے آدمی کو سو روپے دینے کا اعلان کرتا ہوں"

ہال کے آخری حصہ سے ایک آواز گونجی
" میں ایک سو پانچ روپے دینے کے لئے تیار ہوں"

یہ آواز میاں بدحواس کی تھی!

ایک مرتبہ یہاں بدحواس کے ایک دوست دوسری منزل پر سے نیچے گر گئے۔ ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور انھیں دواخانہ پہنچا دیا۔ میاں بدحواس اپنے دوست کی بیوی کو اس افسوسناک

حادثہ کی اطلاع دیتے گئے۔ پہلے انھوں نے اپنے دوست کی بیوی کو سلام کیا اللہ پھر بولے "کہئے کیسی طبیعت ہے؟"

دوست کی بیوی نے کہا "خدا کا شکر ہے"۔

"بچے کیسے ہیں؟" انھوں نے پوچھا

"اچھے ہیں" اس نے کہا۔

یہ بولے "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو ایک افسوس ناک حادثہ کی اطلاع دینے آیا ہوں"۔

ان کے دوست کی بیوی نے پریشانی سے کہا "کیوں کیا ہوا؟"

آپ نے فرمایا "کچھ نہیں — ایک گھنٹے پہلے آپ کے شوہر کا کوٹ دوسری منزل پر سے نیچے گر گیا تھا"۔

"خیر یہ تو کوئی فکر کی بات نہیں"۔ ان کے دوست کی بیوی کو اطمینان ہو گیا۔

"ٹھیک ہے" انھوں نے کہا "لیکن افسوس کہ کوٹ جب نیچے گرا تو آپ کے شوہر اسے پہنے ہوئے تھے"۔

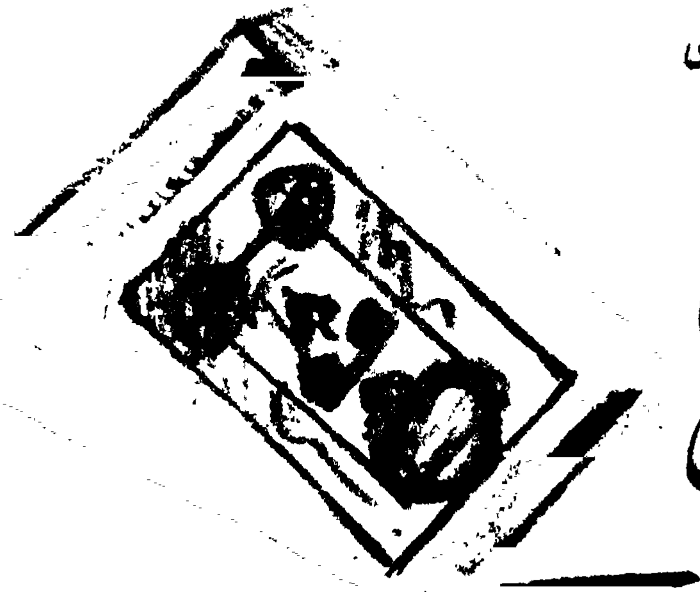
میاں بدحواس کی بدحواسیاں جہاں دوسروں پر بڑے بڑے ستم ڈھا چکی ہیں وہاں خود انھیں بھی عدالت کی ہوا کھلا چکی ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ ایک دن آپ سائیکل پر بازار گئے ہوئے تھے اور ہمیشہ کی طرح غائب دماغ اور بدحواس تھے۔ ان کے سامنے سے چھ فٹ کا ایک لمبا تڑنگا آدمی چلا آ رہا تھا۔ آپ نے نہ جانے کس دھن میں کوشش کی کہ اپنی سائیکل کو اس آدمی کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکال لیں — اور بس اب تم سمجھ سکتے ہو کہ کیا ہوا ہو گا۔ لیکن میاں بدحواس نے اب بھی ہمت نہ ہاری اور چوری اور سینہ زوری کی طرح لگے اس لمبے تڑنگے آدمی پر بگڑنے کہ تم اتنے لمبے کیوں ہو؟

غرض نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس لمبے آدمی کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ لمبے آدمی اور میاں بدحواس دونوں کی طرف سے وکیل مقرر تھے۔ اب ذرا لطف دیکھئے کہ جب مقدمہ شروع ہوا تو میاں بدحواس نے صاف صاف اپنے جرم اور اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ لیکن ان کے وکیل نے میاں بدحواس کو بچانے کی کوشش میں ایک لمبی چوڑی تقریر

(بقیہ صفحہ [illegible] پر دیکھئے)

محمد شمیم جیراجپوری

انوکھی ماچس



ایک سپاہی اپنے گھر آرہا تھا۔ راستے میں اُسے ایک بڑھیا ملی۔ بڑھیا بولی "تو کون ہے؟ اور کہاں جا رہا ہے۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہہ دے۔"

سپاہی نے سوچا کہ معلوم ہوتا ہے اس کے پاس روپیے ہیں۔ اور ادھر سپاہی بھی خالی ہاتھ گھر جا رہا تھا اس نے سوچا کہ اگر بڑھیا سے کچھ روپے مل جائیں گے تو میں اپنا ٹوٹا پھوٹا گھر چل کر پھر سے بنواؤں گا۔

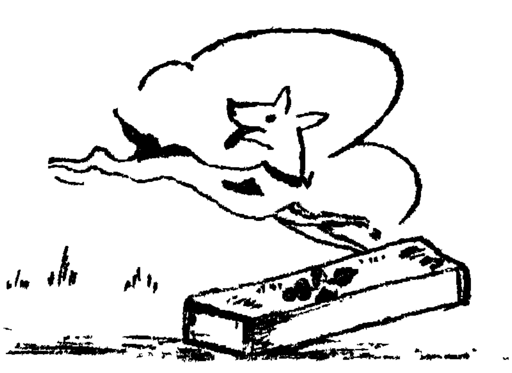
بڑھیا نے کہا "دیکھو یہ جو برگد کا درخت ہے نا اس کے اوپر ایک بڑا سا کھو کھلا ہے۔ تم اس میں اُتر جانا۔ نیچے جانے پر تم کو ایک مکان ملے گا۔ اس کے داہنی طرف والے کمرے کو تم کھولنا۔ دروازہ کھولنے پر تم دیکھو گے کہ ایک بہت بڑا صندوق ملے گا اور اس پر ایک بہت خوفناک کُتا بیٹھا ہوا ہے تم اس سے ڈرنا مت۔ یہ لو ایک جادو کا ڈنڈا اس سے اس کُتے کو چھو دینا اور کُتے کو صندوق سے اُتار کر اس میں سے روپیہ لے لینا۔ اسی طرح دوسرا کمرہ کھولنا اور اسی طرح پھر کُتا ملے گا اُس کے ساتھ بھی یہی کرنا۔ اور یہی تیسرے کمرے میں بھی کرنا۔ دیکھو روپیہ لے کر صندوق کو

منہ پر بند کر دینا۔ ہاں ایک کام میرا بھی کرنا ہوگا۔
تیسرے کمرے میں ایک ماچس کی ڈبیا ملے گی اسے
تم حفاظت سے لاکر مجھے دے دینا۔"

یہ سُن کر سپاہی فوراً اُس پیڑ پر چڑھ گیا جب وہ پیڑ کے اندر گیا تو اُس کو وہی سب کچھ ملا جو اس نے کہا تھا۔ اس نے تمام روپیہ ایک کپڑے میں باندھ دیا۔ اور کھوکھلے کے مُنہ پر آکر بُڑھیا کو آواز دی۔ بُڑھیا نے پُوچھا۔ ماچس لائے یا نہیں۔ سپاہی نے کہا ٹھہرو ابھی لاتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں سپاہی ماچس لے کر آیا اور بُڑھیا سے کہا اب تم مجھے نکال لو۔ بُڑھیا نے کہا۔ پہلے تم مجھے ماچس دے دو۔ سپاہی نے سوچا کہ معلوم ہوتا ہے یہ عورت کوئی جادوگرنی ہے اور ڈبیا لے کر مجھے یہیں چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔ سپاہی نے کہا تم مجھے اُوپر کھینچ لو تو میں تم کو ڈبیا دوں گا۔ یہ سُن کر بُڑھیا سپاہی پر جھپٹی اور اس ڈبیا کو چھیننا چاہا۔ مگر سپاہی نے اس کا گلا زور سے دبا کر ختم کر دیا۔

بُڑھیا کے مرجانے کے بعد سپاہی روپیوں اور ڈبیا کو لے کر گھر کی طرف چلا۔ وہاں جاکر اس نے دیکھا کہ اس کا گھر غائب تھا اور اس کی جگہ عالی شان مکان تھا۔ سپاہی نے پڑوسیوں سے پُوچھا کہ آخر بات کیا ہے۔ اُنھوں نے بتلایا کہ تمھارے مرجانے کے بعد بادشاہ نے تمھارا گھر گرواکر اپنا محل بنوا لیا ہے۔

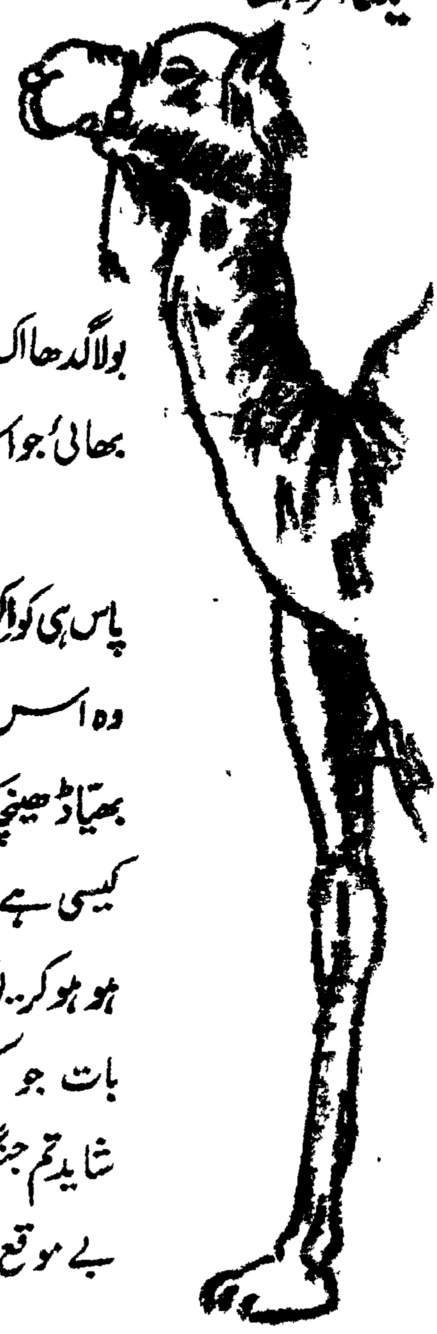
اب اسے ڈبیا کا خیال آیا اُس نے جلدی سے اپنے جھولے سے نکال کر کھولا۔ اس نے دیکھا کہ وہی تینوں کتے جو کھوکھلے میں ملے تھے ماچس میں کھڑے تھے۔ تینوں کتوں نے پُوچھا "کیا کام ہے؟" سپاہی نے کہا "جلدی سے اس بادشاہ کا خاتمہ کر دو۔" بس پھر کیا تھا ان کتوں نے بات کی بات میں ظالم بادشاہ کا خاتمہ کر دیا اور وہاں کے لوگوں نے سپاہی کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔



یکتا امروہوی

ڈھینچک الشعراء

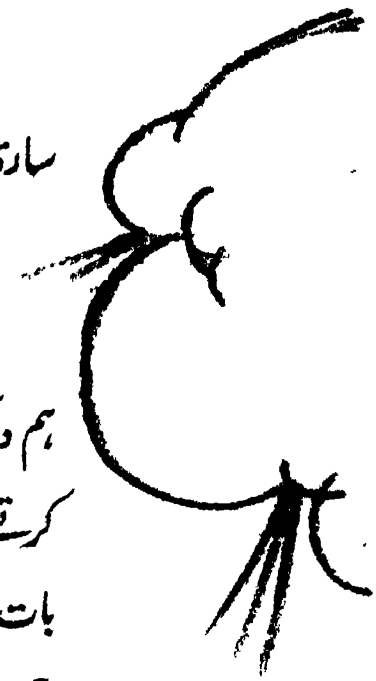
(تمام شعراء سے معذرت کے ساتھ جسمیں میں خود بھی شامل ہوں)



بولا گدھا اک، ڈھینچک ڈھینچک — کون کہے یہ، بھائی ذرا رُک !
بھائی جو اس کا ہو، وہ بولے — اس کے لئے وہ ہی لب کھولے

پاس ہی کو اک اونٹ کھڑا تھا — قد میں جو بے حد ہی بڑا تھا
وہ اس کی آواز پہ بولا — احمق پن سے کیوں منہ کھولا
بھیا ڈھینچک کچھ تو بتاؤ — بات بتاؤ، کان نہ کھاؤ
کیسی ہے آواز تمھاری — مدھم، پنچم، ہلکی بھاری
ہو ہو کر..یوں ترچھے آڑے — کیوں کانوں کے پردے پھاڑے
بات جو کہہ دوں رتی رتی — جھاڑو گے تم مجھ پہ دولتی
شاید تم جنگل میں بندھے ہو — سچ ہے تم بالکل ہی گدھے ہو
بے موقع منہ پھاڑا تم نے — اُف کتنا چنگھاڑا تم نے





ساری قوت جس میں لگا دی — زور میں آ کر دُم بھی اُٹھا دی

پیٹ پھُلایا اور پٹخایا ،

سارے جہاں کو سر پہ اُٹھایا !

ہم دیکھو خاموش ہیں کتنے — بڑ بڑ بڑ باہوش ہیں کتنے

کرتے نہیں ہیں بات چھچھوری — بے ڈھنگی سی سینہ زوری

بات سلیقے سے کرتے ہیں — ہم کم گوئی پر مرتے ہیں

احمق ہوتا ہے بڑ بولا — بے حد ہلکا جب بھی تولا

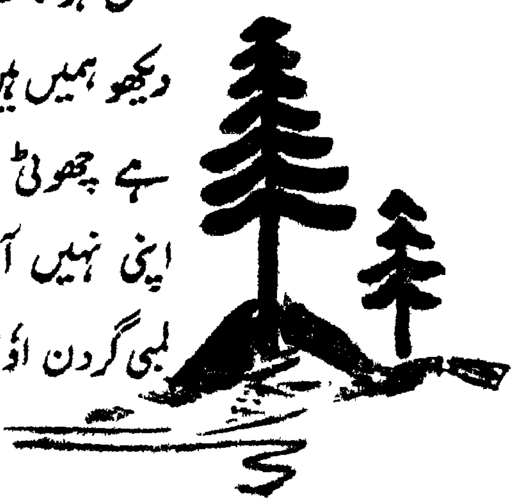
دیکھو ہمیں ہیں بھاری بھرکم — ہو جاتے ہیں شور سے برہم

ہے چھوٹی ہر بات ہماری — لمبی ہے بس لات ہماری

اپنی نہیں آواز بھی اونچی — اپنی نہیں پرواز بھی اونچی

لمبی گردن اونچا قد ہے — اور اونچائی کی اک حد ہے

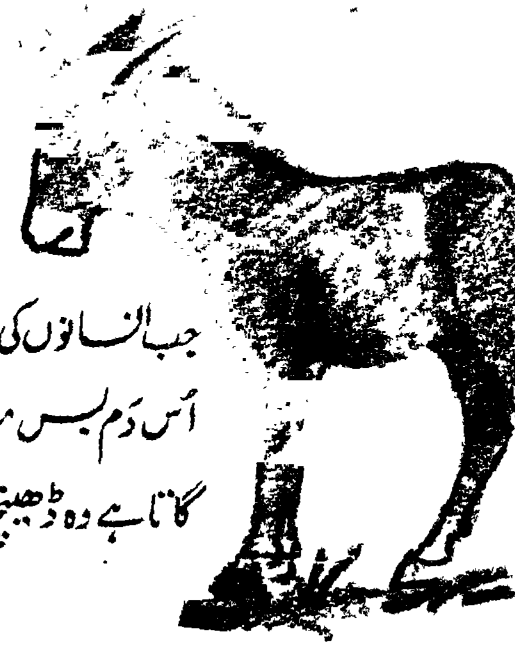
بڑھتے نہیں ہم اپنی حد سے





اونچی نہیں آواز بھی قد سے

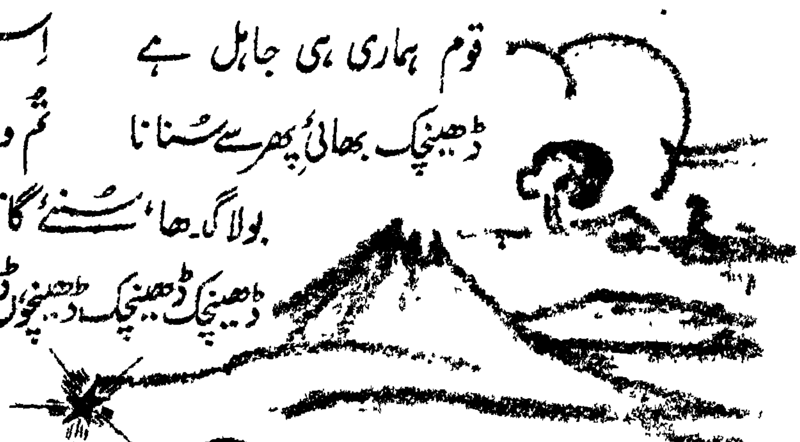
بولا گدھا یہ، اے مولانا   میں نے سنا یہ سب افسانہ
مَیں کب چیخا کب چلایا   کیوں احمق مجھ کو بتلایا
کیوں میری آواز کو ٹوکا   بولنے سے کیوں مجھ کو روکا
ان باتوں کو تم کیا سمجھو   بس تم خود کو اچھا سمجھو
جس نے خود کو اچھا جانا   وہ خود احمق اور دیوانا
ڈھینچک ڈھینچک ڈھینچوں ڈھینچوں   مَیں تو پرانا اک شاعر ہوں
تم کو خبر بھی ہے مولانا!   میرا تھا یہ قومی ترانا
میں نے ترنم تھا فرمایا   میرا ترنم تم کو نہ بھایا
میری غزل گر تم سن پاؤ   میرے ہی پھر تم گن گاؤ
میرے جتنے بھی ہیں گانے!   سب آزادی کے ہیں ترانے
قوم گدھا کا کوئی گدھا ہو   جھوٹ نہیں کہتا، سچ سمجھو!



جب انسانوں کی خدمت سے — بھاگتا ہے رسی کو تڑا کے
اُس دم بس میرا یہ گانا — یعنی آزادی کا ترانا!
گاتا ہے وہ ڈھینچوں ڈھینچوں — میں سُن سُن کر خوش ہوتا ہوں

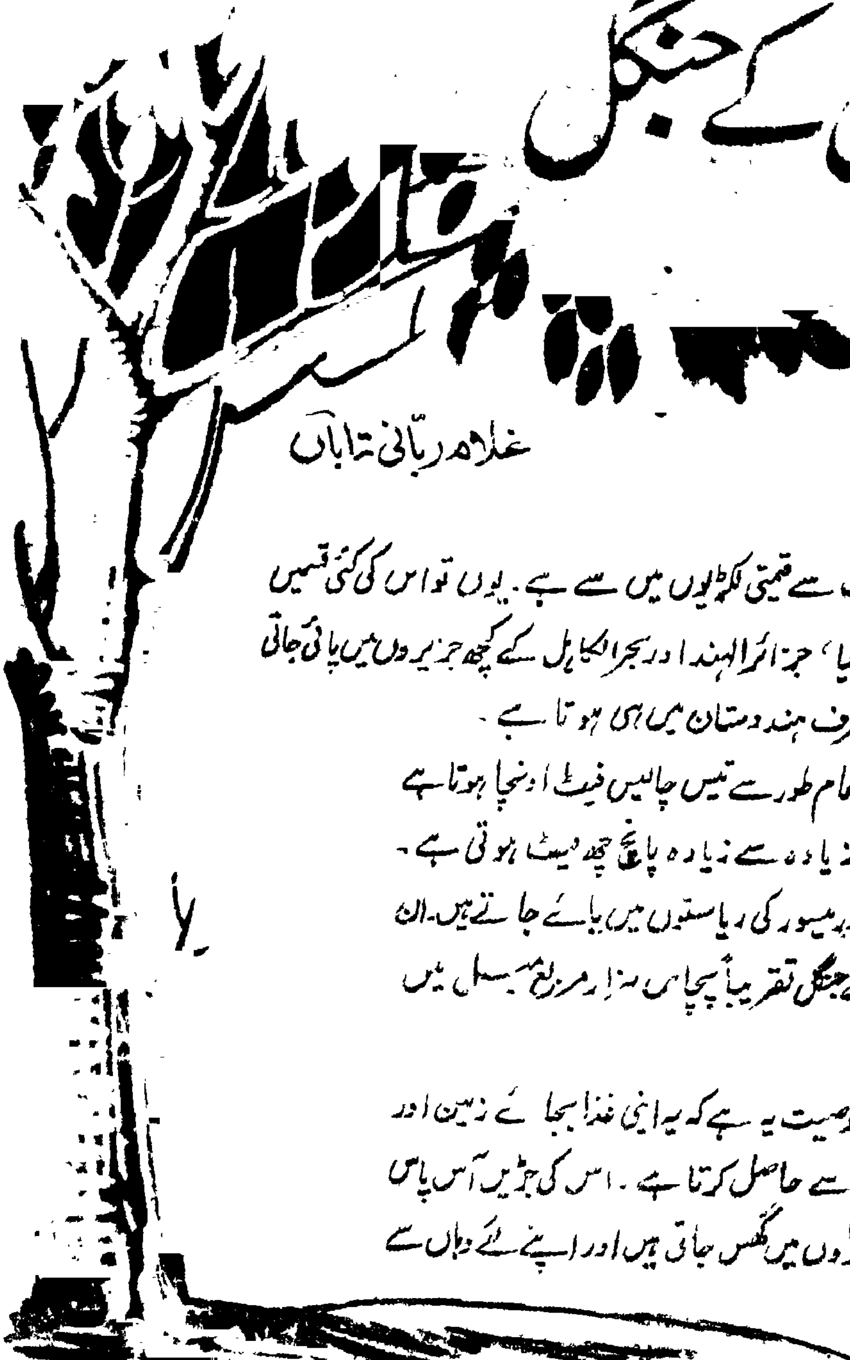
اونٹ نے جب یہ باتیں سنیں سب — اور پھر ان کا سمجھا مطلب
بولا گدھے سے وہ خوش ہو کر — آپ اگر شاعر ہیں برادر!
طول ہوا ہے بات کو کافی — چاہتا ہوں میں تم سے معافی
قوم ہماری ہی جاہل ہے — اِس کی آزادی مشکل ہے
ڈھینچک بھائی پھر سے سنانا — تم وہ اپنا قومی ترانا!

بولا گدھا سُنیے گاتا ہوں
ڈھینچک ڈھینچک ڈھینچوں ڈھینچوں



صندل کے جنگل

غلام ربّانی تاباں



صندل دنیا کی سب سے قیمتی لکڑیوں میں سے ہے۔ یوں تو اس کی کئی قسمیں ہیں جو ہندوستان، آسٹریلیا، جزائر الہند اور بحرالکاہل کے کچھ جزیروں میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اصل صندل صرف ہندوستان میں ہی ہوتا ہے۔

صندل کا درخت عام طور سے تیس چالیس فیٹ اونچا ہوتا ہے اور اس کے تنے کی موٹائی زیادہ سے زیادہ پانچ چھ فیٹ ہوتی ہے۔ اس کے جنگل بمبئی، کورگ اور میسور کی ریاستوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان تین ریاستوں میں اس کے جنگل تقریباً پچاس ہزار مربع میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔

صندل کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنی غذا بجائے زمین اور ہوا کے دوسرے درختوں سے حاصل کرتا ہے۔ اس کی جڑیں آس پاس کے دوسرے درختوں کی جڑوں میں گھس جاتی ہیں اور اپنے لئے وہاں سے

خوراک حاصل کرتی ہیں اگر آس پاس درخت نہ ہوں تو گھاس سے بھی یہ خوراک حاصل کر لیتا ہے جس درخت سے یہ اپنی خوراک حاصل کرتا ہے وہ رفتہ رفتہ کمزور ہو کر مرجھا جاتا ہے۔ اگر صندل کے درخت کے آس پاس دوسرے شاداب درخت یا گھاس نہ ہو تو یہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے صندل کے جنگلوں میں چھوٹی بڑی جھاڑیوں اور گھاس کا خاص طور سے انتظام کیا جاتا ہے۔

پہلے یہ پودے نرسریوں میں تیار کئے جاتے تھے۔ جب ذرا بڑے ہو جاتے تو ان کو گملوں میں لگا دیا جاتا — اور پھر گملوں سے نکال کر جنگل میں بو دئے جاتے تھے۔ اس طریقے سے جنگل تیار کرنے میں بہت روپیہ صرف ہوتا تھا۔ اب جنگل میں براہ راست بیج بونے کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ جہاں یہ بیج بوئے جاتے ہیں اس علاقے کے چاروں طرف خاردار جھاڑیاں لگا دی جاتی ہیں اور بوئی ہوئی زمین کو کانٹوں سے ڈھک دیا جاتا ہے اس طرح پودے جانوروں سے محفوظ بھی رہتے ہیں اور اپنی غذا بھی پاتے رہتے ہیں۔ اس نئے طریقے کی لاگت پچھلے طریقے سے کم ہونے کی وجہ سے جنگلوں کا رقبہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔

ان جنگلوں میں آگ لگنے کے حادثے بھی اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ صندل کی لکڑی میں آگ بہت جلد پکڑتی ہے۔ محکمہ جنگلات کو آگ کی روک تھام کے لئے ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے۔ صندل کے جنگل کی ایک اور دشمن ایک خاص قسم کی بیماری ہے جس سے متاثر ہو کر درخت کے پتے سکڑنے اور موٹے ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور درخت سال دو سال کے اندر خشک ہو جاتے ہیں سب سے پہلے اس بیماری کا حملہ تقریباً پچپن سال قبل کُرگ کے جنگل پر ہوا اور یہ تیزی کے ساتھ شمالی علاقوں میں پھیلنے لگی۔ یہاں تک اس کے اثرات پہنچے اس نے تباہی مچا دی۔ اب اس کا اثر کولار کے ضلع تک پہنچ چکا ہے۔ ہر ممکن کوشش کے باوجود ابھی تک اس کی روک تھام کا کوئی موثر طریقہ نہیں معلوم ہو سکا۔ ایک موقع پر چار میل لمبی اور آدھے میل چوڑی جگہ درختوں سے صاف کر کے اس کو جنگل کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں پھیلنے سے روکنے کی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اس بیماری کی وجہ سے میسور میں صندل کے جنگلوں کو ہر سال کافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ یوں تو صندل کے درخت کی چھال

بھی کام آجاتی ہے۔ لیکن اندر کے گودے میں ایک قسم کا تیل ہوتا ہے اس لئے یہ گودا زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ گودا خاصہ نرم ہوتا ہے اور خوشبودار بھی۔ اس گودے کی مقدار سوکھے ہوئے درخت میں ہرے درختوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے صندل کے ہر درخت کاٹے نہیں جاتے، بلکہ ہر سال اکتوبر نومبر میں گرے ہوئے خشک درخت جنگل سے اٹھا لئے جاتے ہیں۔

میسور میں صرف صندل کے جنگل ہی نہیں بلکہ کوئی بھی درخت حکومت کی اجازت کے بغیر نہیں کاٹا جا سکتا۔ محکمہ جنگلات گرے ہوئے درختوں کو اکٹھا کر کے سرکاری گوداموں میں پہنچا دیتا ہے۔ جہاں ان کی چھال کو صاف کر کے گودا نکالا جاتا ہے۔ یہ گودا سرکاری صندل کے کارخانے میں چلا جاتا ہے۔ اس کا تھوڑا سا حصہ غیر سرکاری کارخانوں کے ہاتھ بھی فروخت کر دیا جاتا ہے جہاں اس کا تیل نکالا جاتا ہے صندل کی لکڑی مختلف آرائش کا سامان بنانے میں بھی استعمال ہوتی ہے۔

پہلی جنگِ عظیم سے پہلے صندل کی تمام لکڑی چین، فرانس، جرمنی اور انگلستان چلی جاتی تھی۔ یہاں اس کا تیل نکالا جاتا تھا۔ یہ تیل دوائیں بنانے میں استعمال ہوتا تھا۔ جنگ کے بعد میسور میں صندل کا کارخانہ کھولا گیا جس نے اتنی ترقی کر لی کہ میسور کی صنعت میں اس نے اہم مقام بنا لیا۔ اب تو ملک کے دوسرے حصوں میں بھی چھوٹے بڑے کئی صندل کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ لیکن ابھی تک اس صنعت میں میسور آگے آگے ہے۔ ہر سال اس سے میسور کی حکومت کو لاکھوں روپیہ کا فائدہ ہوتا ہے صنعت کی ترقی کے ساتھ لوگوں اوسط آمدنی بھی بڑھ رہی ہے۔

ہندوستان اس وقت انتظامی اُمور کے لئے ۲۹ ریاستوں ۳۰۰ ضلعوں اور ۲۵۰۰ تحصیلوں میں تقسیم ہے۔ پورے مُلک میں ۵ لاکھ ۸۶ ہزار گاؤں ہیں۔

دِلّی جو ایک شہر تھا

مسعود الحق صدیقی



جمنا کے کنارے بار بار اُجڑ کر بار بار بسنے والی دلّی آج سے نہیں بہت پرانے زمانے سے لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتی چلی آئی ہے جس طرح آج دلی ہندوستان کے دل کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح آج سے ڈھائی تین ہزار سال پہلے کوروں پاوندوں کے زمانے میں "اندرپرست" کے نام سے اس کی بڑی مان دان تھی۔ اس چمن میں آٹھ بار بہار آئی اور آٹھ ہی بار خزاں نے اس کو ویران کیا۔ مگر ہر تباہی کے بعد یہ ایک نئے نام سے جلوہ گر ہوتی رہی۔

قطب مینار اور قطب مسجد ہمیں اس
لی" کی یاد دلاتے ہیں جس کی بنیاد
ی کے جہاں دیدہ جانشین قطب الدین
نے ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج کو
دے کر رکھی تھی۔

۱۳۰۳ء میں آبادی کے اضافے کی
سے علاؤالدین خلجی نے شمال و مغرب کی
بڑھ کر "سیری" کے مقام پر دوسری
ئی۔ اس وقت کی عمارتوں کے نشان
نڈروں کی صورت میں ہمیں اس زمانے
سی جھلک دکھاتے ہیں۔

غیاث الدین تغلق نے ۱۳۲۱ء میں
آباد" کے نام سے تیسری دلی بنائی۔
مینار سے چار میل مشرق میں غیاث الدین
اور دوسرے کھنڈر تیسری دلی کے
شہادت دیتے ہیں۔

ابھی تیسری دلی کو قائم ہوئے صرف کچھ
مدت گذری تھی کہ تغلق خاندان کے
سے بادشاہ محمد شاہ نے قطب اور
کے درمیان "جہاں پناہ" کے نام سے
دلی کی بنیاد ڈالی کہتے ہیں کہ پانچ میل
کے علاقے میں یہ شہر آباد کیا گیا تھا۔ اس میں
شمال کی جانب چھ اور جنوب اور مشرق
میں سات دروازے تھے۔ چراغ دہلی کا
گاؤں آج بھی موجود ہے، اس کے علاوہ
اس دہلی کے دوسرے کھنڈرات بھی موجود
ہیں۔

تغلق خاندان کے پہلے بادشاہوں کی طرح
اس کے تیسرے بادشاہ نے ۱۳۵۴ء میں
"فیروز آباد" کے نام سے پانچویں دلی قائم
کی۔ یہ دلی پچھلی دلیوں سے ذرا دور اور
موجودہ دلی سے قریب بنی۔ کرکٹ کے
ٹسٹ میچ جس جگہ ہوتے ہیں اس کے
قریب ہی فیروز شاہ کوٹلہ کے نام سے
ایک قلعہ ہے۔ یہی پانچویں دلی تھی۔ اس
کی یادگار کے طور پر خود قلعے کی دیواریں،
اشوک کی لاٹ، کالی مسجد اور مسجد کلاں
موجود ہیں۔

پرانا قلعہ دہلی کی تاریخی عمارتوں میں
بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ چھٹی دلی یہاں پر
بنی۔ اس کی تعمیر ہمایوں نے شروع کی۔
اور اس کو ختم شیر شاہ نے کرایا۔ اس کی

تکمیل میں تقریباً بارہ سال لگے۔

سترھویں صدی میں حکومت کی باگ ڈور شاہ جہاں نے اپنے ہاتھوں میں لی۔ کہتے ہیں کہ شاہ جہاں کو عمارتیں بنوانے کا شوق مرض کی حد تک تھا۔ اس نے اپنے نام کی مناسبت سے "شاہ جہاں آباد" نامی ساتویں دلی بنائی۔ یہ دلی آج کی دلی ہے۔ اس زمانے میں اس کے چاروں طرف ساڑھے پانچ میل لمبی ایک دیوار تھی۔ کشمیری گیٹ اور ترکمان گیٹ اسی دیوار کے دروازے ہیں۔ لال قلعہ اور جامع مسجد اسی دلی کی دو بہت مشہور عمارتیں ہیں۔

انگریزوں کی یادگار اور فنِ تعمیر کا شاہکار آٹھویں دلی ۱۹۱۲ء میں وجود میں آئی۔ آج ہم جس جگہ کو نئی دہلی کہتے ہیں یہ وہی ہے۔ اس شہر کا نقشہ بنانے والے مسٹر ایڈون لوٹنز ہیں۔ انھوں نے ہندو، بدھ اور مغل فنِ تعمیر کا بڑا حسین امتزاج پیدا کیا۔ چنانچہ آج نئی دہلی کی عمارتوں میں ان سب کے بہترین نمونے ہمیں نظر آتے ہیں۔ آج دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں اس کا نام سرِفہرست ہے۔ یہ جگہ خوبصورت ہے، عظیم ہے، عالیشان ہے۔ چوڑی چوڑی اور صاف ستھری سڑکیں، خوشنما پارک، بڑے بڑے ہوٹل اور کناٹ پلیس جیسے بے مثل بازار کی چہل پہل دیکھنے کے قابل ہیں۔ پارلیمنٹ ہاؤس، راشٹرپتی بھون، سنٹرل سکریٹریٹ، انڈیا گیٹ، آل انڈیا ریڈیو اور برلا مندر کی عمارتیں ایسی ہیں کہ جن پہ یہ بستی جتنا فخر کرے کم ہے۔"

اُجڑنے اور بسنے کے اس کھیل میں ہندوستان کے دل پر ایک زخم لگتا اور اس پر مرہم رکھا جاتا رہا۔ "امیر تیمور کی خون کی پیاسی تلوار نے دلی والوں سے کچھ اس طرح انتقام لیا تھا کہ دلی عرصۂ دراز تک خون کے آنسو روتی رہی۔ ان زخموں کو مندمل کرنے کی کوشش تو کی گئی۔ مگر وہ توانائی اور طاقت جو صحت مندی کی علامت ہے نہ پیدا ہوسکی۔ اکبر اور جہانگیر نے اپنے دادا کی طرح آگرے کو پسند کیا۔ مگر قدرت نے اس بے توجہی کی تلافی شاہ جہاں کو پیدا کرکے کر دی۔ اسی نے شاہ جہاں آباد کو بنا سنوار کر "عروس البلاد" بنا دیا۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے اور ۱۸۵۷ء کے واقعات نے دلی

کے سہاگ کو پھر لوٹا اور سے
"دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب"
کس مپرسی کی حالت میں پھر سنسان اور اُجاڑ ہوگیا۔ مغلوں کے آخری چراغ کو بجھانے کے بعد بدیسیوں نے پہلے تو دلی کو تاراج کیا مگر ۱۹۱۱ء میں قسمت نے پھر پلٹا کھایا اور نئی دلی کی تعمیر نے پھر کاری زخموں پر مرہم رکھا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء آیا۔ اس تاریخ نے تو صرف دلی ہی کیا سارے ہندوستان کی قسمت بدل دی۔ مگر ابھی دلی کو ایک آزمائش سے اور گذرنا تھا۔" ایک طرف بھارت ماتا کی غلامی کی زنجیریں کٹ گئیں، دلی اور دلی کو چاہنے والے آزاد ہو گئے۔ دوسری طرف دلی کی گلیوں میں کچھ اس طرح خون کی ہولی کھیلی گئی کہ امیر تیمور اور نادر شاہ کی یاد ماند پڑگئی۔ دلی رہ گئی، دلی والے نہ رہے۔ باغ رہ گیا بہار رخصت ہوگئی" مگر اب بہار لانے کے لئے شاہ جہاں کی ضرورت نہیں تھی۔ کسی گورے حکمران کی امداد نہیں چاہیئے تھی — ہندوستان لٹا پٹا دیس تھا۔ غریبوں اور جاہلوں کا دیس تھا۔ بھوک اور بیماری کا دیس تھا مگر تھا ہمارا دیس، اس کی مفلسی اس کی جہالت، اس کی بھوک اور اس کی بیماریاں دور کرکے اس چمن میں بہار لانے کا کام ہمارا اپنا کام تھا۔ چنانچہ ہم اور ہماری سرکار اس کام میں لگ گئے۔ ہم نے پچھلی تباہی کے آثار بڑی حد تک تو مٹا دیئے ہیں۔ دلی کی رونق پہلے سے زیادہ ہوگئی ہے۔ آج بھی ہماری سرکار کا دارالسلطنت دہلی ہی ہے۔ ایک آزاد ملک کی راج دھانی ہونے کے ناتے اس کی چہل پہل، اس کا ہنگامہ اس کی زندگی میں بڑا اضافہ ہوگیا ہے۔

یوں تو دہلی میں قدم قدم پر تاریخی عمارتیں اور ان کے کھنڈر ملتے ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر اپنی موجودگی سے آج بھی دلی کی عظمت کو دوبالا کر رہے ہیں۔

ان عمارتوں کا حُسن، اور ان کا تناسب ان کی مضبوطی اور ان کی عظمت کا ڈنکا نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں بجتا ہے۔ ان کو دیکھنے کے لئے لوگ دُور دُور سے آتے رہتے ہیں۔

جرہ بیگم

بادل کا سپنا



افراد :۔

شیلا ۔ آٹھ نو سال کی ایک لڑکی
بھیا ۔ نو دس سال کا لڑکا
اماں ۔ شیلا اور بھیا کی اماں
گھٹا ۔ دس بارہ سال کی لڑکی
چندا ماما ۔ سات آٹھ سال کا لڑکا
بادل کے بچے اور تارے

پہلا سین

مکان کے سامنے کا حصہ، کوٹھے پر جانے کے لئے ایک زینہ ہے۔ سامنے مکان رہے جس میں ایک دروازہ ہے، اور کھڑکی بند ہے اسٹیج پر دو مونڈھے

پڑے ہیں۔ اور دیوار کے ساتھ پلنگ لگے
رکھے ہوئے ہیں۔
وقت :- دوپہر
داہنی طرف سے شیلا بھاگتی ہوئی
آتی ہے۔
شیلا۔ (اٹھلاکر) اماں، اماں، دیکھو! یہ
بھیا نہیں مانتے۔
بھیا۔ (پیچھے پیچھے شیلا کی چوٹی پکڑے
آتا ہے، نقل کرتے ہوئے) اماں
اماں دیکھو یہ بھیا نہیں مانتے۔
شیلا۔ چھوڑو میری چوٹی۔ میرا ربن سب
پھٹ جائے گا۔
بھیا۔ ارے بھئی غضب ہو جائے گا رانی
صاحبہ کا فیشن بگڑ جائے گا۔
شیلا۔ دیکھو تم نہیں مانوگے۔ میں نے سو دفعہ
کہہ دیا کہ جب میں باہر جایا کروں
تو مت تنگ کیا کرو۔
بھیا۔ (ہاتھ جوڑ کر) معاف کیجئے سرکار! میں
بھول گیا تھا، تو لیڈی صاحبہ! آپ
گھومنے جا رہی ہیں۔
شیلا۔ (روہانسی ہوکر) ہٹو یہاں سے، میں
اپنے دوست کے گھر جا رہی ہوں
بھیا۔ کاش کہ ہم بھی آپ کے دوست
ہوتے۔
شیلا۔ معاف کیجئے! مجھے نہیں چاہئے
ہیں ایسے دوست جو ہر وقت
چڑھاتے ہی رہیں۔
بھیا۔ لیکن افسوس ہے، میں تو آپ کا
بھائی ہوں۔ چاہے آپ کو چاہئے
ہو یا نہیں۔
شیلا۔ بڑے اچھے بھائی ہو، جو ہر وقت
تنگ کرتے ہو، اوروں کے بھائی
پیار کرتے ہیں۔
بھیا۔ (شیلا کے گلے میں باہیں ڈال کر)
میری اچھی بہن، میری پیاری بہن
(شیلا اس کے ہاتھ الگ کرنے کی
کوشش کرتی ہے۔ مگر وہ بندر کی
طرح چمٹتا جاتا ہے)
شیلا۔ اماں، اماں دیکھو! یہ بھیا نہیں مانتے
اماں کی آواز "لے کیا کر رہا ہے
کیوں بہن کو ستا رہا ہے"
بھیا۔ ستا نہیں رہا ہوں، پیار کر رہا ہوں

میری پیاری سی بہن ۔

شیلا۔ کسی نہ کسی طرح اپنے کو چھڑا کر بھاگ جاتی ہے ۔ امّاں داہنی طرف سے تولیا سے ہاتھ پونچھتی اندر آتی ہے ۔

امّاں ۔کیوں ہر وقت بہن کو ستاتا رہتا ہے کبھی تو دونوں مل جُل کر رہا کرو ۔

بھیّا ۔ امّاں جی ! میں کہاں ستا رہا تھا ۔ میں تو ایسے ہی کر رہا تھا (ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیتا ہے ۔ میری پیاری سی بہن ، میری اچھی سی گڑیا بھلا اس میں ستانے کی کیا بات تھی ۔ تم ہی بتاؤ ۔

امّاں ۔ (ہنس کر) اچھا چلو نا ہٹو، جاؤ کچھ کام کرو ۔

شیلا ۔ امّاں ! میں جا رہی ہوں سیتا کے گھر ۔

امّاں ابھی سے ! اُس نے تو چار بجے بلایا تھا ۔ نہیں ابھی ساڑھے تین ہی بجے ہوں گے ، اور یہ چھتری کیوں لے جا رہی ہو ؟ پانی تو نہیں برس رہا ہے ۔

شیلا ۔ پانی نہیں تو دھوپ تو ہے ۔ یہ تو دھوپ کی چھتری ہے ۔

امّاں ۔ دھوپ بھی ایسی نہیں اور چار بجے تو بالکل نہ ہوگی ۔ چھتری رکھ دو ۔ اتنی تیز ہوا چل رہی ہے کہ چھتری کہیں پھٹ نہ جائے ۔

(امّاں یہ کہہ کر بائیں طرف سے چلی جاتی ہے)

بھیّا ۔ (شیلا کی نقل کرنے لگتا ہے) ہمیں تو دھوپ لگتی ہے ۔ ہم تو چھت میں لگا کر چلتے ہیں ۔

شیلا ۔ (چڑھ کر) پھر تم نے چھیڑنا شروع کر دیا ۔ ہماری چھتری ہے ۔ ہم چاہے لگائیں یا نہ لگائیں ۔

بھیّا ۔ (اس سے چھتری لینے کی کوشش کرتا ہے) ، تمہاری چھتری ہے تو کیا ، لاؤ رکھو ابھی امّاں نے کہا ہے کہ چھتری لے کر نہ جانا ۔ ہوا تیز چل رہی ہے ، کہیں اڑ نہ جاؤ مس صاحب ۔

شیلا ۔ (بھاگ کر) ہٹو ، ہٹو ۔ بڑی ہوا ہے ، ہم لگائیں گے چھتری ۔ (بھاگ کر

زینہ پر چڑھ جاتی ہے ، بھیّا ٹھوکر
کھاکر گرتا ہے ۔ پھر اٹھتا ہے اور
زور سے چلّاتا ہے)

بھیا۔ دیکھو! ہوا تیز ہے شیلا ۔

دوسرا منظر

پیچھے نیلا پردہ ، سامنے سفید سفید
بادل ۔ اسٹیج خالی ہے ۔ پیچھے سے
موسیقی کی آواز آتی ہے ۔
ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ
شیلا اندر داخل ہوتی ہے ۔
اسٹیج کے داہنے سرے پر رک کر
چاروں طرف دیکھنے لگتی ہے ۔ ایک
بادل کے پیچھے سے گھٹا دوڑ کر
آتی ہے ۔

گھٹا ۔ تم یہاں کیسے ؟

شیلا ۔ یہ کس کا گھر ہے ، یہاں کون رہتا
ہے ؟

گھٹا ۔ یہ آکاش ہے ، یہاں بادل کے
بچّے رہتے ہیں ۔ (بادل کے بچے
بادلوں میں سے نکل نکل کر آتے
ہیں ، اور شیلا کو دیکھنے لگتے ہیں ۔

بادل کے بچے ۔ یہ کون ہے ؟

گھٹا ۔ انسان

بادل کے بچے ۔ انسان ! انسان !!

شیلا ۔ (شیلا بچوں کو دیکھ کر) ارے
کیسے پیارے پیارے بچے ہیں کیا
یہی بادل کے بچے ہیں ؟

گھٹا ۔ ہاں !

شیلا ۔ اور آپ ان کی اماں ہیں ۔

گھٹا ۔ ہاں ! میں گھٹا ہوں ۔

شیلا ۔ کالی گھٹا ۔ ارے معاف کیجئے ۔
میرا مطلب ؟

گھٹا ۔ (ہنس کر) ہاں ! ہاں !! ٹھیک ہے
گھٹا کالی اور نیلی ہی ہوتی ہے ۔

شیلا ۔ مگر آپ کے بچے تو بڑے گورے
گورے ، پیارے پیارے ہوتے
ہیں ۔

گھٹا ۔ کیوں نہ ہوں ، سورج کی پہلی کرن
ان کو جنم دیتی ہے ۔ تالابوں اور
سمندر سے یہ بھاپ بن کر اڑتے
ہیں ۔ صاف اور ستھرے ۔ یہ
میرے پاس آتے ہیں ، یہ اجے

کیوں نہ ہوں ؟

شیلا۔ اُجلا تو ہماری امّاں بھی ہمیں کرتی ہیں، مگر جہاں زرا کوئی کام کیا، یا کھیل میں لگے پھر گندے ہوجاتے ہیں۔

گھٹا۔ یہ تو سچ ہے۔ بادل کے بچے بھی بہت کام کرتے ہیں۔ بہت دُور دُور جاتے ہیں، اور اکثر وہاں سے میلے ہوکر لوٹتے ہیں۔

شیلا۔ یہ ننھے مُنے بچے بھی کچھ کام کرتے ہیں۔

گھٹا بہت کام۔ یہ اُونچے اُونچے پربتوں پر جاتے ہیں، وہاں کہرا اور برف بن کر اترتے ہیں ان میں سے کچھ پہاڑوں کا ٹھنڈا جل لے کر پھر میدانوں کو پلٹتے ہیں، اور پیاسی زمین اور سوکھے کھیتوں کو سینچ کر پھر سے ہرا بھرا اور تروتازہ کرتے ہیں۔

شیلا۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ یہ بارش بن جاتے ہیں۔

گھٹا۔ ہاں! یہی بادل کے بچے، بارش، اولا، کہرا اور برف بن کر پھرے ندیوں، تالابوں اور سمندر میں مل جاتے ہیں۔

شیلا۔ لیکن یہ سب کام اُنہیں کون سکھاتا ہے۔ کیا ان کا کوئی اسکول ہے ؟

گھٹا۔ کیوں نہیں، اپنے اسکول میں یہ سب کچھ سیکھتے ہیں۔

شیلا۔ گاتے اور ناچتے بھی ہیں۔

(گھٹا سر ہلاتی ہے)

شیلا۔ (بچوں سے) ایک گانا ہمیں بھی سُناؤ۔

(بادل کے بچے گانا گاتے ہیں)

شیلا۔ تم لوگ تو بہت اچھا گاتے ہو، دیکھو! میں تمہیں ایک گانا سناتی ہوں۔

دیکھ کے اکیلی، مجھے برکھا ستائے
بالوں سے کھیلے کبھی چھینٹے اُڑائے

(بچّے خوش ہوکر شیلا کے ساتھ ناچنے لگتے ہیں)

گھٹا۔ یہ تو بہت اچھا ناچ تھا۔
(دو تین بادل کے بچے ایک بچے
کو کھینچ لاتے ہیں)
بادل کے بچے۔ دیدی، دیدی یہ رو رہا ہے
گھٹا۔ چھوٹے بچے کو گود میں لے کر
کیوں؟ تم رو کیوں رہے ہو۔
بادل کے بچے۔ یہ کہتا ہے ہم آئس کریم
کھائیں گے۔ آئس کریم۔
گھٹا۔ تم آئس کریم کھاؤ گے۔
(بچہ سر ہلاتا ہے)
گھٹا۔ تو آئس کریم کا موسم نہیں ہے۔ ابھی
تو برف نہیں بنی، ابھی تو جاڑے
نہیں آئے، ابھی تو برسات ہے۔
بادل کے بچے۔ دیدی، دیدی ہم بھی
آئس کریم کھائیں گے۔ آئس کریم،
آئس کریم۔
گھٹا۔ (کھڑی ہوکر) مگر نہیں، برسات میں
کیسے آئس کریم بن سکتی ہے۔ اچھا
تو پھر سب اولا، ملائی کھا سکتے
ہیں۔ لیکن پہلے تھوڑی بارش ہو
تب اولا بنے۔

بچے سب دوڑتے ہیں۔ اسٹیج پر
اندھیرا ہونے لگتا ہے۔ بادل
گرجنے کی آواز آتی ہے، بجلی
کوندتی ہے۔ بچے چھوٹی چھوٹی
پچکاریاں لے کر پانی کی بوچھار
کرنے لگتے ہیں۔ اور گاتے جاتے
ہیں۔ بادل گرجا۔ بادل ـــ
شیلا۔ (گھبرا کر) ارے، ارے یہ کیا
ہو رہا ہے۔ میں تو بھیگی جا رہی
ہوں، ارے، ارے۔
گھٹا (شیلا کا ہاتھ پکڑ کر) جاؤ اس
کرن سے اوپر چڑھ جاؤ۔ شیلا
دوڑتی ہے۔

تیسرا منظر

اسٹیج پر اندھیرا، پیچھے پردے
پر تارے جگمگا رہے ہیں۔ سامنے
اسٹیج پر کہیں کہیں تارے جگمگاتے
نظر آتے ہیں۔ پیچھے سے گانے کی
آواز آتی ہے۔ گانا شروع ہوتا
ہے اور تارے ناچتے جاتے ہیں۔
اسٹیج پر آہستہ آہستہ روشنی

ہوتی جاتی ہے ۔ اور بائیں طرف
سے شیلا آہستہ آہستہ اسٹیج پر آکر
کھڑی ہو جاتی ہے ۔

شیلا۔ تارے! میں سوچا کرتی تھی، کیا
کبھی میں تاروں تک پہنچ سکوں گی۔
پردے کے پاس سے چاند بھی
دھیرے دھیرے نکلنے لگتا ہے ۔

تارے:۔

ندی کنارے آئے چاند
دیکھ مجھے شرمائے چاند
ڈبکی لگائے، غوطہ کھائے
لہروں میں چھپ جائے چاند

پھول کنول کا پانی میں
دیکھ دیکھ للچائے چاند
جال بچھائے کرنوں کا
پھر جال میں پھنس جائے چاند

چاند۔ چاند بیچ اسٹیج پر آجاتا ہے ۔

شیلا۔ اچھا! آپ ہی ہیں چندا ماموں،
مگر ہماری دادی تو کہتی تھیں کہ چاند
میں ایک بڑھیا بیٹھی چرخا کاتتی ہے۔

چاند۔ جو چاہے سمجھ لو۔ یونان میں تو مجھے
سندر ناری کہتے ہیں۔ اور میرے
بڑے بڑے مندر تھے ۔ انگلستان
کے لوگ مجھے پاگل پن کی نشانی
مانتے ہیں۔ لیکن بچے تو مجھے اپنا
ماما ہی جانتے ہیں ۔

شیلا۔ مگر آپ کیسے ماما ہیں بچوں کے
پاس کبھی آتے ہیں، دور ہی دور
رہتے ہیں اور کبھی کبھی چھپ بھی
جاتے ہیں ۔

چاند۔ چھپ نہ جاؤں تو کیا کروں۔ میرے
بڑے بھیا سورج، جب سورج
ڈالتے ہیں، تب میں چمک اٹھتا
ہوں۔ جب روشنی نہیں ڈالتے
اس دن میں منہ چھپا لیتا ہوں۔

شیلا۔ ارے جب آپ دوسروں سے
روشنی لیتے ہیں، تو پھر ان ننھے
منے تاروں کو کیسے چمکاتے
ہوں گے ۔

چاند۔ ننھے منے تاروں۔ یہ بھی ایک
ہی رہی تم ان کو چھوٹا سمجھ رہی ہو
ارے یہ تو بہت بڑے ہیں۔ یہ

خود نہ جانے کب سے جگمگا رہے
ہیں۔
شیلا۔ سچ !
چاند۔ اور کیا۔ بڈھے ہوگئے ہیں۔ کبھی
کبھی تو کوئی کوئی ٹوٹ ٹوٹ کر
گر بھی پڑتا ہے۔
شیلا۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے تارو!
کیا تم سچ سچ چاند، سورج سے
بھی بڑے ہو۔
تارے۔ ستاروں سے آگے جہاں اور
بھی ہیں۔
شیلا۔ یہ کیا بات ہوئی۔
چاند۔ یہ تاروں کا راز زمین کے رہنے
والے نہیں سمجھ سکتے۔ یہ تو کسی
سے بات نہیں کرتے۔ میرے
ساتھ کبھی کبھی ہنسی دل لگی کرتے
ہیں۔ کبھی کوئی میرے پیچھے چھپ
جاتا ہے۔ کبھی کوئی مجھ سے آگے
آگے بھاگتے ہیں۔
تارے۔ چندا ماما دُور کے
بڑے پکائے بور کے

شیلا۔ یہ لوری تو میری ماں مجھے سُناتی
تھیں۔ جانے میری اماں کیا کر رہی
ہیں۔
چاند۔ کیا تم کو اماں یاد آرہی ہیں۔
شیلا۔ سر ہلاتی ہے۔
چاند۔ تو آؤ میں اماں کے پاس پہنچا نے
دوں۔ لو پکڑو میرا ہاتھ دیکھو!
اس کرن پر پیر رکھو۔ وہ دیکھو
تمہارا گھر نظر آرہا ہے۔ اچھا اب
ڈرنا نہیں۔

چوتھا منظر

اسٹیج کے درمیان میں ایک
چار پائی پڑی ہے۔ جس پر
شیلا لیٹی ہے۔ کرسی پر سرہانے
اس کی ماں بیٹھی ہے۔ پیچھے بھیا
بیٹھا ہے۔
ماں۔ نہ جانے اس کو کیا ہوگیا ابھی
تک آنکھ نہیں کھولی۔ اس نے۔
شیلا۔ (اُٹھ کر بیٹھتی ہے) اماں، اماں
میں کہاں ہوں ؟
ماں۔ کہاں ہوگی اپنے گھر میں۔

شیلا۔ میں تو آکاش پر گئی تھی۔ میں نے بادل کے بچّے دیکھے تھے۔ پیارے پیارے۔

بھیّا۔ اور اپنے گھر کی چھت آکاش ہوگئی۔

شیلا۔ نہیں بھیّا سچ مچ وہاں گھٹا تھی، اور میں نے تارے دیکھے۔

بھیّا۔ اب دن میں تارے نظر آنے لگے۔

شیلا۔ تم کو تو ہر بات میں مذاق سُوجھتا ہے۔ امّاں سنو تو! میں نے چاند سے باتیں کیں۔

بھیّا۔ (سر پر ہاتھ رکھ کر) بے چاری کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔

اماں۔ ارے چپ بھی (شیلا سے) ہاں ہاں بیٹا تم نے بڑا اچھا خواب دیکھا ہوگا۔ پر چل کر اب روٹی تو کھالے۔

شیلا۔ سپنا؟ سپنا؟ (کھڑی ہوکر سوچتی ہے۔ امّاں اور بھیّا ساتھ ساتھ چلے جاتے ہیں شیلا آسمان کی طرف مُنہ کرکے زور سے کہتی ہے) کیا سچ مچ یہ خواب ہی تھا۔ (پردہ)

بقیہ "چین کا آنکھوں دیکھا حال"

کے لئے بہت مشہور تھی۔ غور کیجئے کہ چھ سو سال سے یہ جھیل قائم ہے۔ کتنی حکومتیں آئیں اور گئیں۔ لیکن انھوں نے اسے خالی کرنے یا دریائے یانگ سی کو رام کرنے کا کوئی علاج نہ کیا۔ لیکن جب سے وہاں عام آدمیوں کی حکومت قائم ہوئی ہے اور انھیں دیسی اور بدیسی لٹیروں سے آزادی ملی ہے اس علاقے کے تمام کسانوں نے اس جھیل کو خالی کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کا پانی ایک بہت بڑی نہر کے ذریعے سمندر میں لے جا رہے ہیں۔ اور یانگ سی کی ہٹ اور بدچلنی کی روک تھام کے لئے ایسے بند بنائے ہیں کہ اب وہ پھر سیلاب نہ لا سکے گا چینی اپنے ملک کی غریبی اور افلاس کو دُور کرنے کے لئے اور بھی بڑے بڑے کام کر رہے ہیں۔ سوتی اور اونی کپڑوں کی ملیں اور کل پُرزے بنانے کے بھاری کارخانے کھل رہے ہیں۔ اس طرح کچھ دنوں کے بعد وہ باہر کے ملکوں کے محتاج نہ رہیں گے۔

مُشیر فاطمہ

انگلستان کا آنکھوں دیکھا حال



آزادی سے پہلے ہمارے دیس میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ اس وقت بہت سے انگریز ہمارے یہاں رہتے تھے اور ہم کو انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ ان کے متعلق ہم کو بہت سی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ انگریز ہمارے لئے بہت نئے اور نامعلوم نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی جب آدمی کہیں نئی جگہ جاتا ہے تو اس کو کچھ عجیب سا لگتا ہے، اور سوچتا ہے کہ وہاں رہنے میں پتہ نہیں کیا کیا دشواریاں پیش آئیں۔

انگلستان جانے سے پہلے میں نے وہاں کے متعلق اپنے دوستوں اور بزرگوں سے معلومات حاصل کی ہمارے جو دوست اور ساتھی انگلستان میں تھے ان سے خط کے ذریعے تازہ معلومات حاصل کرلیں، بمبئی سے ۲۱ دن میں لندن پہنچی، وہاں ہمارے دوست اسٹیشن پر لینے آئے تھے۔ ان کے ساتھ اپنے کمرے پر پہنچ گئی (جو کہ انھوں نے پہلے سے ہمارے لئے کرائے پر لے لیا تھا)

۱۰ اکتوبر سے ہماری لندن کی زندگی شروع ہوتی ہے، سب سے پہلے تو ہم نے ہندوستان کے ہائی کمشنر کے دفتر میں اپنا نام رجسٹر کروایا اس کے بعد لندن یونیورسٹی داخلے کے لئے گئے، ہم کو اپنے داخلے کی اطلاع

ہندوستان ہی میں مل گئی تھی، وہاں فیس وغیرہ جمع ہوگئی اور دفتر سے ہم کو ضروری کاغذات ملے جس میں لندن کی سڑکوں کا نقشہ، بسوں اور زمین دوز ٹرینوں کا نقشہ بھی تھا، اب اس کی مدد سے ہم لندن کے کسی بھی حصے میں آسانی سے پہنچ سکتے تھے، لندن کی بسیں تو بمبئی کی جیسی تھی لال رنگ کی دو منزلہ بس تھی۔ مگر زمین دوز ٹرین ہمارے لئے نئی چیز تھی۔ جو لوگ بمبئی گئے ہیں ان کو شاید معلوم ہو کہ بھوپال کی بعض بعض جگہوں سے ٹرین سرنگ میں سے گزرتی ہے، بس ایسی ہی سمجھ لیجئے کہ لندن کی سڑکوں سے کئی گز نیچے سرنگیں کھود کر ریل کی پٹریوں کا جال پورے لندن میں بچھا ہوا ہے، ہر محلے میں اس کے کئی کئی اسٹیشن ہیں، جیسے ہم بس سے سفر کرتے ہیں۔ یہ ٹرین بہت تیز چلتی ہے، اور ہر پانچ یا دس منٹ پر روانہ ہوتی رہتی ہے، اس سے سفر کرنے سے لوگوں کا وقت بہت بچتا ہے، بس کی طرح دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑتا، اور لندن کی سڑکوں کی بھیڑ بھی اس سے کم ہوگئی ہے۔ کیونکہ لوگ سڑک کے اوپر چلنے کے بجائے سڑکوں کے نیچے چلنے لگے ہیں، ہاں ان سرنگوں تک پہنچنے کے لئے کہیں تو لفٹ لگے ہیں، اور کہیں بجلی سے چ والی سیڑھیاں ہیں، آپ سیڑھی پر کھڑے ہوجا بغیر ایک قدم اٹھائے ہوئے آپ نیچے پہنچ جائیں گے۔ ایسے ہی اوپر آنے کے لئے سیڑھیا ہیں۔

انگلستان کی دوکانیں بھی بہت بڑی او بہت اچھی سجی ہوتی ہیں، ہر دوکان کے باہر ایک بڑا سا شوکیس ہوتا ہے جس میں دوکان کی تمام چیزیں مع قیمت کے لگی ہوتی ہیں۔ آپ کو دوکان دار سے قیمت پوچھنی نہیں پڑتی۔ کہ آپ کے پاس فلاں چیز ہے اس کی کیا قیمت ہے۔ پھر یہ دوکانیں بہت بڑے بڑے ہال میں ہوتی ہیں بڑی دوکانوں میں تو چار یا پانچ منزلیں ہوتی ہیں اور ان میں سوئی سے لے کر موٹر تک مل جاتی ہے، سینما تھیٹر، ریل، ہوائی جہاز اور جہاز کے ٹکٹ خرید سکتے ہیں، بعض بینک کی شاخیں بھی اس دوکان میں ہوتی ہیں۔

انگلستان کے پارک اور تفریح گاہیں بہت مشہور ہیں، پارک میں بہت خوبصورت اور سائے دار درخت ہوتے ہیں، یہاں کے لان کا مقابلہ دنیا میں کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔ لندن

آکسفورڈ اور کیمبرج میں تو کئی کئی سو برس پُرانے لان ہیں، ایسے ہی بہت خوبصورت پھولوں کے پودوں اور بیلوں نے پارک کو اور بھی خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ مگر سردیوں میں برف اور تیز سردی کی وجہ سے تمام درخت پتّوں سے خالی ہو جاتے ہیں اور کیاریوں میں پھول بھی نہیں ہوتے۔ اکتوبر سے مارچ تک پھول پتّوں کا نام نہیں ہوگا۔ مگر مارچ کے آخر تک تمام درخت پھولوں اور پتّوں سے لد جاتے ہیں اور کیاریوں میں خوبصورت پھول دکھائی دینے لگتے ہیں۔

میونسپلٹی کی طرف سے ہر محلّے میں ایک پارک ضرور ہوتا ہے۔ لندن کے ہائڈ پارک ریجنٹ پارک اور کنسگٹن گارڈن بہت مشہور ہیں، چھٹی کے دن لوگ صبح سے شام تک یہاں تفریح کے لئے آتے ہیں، ان پارکوں کے بیچ میں چھوٹا سا تالاب بھی ہے، جس میں لوگ کشتیاں چلاتے ہیں، بچّے بھی اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیاں چلاتے ہیں۔

مجھے وہاں کی سب سے زیادہ جو چیز پسند آئی وہ ہیں لندن کے میوزیم، برٹش میوزیم کا نام تو آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ اس میں تمام دُنیا کی پرانی تہذیب کا خزانہ جمع ہے مصر کی ممی، یونان اور روم کی تہذیب کے نادر نمونے عربوں کی بہترین کتابیں اور ایجادیں میکسیکو کی تہذیب کے نمونے سب ہی اِس میں جمع ہیں پھر تمام دنیا کی نادر اور نایاب کتابوں کی بہترین لائبریری ہے جس میں ایک وقت میں ایک ہزار آدمی بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں۔

ایسے ہی نیچرل ہسٹری میوزیم قدرت کی تاریخ کے نادر نمونے ہیں، پرانے زمانے کے عجیب وغریب اور بڑے جانوروں کے ڈھانچے ہیں، اس کے علاوہ موجودہ زمانے کے ہر ملک کے جانور، پرندوں کیڑوں مکوڑوں کے ماڈل بھی تھے،

سائنس میوزیم میں دنیا کی سائنس کی ترقی دکھائی گئی ہے، اسٹیفنسن کے انجن سے لے کر موجودہ زمانے کا انجن۔ رائٹ کے ہوائی جہاز سے لے کر آج کے کومٹ جہاز کے نمونے ہیں۔ ایسی ہی تقریبًا ہر ایجاد کے نمونے ہیں، پہلے ٹیلیفون کا خیال کیسے پیدا ہوا پہلی سلائی کی مشین جو چرخے سے ملتی جلتی ہے، وقت معلوم کرنے کے قدیم طریقے اور آجکل کی گھڑیاں

ان میوزیم کو دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان میوزیم کی سیر کے بعد آدمی کی معلومات میں کتنا اضافہ ہوتا ہے جس کو کتابوں کے ذریعے حاصل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

میوزیم کے متعلق سب سے اچھی بات یہ ہے کہ انگلستان کے محکمۂ تعلیم نے اس بات کا خاص انتظام کیا ہے کہ تمام اسکولوں کے بچے ان میوزیم کو دیکھیں اس سے متعلق باقاعدہ معلومات حاصل کریں، ہر میوزیم میں بچوں کی مدد کے لئے ایک دفتر ہوتا ہے جو بچوں کو میوزیم دیکھنے کا صحیح طریقہ بتاتا ہے اور اس سے متعلق ضروری معلومات بھی پہنچاتا ہے۔

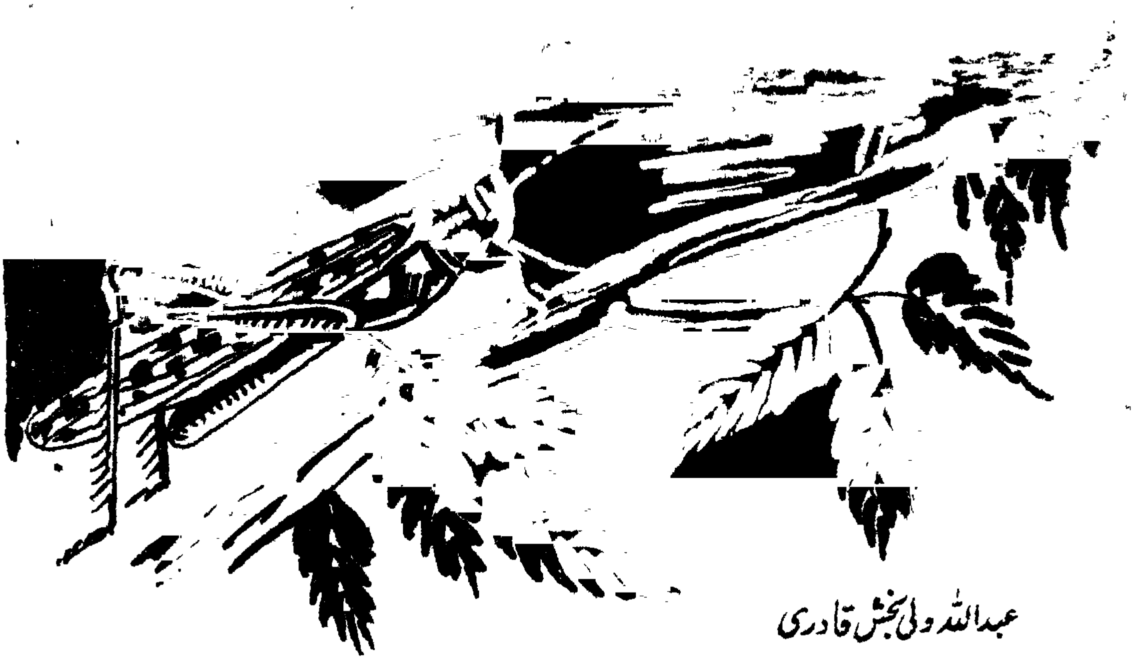
میوزیم کی طرح لندن کا زندہ عجائب گھر بھی دیکھنے کے قابل ہے، اس میں دنیا کے ہر قسم کے جانور پرندے کیڑے مکوڑے موجود ہیں، یہاں کی سب سے مشہور چیز چمپینزی ہے، یہ بندر اور آدمی کے بیچ کا جانور ہے، اپنے ہاتھوں کو استعمال کرسکتا ہے، روزانہ شام کو چار بجے اس کو پبلک کے سامنے چائے پلائی جاتی ہے جس میں یہ چمچہ استعمال کرتا ہے، جگ میں سے چائے انڈیلتا ہے اور بعد میں کیرم کھیلتا ہے۔

انگریز اپنی پرانی چیزوں اور رسم و رواج کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ قوم کے سرمایے کی حفاظت تو ہوتی ہی ہے، ہر شخص اپنے بزرگوں کی یادگاروں کو ضرور رکھتا ہے، ہر گھر میں دادا جان کی گھڑی اور نانی اماں کا سلائی کا بکس یا اس قسم کی دوسری چیزیں ضرور ہوتی ہیں، اپنے دیس کی پرانی چیزیں پچھلی صدی کے گلدان، چائے دانی، جگ یا کوئی دوسری چیز اپنے گھر میں ضرور رکھتے ہیں، اسی سے گھر کو سجاتے ہیں۔

انگریز بچے بڑے مہذب اور محنتی ہوتے ہیں وہاں نوکر تو ہوتے نہیں جس کی ہزار ڈیڑھ ہزار تنخواہ ہوگی وہی نوکر رکھ سکتا ہے، اس لئے گھر کا کام سب لوگ مل جل کر کرتے ہیں، بچے اسکول کے بعد اپنے ماں باپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اگر اماں کھانا پکاتی ہیں تو بچے برتن دھو دیتے ہیں اور ابا جان گھر کی صفائی میں مدد کرتے ہیں، اپنے باغیچے میں سارا کام خود ہی کرتے ہیں، کبھی مالی یا مزدور سے کام نہیں کرواتے ہیں۔

دوسروں کی مدد بڑی خوشی سے کرتے ہیں خاص کر پردیسیوں سے بہت اچھا برتاؤ کرتے ہیں، کسی بھی بچہ سے راستہ پوچھئے تو بہت تمیز سے ٹھیک ٹھیک

راستہ بتائے گا۔ جہاں تک جا سکتا ہوگا وہاں
تک چل کر راستہ دکھائے گا۔
پھر یہ بچے کسی کو گھور کر نہیں دیکھتے شاید
اس کی یہ بھی وجہ ہو کہ ان کے ملک میں دنیا کے
ہر حصّے سے لوگ آتے رہتے ہیں، اگر کبھی بس پر
یا کہیں راستے میں کسی بچے نے میری طرف دیکھنا
بھی چاہا تو ماں نے فوراً اشارے سے منع کر دیا
کبھی یہ نہیں ہوا کہ بچے میرے لباس وغیرہ کو
دیکھ کر ہنستے، یا کانا پھوسی کرتے، بعد میں والدین
بچوں کو بتا دیتے ہیں یہ لوگ کہاں سے آئے اور
کیسا لباس پہنتے ہیں۔



عبداللہ ولی بخش قادری

ٹڈّی

ٹڈیوں کے دَل کے دَل جب فضا میں پرواز کرنے لگتے ہیں تو آسمان پر اندھیرا سا چھا جاتا ہے اور زمین کے چپے چپے پر ان کی بیٹ دکھائی دیتی ہے۔ اس وقت کوئی دوسری چیز آسمان پر نظر نہیں آتی۔ یہ دیکھ کر بچے شور مچانے لگتے ہیں۔ کوئی جھاڑو لے کر چھت پر چڑھ جاتا ہے اور کوئی کپڑا لے کر میدان کی طرف بھاگتا ہے۔ ہر طرف "ٹڈی آئی" "ٹڈی آئی" "ہو ہو، ہے ہے" کا شور ہونے لگتا ہے۔ لیکن دیہات کے اندر کسان کا دل انھیں دیکھ کر دہلنے لگتا ہے۔ باغوں کے رکھوالے فکرمند ہوجاتے ہیں کیونکہ یہ ہرے بھرے کھیتوں اور شاداب پیڑ پودوں پر بیٹھ کر انھیں کھا جاتی ہیں۔ اور ذرا سی دیر میں دنوں اور مہینوں کی محنت خاک میں مل جاتی ہے۔ یہ ٹڈیاں ہمارے لئے نئی نہیں ہیں، بلکہ

بہت قدیم زمانے سے پائی جاتی ہیں۔ ان کا ذکر انجیلِ مقدس اور قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انسان نے انھیں کھانے کے لئے استعمال کیا ہے۔ آج بھی بہت سے لوگ انھیں بھون کر کھاتے ہیں۔

درحقیقت یہ ٹڈّیاں گھاس کے عام ٹڈّوں کی ہی ایک قسم ہیں۔ یہ بہت کثرت سے انڈے بچے دیتی ہیں اور بہت جلدی نسل بڑھ جاتی ہے ان میں بے پناہ مسافت طے کرنے کی اہلیت ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے یہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچتی رہتی ہیں اور فصلوں کو بھاری نقصان پہنچا دیتی ہیں۔ اس لئے کسانوں کے پرانے دشمنوں میں ٹڈّیوں کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔

یوں تو ٹڈیاں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں عام طور پر پائی جانے والی ٹڈّی کو "ریگستانی ٹڈّی" کہا جاتا ہے۔ زیادہ تر ان کے حملے سندھ۔ بلوچستان۔ راجپوتانہ۔ پنجاب اور اُتر پردیش پر ہوتے رہے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ دَل آسام اور مدراس تک پہنچ جایا کرتے ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ ہمارے دیس میں ٹڈّی دَل ایک مقررہ نظام کے ماتحت آتے رہے ہیں اور ان کی مُدّتِ قیام چار سال سے لیکر نو سال تک ہوتی ہے۔ پرانے سرکاری کاغذات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۶۱ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک ٹڈیوں کے آٹھ بڑے حملے ہو چکے ہیں اور ۱۹۴۹ء سے جو نیا حملہ شروع ہوا ہے وہ ابھی تک برابر جاری ہے۔ تجربہ کار لوگوں کا قیاس ہے کہ ٹڈّیوں کا یہ دور اس سال کے آخر تک رہے گا۔ اس زمانے میں ٹڈّی دَل نہ صرف ہندوستان آتے رہے ہیں بلکہ پاکستان، افغانستان، ایران، عرب اور مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ممالک بھی ان کی زَد سے نہ بچ سکے۔ ابھی حال ہی میں جون اور جولائی کے مہینوں میں دہلی اتر پردیش اور پنجاب کے مختلف شہروں پر ان کے حملے ہو چکے ہیں۔ اور اب بھی ہوئے جا رہے ہیں۔

عام طور پر ٹڈیاں صرف دن میں اُڑا کرتی ہیں اور رات کو آرام کرنے کے لئے درختوں۔ فصلوں اور جھاڑیوں پر رک جاتی ہیں اور پتوں یا ہرے دانوں کو چاٹ جاتی ہیں۔ اگر کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی تب چٹیل

میدان ہی میں گر جاتی ہیں۔ یہ نیم اور پیاز سے ایک قسم کا پرہیز کرتی ہیں اور روئی۔ مکا۔ جوار باجرہ۔ گیہوں۔ گوبھی وغیرہ کی شوقین ہوتی ہیں۔ ان کے دَل شہروں پر سے عموماً گذرتے چلے جاتے ہیں مگر تیار فصلیں اور ہرے بھرے درخت دیکھ کر تمام ٹڈیاں ان پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ یہ ٹڈیوں کے دل بہت بڑی فوج کے دستوں کی طرح میلوں میں پھیلے ہوتے ہیں۔ ان کی گنتی تو نا ممکن ہے یہ دَل اکثر بیس بیس پچیس پچیس میل تک لمبے چوڑے ہوتے ہیں۔

ایک ٹڈی کی عمر تقریباً چھ مہینے ہوتی ہے اور ایک مادہ ٹڈی اپنی زندگی میں آٹھ سو کے لگ بھگ انڈے دیا کرتی ہے۔ آٹھ ہفتے کے اندر اندر انڈے سے بچہ نکل کر اُڑنے لگتا ہے۔ اس وقت ان بچوں کا رنگ ہرا ہوتا ہے۔ جس زمانے میں بارش کم ہوتی ہے زمین کے اندر نمی کم ہونے کی وجہ سے زیادہ تر انڈوں سے بچے نہیں نکل پاتے۔ یہ انڈے زمین کے اندر تین انچ سے لے کر چھ انچ تک گہرائی میں ہوا کرتے ہیں اور اس وجہ سے اکا دکا ٹڈیاں پیدا ہوکر رہ جاتی ہیں لیکن جب زیادہ بارش ہوتی ہے تو یہ اور زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں بے شمار ٹڈیاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کثرت کا کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ان کے اندر بہت لمبی اُڑان کر اور غول بنا کر دور دراز کی مسافت طے کرنے کی طاقت پیدا ہوجاتی ہے۔ بڑی ہوکر ٹڈی کا رنگ سیاہی مائل ہوجاتا ہے۔ یہ تین انچ کے قریب لمبی ہوتی ہے۔ ابھی تک کی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ راجپوتانہ۔ بحر قلزم اور خلیج فارس کے قریب ان کے مستقل ٹھکانے ہیں جہاں یہ لاتعداد پیدا ہوتی ہیں اور موافق موسم کی وجہ سے جب ان کی تعداد معمول سے زیادہ ہوجاتی ہے اس وقت ان کے دَل کے دَل ہندوستان۔ پاکستان اور دیگر ممالک کا رُخ کیا کرتے ہیں۔

ان کی روک تھام کے لئے ہماری حکومت کی طرف سے باقاعدہ انتظام ہے۔ جب یہ آجاتی ہیں تو ان کے برباد کرنے کی فوری تدبیر کی جاتی ہے۔ ہوائی جہاز تک سے ان کو مارنے کے لئے دوائیں چھڑکی جاتی ہیں۔ تاہم ان کو برباد کرنے کی مہم میں مقامی لوگوں

بھی حکومت کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ جہاں ٹڈیوں نے انڈے دے دئے ہوں اس کو پانی سے بھر دینا چاہیئے۔ ایسی جگہوں ہل چلا دینے سے بھی انڈوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اگر کسی جگہ ٹڈیاں بیٹھ گئی ہوں یا اُن کے بچے نکل آئے ہوں تب ان کے خاتمے کے لئے دوسرے طریقے استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ لیکن سب سے آسان ترکیب یہ ہے کہ ایسی جگہ پہ آگ لگا دی جائے۔ گمران تمام تدابیر کے باوجود ٹڈیاں کافی نقصان کر دیا کرتی ہیں ان سے پوری طرح اس وقت محفوظ رہا جا سکتا ہے جب ان کے پیدا ہونے کے مقامات پر ہی انھیں ختم کر دیا جائے آج کل وہ تمام ممالک جہاں پر ٹڈیوں کے دَل آیا کرتے ہیں، مِل جُل کر ان کے مستقل ٹھکانوں کا وجود مٹانے کی ہر ممکن تدابیر سوچنے میں مشغول ہیں، تاکہ یہ نیست و نابود ہو سکیں۔

ہمارے آئین کے محافظ

چیف جسٹس سپریم کورٹ ۔ ۔ ۔ جناب مہر چند مہاجن
جسٹس " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " گلنا دنڈ داس
" " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " ایس۔ آر۔ داس
" " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " مکرجی
" " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " این۔ ایچ۔ بھگواتی
" " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " غلام حسین
" " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " ٹی۔ ایل۔ وینکٹا رامانیہ آئر
" " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " ویون بوس



چنے کی دال

ا ع انصاری

ایک تھی مینا۔ اس نے کہیں چنے کا ایک دانہ پایا۔ اسے اس نے چکی میں ڈلا۔ دلنے سے چنے کی دو دالیں ہوگئیں۔ لیکن چکی سے ایک ہی دال باہر آئی۔ ایک چکی کے کھونٹے ہی میں پھنس کر رہ گئی۔ مینا بڑھئی کے پاس گئی اور اس سے کہا۔

"بڑھئی! بڑھئی! کھونٹا چیر، کھونٹے میں دال ہے۔ کیا کھاؤں، کیا پیوں، اور کیا لے کر پردیس جاؤں —؟

بڑھئی بولا —" واہ بڑی آئی دال والی — ایک دال کے لئے میں جاکر کھونٹا چیروں؟ چل دور ہو، میں نہیں چیرتا۔"

مینا یہاں سے راجا کے پاس گئی اور اس سے فریاد کی —" راجا! راجا! بڑھئی کو مار، بڑھئی کھونٹا نہیں چیرتا، کھونٹے میں دال ہے۔ کیا کھاؤں، کیا پیوں اور کیا لے کر پردیس جاؤں؟"

راجا نے جواب دیا۔ " چل دور ہو، شریر کہیں کی۔ آئی ہے، ایک دال کے لئے بڑھئی کو سزا دلوانے۔"

مینا یہاں سے محل میں رانی کے پاس گئی اور اس سے فریاد کی —" رانی! رانی! راجا کو چھوڑ دے۔ راجا بڑھئی کو نہیں مارتا، بڑھئی کھونٹا نہیں

چیرتا، کھونٹے میں دال ہے، کیا کھاؤں، کیا پیوں اور کیا لے کر پردیس جاؤں؟"

رانی بولی ـــ "واہ، ایک دال کے لئے میں اپنے راجا کو چھوڑ دوں؟ بڑی آئی ہے دال والی۔"

مینا یہاں سے سانپ کے پاس گئی۔ اور اس سے بولی ـــ "سانپ! سانپ! رانی کو ڈس رانی راجا کو نہیں چھوڑتی، راجا بڑھئی کو نہیں مارتا بڑھئی کھونٹا نہیں چیرتا، کھونٹے میں دال ہے۔ کیا کھاؤں، کیا پیوں اور کیا لے کر پردیس جاؤں۔"

سانپ بولا ـــ "واہ بھئی واہ، اچھی آئی حکم چلانے مجھ پر۔ ایک دال کے لئے میں جا کر رانی کو ڈسوں؟ چل دور ہو، میں نہیں ڈستا۔"

مینا یہاں سے لاٹھی کے پاس گئی اور اس سے بولی ـــ "لاٹھی! لاٹھی! سانپ کو پیٹ، سانپ رانی کو نہیں ڈستا۔ رانی راجا کو نہیں چھوڑتی، راجا بڑھئی کو نہیں مارتا، بڑھئی کھونٹا نہیں چیرتا ـــ کھونٹے میں دال ہے، کیا کھاؤں، کیا پیوں اور کیا لے کر پردیس جاؤں؟"

لاٹھی نے جواب دیا ـــ "واہ واہ کیا کہنے ہیں تمہارے!! ایک دال کے لئے میں جاؤں اور سانپ کو پیٹوں۔ جا بھاگ یہاں سے۔"

مینا یہاں سے بھاڑ یعنی آگ کے پاس گئی اور اس سے بولی ـــ "بھاڑ بھاڑ! لاٹھی کو جلا۔ لاٹھی سانپ کو نہیں پیٹتی، سانپ رانی کو نہیں ڈستا، رانی راجا کو نہیں چھوڑتی، راجا بڑھئی کو نہیں مارتا، بڑھئی کھونٹا نہیں چیرتا، کھونٹے میں دال ہے۔ کیا کھاؤں، کیا پیوں اور کیا لے کر پردیس جاؤں؟"

بھاڑ بولا ـــ "نہیں، میں تمہاری ایک دال کے لئے لاٹھی کو جلانے نہیں جاؤں گا۔"

مینا سمندر یعنی پانی کے پاس گئی اور اس سے بولی ـــ "سمندر! سمندر! بھاڑ کو بجھا دے بھاڑ لاٹھی کو نہیں جلاتا، لاٹھی سانپ کو نہیں مارتی، سانپ رانی کو نہیں ڈستا، رانی راجا کو نہیں چھوڑتی، راجا بڑھئی کو نہیں مارتا، بڑھئی کھونٹا نہیں چیرتا، کھونٹے میں دال ہے۔ کیا کھاؤں کیا پیوں اور کیا لے کر پردیس جاؤں؟"

سمندر نے جواب دیا ـــ "واہ مینا واہ! کیا خوب کہا تم نے!! ایک دال کے لئے میں بھاڑ بجھاؤں؟ جاؤ، میں نہیں بجھاؤں گا۔"

مینا یہاں سے سیدھی ہاتھی کے پاس پہنچی اور اس سے کہا ـــ "ہاتھی! ہاتھی! سمندر سُکھے

سارے پانی کو پی جا۔ سمندر پہاڑ کو نہیں بجھاتا پہاڑ لاٹھی کو نہیں جلاتا۔ لاٹھی سانپ کو نہیں پیٹتی، سانپ رانی کو نہیں ڈستا، رانی راجا کو نہیں چھوڑتی، راجا بڑھئی کو نہیں مارتا، بڑھئی کھونٹا نہیں چیرتا، کھونٹے میں دال ہے۔ کیا کھاؤں کیا پیوں اور کیا لے کر پردیس جاؤں؟"

ہاتھی چنگھاڑا اور بولا —"چل بھاگ یہاں سے، تیرے لئے میں جاؤں سارے سمندر کا پانی پینے؟"

مینا تیزی سے اڑتی ہوئی بنور کے پاس گئی۔ بنور ایک ایسی بیل ہے جس کی نہ تو جڑ ہوتی ہے اور نہ پتیاں۔ یہ موٹے دھاگے جیسی پیلے رنگ کی ہوتی ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اگر کسی بڑے سے بڑے درخت کے اوپر پھینک دیا جائے تو یہ آہستہ آہستہ اس پر پھیلتا جائے گا اور اسے جکڑتا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ درخت ایک دن خشک ہو کر ختم ہو جائے گا۔ مینا نے اس سے کہا —" بنور! بنور! ہاتھی پھان (یعنی اس کے پاؤں اور سونڈ کو درخت کی طرح جکڑ دے) ہاتھی سمندر کو نہیں خشک کرتا، سمندر پہاڑ کو نہیں بجھاتا پہاڑ لاٹھی کو نہیں جلاتا، لاٹھی سانپ کو نہیں پیٹتی، سانپ رانی کو نہیں ڈستا، رانی راجا کو نہیں چھوڑتی، راجا بڑھئی کو نہیں مارتا، بڑھئی کھونٹا نہیں چیرتا، کھونٹے میں دال ہے، کیا کھاؤں، کیا پیوں کیا لے کر پردیس جاؤں؟"

بنور نے کہا —"بی مینا! مجھے اتنی فرصت نہیں کہ میں ایک دال کے لئے ہاتھی کو جکڑنے جاؤں، اپنی راہ لو۔"

مینا چوہے کے پاس گئی اور اس سے "چوہے! چوہے! بنور کو کاٹ، بنور ہاتھی کو نہیں جکڑتی، ہاتھی سمندر کو خشک نہیں کرتا۔ سمندر پہاڑ کو نہیں بجھاتا، پہاڑ لاٹھی کو نہیں جلاتا، لاٹھی سانپ کو نہیں پیٹتی، سانپ رانی کو نہیں ڈستا، رانی راجا کو نہیں چھوڑتی، راجا بڑھئی کو نہیں مارتا، بڑھئی کھونٹے کو نہیں چیرتا، کھونٹے میں دال ہے، کیا کھاؤں، کیا پیوں اور کیا لے کر پردیس جاؤں؟"

چوہے نے جواب دیا —"نہیں میں ایک دال کے لئے بنور کاٹنے نہیں جا سکتا۔ چل بھاگ یہاں سے۔"

مینا نے کہا۔ اچھی بات ہے جاتی ہوں اور یہ کہہ کر وہ بلی کے پاس گئی اور اس سے

...ڑی کی ـــ "بلی! بلی! چوہے کو پکڑ، چوہا
...ر کو نہیں کاٹتا، بجوّر ہاتھی کو نہیں جکڑتی،
...تھی سمندر کو نہیں خشک کرتا۔ سمندر پہاڑ کو
...نہیں بجھاتا، پہاڑ لاٹھی کو نہیں جلاتا، لاٹھی سانپ
...نہیں پیٹتی، سانپ رانی کو نہیں ڈستا، رانی راجا
...نہیں چھوڑتی، راجا بڑھئی کو نہیں مارتا، بڑھئی
...ٹے کو نہیں چیرتا، کھونٹے میں دال ہے۔ کیا کھاؤں
...یا پیوں اور کیا لے کر پردیس جاؤں؟"

بلی تھی بھوکی۔ چوہے کا نام سنتے ہی اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ اسی وقت مینا کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوگئی۔

لیکن چوہے نے مینا کے ساتھ بلی کو جو آتے دیکھا، تو وہیں سے گڑگڑا کر کہنے لگا ـــ "مجھ کو چانپو وانپو مت کوئی ـــ میں بجوّر کاٹوں لوئی"

بجوّر نے مینا کے ساتھ جو چوہے کو آتے دیکھا تو کانپتی ہوئی بولی ـــ "مجھ کو کاٹو واٹو مت کوئی ـــ میں ہاتھی جکڑوں لوئی"

ہاتھی نے مینا کے ہمراہ جو بجوّر کو آتے دیکھا تو اس نے دور ہی سے کہا ـــ "مجھ کو جکڑو وکڑو مت کوئی ـــ میں سمندر سوکھوں لوئی۔"

سمندر نے مینا کے پیچھے ہاتھی کو جھومتے جھامتے آتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا۔ "مجھ کو سوکھو وکھو مت کوئی ـــ میں پہاڑ بجھاؤں لوئی۔"

پہاڑ نے سمندر کو مینا کے ساتھ آتے دیکھا تو بول اٹھا ـــ "مجھ کو بجھاؤ وجھاؤ مت کوئی ـــ میں لاٹھی جلاؤں لوئی۔"

لاٹھی نے پہاڑ کو مینا کے ساتھ اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا۔ "مجھ کو جلاؤ ولاؤ مت کوئی ـــ میں سانپ پیٹوں لوئی۔"

سانپ نے مینا کے آگے آگے لاٹھی کو آتے دیکھا تو کہنے لگا ـــ "مجھ کو پیٹو ویٹو مت کوئی ـــ میں رانی ڈسوں لوئی۔"

رانی نے دیکھا کہ مینا اپنے پیچھے پیچھے ایک بہت ہی خوفناک سانپ کو لئے چلی آرہی ہے، تو اس نے دور ہی سے چیخ کر کہا ـــ "مجھ کو ڈسو وسو مت کوئی ـــ میں راجا کو چھوڑوں لوئی۔"

رانی مینا کو ساتھ لے کر راجا کے پاس پہنچی۔ اور اس سے کہا کہ اگر آپ بڑھئی کو کھونٹا نہ چیرنے کے جرم میں سزا نہیں دیتے، تو میں آپ کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ راجا یہ سنتے ہی گھبرا اٹھا اور بولا ـــ "مجھ کو

چھوڑ دو، چھوڑ دو مت کوئی ـــــ میں بڑھئی مارو کوئی۔"

راجا نے بڑھئی کو بلوایا اور اس کو حکم دیا کہ جا کر ابھی کھونٹے کو چیر دے، نہیں تو میں تجھے بہت سخت سزا دوں گا۔ بڑھئی ہاتھ جوڑ کر بولا ـــــ "مجھ کو مارو دار و مت کوئی ـــــ میں کھونٹا چیروں توئی۔"

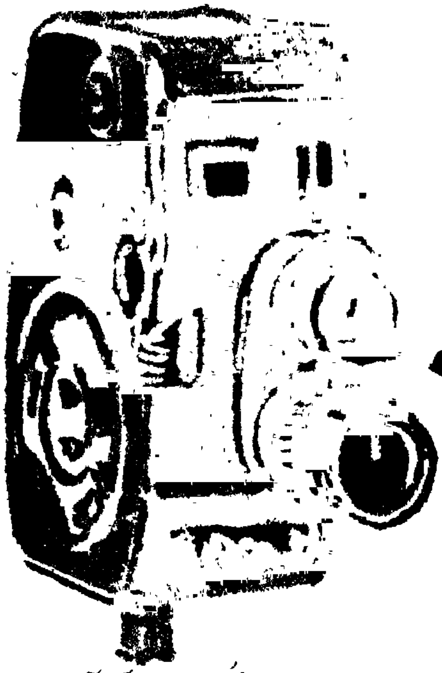
بڑھئی اسی وقت مینا کے ساتھ گیا۔ اس نے جا کر کھونٹے کو چیر دیا۔ چڑیا کی دال بھی چکّی سے باہر نکل آئی ـــــ دونوں دالوں کو اپنی چونچ میں دبا کر وہاں سے اڑ گئی۔

(بقیہ "ہماری زمین ہمارا گھر")

اور وہ بات یہ ہے کہ ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ سیارۂ زمین پر تمام انسان ایک دوسرے کے ساتھی مسافر ہیں۔ یہ زمین ہم سب کا گھر ہے اور ہمیں اسی گھر میں رہنا ہے اس لئے کہ ہمیں کسی دوسرے گھر کا پتہ معلوم نہیں ہے۔ یہ زمین اس جہاز کی طرح ہے جو سمندر میں اندھا دھند چلا جا رہا ہو۔ جہاز کے تمام مسافروں کی سلامتی اسی میں ہے کہ جہاز محفوظ رہے۔

ہم سب سیارۂ زمین پر ساتھی مسافر ہیں اس لئے سب انسانوں کا دُکھ سُکھ ہمارا دُکھ سُکھ ہے۔

فتح پور سیکری کا بلند دروازہ ہندستان کا سب سے زیادہ اونچا دروازہ ہے۔ اس کی عمر ۳۵۰ سال سے زیادہ ہے۔ اسے شہنشاہ اکبر نے ۱۶۰۲ء میں بنوایا تھا۔



سراج انور

اچھی تصویریں بنائیے

آپ میں سے بہت سوں کے پاس ایک ننھا منھا کیمرہ تو ضرور ہوگا۔ لیکن ممکن ہے کہ آپ نے
س سے اب تک جو تصاویر اتاری ہوں وہ اتنی صاف۔ واضح اور خوب صورت نہ آئی ہوں
نی کے آپ چاہتے ہیں۔ آئیے آپ کی اس مشکل کو حل کرتے ہوئے آج آپ کو یہ بتائیں کہ
پ اپنے کیمرے سے عمدہ تصاویر کس طرح بنا سکتے ہیں؟

سب سے پہلے تو آپ کے پاس ایک اچھا کیمرہ ہونا چاہیئے۔ اچھے [illegible] نہیں
ہ وہ قیمتی بھی ہو۔ بلکہ ایسا کیمرہ جس پر آپ بھروسہ کرسکیں [illegible] آپ آسانی سے سمجھ بھی
سکیں۔ اس کیمرے کو پہلے آپ اچھی طرح سے دیکھ لیجئے کہ اس میں کوئی [illegible] تو نہیں۔ یا کہیں سے
روشنی تو اندر نہیں پہنچتی۔ اس کے بعد آپ کو فلم کا استعمال [illegible] دو قسم
کی فلمیں ان دنوں استعمال میں لائی جاتی [illegible] ORTHOCHROMATIC [illegible] اگر آپ
تمام تصاویر دھوپ میں بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو ORTHOCHROME [illegible] اور اگر
آپ سائے میں تصاویر لینا چاہتے ہوں تو PANCHROMATIC فلم [illegible] استعمال

میں اگر ذرا بھی گڑبڑ ہو گئی تو سمجھ لیجئے، معاملہ بھی چوپٹ ہے۔

اب جب کہ آپ فلم کیمرے میں ڈال لیں تو سب سے بڑی چیز خود اعتمادی اور ہمت ہے جو آپ میں ہونی چاہیئے۔ میں نے بہت سے ایسے لڑکوں کو دیکھا ہے جو اپنی پوری فلم محض اتنی سی بات کی خاطر خراب کر لیتے ہیں کہ وہ دھوپ میں پھر نا پسند نہیں کرتے۔ یا اگر کوئی تصویر انھیں سورج کی روشنی میں بنانا ہے اور سورج اُس وقت بادل کی اوٹ میں ہو گیا ہے تو وہ یہ انتظار نہیں کر سکتے کہ سورج نکل آئے، تب تصویر لی جائے، تصویر بنانے کے لئے گھبراہٹ کی نہیں، مستقل مزاجی کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد آپ کو روشنی کے متعلق واقفیت ہونی چاہیئے۔ یہ چیز چونکہ بہت ہی اہم ہے، اس لئے میں اسے ذرا تفصیل سے بتاؤنگا۔ تصویر بنانے کے لئے سورج کی روشنی بہت ہی ضروری ہے۔ اور روشنی بھی وہ جو بہت ہلکی ہو اور جس کی طرف وہ شخص آسانی سے دیکھ سکے جس کا فوٹو بنایا جا رہا ہے۔ سورج نکلنے کے دو گھنٹے بعد اور ڈوبنے سے دو گھنٹے پہلے کی روشنی بہت ہی عمدہ ہے۔ یعنی آپ صبح کو تصاویر سات بجے سے نو بجے تک اور شام کو پانچ بجے سے سات بجے تک بنا سکتے ہیں۔ دوپہر اس کے لئے یوں موزوں نہیں ہے کہ سورج بالکل سر کے اوپر ہوتا ہے اور اُس کی روشنی آنکھوں پر نہیں پڑ سکتی (مناظر ہر وقت لئے جا سکتے ہیں)

روشنی کے متعلق آپ سمجھ گئے نا۔ اب سنئے پس منظر کے متعلق۔

فرض کیجئے آپ اپنے چھوٹے بھائی اسلم کی تصویر لینا چاہتے ہیں۔ اسلم کو سامنے کھڑا کیجئے، اب اسلم کے پیچھے آپ کو جو کچھ نظر آ رہا ہے اُسے آپ پس منظر کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تک ہو کوشش کیجئے کہ پس منظر بالکل سادہ ہو۔ اُس میں اتنی جاذبیت نہ ہو کہ تصویر بننے کے بعد جب کوئی تصویر دیکھے تو اسلم پر تو بعد میں اُس کی نگاہ پڑے پہلے پس منظر کو دیکھنے لگے۔ پس منظر کی خوب صورتی اس چیز کو لے ڈوبے گی جس کو آپ تصویر میں نمایاں دکھانا چاہتے ہیں۔ اس لئے اسلم کے پیچھے ایک سادہ

کپڑا جس پہ شکنیں کم ہوں لٹکا دیجئے (خیال رہے یہ کپڑا اتنا بڑا ہو کہ تصویر میں مکمل آ جائے۔ یہ نہ ہو کہ اِدھر اُدھر کی چیزیں بھی نظر آنے لگیں)، یا اگر سادہ کپڑا نہیں ملتا تو کوئی دیوار یا کوئی جھاڑی ہی سہی۔ سادہ کپڑے سے میری مراد سفید کپڑا ہرگز نہیں۔ بلکہ ایک ایسا کپڑا جو نہ زیادہ گہرے رنگ کا ہو اور نہ زیادہ ہلکا۔ اور جس پر بیل بوٹے اور چار خانے بھی نہ پڑے ہوں۔ بس بالکل سادہ۔ اسلم کے پیچھے یہ کپڑا لٹکانے میں ذرا احتیاط سے کام لیجئے۔ شکنیں کہیں نہ ہونی چاہئیں۔

یہ سب چیزیں ہو گئیں۔ اب اپنے آپ کو اسلم کا فوٹو بنانے کے لئے تیار کر لیجئے۔ آپ نے پردہ بھی لٹکا دیا اور اسلم کو سامنے بھی کھڑا کر دیا۔ اب دیکھئے کہ سورج کی روشنی اسلم پر پڑ رہی ہے یا نہیں۔ پڑ رہی ہے نا۔ ٹھیک، اب آپ کیمرہ لے کر اسلم کے سامنے آ جائیے۔ کیمرہ مضبوطی سے آپ کے ہاتھ میں جما ہو۔ اب آپ ان چار باتوں کا خیال رکھئے (۱) کیمرے میں جو ایک گھنڈی سی B۔ I (آئی اور بی) پر لگی ہوتی ہے۔ اس وقت "آئی" پہ ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اسے "آئی" پر لگا لیجئے۔ کیونکہ B صرف چھاؤں میں فوٹو بنانے کے لئے ہوتا ہے (اس کے متعلق میں پھر آپ کو بتاؤں گا۔ فی الحال تو آپ دھوپ میں تصویر بنانا سیکھئے)۔ (۲) فلم کا نمبر ایک آپ کو کیمرے کی پشت پر ایک لال سے سوراخ میں نظر آ رہا ہے۔ (۳) چونکہ سورج کی روشنی آپ کی کمر پر پڑ رہی ہے۔ (جو ہمیشہ پڑنی چاہئے، کیوں کہ کیمرہ ہمیشہ اندھیرے میں رہنا چاہئے اور سورج کی روشنی فوٹو بناتے وقت ہرگز اُس لینس پر نہیں پڑنی چاہئے) اس لئے آپ کا سایہ اسلم پر پڑ رہا ہوگا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کوشش کیجئے کہ سایہ اسلم پر تو کیا بلکہ اُس حصے میں بھی نہ ہو، جتنا حصہ آپ کو اپنے کیمرے کے منظر دیکھنے والے شیشے (VIEW FINDER) میں نظر آ رہا ہے۔ (۴) کیمرہ اسلم کے چہرے سے زیادہ نیچے یا زیادہ اوپر تو نہیں ہے؟

اب آپ یہ دیکھئے کہ آپ کے منظر دکھانے والے شیشے (VIEW FINDERS) میں سے کون سا موزوں ہے۔ جس میں آپ اسلم کو دیکھیں۔ کیمرہ ایک چوکور ڈبے کی طرح ہوتا

ہے، جس کے سب سے سامنے والے حصے میں ایک لینس لگا ہوتا ہے، جس کے ذریعے تصویر کا عکس اندر کیمرے میں پہنچتا ہے، اس کے برابر ہی ڈبے کے دو رخوں پر دو مستطیل قسم کے شیشے لگے ہوتے ہیں، جن میں آپ کو سامنے کا منظر نظر آتا ہے، میری مراد انھیں سے ہے۔ اگر آپ کیمرہ سیدھا پکڑیں تو یہ شیشہ ▯ اس طرح ہو جائے گا، اگر آپ کیمرے کو ایک پہلو پہ لٹا دیں تو دوسرا شیشہ ▭ اس طرح ہو جائے گا، انگریزی میں پہلے والے کو VERTICAL اور دوسرے کو HORIZENTAL کہتے ہیں میں انھیں آپ کی آسانی کے لئے V اور H کا نام دے دیتا ہوں۔ اب آپ کو سوچنا یہ ہے کہ اسلم کو کون سے شیشے میں دیکھیں۔ V میں یا H میں۔ آپ اسلم کو V میں دیکھیں۔ کیونکہ اسلم اس وقت کھڑا ہے۔ یہ اب آپ کے اپنے دماغ پر منحصر ہے کہ کس چیز کو کس شیشے میں دیکھنا چاہیئے؟ بہت سے آدمیوں کو اگر دیکھنا ہو تو H میں اور اکیلے آدمی کو اگر دیکھنا ہو تو V میں دیکھیئے۔ آپ کے لئے ایک آسان سی مثال دیتا ہوں۔ قطب مینار کو آپ V والے شیشے میں دیکھیں گے۔ کیونکہ وہ سیدھا کھڑا ہے۔ اُسے اگر آپ H شیشے دیکھیں گے تو وہ پورا نظر نہیں آ سکتا۔ اسی طرح جامع مسجد کو آپ H والے شیشے میں دیکھیں کیونکہ جامع مسجد قطب مینار کی طرح سیدھی نہیں کھڑی ہوئی۔ بلکہ مجموعی طور پر زمین پر لیٹی ہوئی ہے۔ فرض کیجئے اسلم کے دائیں طرف آپ کو وہ پردہ جو آپ نے اُس کے پیچھے لٹکایا ہے ہٹا ہوا نظر آتا ہے تو آپ کیمرہ تھوڑا دائیں طرف کر لیجئے۔

اسلم سے اب کہیئے کہ وہ کیمرے کی طرف دیکھے۔ اُس سے کہیئے گھورے نہیں، ملائمت سے دیکھے۔ اگر وہ کوئی پوز بنانا چاہے تو پہلے اُسے بنا لے دیجئے۔ پھر خود جا کر اُسے ٹھیک کیجئے۔ اور یہ دیکھئے کہ اسلم کس طرف سے آپ کو خوبصورت نظر آتا ہے۔ اگر وہ خاموش ہے تو اُس سے کہیئے کہ وہ مسکرائے جب آپ ہر طرح سے مطمئن ہو جائیں تب کیمرے کا شٹر چلائیں۔ یہ نہیں کہ اسلم کا کان پکڑ کر اسے جہاں دل چاہا کھڑا کر دیا اور کھٹاک سے کیمرے کا بٹن دبا دیا۔ جب آپ اپنی فلم اور اپنا روپیہ ضائع کر رہے ہیں تو میری سمجھ

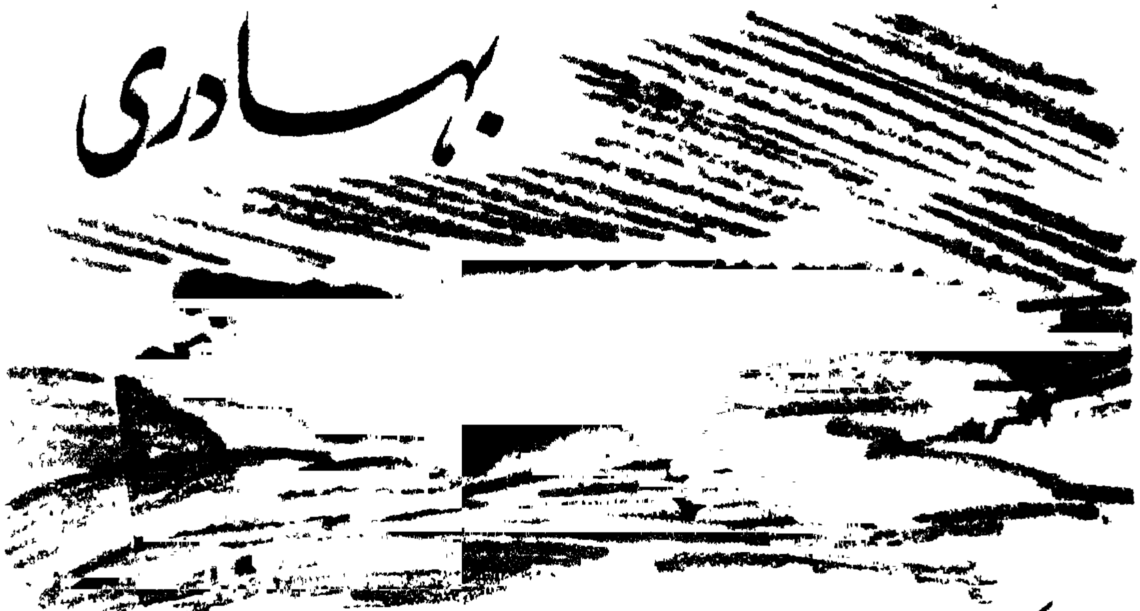
(بقیہ دیکھیے صفحہ ۱۲۲ پر)

مینا نے دیوالی منائی



فضل الرحمن نیازی

بہادری



کسی گاؤں میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ اس کا ایک لڑکا تھا۔ لڑکے کا نام ساجد تھا۔ ساجد بڑا نیک اور بہادر تھا۔

ساجد کو مچھلی کے شکار کا بڑا شوق تھا۔ ایک روز ساجد اپنی چھڑیں اٹھا کر ایک تالاب پر شکار کھیلنے گیا۔

ابھی اس نے ایک ہی مچھلی پکڑی تھی کہ ایک مگرمچھ نے اس کی ٹانگ گھسیٹ لی۔

ساجد چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو دیکھا کہ ایک بند سی کوٹھری میں وہ بند ہے۔

پہلے تو وہ گھبرایا پھر اس نے اپنی جیب سے بڑا چاقو نکال کر مگرمچھ کے پیٹ میں مار دیا۔ مگرمچھ کا پیٹ پھٹ گیا اور وہ مر گیا۔

ساجد باہر نکلا۔ اور مگرمچھ کے پیٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس میں سے اس کو سونے کے زیور ملے۔ جو مگرمچھ کی ماری ہوئی عورتوں کے تھے۔

جب بادشاہ کو اس بات کی خبر ہوئی تو اس نے ساجد کی بہادری کی داد دی۔ اور بہت سا انعام دیا۔ اور اس خوشی میں اس نے خوب پٹاخے چھڑائے۔

پٹاخوں کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔



اخگر مشتاق رحیم آبادی

نئی دُنیا

جہالت ہی سبب ہوتا ہے ذلت اور غریبی کا
جہالت ہی سبب ہوتا ہے اکثر بدنصیبی کا
جہالت جیسی لعنت کو زمانے سے مٹائیں گے
اِسی دُنیا کو ہم اک دن نئی دُنیا بنائیں گے

★

نہ باہم رنجشیں ہوں گی نہ باہم سختیاں ہوں گی
نہ یہ ظلم و ستم ہوں گے نہ یہ بدبختیاں ہوں گی
ستم رانوں میں لُطف و رحم کے جذبے جگائیں گے
اِسی دُنیا کو ہم اک دن نئی دُنیا بنائیں گے

★

[illegible] کر دیں گی یہ خزاں سامانیاں ساری
بہاروں میں بدل جائیں گی یہ ویرانیاں ساری

خدا چاہے تو ویرانوں کو بھی گلشن بنائیں گے
اسی دُنیا کو ہم اِک دن نئی دُنیا بنائیں گے

★

کسی صورت بھی ہم بجھنے نہ دیں گے کوششوں کی رَو
جو کم ہوتی نظر آئی چراغِ زندگی کی لَو

چراغِ زندگی میں خون بھی اپنا جلائیں گے
اسی دُنیا کو ہم اِک دن نئی دُنیا بنائیں گے

★

بزورِ علم ہی "انساں" نے طوفانوں کے رُخ موڑے
بزورِ علم ہی "انساں" نے تارے چرخ سے توڑے

خدا چاہے تو ہم بھی علم کی طاقت دکھائیں گے
اسی دُنیا کو ہم اِک دن نئی دُنیا بنائیں گے

★

فلک پر جگمگائے گا ستارہ آدمیت کا
زمیں پر بول بالا ہوگا پھر عدل و صداقت کا
زمانے کو سبق روشن ضمیری کا پڑھائیں گے
اِسی دُنیا کو ہم اِک دن نئی دُنیا بنائیں گے

★

نرالی شان کا ہوگا قریب و دُور کا عالم
نظر آئے گا تا حدِ نظر اِک نُور کا عالم
نئی شمعیں جلائیں گے نئی محفل سجائیں گے
اِسی دُنیا کو ہم اِک دن نئی دُنیا بنائیں گے

★

فروزاں ہوں گی ہر سینے میں شمعیں عزم و ہمت کی
کریں گے دل سے پوری ہر ضرورت ملک و ملت کی
ہم اپنے ملک و ملت کو نئی منزل پہ لائیں گے
اِسی دُنیا کو ہم اِک دن نئی دُنیا بنائیں گے

★

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

لکھنؤ کی سیر

آپ نے کبھی لکھنؤ کی سیر کی ہے ؟ اگر نہیں کی ہے تو ضرور کبھی نہ کبھی اس شہر کی سیر کر آئیے یہ آج کل کے صوبہ اتر پردیش کا دارالسلطنت ہونے ہی کی وجہ سے مشہور نہیں ہے بلکہ عرصہ ہوا ۱۷۷۵ء میں جب نواب آصف الدولہ نے اسے اپنی راجدھانی بنایا تھا اس وقت سے یہ شمالی ہند کا ایک بہت خوبصورت اور مشہور شہر رہا ہے ۔

آپ کی گاڑی جب اس کے ریلوے اسٹیشن پر رُکے گی اُسی وقت سے آپ پر اس کی خوبصورتی ظاہر ہونا شروع ہو جائے گی۔آپ شمالی ہند کے تمام ریلوے اسٹیشن دیکھ آئیں کہیں ایسا خوبصورت اور آرام دہ اسٹیشن نظر نہ آئے گا۔

لکھنؤ والے اسے چار باغ اسٹیشن کہتے ہیں کیونکہ نوابوں کے زمانے میں یہاں چار بڑے بڑے باغ تھے۔ یہ باغ تو اب رہے نہیں ہیں لیکن نام باقی رہ گیا ہے۔یہ چار باغ اسٹیشن کوئی تیس پینتیس برس ہوئے انگریزوں نے ستر لاکھ روپے کے خرچ سے بنوایا تھا۔

لکھنؤ باغوں اور پارکوں کا شہر ہے۔نوابوں کے زمانے میں تو یہاں کوئی تین چار سو اچھے

اچھے باغات تھے لیکن اب سوائے ایک دو کے کوئی باقی نہیں رہے۔ ہاں نام اب بھی ہے۔ جو باغات باقی رہ گئے ہیں اُن میں سب سے اچھا سکندر باغ ہے۔ آپ لکھنؤ آئیں تو اس باغ کو ضرور دیکھئے گا۔ اب سے حکومت نے سرکاری باغ قرار دیا ہے۔ اس میں سینکڑوں قسم کے درخت اور پودے سرکاری انتظام سے لگائے جاتے ہیں اور ان کی بڑی نگرانی کی جاتی ہے۔ یہ باغ دراصل واجد علی شاہ نے اپنی ایک بیگم سکندر محل کے لئے لگوایا تھا۔

دوسرا مشہور باغ بنارسی باغ ہے۔ اسے شاہ نصیرالدین نے بنوایا تھا اب اس میں زندہ عجائب خانہ ہے۔ جس میں دنیا بھر کے طرح طرح کے جانور آپ کو چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ شیر، گینڈا، کانگرو، طرح طرح کے بندر، طرح طرح کے پرند مثلاً شتر مُرغ، سفید مور، بہشتی پرند وغیرہ۔ یہ باغ بھی قابل دید چیز ہے۔

یہاں پارک بھی بہت ہیں تقریباً ہر محلے میں ایک پارک ضرور ملے گا۔ لیکن سب سے اچھے اور بڑے پارک وکٹوریا پارک، کمپنی باغ پارک اور قیصر باغ کے پارک ہیں۔ ان میں آپ چہل قدمی کریں گے تو لطف آ جائیگا۔

اچھا اب باغوں اور پارکوں کا ذکر چھوڑ یے یہاں کی پرانی شاہی عمارتیں اگر آپ نے نہ دیکھیں تو سمجھئے لکھنؤ دیکھا ہی نہیں۔ ان عمارتوں میں سب سے مشہور عمارت آصف الدولہ کا عظیم الشان امام باڑہ ہے۔ یہ ہندوستان کی مشہور عمارتوں میں سے ہے۔ اس میں آصف الدولہ اور ان کی بیوی شمس النساء بیگم کی قبر بھی ہے۔ خاص خوبی یہ ہے کہ چھت اتنی لمبی چوڑی ہے کہ شاید ہی کسی عمارت کی کہیں ہو اور اس میں کہیں بھی کسی قسم کی لکڑی نہیں لگائی گئی ہے۔ اس امام باڑہ کی مسجد بھی قابل دید ہے اور پھر اس میں ایک باؤلی (وہ کنواں جس میں زینے لگے ہوتے ہیں) بھی بہت وسیع بنی ہے اور اسی عمارت میں ایک بھول بھلیاں ہے جس کے اندر آپ جائیں تو بغیر راستہ بتائے آپ باہر نکل نہیں سکتے۔ آپ جب لکھنؤ آئیں تو سب سے پہلے اسی عمارت کو دیکھیں۔ یہ عمارت آصف الدولہ نے

اپنے سستے زمانے میں ایک کروڑ روپے
کے خرچ سے بنوائی تھی۔

ہاں یہ تو بھول ہی گیا۔ اسی امام باڑہ
کے باہر ایک بہت اونچا دروازہ ہے جس کا
نام رومی دروازہ ہے۔ یہ دروازہ بھی
آصف الدولہ ہی نے بنوایا تھا اور دیکھنے
کے لائق ہے۔

آصف الدولہ کے بعد اودھ کے جو
نواب ہوئے ان کا نام تھا سعادت علی خاں
انھوں نے بھی لکھنؤ کو خوبصورتی کے ساتھ سجانے
میں حصہ لیا۔ انھوں نے بھی بہت سی عمارتیں
یادگار چھوڑیں ہیں جن میں سے ریذیڈنسی،
لال بارہ دری، موتی محل، خورشید منزل (اب
اس میں لا مارٹی نیر گرلس اسکول ہے) حیات
بخش کوٹھی (اب یہ گورنمنٹ ہاؤس کہلاتا
ہے اور اتر پردیش کے گورنر اس میں رہتے
ہیں) دلکشا، اور درگاہ حضرت عباس، زیادہ
مشہور ہیں۔ ان میں سے موتی محل اور دلکشا
تو تقریباً مٹ گئے ہیں لیکن ان کے مٹے ہوئے
آثار بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔

سعادت علی خاں کے بعد غازی الدین
حیدر نواب ہوئے۔ نواب کیا بلکہ انگر
یز نے انھیں اب بادشاہ کا لقب دیدیا
انھوں نے بھی بڑی خوبصورت عمارتیں
اور وہ سب آپ ضرور دیکھیں۔ خاص
چھتر منزل (جو گومتی کے کنارے بڑی خو
اور بلند عمارت ہے اور جس میں آج کل
ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہے) شا
قابل دید ہیں۔

اسی بادشاہ نے سعادت علی خا
اور ان کی بیوی کے دو بلند مقبرے بھی
تھے جو آپ کو قیصر باغ کے پاس یہاں
میوزک کالج کے سامنے نظر آئیں گے۔
بادشاہ نے کانپور میں گنگا سے ایک نہ
نکالی تھی جو گومتی میں ملائی گئی تھی یہ نہر آ
بھی ہے اور یہ نہر غازی الدین حیدر کے نا
سے مشہور ہے۔

غازی الدین حیدر کے بعد ان کے
بیٹے نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے اس نے
بھی بہت سی قابل دید عمارتیں بنوائیں جو آج
بھی موجود ہیں۔ مثلاً بادشاہ باغ (جہاں آج
کل لکھنؤ یونیورسٹی قائم ہے) شیر دروازہ

دارالشفا (یہاں اب اسمبلی کے ممبران کی آرام گاہ بنا دی گئی ہے لیکن نام وہی قائم ہے)
بنارسی باغ (اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے)
کوٹھی روشن الدولہ، یہاں اب عدالتیں قائم ہیں۔ یہ کوٹھی نصیرالدین حیدر کے وزیر روشن الدولہ نے بنوائی تھی۔ ترواली کوٹھی اس میں اب امپیریل بینک ہے۔

نصیرالدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ انھوں نے سب سے عمدہ اور خوبصورت عمارت حسین آباد کا امام باڑہ بنوایا۔ اسے تاج محل کے نمونے پر بنوایا گیا تھا اور واقعی بہت خوبصورت اور دیکھنے کے قابل عمارت ہے۔ اس میں محمد علی شاہ اور ان کی ماں کی قبر بھی ہے۔ اسی امام باڑہ کے قریب محمد علی شاہ نے ایک بارہ دری بنوائی ہے جو پکچر گیلری کے نام سے بھی مشہور ہے اس میں تمام نوابین اودھ کی بڑی بڑی قد آدم تصویریں لگی ہوئی ہیں۔

محمد علی شاہ کے بعد امجد علی شاہ آئے۔ ان کے زمانے میں کوئی خاص عمارت نہ بن سکی لیکن انھوں نے اپنے وزیر امین الدولہ کے نام پر محلہ امین آباد قائم کیا جو آج کل شہر کا سب سے مشہور کاروباری بازار ہے۔

امجد علی شاہ کے بعد واجد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ ان کا نام تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ انھیں کے زمانے میں غدر ۱۸۵۷ء ہوا تھا اور انگریزوں نے ان سے سلطنت چھین لی تھی اور انھیں کلکتہ میں باقی عمر رہنے پر مجبور کیا تھا۔ انھیں بھی عمارتیں بنوانے کا بڑا سلیقہ اور شوق تھا لیکن بہت کم دنوں حکومت کر پائے۔ اس لئے تھوڑی سی عمارتیں بنوا پائے۔ ان میں سے قیصر باغ، سکندر باغ (جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے) بہت مشہور ہیں۔ حضرت گنج کا مشہور بازار بھی اسی بادشاہ نے قائم کیا تھا۔ نئی عمارتوں میں سے جو انگریزوں کے زمانے میں بنی ہیں۔ یا اب بن رہی ہیں۔ کونسل ہاؤس، نیا کونسل ہاؤس (دارالشفا)، جنرل پوسٹ آفس یونیورسٹی، میڈیکل کالج، ہسپتال، گورنمنٹ پریس اور حسین آباد کلاک ٹاور قابل دید عمارتیں ہیں۔

آپ شاید کہیں کہ اتنی ساری عمارتیں

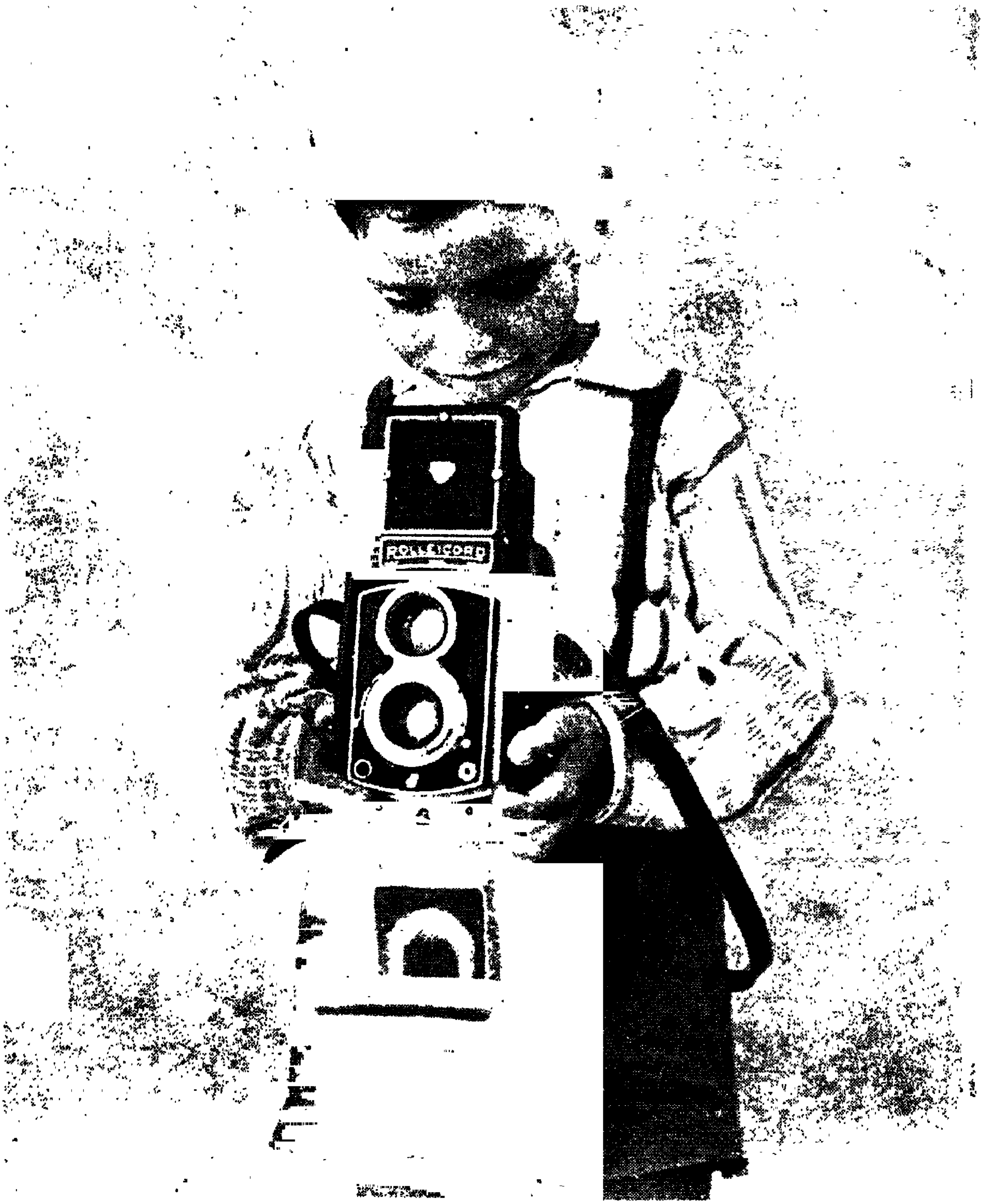
دو ایک دن میں کیسے دیکھی جا سکتی ہیں یہ صحیح ہے کہ جب تک آپ کم از کم ایک ہفتہ لکھنؤ میں نہ رہیں یہ سب عمارتیں اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن اگر آپ ایک ہی دو دن کے لئے لکھنؤ آئیں تو تو یہ عمارتیں ضرور دیکھ لیجئے گا ورنہ آپ کا لکھنؤ آنا بیکار ہوگا
آصف الدولہ کا امام بارہ، رومی دروازہ حسین آباد کا امام باڑہ۔ بارہ دری، چھتر منزل شاہ نجف، بنارسی باغ، سکندر باغ، قیصر باغ، کونسل ہاؤس، یونیورسٹی، میڈیکل کالج حسین آباد کلاک ٹاور۔

ہاں یہاں کے لوگوں کا حال اور یہاں کی اردو زبان کا ذکر تو رہ گیا۔ آپ نے یہ تو سنا ہوگا کہ یہاں کی اردو زبان کس قدر عمدہ اور مشہور ہے۔ لیکن اب اس کا ذکر پھر کبھی آئندہ کروں گا۔

بقیہ "اچھی تصویریں بنائیے"

میں نہیں آتا اس گھبراہٹ کا فائدہ کیا ہے جتنا آپ سوچیں گے، اتنی ہی آپ کی تصویروں میں خوبصورتی پیدا ہوتی چلی جائے گی۔
جب اس طرح پوری فلم بن جائے تو اُسے اگر آپ خود دھوتے ہوں تو دھو لیجئے۔ ورنہ کسی مقامی فوٹو گرافر کو دھلنے دے دیجئے از راہ کرم فلم کو کھول کر مت دیکھئے، جیسا کہ پچاس فی صدی آدمی کرتے ہیں۔ فلم کھول کر دیکھنے سے روشنی اُس میں پہنچ جائے گی اور فلم خراب ہو جائے گی۔

یہ تو تھا دھوپ میں تصویر بنانے کا طریقہ۔ اب چھاؤں میں (B کا استعمال) تصویر بنانے کا اور مناظر کھینچنے کا طریقہ میں انشاءاللہ آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔ میری بتائی ہوئی ہدایات اگر آپ کے لئے ناکافی ہوں تو پیام تعلیم کی معرفت خط لکھ کر آپ مجھ سے خود پوچھ سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا!



بس تیار ہوجائیے ـــــ شکریہ

فوٹو سراج انور



گلهشیر
اسی کی طرح برف
بهتی رهی



گلیشیر

محسن حامد

ہماری زمین بھی کتنی عجیب و غریب جگہ ہے۔ قدرت کے اس کارخانے میں جدھر بھی نظر ڈالیئے آپ کو ایسی ان گنت چیزیں نظر آئیں گی کہ انسانی عقل حیران ہی رہ جائے۔ یہ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ، بڑے بڑے سمندر، لمبے لمبے دریا جو ہزاروں میل کا سفر طے کر کے سمندر کی آغوش میں جا گرتے ہیں صاف شفاف پانی کی جھیلیں، لہلہاتی وادیاں، اور نہ جانے کتنی ایسی چیزیں ہیں جنھیں دیکھ کر انسان حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

آپ پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیوں کو فتح کرنے کی مہموں کا حال پڑھتے ہوں گے۔ اس میں آپ نے گلیشیر کا ذکر بار بار پڑھا ہوگا۔ یہ برف کے بڑے بڑے بہتے ہوئے تودے نہ صرف پہاڑوں پر ہی ملتے ہیں، بلکہ سرد ممالک میں جہاں بھی سال کے بیشتر حصّے میں برف باری ہوتی رہے پائے جاتے ہیں۔ خطِ استوا اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں گلیشیر صرف اونچے اونچے پہاڑوں ہی میں پائے جاتے ہیں۔ گلیشیر بننے کے لئے دو چیزوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اول یہ کہ درجۂ حرارت کم ہو اور دوسرے یہ کہ کافی برف باری ہو تاکہ گلیشیر میں سال بھر برف قائم رہے اور بھاپ بن کر اڑ جانے یا پانی بن کر بہ جانے سے

کی واقع نہ ہو۔

بعض سرد علاقوں میں ہر سال برف باری ہوتی ہے اور بعض زیادہ سرد حصوں میں جتنی برف گرتی ہے اس سے بہت کم پگھلتی ہے۔ اس لئے سال بہ سال برف کے ڈھیر جمع ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اس کے اپنے وزن یا دباؤ کی وجہ سے نیچے کی برف سخت اور ٹھوس ہو جاتی ہے۔ برف کا یہ تودہ گلیشیر کہلاتا ہے۔ جب یہ تودہ بہت بڑا ہو جاتا ہے تو محض اپنے وزن کے دباؤ سے پھسلنے اور حرکت کرنے لگتا ہے۔

پرانے زمانے میں بارہا گلیشیر دنیا کے وسیع علاقوں پر پھیلے رہے جن کی وجہ سے زمین کی سطح میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔

جب ایک گلیشیر میں برف کا تودہ پہاڑ سے نیچے کی طرف یا میدانی علاقے کی طرف حرکت کرتا ہے تو چٹان اور زمین کو توڑ پھوڑ کر ان کے ٹکڑوں کو اپنے ساتھ گھسیٹ لے جاتا ہے۔ اس برف کا پیندا نیچے کی چٹان کو بھی منجمد کر دیتا ہے۔ اس لئے جب گلیشیر حرکت کرتا ہے تو چٹان کے منجمد تودوں کو بھی اپنے ساتھ اکھیڑ لے جاتا ہے۔

اگر آب و ہوا زیادہ گرم ہو جائے تو گلیشیر کی برف اور زیادہ پگھل جائے گی۔ یہاں تک سارا گلیشیر غائب ہو جائے گا۔

وادی نما گلیشیر

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ گلیشیر بڑے پہاڑوں کی وادیوں میں پائے جا وادی نما گلیشیر کا دوسرا نام الپائن گلیشیر کیونکہ سب سے پہلے اس قسم کے گلیشیر مشہور پہاڑ ایلپس میں دریافت کئے دریا کی طرح اس گلیشیر کے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ جو پہاڑ کے مختلف حصوں لا لا کر بڑے گلیشیر میں ڈالتے رہتے ہیں سب سے بڑا وادی نما گلیشیر الاسکا جو تقریباً پچاس میل لمبا ہے۔ اس کے ایک گلیشیر کا نمبر ہے جو انچاس لمبائی میں وادی نما گلیشیر ۹ سے اور چوڑائی میں ۲ فرلانگ سے تقر لمبا ہو سکتا ہے۔ اور ان کی موٹائی سے لے کر کئی ہزار تک ہو سکتی ہے

پائیڈ ماونٹ گلیشیر

یہ گلیشیر بڑے بڑے پہاڑوں

جھیل کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ عام طور سے اس قسم کے گلیشیر کا برف وادی نما گلیشیر سے آتا ہے ہوتا یہ ہے کہ جب وادی نما گلیشیر بہتے بہتے پہاڑ کے نیچے اتر آتے ہیں تو اس کا برف ایک جگہ جمع ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جو بعد میں ایک بہت بڑی جھیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اسی کا نام پائڈ ماؤنٹ گلیشیر ہے۔

آئس کیپ

قطب شمالی اور قطب جنوبی کے قریب کے علاقوں میں جہاں تقریباً سال بھر درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے رہتا ہے۔ آئس کیپ گلیشیر پائے جاتے ہیں۔ جو سطح سمندر اور سطح مرتفع پر سینکڑوں میل دور دور تک پھیلے ہوتے ہیں۔ اسی قسم کے گلیشیر آئس لینڈ اور اسکنڈی نیویا میں بھی پائے جاتے ہیں۔

برّاعظمی گلیشیر

لمبائی اور چوڑائی کے لحاظ سے یہ گلیشیر کی سب سے بڑی قسم ہے۔ لاکھوں مربع میل میں پھیلنے والے یہ گلیشیر قطب شمالی اور قطب جنوبی کے نزدیک پائے جاتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک گلیشیر گرین لینڈ میں ہے جو ۵ لاکھ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ سطح زمین پر ہمیشہ کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کل جہاں پر بڑے بڑے سمندر موجزن تھے آج اونچے اونچے پہاڑ کھڑے ہیں۔ پرانی جھیلیں اب مٹی اور ریت سے پٹ کر سطح زمین کے برابر آگئی ہیں پرانے زمانے کے اونچے اونچے پہاڑوں کو دریاؤں گلیشیروں اور ہواؤں نے کاٹ کاٹ کر سمندر کی سطح تک پہنچا دیا ہے۔

ان ایجنٹس کو جو سطح زمین پر تبدیلیاں لاتے رہتے ہیں انگریزی میں WEATHRING AGENT کہتے ہیں گلیشیر بھی ان میں سے ایک ہے۔ یہ پہاڑوں سے چٹانیں کاٹ کاٹ کر بہت دور لے جاتا ہے اور ان کو وہاں جما دیتا ہے۔

کوہ پیماؤں کے لئے گلیشیر بہت خطرناک ہے۔ اس میں پڑی ہوئی بڑی بڑی دراڑیں جو تازہ گری ہوئی برف سے ڈھک جاتی ہیں وہ کوہ پیماؤں کو محتاط رہنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اس صورت میں کوہ پیما کو قدم آگے بڑھانے سے پہلے یہ اطمینان کر لینا ضروری ہے کہ آیا اس کا اگلا قدم کسی گڑھے یا دراڑ میں تو نہیں پڑنے والا ہے اس کام کو وہ اپنی چھوٹی کلہاڑی کی مدد سے کرتا ہے اور قدم بڑھانے سے پہلے برف کی موٹائی کا اندازہ لگا لیتا ہے

ہمالیہ کی ایک اونچی چوٹی ننگا پربت پر چڑھنے والے کئی کوہ پیما گلیشیر کی انہی دراڑوں میں گر کر اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔

پیامی معمانمبر ۳۸

	ر		۱ چ
	ر		۲ د
ر		ن	۳ م
ر	ی		۴
		ا	۵ ر
	ل		۶ ع

اشارے

... پیام تعلیم کا سالانہ چندہ ——— روپے ہے۔

۱۔ جب کوئی ... تک بھاگے گا تو تھکن ہو ہی جائے گی۔ (دور ۔ دیر)

۲۔ ہمارے ملک کے ... دیکھنے کے لئے بڑی دور دور سے لوگ آتے ہیں (مندر ۔ منظر)

... اس زمانے کے تو ... بھی لالچی ہوتے ہیں (امیر ۔ فقیر)

... ... اندھیری ہو تو تھوڑی دور جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے (راہ ۔ رات)

... بہت کم لوگ ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ——— کے بغیر ترقی مشکل ہے۔ (عدل ۔ عمل)

... پیامی معمانمبر ۳۸ ماہنامہ پیام تعلیم ۔ جامعہ نگر نئی دہلی

ٹوکن پیامی معمانمبر ۳۸

نام ....

پتہ ....

... پبلشر حامد علی خاں

مطبوعہ ۔ کوہ نور پریس ۔ دہلی

پیامی معمّا نمبر ۷۳ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل پیامی معمّا نمبر ۷۳ (۱) توبہ (۲) جیل (۳) مال (۴) دادی (۵) نوٹ (۶) بے کار

اس بار صحیح حل ۴۰ آئے لہذا پہلا انعام ۱۲ ر آنے فی کس تقسیم کیا گیا

(۱) صلاح الدین۔ جامعہ نگر (۲) فاروق علی۔ آگرہ (۳) شریف احمد۔ ادے پور (۴) امجد علی۔ ہردوئی (۵) عبد الودود۔ جودھپور (۶) احمد دین۔ حیدرآباد (۷) میمونہ بیگم۔ شولاپور (۸) محمد حسن۔ شولاپور (۹) عبد الحق۔ بدایوں (۱۰) محمد یدہسکھ بالکرشن۔ امرتسر (۱۲) محمد صدیق۔ بریلی (۱۳) نور محمد۔ مظفر نگر (۱۴) محمد رفیق۔ بریلی (۱۵) اقبال حسین۔ اوجین (۱۶) علی گڑھ (۱۷) احمد کمال۔ دہلی (۱۸) محمد یونس۔ دہلی (۱۹) اصغر حسین۔ کلکتہ (۲۰) ایس۔ محمد حسین۔ بریلی (۲۱) وجیہ دادا۔ (۲۲) انوار علی۔ جونپور (۲۳) فرید میاں۔ گیا (۲۴) اوم پرکاش۔ جبل پور (۲۵) فضل مولا۔ کلکتہ (۲۶) محبوب حسین۔ نئی دہلی (۲۷) عنایت علی۔ منگلور (۲۸) مجیب الرحمٰن۔ پٹنہ (۲۹) اختر حسین۔ الہ آباد۔ احمد علی۔ الہ آباد (۳۱) فضل الرحمٰن۔ ناگپور (۳۲) قمر جہاں بیگم۔ ہردوئی (۳۳) بدر الدین۔ کلکتہ (۳۴) حا دہلی (۳۵) فردوس بیگم۔ علی گڑھ (۳۶) عبد العزیز۔ پٹنہ (۳۷) شمس الدین۔ بنارس (۳۸) حکمت اللہ۔ رام محمد شفیع۔ دہلی (۴۰) غلام حسین۔ حیدرآباد

اس بار ایک غلطی والے ۴۶ حل موصول ہوئے لہذا دوسرا انعام ۷ ر فی کس تقسیم کردیا گیا۔ (جگہ کی کمی کی وجہ سے تمام نام نہیں دئے جاسکتے)

نوٹ:۔ بعض بچے ایسا کرتے ہیں کہ:۔

(۱) اپنے حلوں کے ساتھ ٹکٹ نہیں رکھتے۔ (۲) ٹکٹ کاغذ پر چپکا دیتے ہیں۔

(۳) استعمال شدہ ٹکٹ بھیجتے ہیں۔ (۴) اپنے حل ٹھیک وقت پر نہیں بھیجتے۔ ایسا کرنیوالوں کے


343-A
نوبہار
بچوں کی صحت کے لئے
لاجواب ٹانک
قیمت فی شیشی
ایک روپیہ
NAV BAHAR
An incompatable
نوبہار
ہندوستانی دواخانہ
پوسٹ بکس نمبر ۲۷ بلیماران دہلی
(قائم کردہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم)
ہندوستانی دواخانہ
پوسٹ بکس نمبر ۲۳ بلیماران